روحِ بیدل

•

تالیف
ڈاکٹر عبدالغنی

•

مجلسِ ترقی ادب
کلب روڈ ــــ لاہور

روحِ بیدل

تالیف

ڈاکٹر عبدالغنی

★

ناشر

مجلس ترقی ادب ـ ۲ کلب روڈ لاہور

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول : جولائی ۱۹۶۸ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : سید امتیاز علی تاج ، ستارۂ امتیاز
ناظم مجلس ترقی ادب ، لاہور

طابع : محمد زرین خاں

مطبع : زرین آرٹ پریس ریلوے روڈ لاہور

قیمت : ۵ر روپے

بصد عجز و نیاز

بعالی خدمت جناب ابوالبرکات سید محمد فضل شاہ صاحب
سجادہ نشین جلالپور شریف (جہلم)
و
امیر حزب اللہ ادام اللہ برکاتہم
جن کی نگہ باطن نے بڑے لطف و کرم سے مشاہدہ کرایا کہ
معنوی اور صوری لحاظ سے
"انسان خالق حقیقی کا حیرت زا شاہکار ہے"

تقدس جوهری رمزِ کمالت کیست دریابد
ز بس کز فهم بیرونی تو هم خود را نمی یابی

بیدل

ترتیب

مضمون	صفحہ
حرفِ اول ؛ از مصنف	۱ تا ۲۴
۱- میرزا بیدل پر اپنے عہد کے اثرات	۲۷ تا ۴۳
۲- میرزا بیدل کی سیرت و شخصیت	۴۴ تا ۹۸
۳- مزار بیدل	۹۹ تا ۱۳۴
۴- بیدل اور غالب	۱۳۵ تا ۱۴۱
۵- مثنوی طورِ معرفت	۱۴۲ تا ۱۵۹
۶- بیدل کی ایک جمالیاتی علامت	۱۶۰ تا ۱۹۰
۷- بیدل اور حباب — ایک مطالعہ	۱۹۱ تا ۲۵۹
۸- کلام بیدل میں لفظِ آئینہ	۲۶۰ تا ۲۸۳
۹- بیدل کے ہاں لفظِ آئینہ کا علمی پس منظر	۲۸۴ تا ۳۰۸
۱۰- کلامِ بیدل میں معنی خیز علامتیں	۳۰۹ تا ۳۳۴

ضمیمہ

مضمون	صفحہ
۱- تذکرۂ بیدل	۳۳۵ تا ۳۸۴
۲- لعل کنور	۳۸۵ تا ۳۹۶
۳- بیدل کی ایک غیر مطبوعہ مخمس	۳۹۷ تا ۴۰۲
فرہنگ اصطلاحات	۴۰۳ تا ۴۱۶
کنایات	۴۱۷ تا ۴۲۰
اشاریہ	۴۲۱

مصنف

ڈاکٹر عبدالغنی ایم ۔ اے ، پی ۔ ایچ ڈی ولد میاں فتح محمد مرحوم اعوان ۔

تاریخ پیدائش : ۲۵ جنوری ۱۹۱۰ء ۔ وطن : بلو ، ضلع جھنگ ۔

دوسری تصنیفات : امیر حزب اللہ : (بزبان اردو) سیرت بیدل (بزبان انگریزی) ۔

بکلام بیدل اگر رسی مگذر ز جادۂ منصفی
کہ کسی نمی طلبد ز تو صلۂ دگر مگر آفرین
بیدل

چمن غیر بیدلم که سحاب رشحهٔ خامه‌اش
بتاملی گهر افکند سر قطره نگون کند
(بیدل)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اول

اکتوبر ۱۹۴۹ء کے رسالہ 'مخزن' میں جب 'مرزا عبدالقادر بیدل پر اپنے عہد کے اثرات' کے متعلق راقم سطور نے اپنی معلومات کی روشنی میں بحث کی تو اس رسالے کے نامور ایڈیٹر مولانا حامد علی خاں کو مقالہ بھیجتے ہوئے تعارفی مراسلے میں یہ سطر بھی تحریر کی :

> "جہاں تک میری کوششوں کا تعلق ہے ، انشاءاللہ زندگی بھر
> بیدل کو دنیا سے روشناس کرانے کے لیے صرف کرتا رہوں گا ۔"

خوش قسمتی سے کوئی ڈیڑھ سال بعد مارچ ۱۹۵۱ء میں بیدل پر تحقیقات کے لیے پنجاب یونیورسٹی نے مجھے وظیفہ عطا کیا اور اس طرح یک سوئی سے بیدل پر کام کرنے کے لیے موقع مل گیا ۔ تحقیق و تدقیق کا یہ کام مئی ۱۹۵۳ء کے خاتمے پر پایۂ تکمیل کو پہنچا ۔ انگریزی زبان میں ایک مقالہ مرتب ہوا تھا ۔ چناں چہ اس کی بنا پر یونیورسٹی نے جنوری ۱۹۵۶ء میں مجھے دکتری کی ڈگری عطا فرمائی ۔ اس کے بعد ۱۹۶۰ء میں یہ مقالہ[۱] پبلشرز یونائیٹڈ لاہور نے طبع کرایا اور اہل علم سے بیدل کو متعارف کرانے کا جو وعدہ گیارہ سال پہلے کیا گیا تھا ، کسی حد تک پورا ہوگیا ۔

لیکن انگریزی کے اس رسالۂ دکتری کے علاوہ اردو زبان میں بھی میرے مقالات شروع سے ملک کے مقتدر رسائل میں چھپتے چلے آ رہے تھے ۔ غور و فکر اور مسلسل مطالعے کی وجہ سے بیدل کی شخصیت اور شاعرانہ حیثیت کے جو نئے پہلو نگاہوں کے سامنے آتے تھے ، انھیں سپردِ قلم کر دیا جاتا تھا ۔ اس طرح مقالات کی ایک قابل قدر تعداد موجود ہوگئی ۔ ان کی طرف توجہ نہ دی جاتی

۱- Life & Works of Abdul Qadir Bedil.

تو خطرہ تھا کہ ساری محنت رائگاں جاتی ، اس لیے اب انھیں یکجا کرکے 'روح بیدل' کے نام سے شائع کرایا جا رہا ہے ۔ اس مجموعے کو اس شاعرِ اعظم کے تعارف کے سلسلے میں بندے کی طرف سے ایک اور کوشش تصور فرمائیں ۔

'روح بیدل' کا لفظ اکتوبر ۱۹۴۹ء کے مذکورہ بالا مقالے کی آخری سطر سے لیا گیا ہے ۔ بیدل کے متعلق یہ میرا اولین مقالہ تھا اور بقول مولانا غلام رسول مہر خیالات جس طرح ذہن میں آتے گئے تھے ، انھیں اسی طرح قلم‌بند کرتا چلا گیا تھا ۔ ان کے مضمرات میں گہرائی ، وسعت اور ربط پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی ۔ تاہم اسی سے یہ پتا ضرور چلتا ہے کہ 'روح بیدل' سے آشنا ہونے کی خواہش ابتدا ہی سے دل میں پیدا ہو گئی تھی ۔ بعد میں یہ خواہش مختلف طریقوں سے تکمیل کے مراحل طے کرتی رہی ۔ اور اگرچہ اصل منزل اب بھی کافی دور ہے ، لیکن اپنی مساعی سے اربابِ علم کو آگاہ کر دینا ازبس ضروری نظر آتا ہے ۔ عین ممکن ہے ان کو سامنے رکھ کر اور میری کوتاہیوں سے پوری طرح باخبر ہو کر وہ حضرات اصل منزل کی طرف زیادہ آسانی اور نمایاں کامیابی کے ساتھ سفر جاری رکھ سکیں ۔

ہر مقالے کی تاریخِ اشاعت اس کے اختتام پر درج کر دی گئی ہے اور ساتھ ہی اس مؤقر جریدے کا نام بھی لکھ دیا گیا ہے جس میں مقالہ طبع ہوا تھا ۔ اس طرح ایک تو ان جرائد کا شکریہ ادا کرنا مقصود ہے کیونکہ بیدل کو متعارف کرانے میں انھوں نے میرے ساتھ کھلے دل سے تعاون کیا ۔ دوسرے یہ بھی منظور ہے کہ اربابِ علم کو معلوم ہو سکے کہ میرے خیالات کس طرح نشو و نما پاتے رہے ۔ اپنی ذہنی کاوش جس حیثیت کی بھی ہے ، اسے ان کے حضور پیش کر دیا گیا ہے ۔ اس طرح پتا چل جائے گا کہ ایک کوشش مرورِ ایام سے کس طرح بتدریج زیادہ بارآور ہوتی چلی گئی اور اس کا منتہا کیا ہے ؟

برصغیر ہند و پاک میں اس ناچیز کے علاوہ بعض بڑے نامور اہل قلم نے بھی بیدل کے متعلق بڑے بصیرت افروز مقالات تحریر فرمائے ہیں ۔ یہاں ان مقالات کی طرف اشارہ کیا جائے گا جو بعد میں معرض تحریر میں آنے کی وجہ سے میرے رسالہ' دکتری میں زیرِ بحث نہیں آ سکے ۔ اردو زبان کے مشہور نقادِ سخن سید عابد علی عابد نے 'غالب اور بیدل' کے عنوان سے بیدل سے غالب کی عقیدت اور شیفتگی کی وجوہ بیان فرمائیں ۔ یہ مقالہ 'نئی تحریریں' نمبر ۱ ، مطبوعہ لاہور

(حلقہ ارباب ذوق) میں موجود ہے۔ سید صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ غالب کے دل میں حد سے زیادہ بڑھی ہوئی خودداری، تمکین اور وقار کا جذبہ موجود تھا اس لیے اس کی نظر میں معیاری انسان اور شاعر وہ تھا جو مدحِ سلاطین و وزرا سے بے نیاز ہو۔ غالب نے گو معاشی مجبوریوں کی وجہ سے مدح سرائی کی تو اس سے اس کی شخصیت دولخت ہو گئی۔ اس کے دو معنوی وجود پیدا ہو گئے، جو اکثر ایک دوسرے سے برسرِپیکار رہتے تھے۔ لیکن بیدل میں غالب کو وہ معیاری فنکار، شاعر اور مفکر نظر آیا جو اس کے وجود میں مثالی تصوّر کی طرح زندہ رہتا تھا۔ اس لیے جب غالب، بیدل کی مدح کرتا ہے تو وہ اس غالب کی مدح کرتا ہے جو وہ بن نہ سکا اور جس کی آرزو کرتا تھا۔ سید عابد علی عابد کے خیال کے مطابق غالب کو بیدل سے عقیدت کی پہلی وجہ بیدل کے اوصاف اور اس کی ذات کی وجہ سے تھی۔

سید صاحب موصوف اپنے اس مقالے میں تحریر فرماتے ہیں کہ غالب کی بیدل سے شیفتگی کی دوسری وجہ بیدل کے کلام کے اسلوب اور اس کے فکری پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہے۔ انھوں نے تصریح فرمائی ہے کہ بیدل مختلف مقامات سے سوچتا ہے اور اپنی ترکیبات اور الفاظ میں ان کے معنوی التزامات اور اشارات مخفی کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر سید صاحب بیدل کا ایک شعر لیتے ہیں جس کی گوناگونی اور نیرنگی تو مسلّم ہے، لیکن اس کی دقیق ترین صفت حسن کی گریز پائی ہے اور وہ یہ ہے کہ شاعر یا فنکار حسن کی کلّیت کا احاطہ کرنے کے لیے کتنے ہی پہلوؤں سے اسے کیوں نہ دیکھ لے، لیکن حرماں کا احساس ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ سید صاحب یہاں حسن کا لفظ جمالیات کے نقطۂ نظر سے استعمال کرتے ہیں اور اس میں حسنِ حسی سے لے کر حسنِ ذہنی اور روحانی تک ہر مرحلہ شامل ہے اور حسنِ مطلق بھی، جو سب سے زیادہ گریز پا ہے۔ سید صاحب فرماتے ہیں کہ حقیقت اور نکوئی پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے کیوں کہ یہ حسن کے دوسرے نام ہیں۔ اب بیدل کی نظر میں فنونِ لطیفہ کے حسن، تناسب وغیرہ تک یہ تمام مقامات تھے تو مندرجۂ ذیل شعر ہوا:

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنجِ خمارِ ما
چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنارِ ما بہ کنارِ ما

سید عابد علی عابد کہتے ہیں کہ غالب کو بیدل کی یہ ادا بہت پسند آئی۔

اس کے شعر میں بھی مطالب کے مختلف مقامات ہوتے ہیں ۔ بیدل سے غالب نے سیکھا کہ مطالب عامیانہ نہ ہوں اور ابتذال سے پاک ہوں ۔ لطافتِ مطالب نے اسے تشبیہ کی خوبی اور استعارے کے حسن کی طرف رہنمائی کی اور تراکیب تازہ اور لطیف استعارات و تشبیہات کے استعمال میں بھی بیدل کا نمونہ غالب کے لیے مصبرِ راہ بنا ، حتیٰ کہ اپنی مسلمہ خود بینی کے باوجود ایک شاگرد کی طرح غالب نے بیدل کے مطالب و مضامین بہ ادنیٰ تصرّف یا تھوڑی سی آنچ کے ساتھ اپنے کلام میں شامل کیے ۔

فنِ تنقید میں ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب کا مقام بھی بڑا بلند ہے ۔ انھوں نے بھی فارسی گویانِ ہند کے درمیان علامہ اقبال کا مقام متعین کرتے ہوئے ضمناً بیدل کا تذکرہ کیا اور فرمایا کہ بیدل کی علامتِ حباب کے مقابلے میں اقبال کی علامتِ شاہین زیادہ حیات آفریں ہے ۔ قبلہ ڈاکٹر سید صاحب کی اس تنقید کا اثر میرے اس مقالے میں موجود ہے ، جس میں بیدل کی علامتِ حباب کو زیرِ بحث لایا گیا ہے ۔

ایک طویل مقالہ جناب مجنوں گورکھ پوری نے رسالہ 'سویرا' کے سال نامہ ۱۹۵۷ء میں تحریر فرمایا ۔ یہ ایک خط کی صورت میں تھا جو انھوں نے ایک خیالی پیکرِ محسن یاسمین کو لکھا ۔ وہ لکھتے ہیں کہ زندگی کے اواخر میں ان کے دل میں مدت العمر کا دبا ہوا ارمان ابھر آیا اور لگاتار تین دن لکھتے رہنے کے بعد اٹھائیس صفحات پر پھیلا ہوا یہ خط مکمل کیا ۔ لڑکپن سے بیدل کی شخصیت اور شاعری ان پر چھائی ہوئی تھی ۔ اس خط میں انھوں نے جی کھول کر اپنے تاثرات قلم بند کیے اور بڑی قطعیت کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا ۔ یہ نگارشات ایک ایسے ادیب ، نقاد نگار اور شاعر کے قلم سے ہیں جسے فنی اور فکری لحاظ سے کیا اور سیرت و شخصیت کے اعتبار سے کیا ، بیدل کے ہم پایہ اور کوئی شاعر نظر نہیں آتا ۔

شخصیت کے نقطۂ نگاہ سے مجنوں گورکھ پوری بیدل کی الدروی طلب سے بے حد متاثر ہیں جو پوری سعی و محنت اور کدوکاوش کے باوجود شرمندۂ تسکین نہیں ہو سکی ۔ اس طلب نے ایک بار بیدل کے ایامِ طفلی میں خارجی پیکر بھی اختیار کر لیا تھا ، جس کا تذکرہ وہ بڑے حسین اور دلکش پیرائے میں اپنی نثری تصنیف 'چہار عنصر' میں کرتے ہیں ۔ یہی بنیادی عنصر بیدل کی شخصیت میں

جاذبیت پیدا کرتا ہے ، ان کے تخیّل کو حسنِ گریز پا کا واله و شیدا بناتا ہے اور ان کے ذہن میں نامعلوم عظمتِ کردار کے تصورات ابھارتا ہے ۔ مختون گورکھپوری لکھتے ہیں کہ بیدل زندگی کی اُن منزلوں سے گزر چکے ہیں جنہیں اندرونی تصادمات کہا جاتا ہے ۔ ان کے خیالات اور جذبات و احساسات میں کامل ہم آہنگی ہے ۔ وہ حسّی اور ذہنی ہفت خواں طے کر چکے ہیں اور ان کے لیے کوئی عقدہ اور کوئی مسئلہ لاینحل نہیں ، اس لیے وہ بڑی بلندیوں پر بیٹھ کر ہر چیز کا جائزہ لیتے ہیں ۔ دنیا کے جھوٹے رسوم و قیود اور زندگی کے عارضی اور سطحی مروجات کو خاطر میں نہیں لاتے اور عارفانہ وضع اختیار کرکے دنیا کے ساتھ نباہتے ہیں ۔ دنیا کی کوتاہیوں اور ناقابلیتوں کو سمجھ کو فراخ دلی کے ساتھ اسے معذور اور معاف رکھتے ہیں ۔ اس لیے اپنے کلام میں بڑی شرافت اور خوش نیتی کے ساتھ اس انداز سے دنیا کی کم فہمی ور کوتاہ نگاہی کی شکایت کرتے ہیں کہ شکایت پیغام بن جاتی ہے : مثلاً

ذرہ تا خورشید عرفان جلوہ است امّا چہ سود
دیدہ ہای خلق ُپر غفلت نگاہ افتادہ است
عاصی محمل بدوش وہم جولاں می‌کند
کیست تا فہمد کہ منزل ہم براہ افتادہ است

ظاہر ہے بیدل علم و عرفان کے فدائی ہیں مگر اُن لوگوں کو برا سمجھتے ہیں جو اپنے نصابی علم کے زور سے جاہل عوام النّاس کو اپنا غلام بنائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اسی طرح دنیا داری اور ثروت پرستی سے بھی انھیں دلی نفرت ہے ۔ وہ صرف فطری اور اصلی قابلیت رکھنے والوں کے دوست اور مدّاح ہیں اور ایسے لوگوں کے لیے ان کا یہ پیغام ہے :

بد طینتی اگر سپرد راہِ غفلتی
خوبان ز کفِ عنانِ تحمل چرا دہند

ماورائیت اور خدا رسیدگی کے ساتھ ساتھ بھی عنانِ تحمّل اور جبلی شرافت بیدل کو انسان پرست ، خلایق دوست ، جمہور کا خیر خواہ اور فلاح اندیش بناتی ہے ، جو ان کی زندگی کا آفاقی پہلو ہے ۔ ان تمام امور سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیدل بے نظیر صاحبِ دل اور شخصیت کے لحاظ سے مجتہد اور منفرد تھے ۔ انھیں عرفانِ ذات بھی حاصل تھا اور معرفتِ آفاق بھی ۔ اپنوں کے درمیان وہ بیگانے

رہے ۔ اپنی برتر شخصیت کے باوجود اسے "ہیچ بودن" کا شدید احساس ان کے دل میں پایا جاتا تھا ؛ یعنی ان کے لیے حساسِ برتری نفس کی پیچیدہ گرہ نہ بن ۔

بیدل کی شخصیت کے متعلق مجنوں گورکھ پوری کے سارے خط میں بکھرے ہوئے خیالات کا یہ ماحصل ہے ۔ اب ہم یہ معلوم کرتے ہیں کہ بیدل کی شاعری کے متعلق ان کے کیا تاثرات ہیں ۔ مجنوں گورکھ پوری اسلوبِ بیدل کی بنیاد بھی ان کی اندرونی طلب میں دیکھتے ہیں ۔ یہ طلب انفس و آفاق کے متعلق انہیں آئے روز نئے نئے حقائق سے روشناس کرتی تھی ۔ ان کی وردات قلبی نے مخصوص دائرے میں رہتے ہوئے زمان و مکان کی تمام وسعتوں کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا ۔ ظاہر ہے اس طرح بیدل کے خیالات و جذبات عام مروجہ معیار سے منحرف ہو گئے اور ان کے اظہار کے لیے انھیں نئے اسالیب ایجاد کرنے پڑے ۔ وہ نئی ترکیبوں اور نئے اسالیب کے پروردگار بن گئے ۔ نئی تشبیہوں ، نئے استعاروں اور نئی کیفیتوں کا سامان وافر انھوں نے موجود کر دیا ۔ مثلاً :

تمام تشوینم لیک غافل کہ دل براہ کہ می خرامد
جگر بہ داغ کہ می نشیند نفس بہ آہ کہ می خرامد

اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ عام اور کثیرالاستعمال الفاظ میں بھی اپنی ابداعی قوت اور اپنے خلاق تخیل سے انھوں نے نئی نوادائی اور نئی بلاغت پیدا کر دی ۔ اس مرحلے پر مجنوں گورکھ پوری کلامِ بیدل میں سے لفظ 'رنگ' کو منتخب کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ کس طرح اس کے معنوی امکانات کا جائزہ لے کر بیدل نے اس میں طرح طرح کی معنوی وسعتیں پیدا کر دیں ۔ حسب مجنوں گورکھ پوری کے اس طرح انتخاب کردہ چند اشعارِ بیدل ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

شکست رنگ جرأت می کشاید بال اظہارم
بیدلی ہای بسمل شوخیِ آواز می دارد

—

بہ خیال چشم کہ می رسد قدح جنوں دل تنگ ما
کہ ہزار میکدہ می دود بہ رکاب گردش رنگِ ما

در یادِ توام نیست غم از کلفتِ امکان
گردی که بود در رہِ گلشن ہمہ رنگ است

عالمِ رنگ است سر تا پای من
در خیالت گردِ خود گردیدہ ام

تجدید ناز آمدہ رنگ بہار آرائیت
بے پردگی دیوانہ طرح نقاب انگندئت

اس طرح مضمون گویکہ پوری والہانہ انداز میں بیدل کے اسلوبِ شعری کا ایک ایک عنصر رنگین نگاہوں کے سامنے لاتے ہیں اور مثالیں پیش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں مجرد کو مجسم اور غیر محسوس کو محسوس بنا دینے کے فن میں بیدل بے مثل دستگاہ رکھتے تھے ۔ ان کا رمز شناس تخیل سنگ و خشت میں بھی احساس کی فراوانی اور نورِ زندگی کی تابانی دیکھتا تھا اور اپنے اس تخیل کے ذریعے وہ مناظر فطرت کی تصویریں بڑی تخیلی بصیرت کے ساتھ کھینچتے ہیں ، اور پھر جب وہ سیدھی سیدھی باتیں چھوڑ کر اپنے فن میں ترچھا پن پیدا کرتے تھے ، جس کو سننے اور سمجھنے کے لیے اونچے تربیت یافتہ اور بالغ ادراک کی ضرورت ہے ، تو ان کا کلامِ زیادہ بلیغ اور ہمہ گیر پیغام کا حامل بن جاتا تھا ۔ اس ترچھے پن کی مثال یہ اشعار ہیں :

بحر بیتاب که آن گوہر نایاب کجاست
چرخ سرگشته که خورشید جہانتاب کجاست
دیر زین غصه در آتش که چه رنگ است صنم
کعبه زین درد سیه پوش که محراب کجاست
ای سمندر به ہوس داغ فروش آتش کو
ماہیان تشنه بمیرند دمِ آب کجاست

ان اشعار سے زندگی کی مسلسل نایافت کا اظہار ہوتا ہے ۔ یہی بیدل کی حقیقی روح ہے ۔ بیدل کے لیے نارسائی کا درد زندگی کا راز تھا اور زندگی کا سہارا :

مقام وصل نایاب است و راہِ سعی ناپیدا
چہ می کردیم یا رب گر نہ بودی نارسیدنہا

یہ انکشاف اور یہ احساس انجام کار بیدل کے ہاں اس شعر کا جامہ اوڑھ لیتا ہے جس کی بے دریغ کائناتی معنویت کا اوسط ذہن احاطہ نہیں کر سکتا :

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نہ رفت رنجِ خمار ما
چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنار ما بہ کنار ما

بیدل کے اشعار کی انھی پہنائیوں کے زیر نظر مجنوں گورکھ پوری لکھتے ہیں کہ اگر ان کے ہر شعر کی اندرونی کائنات کا تجزیہ کیا جائے تو نہ جانے کتنا بڑا دفتر تیار ہو جائے ۔

مجنوں گورکھ پوری رقم طراز ہیں کہ بیدل کے شعری اور نثری کارناموں کا غائر مطالعہ کرنے سے یہ سبق ملتا ہے کہ فن اور اخلاق کے درمیان کوئی بیگانگی نہیں ، اور اصل فن وہی ہے جو اخلاق کی تہذیب میں مددگار ثابت ہو ۔ اس عظیم شاعر کی رنگا رنگی کی کوئی حد و نہایت نہیں ۔ اس کا نیرنگ ساز تخیل کسی مقام پر پابند نہیں ۔ ہر قسم کے تجربات و واردات کے اظہار پر اس کو قدرت حاصل ہے ۔ اس کا اسلوب اس قدر اچھوتا ہے کہ وہ ہر واقعے ، ہر تجربے اور ہر چیز کو نئے زاویے سے دیکھتا ہے اور نظر سے اوجھل پہلوؤں اور پوشیدہ تہوں کا پتا لگاتا ہے اور نئی باتیں معلوم کرتا ہے جن کو پرانے اسالیب میں بیان نہیں کیا جا سکتا ۔ ان کا ہر شعر ایک نئے آہنگ کی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے اور کوئی شعر ایسا نہیں جو ہمیں کچھ نہ کچھ دے نہ جاتا ہو ، اور جو کسی نہ کسی اعتبار سے ہمارے نفس کی تہذیب اور تربیت میں مددگار نہ ہوتا ہو ۔

شخصیت اور اسلوب کے علاوہ مجنوں گورکھ پوری نے بیدل کے فکری اجتہاد کو بھی زیر نظر رکھنے کی کوشش کی ہے ۔ وہ اسے بہت بڑا دانشور ، معلم اخلاق اور دانائے راز سمجھتے ہیں جو زندگی کی اصلیت اور اخلاق و تمدن کی اہمیت سے واقف تھا ۔ مجنوں گورکھ پوری کہتے ہیں کہ اگلے زمانے کے فارسی زبان کے شاعروں میں بیدل سے بڑا حکیم اور مفکر مشکل سے ملے گا ۔ اس کو تحقیق اور کائناتی وجود کی جدلیت یعنی "ہر متضاد اور متناقض بالذات اہمیت کا درک تھا اور وہ اندرونی تضاد کو بیان کرنے کے لیے طرح طرح کے پیرائے اختیار کرتا تھا جو غیرمانوس ہونے کے باوجود بھی ہمیں دل کش معلوم ہوتے ہیں ؛ مثلاً :

علتِ امدادِ خلق اوج و حضیضِ فطرت است
زین سبہا بولہب عمم پیمبر بودہ است

اور عمل نے بار بار اس قسم کے ہیچ اشارے اس زمانے میں کیے جب کہ ہیگل اور مارکس کے جدلیاتی فلسفے کا جواب بھی تصور میں نہیں آ سکتا تھا۔

ان تصریحات کے زیرِ نظر مجنوں گورکھ پوری یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ واقعی بیدل محیطِ بے ساحل ہے۔ اس کی کائنات فکر کا رقبہ لا محدود ہے۔ دنیا اور انسان کی خلقت کے راز، انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور مسئلوں میں کون سا پہلو یا مسئلہ ہے جس پر بیدل نے غور و فکر نہ کیا ہو اور جس کے متعلق اس کے ہاں ہدایتی اشارے نہ ملتے ہوں۔ حکمت و فلسفہ، اخلاق و معاشرت، مذہب و معرفت، کیا ہے جو بیدل کے کلیاتِ نظم و نثر میں نہ ہو اور جس میں بیدل ہمارے لیے ایک مجتہد کی حیثیت نہ رکھتا ہو۔ مضامین اور اسالیب دونوں میں بیدل کے ہاں جیسا لامتناہی تنوع ہے، اس کی مثال فارسی یا اُردو کے کسی دوسرے شاعر یا نثر نگار کے ہاں نہیں ملتی — اسی عظمت اور تنوع کے سبب ہم عصر یا بعد کے لوگ بیدل سے حقیقی معنوں میں آشنا نہ ہو سکے۔ وہ اپنی شخصیت، اپنے فکر و احساس اور اپنے اسلوب و انداز کے اعتبار سے ایک مجتہد تھا۔ دنیا کی اس تک نارسائی اور اپنے بلند مقام کا اسے احساس تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بات سمجھنا آسان نہیں اور اس کو کسی سے شکایت نہیں تھی۔ اس کا ایک شعر ہے:

در جستجوی ما نکشی زحمتِ سراغ
جای رسیدہ ایم کہ عنقا نمی رسد

جناب مجنوں گورکھ پوری ضمناً بیدل اور غالب کا موازنہ بھی کرتے ہیں؛ غالب نے بیدل کا کیوں اتباع کیا؟ اس کا ایک جواب مراسلہ نگار یہ دیتے ہیں کہ بیدل کی طرح غالب کو بھی وجودِ کائنات اور وجودِ انسان کی جدلیت کا شدید احساس تھا اور اس نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ اس اندرونی تضاد کو صرف بیدل کی سکھائی ہوئی زبان میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس اتباع میں غالب کس حد تک کامیاب ہوئے؟ مجنوں گورکھ پوری اس سوال کا جواب بڑا مایوس کن دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ غالب کے اردو دیوان میں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جو اپنی اسلوبی انفرادیت کے باوجود فکر و تخیل میں

بیدل کے اشعار سے ماخوذ ہیں ؛ مثلاً بیدل کا شعر ہے :

از بس تپاش دامن دل دار نازک است
دستم اگر بکار رود کار نازک است

اب غالب کا یہ مشہور شعر بیدل کے شعر کا محض ایک بگڑا ہوا عکس ہے :

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

مجنوں گورکھ پوری کہتے ہیں غالب کا شعر بڑی پست سطح سے کہا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ اگر غالب کے کلیات فارسی اور بیدل کے کلیات کا ساتھ ساتھ مطالعہ کیا جائے تو فارسی میں بھی متعدد اشعار ایسے نکل آئیں گے جو نہ توارد ہیں نہ سرقہ ، بلکہ جن میں غالب نے شعوری طور پر بیدل کے بعض اشعار کے مطالب کو اپنے نئے اسلوب میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ مثلاً بیدل کا شعر ہے :

کعبہ و بت خانہ نقش مرکز تحقیق نیست
ہر کجا گم گشت راہ سر منزلی آراستند

اور غالب کی ایک مشہور فارسی غزل کا شعر ہے :

در سلوک از ہر چہ پیش آمد گذشتن داشتم
کعبہ دیدم نقش پای رہروان نامیدمش

فاضل مراسلہ نگار کا خیال ہے کہ بیدل کا شعر غالب کے شعر سے زیادہ بلیغ اور دل نشیں ہے ۔ مزید موازنہ کرتے ہوئے وہ کہیں تو لکھتے ہیں کہ غالب کے فلاں فلاں اشعار میں بیدل کے فلاں فلاں اشعار کے ارتعاشات بہت صاف محسوس ہوتے ہیں اور کہیں فرماتے ہیں بیدل کے شعر کے سامنے غالب کا شعر صحافت معلوم ہوتا ہے ، اور کہیں یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ بیدل کے اشعار میں فکر کی تہ در تہ بلاغت اور استعارہ اور تمثیل کی نزاکت زیادہ ہے ۔

یہ مجنوں گورکھ پوری کے مراسلے کی تلخیص تھی ۔ مراسلہ زیادہ پُر لطف اور نشاط انگیز ہے جو مراسلہ نگاری کے اسلوب کا خاصہ ہے ۔ اس میں جزئیات بھی زیادہ ہیں اور ساتھ ہی خاتمے سے پہلے بیدل کے تمام اختراعات نظم و نثر چُن کر یک صد سے کچھ زائد ہر قسم کے شعر بھی درج کر دیے گئے ہیں ۔

اب ایک اور صاحب قلم کا ذکر کیا جاتا ہے ؛ ان کا اسم گرامی

خواجہ عبدالرشید ہے ۔ فوج میں لفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر فائز ہیں ۔ شعبۂ طب سے تعلق رکھتے ہیں ۔ علم و ادب سے انہیں فطری لگاؤ ہے ۔ جدید اور قدیم علوم میں ہم آہنگی پیدا کرنا ان کا محبوب شغل ہے ۔ بیدل کے بھی بڑے پرستار ہیں اور ان کا مطالعہ وہ وجودیت اور روحانیت کے نقطۂ نگاہ سے کرنے کے عادی ہیں ۔ وجودی فلاسفہ میں سے انھوں نے آؤسپنسکی (Ouspensky) کا مطالعہ خاصی دقت نظر سے کیا ہے لیکن جسپر (Gasper) سارتر (Sartre) وغیرہ سے بھی وہ بے خبر نہیں ۔ رموز تصوف سے متعلق اپنی تصنیف 'معارف اسمی' میں خواجہ عبدالرشید کہتے ہیں کہ اقبال سے پہلے دنیائے اسلام نے ہندوستان میں تین مفکر پیدا کیے : حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ، مرزا عبد القادر بیدل رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ۔ بیدل کے متعلق خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ تصوف کی دنیا میں ان کا مقام بہت بلند ہے اور جو رموز و نکات اس کے ہاں موجود ہیں ، مغرب ابھی تک ان کی تہ کو نہیں پہنچ سکا ۔ روحانی دنیا پر بیدل کی گرفت بڑی پختہ اور تجربہ گرانقدر ہے ۔ وجودیت اور روحانیت کی تعلیم جو اس کے ہاں موجود ہے ، وہ دانایان مغرب کے ہاں نہیں ہے ۔ یہ بیدل ہی تھا جس نے اول اول میں دل کو آئینۂ تمثال بڑے پیار سے پکارا تھا ۔ وہ تمام کائنات کو کلمات تصور کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ کلمات حروف سے تخلیق کیے گئے ہیں جو کتاب کائنات میں مصور ہیں اور یہ مصور حروف اشیا کی صورتیں ہیں جو ہم دیکھتے اور سنتے ہیں اور اسی آئینۂ تمثال کے توسط سے ہم ان کا ادراک کرتے ہیں ۔ بیدل کے ہاں وہ سب کچھ موجود ہے جو آؤسپنسکی اور مارٹن بوبر (Martin Buber) نے علی الترتیب وجودیت اور روحانیت پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے ۔

خواجہ صاحب رقمطراز ہیں کہ بیدل کا کلام بڑا سنگین اور مشکل ہے ۔ تاہم جہاں جہاں اور جب کبھی کسی جگہ پر معانی کی جھلک پڑتی ہے تو ذہن کے کئی ایک اندھیرے حصے منور ہو جاتے ہیں ۔ خود بیدل کو اس بات کا احساس ہے ۔ وہ طلب و جہد اور فکر و نظر کی طرف بار بار ہماری توجہ مبذول کراتا ہے کہ شاید کوئی حقیقت کو پا جائے ۔

طلب تو بس بود آنقدر کہ رسعئ ہمری حمر
بجودت اگر نہ رسد نظر خیال ہیچ و خدا طلب

خواجہ صاحب اپنی تصنیف میں فرماتے ہیں کہ جدید مغربی نفسیات میں ذاتی

مشاہدہ (Self-observation) اور خود آگاہی (Self-remembrance) کے دونوں عمل بڑے مقبول ہیں ۔ اور یہ دونوں بیدل کے ہاں ملتے ہیں اور ان سے وہ بھی وہی نتائج برآمد کرتا ہے جو جدید مغربی فلسفہ اور نفسیات میں پائے جاتے ہیں ۔ مختصر یہ کہ بیدل کے ہاں ہمیں وہ سب کچھ ملتا ہے جس کی تلاش ہم معری فلسفہ اور روحانیات میں کرتے ہیں ۔ بیدل جاں، شعور اور حقیقت و مجاز کے متعلق بھی بعض نقطے بڑی خوبی سے بیان کرتا ہے ۔ اپنے اس خیال کی تائید میں خواجہ عبدالرشید اسی عارفِ کامل کے مندرجہ ذیل اشعار نقل کرتے ہیں :

چیست بیداری ز باغ وہم و ظن گل چیدنی
خواب یعنی از غبار خود نگر در دیدنی
کبر و ناز آئینہ نقشی کہ نتوان بست ہیچ
ما و من تعبیر خواب دیدنی تا دیدنی
ساز ہستی و عدم ہست و کشاد چشم ماست
خواب و بیداری ندارد بیش ازین فہمیدنی

روحانیت کے جدید مغربی علم برداروں میں سے خواجہ عبدالرشید مارٹن بوبر (Martin Buber) کا ذکر کرکے فرماتے ہیں کہ بیدل اور ان کے درمیان ایک گونہ مماثلت نظر آتی ہے ۔ بوبر اس صدی کا بہت بڑا مفکر گزرا ہے اور اس کی ایک مختصر سی کتاب نے براعظم یورپ پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے ۔ علامہ اقبال نے بھی ایک مقام پر بوبر کا حوالہ دیا ہے جس سے دل میں خیال گزرتا ہے کہ ممکن ہے علامہٴ موصوف نے اپنے نظریہٴ خودی میں کچھ تاثرات بوبر سے مستعار لیے ہوں ۔ بوبر کی محولہ بالا مختصر کتاب کا نام ”من و تو“ (I and Thou) ہے ۔ اس صوفیانہ کتاب میں بوبر بڑے اونچی قسم کے تصوف کا ذکر کرتا ہے جس میں حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرنے کا راستہ بتایا گیا ہے ۔ یہ جذب و سلوک اور واردات سے متعلق ہے ۔ خواجہ عبدالرشید لکھتے ہیں کہ بیدل کی مندرجہ ذیل نظم کا عنوان بھی ”من وتو“ ہے ۔ یہ نظم خواجہ عباداللہ اختر مرحوم مصنفِ کتاب بیدل نے اپنے قلم سے بوبر کی اس کتاب کے اس نسخے کے ایک خالی ورق پر لکھ دی تھی جو خواجہ عبدالرشید کے اپنے کتب خانے میں موجود ہے :

چو ہستِ مطلق آید در اشارت
بلفظ ’من‘ کنند از وی عبارت

حقیقت کز تعیّن شد معیّن
تو او را در عبارت گفته‌ای 'من'
'من و تو' عارضِ ذات وجودیم
مشبّک هائے مشکوٰة وجودیم
همه یک نور دان اشباح و ارواح
گه از آئینه پیدا گه ز مصباح
چو کردی پیشوای خود خرد را
نمی دانی ز جزو خویش خود را
برو ای خواجه خود را نیک بشناس
که نبود فربهی مانند آماس
'من و تو' برتر از جان و تن آمد
که این هر دو ز اجزای 'من' آمد
بلفظ 'من' ز انسان است مخصوص
که تا گوئی بدو جان است مخصوص
یکی رہ بر تر از کون و مکان شو
جہاں بگزار و خود در خود جہاں شو
بود هستی بهشت[1] امکان چو دوزخ
'من و تو' درمیان مانند برزخ
چو برخیزد ترا این پرده از پیش
نماند نیز حکم مذهب و کیش
همه حکمِ شریعت از منِ توست
که آن بربستهٔ جان و تنِ توست
'من و تو' چون نماند درمیانه
چه کعبه چه کنشت و دیر خانه

۱- ایک نرالا تصور دیکھیے ؛ بیدل 'ہستی' کو بہشت کہتا ہے ۔ وجودی فلاسفہ ان بلندیوں تک کب پہنچ سکتے ہیں ۔

خواجہ عبدالرشید کی اس مختصر تصنیف یعنی 'معارفِ شعر' میں بیدل کا حوالہ چودہ مقامات پر موجود ہے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی اقلیمِ فکر بیدل سے مسخر کر لی ہے ۔ لیکن بنیادی طور پر وہ جس حیثیت کو بیان کرنا چاہتے ہیں اس کا ذکر ہو چکا ہے ۔ خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ انائے ذاتی ، داخلی حقائق اور ان کے بھرپور احساس کی بنا پر پیدا ہوئے و لا شعور، زمان و مکان اور دیگر متعلقہ مسائل کا جس انداز سے وجودیت کے علمبرداروں کے ہاں ذکر ملتا ہے ، اس سے بلیغ تر انداز میں بیدل کے ہاں موجود ہے ۔ اور ان کا عام طور پر خیال ہے کہ اس مسئلے سے آگاہی کے بغیر بیدل کے بہت سے اشعار پوری طرح سمجھ میں نہیں آ سکتے ۔ ہاں ایک نکتے کی توضیح ضروری ہے کیونکہ بیدل کو سمجھنے کے لیے یہ بھی بنیادی اہمیت کا حامل ہے ، خواجہ عبدالرشید راقم سطور کے ایک خط کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس ناچیز کے خیال کے مطابق خواجہ عبداللہ اختر تصوف کی حقیقت سے آشنا نہیں ہو سکتے تھے ۔ حاشا و کلّا ، یہ خیال اس عقیدے پر بالکل مبنی نہیں کہ 'کتابِ بیدل' کے مصنف کو علم و فضل سے حصۂ وافر نہیں ملا تھا ۔ کوئی طالبِ علم ، اہلِ علم و فضل کے سامنے جبینِ عقیدت خم کیے بغیر رہ نہیں سکتا ۔ اس حوالے میں ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا اب تذکرہ کیا جاتا ہے کیوں کہ بیدل اسی کے پیکرِ مثالی تھے ۔
فطرت کے منفی رجحانات کے تصفیے کے بعد جب ہی 'پرخلوص' اور 'پر سوز

۱۔ خواجہ عبدالرشید صاحب نے میرزا بیدل پر چار کتابوں کا مطالعہ کیا ہے ۔ بیدل ، حرفِ راز ، فیض قدس اور راقم کی تصنیف 'سیرتِ بیدل' بزبانِ انگریزی ۔ وہ کہتے ہیں کہ بیدل کے فکر کی نوعیت ان کے مصنفین میں سے کسی نے بیان نہیں کی ۔ 'سیرتِ بیدل' کے متعلق ان کے ۲۲ جولائی ۱۹۶۱ء کے راقم کے نام مراسلے میں یہ فقرات بھی موجود ہیں :

"آپ کی کتاب منگوا کر پڑھ لی ہے اور بڑے غور سے پڑھی ہے ۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے ۔ مجموعی طور پر کتاب ایک شاہکار ہے ۔ نہ صرف یہ کہ یہ کتاب آپ نے بیدل پر لکھی بلکہ اس میں فلسفہ و ادبیات کے بہت اہم نکتے بھی آپ نے بیان کر دیے ہیں ۔ ماشاء اللہ آپ کا مطالعہ بڑا وسیع ہے ۔"

تعلق باللہ کے ذریعے فقر محمدی انسان کی جس طرح قلب ماہیت کر دیتا ہے ، اُس کی کنہہ اور حقیقت کا اندازہ لگانا بڑے سے بڑے فلسفی کے لیے بھی ممکن نہیں - حواسِ خمسہ ، جو ہمارے ادراک کا ذریعہ ہیں اور ہمارے شعور کے دست و پا کی حیثیت سے کام کرتے ہیں ، ہرگز ہرگز اُس حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے - ذاتِ انسانی کی ماہیت میں یہ تبدیلی ایک طرف شعور کو اُس مقام پر پہنچا دیتی ہے جہاں اسے تجلیاتی شعور کہا جاتا ہے کیوں کہ اس مقام پر یہ براہِ راست تجلیِ الٰہی سے مستنیر ہو رہا ہوتا ہے - دوسری طرف یہ تبدیلی دوئی کو بے پناہ روحانی توانائی سے بھی معمور کر دیتی ہے - اس شعور اور توانائی میں دوام نہ بھی ہو لیکن اس کے مستقل تسلسل سے انکار نہیں کیا جا سکتا - حضرت بایزید بسطامی (وفات ۲۶۱ھ) اس مقام پر فائز ہونے تو اپنی تذکرہ لکھتے ہیں

' چون کار او بلند شد در حوصلہ' اہلِ ظاہر نمی گنجید ۔''

اور حضرت بایزید بسطامیؒ کو صوفیائے اسلام میں جو درجہ' بلند حاصل ہے ، اُس کے متعلق شیخ ابو الحسن خرقانی (وفات ۴۲۵ھ) نے سلطان محمود غزنوی (وفات ۴۲۱ھ) کے سامنے بے حد عقیدت مندی کے ساتھ فرمایا :

' بایزیدؒ چنین گفتہ است کہ ہر کہ مرا دید از رقم شقاوت ایمن شد ۔''

یہاں صرف حضرت بایزید بسطامیؒ کا ذکر کیا گیا ہے ، حالانکہ امتِ مسلمہ کا ہر ولی اپنے اپنے مرتبے کے مطابق قلبِ ماہیت کے بعد تجلیاتی شعور اور روحانی توانائی کا پیکر عجیب بنا اور اہلِ ظاہر کے عقل و فہم سے ماوراء رہا - اس قسم کے خوش نصیب انسانوں کو علامہ اقبال ؒکا صور پر انسانِ ربانی کہتے ہیں - ایسے مبارک انسان ہمارے ماہ و سال سے گزر کر آسمانی زماں میں سانس لے رہے ہوتے ہیں اور ہماری کائنات کو پھلانگ کر اُس کائنات میں پہنچ جاتے ہیں جس کی حقیقت سے صرف وہی لوگ باخبر ہوتے ہیں جو اس میں بستے ہیں - ہم تو ان کی زبان سے نکلے ہوئے منتشر کلمات سے استفادہ کرکے اپنی عقل کے مطابق ہی معمولی سا اندازہ ہی لگا سکتے ہیں جو بہرحال ناقص ہوتا ہے -

اب بیدل کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انسانیت کی اس معراج سے اوائل عمر ہی میں بہرہ مند ہوگئے تھے - اس لیے بیدل کو صحیح معنوں میں سمجھنے کے لیے ایک خاص قسم کی طبع لطیف اور قلبِ قدسی کی ضرورت ہے جو تصوف کی بلندیوں اور اس کی معمیات کا کماحقہ احصا کر سکے - فرید الدین عطارؒ کا

'تذکرۃ الاولیا' اس لیے بے مثل اور بے نظیر ہے کہ حضرت عطار، اولیائے کرام کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے پوری اہلیت رکھتے تھے۔ علامہ اقبال کا 'انسانِ کامل' بھی اسی لیے بے عدیل ہے کہ مبدءِ فیض نے اس کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے انھیں ضروری قلبی اور ذہنی صفات عطا کی تھیں۔ عقیبِ محض یا اہلِ عقل کی عامیانہ زندگی انھیں ہرگز ہرگز انسانِ کامل کا یہ روح پرور اور دل فریب نقشہ تیار کرنے کے قابل نہ بناتی۔ میں جب یہ کہتا ہوں کہ خواجہ عباداللہ اختر تصوف کی حقیقت سے آشنا نہیں ہو سکتے تھے، تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ تصوف کے حال و قال کی نوعیت سے اُن کی فطرت کو کچھ اتنا زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔ بنیادی طور پر وہ بس فلسفی ہی تھے اور ایک فلسفی کی حیثیت سے اپنی استطاعت کے مطابق شعورِ بیدل کے بعض پہلو انھوں نے اچھی طرح بے نقاب کیے ہیں۔ لیکن بیدلِ کامل ایک بالکل مختلف حقیقت ہے۔ بیدل کا معاملہ بھی اہلِ ظاہر کے حوصلے سے بمراتب افزوں تر ہے۔ علامہ شبلی اپنے مسلمہ علم و فضل اور کمال درجے کے ادبی و فنی شعور کے باوجود محض اسی لیے "سے سمجھ نہ سکے۔ اور خواجہ عبدالرشید صاحب کی تصنیف 'معرفِ النفس' کا مطالعہ کرکے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ خود حقیقتِ بیدل کے زیادہ قریب بھر رہے ہیں اور اگر انھوں نے دقتِ نظر، انہاک اور یکسوئی کے ساتھ مطالعہ" کتب اور مطالعہ" انفس و آفاق جاری رکھا تو اس حقیقتِ کاملہ کو پا لیں گے۔ انھیں اس سلسلے میں طبعِ موزوں عطا ہوئی ہے۔

بظاہر یہ جملہ" معترضہ تھا مگر بیدل سے اس کا گہرا تعلق ہے، اس لیے اس کا بالتصریح تذکرہ کیا گیا۔ بھارت میں بھی بیدل کے حالات اور ان کی تصنیفات کے متعلق ایک کتاب اردو زبان میں شائع ہوئی ہے۔ یہ پروفیسر سید شاہ محمد عطاء الرحمٰن عطا کاکوی کی 'حیرت زار' ہے جو ایوان اردو پٹنہ کی مطبوعہ ہے اور خاصی قابلِ قدر ہے۔

اس برِ صغیر سے باہر بھی بیدل پر کافی کام ہوا ہے۔ ایشیا کے سوویت علاقوں، خاص کر ازبکستان، تاجکستان اور خود روس میں اس وقت بیدل کی طرف لوگوں کا خاص رجحان ہے اور اس پر کافی کام ہو رہا ہے۔ غفور گورکھ پوری کے الفاظ میں اس کی وجہ یہ ہے کہ بیدل اپنے زمانے کے اعتبار سے اور اپنے انداز میں کسی چیدہ اور برگزیدہ جماعت یا طبقے کا نہیں بلکہ جمہور کا خیرخواہ اور

فلاح اندیش تھا۔ وہ دو گروہوں کا سخت دشمن تھا، ایک تو وہ گروہ جو دولت و ثروت کے بل پر عوام الناس کو زیر رکھنا چاہتا ہے، دوسرے وہ گروہ جو اپنے نصابی علم کے زور سے جاہل عوام الناس کو اپنا غلام بنائے رکھنے کی قصد و اہتمام سے کوشش کرتا ہے، وہ انسان پرست اور خلائق دوست تھا اور اس کا اولین مقصد یہ تھا کہ انسان کے نفس اور اخلاق میں پاکیزگی پیدا کرے۔ اس قسم کے عرف اور مصلح کی حیثیت سے وسطِ ایشیا کے محولہ بالا علاقوں میں بیدل کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ وہاں فکر و نظر اور شعر و ادب کے میدان میں ایک تحریک جاری ہے جس کو وہاں کے لوگ بیدلیت کہتے ہیں۔ وہاں بیدل کے سوانح اور اختراعات پر تحقیق و تدقیق کے ساتھ کام ہو رہا ہے۔ تاجیکستان کے مشہور محقق اور نقاد صدرالدین عینی نے ''عبدالقادر بیدل'' کے نام سے ایک معرکۃ الآرا کتاب تصنیف کی جو ۱۹۵۴ عیسوی میں شائع ہوئی اور ۱۹۵۶ عیسوی میں اس کی بیٹی خالدہ عینی نے ''بیدل و داستان عرفان او'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی۔ ازبکستان کے مشہور دانشور ابراہیم موصوف نے بیدل کی حکیمانہ اور عارفانہ رباعیات پر ایک مبسوط کتاب تصنیف کی ہے۔ ان کے علاوہ بھی بیدل پر بہت سے رسالے اور مقالے لکھے گئے ہیں۔

غفور گورکھ پوری اپنے محولہ بالا مقالے میں رقم طراز ہیں کہ انقلاب روس سے پیشتر بھی وسط ایشیا کی درسگاہوں میں خواجہ حافظ، علی شیر نوائی، فضولی اور بیدل کے دیوان خاص توجہ کے ساتھ پڑھائے جاتے تھے۔ انقلاب کے بعد ان شعرا کی قدر و منزلت بڑھ گئی ہے۔ چناں چہ کیا ثانوی مکتبوں میں کیا دارالعلوم عالیہ میں طالب علموں کو بیدل کے اختراعات نظم و نثر کی مفصل اور خاطر خواہ تعلیم دی جا رہی ہے۔ ان علاقوں کے اکثر شعرا نے بیدل کی پیروی کی ہے۔ ان میں احمد مخدوم، دانش بخارائی اور نقیب خان طغرل احراری کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نقیب خان طغرل جو خواجہ احرار کی اولاد سے ہے، بیدل کی بارگاہ میں عقیدت کا نذرانہ یوں پیش کرتا ہے:

بلند است از فلک ماوی بیدل
نہ باشد ہیچ کس را جای بیدل

ندیدم از سخن گویان عالم
کسی را در جہان ہمتای بیدل

بہ مژگاں می توانم کرد بیرون
اگر خاری خلد برپای بیدل
قبای اطلس نہ چرخ گردوں
بود کوتاہ بر بالای بیدل
بہ رفعت برتر است از کوہ طغرل
جناب حضرت میرزای بیدل

اور عصر حاضر کا ایک مشہور تاجیک شاعر بیدل کے بارے میں کہتا ہے

بہ آب و رنگ او بیدل چو آمد در جہان نغم
ازو حسن دگر آموخت باغ و بوستان نغم
سخن دیرالہ سربستہ ، نہان می داشت معنی را
بہ مثل دانہ' گوہر کہ پنہان است در دریا
نہ مفتی بود ، نے ملا ، نہ بے توفیق روحانی
فقط می کرد بر دنیا نگہ با چشم انسانی

غور فرمائیں ، وسط ایشیا میں لکھے گئے ان اشعار میں بیدل کا اصلی کردار پیش کر دیا گیا ہے - اسے سچی اور مکمل انسانیت کا مبلغ بتایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اس کے خیالات و جذبات مروجہ معیار سے منحرف تھے - اس لیے ان کی خاطر اس کو طرح طرح کے نئے اسالیب ایجاد کرنا پڑے -

افغانستان کی سرزمین بھی بیدل سے عقیدت اور نیازمندی کا شروع ہی سے گہوارہ چلی آ رہی ہے - یہ قلبی نسبت نشو و نما پانے کے بعد ہر زمانے میں بڑی بارآور ثابت ہوئی ہے - آج سے چند سال پہلے آقائے خلیل اللہ خاں خلیلی[1] نے بیدل

۱- آقائے موصوف استاد خلیلی کہلاتے ہیں - نظارت کابل میں معزز عہدے پر فائز ہیں اور ایک مشہور خاندان کے چشم و چراغ ہیں - نثر نگار ہونے کے علاوہ آپ شاعر بھی ہیں - تقسیم ہند کے بعد بھارت والوں نے سومنات کی دوبارہ تعمیر کرائی تو افغانوں کے بت شکنی کے جذبے نے ان کی فطرت میں ہیجان پیدا کیا اور انھوں نے ایک بڑی درد انگیز نظم لکھی جو راقم نے ان کی زبانی اگست ۱۹۵۱ع کی ایک شام ان کے گھر واقع کارتہ سہ کابل میں
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کے سوانح حیات کے متعلق ایک گراں قدر کتاب 'فیض قدس' مطبوعہ انجمن تاریخ افغانستان تصنیف فرمائی جس کا مقدمہ زیادہ تر بیدل کی نثری تصنیف 'چہار عنصر' اور ان کے رقعات و تصنیفات ہیں۔ علاوہ بریں آقائے عبدالحی حبیبی ایک نامور افغان ادیب ہیں۔ وہ پہلے کراچی میں رہ کر فارسی زبان کے مجلہ 'سروش' کی ادارت فرمایا کرتے تھے اور آج کل واپس کابل چلے گئے ہیں۔ وہاں رہ کر اب وہ بیدل کی تصنیفات بڑے اہتمام سے طبع کرا رہے ہیں۔ جنوری ۱۹۶۵ء میں آقائے ڈاکٹر محمد باقر پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور و صدر شعبۂ فارسی پنجاب یونیورسٹی جشن جامی[۲] میں شرکت کے لیے کابل تشریف لے گئے تو واپسی پر یہ مطبوعات ساتھ لائے ہیں اور اب وہ ہم ان کے گراں قدر ذاتی کتب خانے کی زینت ہیں۔ شعرگوئی میں بیدل کا اتباع جس طرح شروع سے کابل میں ہوتا آیا ہے، اب بھی جاری ہے اور وہاں کے اخبارات اور مجلات میں آئے روز بیدل کے اشعار پر مختلف صورتوں میں تضمین ہوتی رہتی ہے۔ میں نے معتبر ذرائع سے یہ بھی سنا ہے کہ اٹلی کے مستشرق پروفیسر بوسانی (Bausani) نے بیدل پر ایک کتاب شائع کرائی ہے۔ افسوس ہے اس کتاب کے متعلق پوری معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ مستشرق[۱] موصوف چند سال گزرے پاکستان بھی آئے تھے۔

برصغیر پاک و ہند اور بیرونی ممالک میں بیدل سے یہ مسلسل و متواتر

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

سی۔ اقبال کا پرسوز اسلوب فارسی گوئی تھا۔ ایک نحیف اور مسحور پاکستانی غزنی پہنچتا ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے مزار پر حاضر ہو کر بچشم گریاں عرض کرتا ہے۔ آپ نے سومنات کی بت شکنی کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے جس مرکز سے بت پرستی ختم کی تھی وہاں اب پھر بت خانہ تعمیر ہو رہا ہے۔ آپ اپنے لشکر قاہرہ کے ساتھ پھر سومنات جائیں اور وہاں سے بتوں کا ازسرِ نو صفایا کر دیں۔ اگر آپ خود تشریف نہیں لا سکتے تو کم از کم ایاز کو اس مہم پر روانہ فرما دیں۔ نظم میں بڑا ڈرامائی تاثر تھا۔

۱۔ اٹلی میں پاکستان کے زرعی اتاشی جناب سید برکت احمد متوطن جلال پور شریف ضلع جہلم ہیں۔ وہ جب ادھر تشریف لائے تو مستشرق موصوف کی بیدل سے دلچسپی کے متعلق بہت کچھ بتاتے رہے۔

شغف ثابت کرتا ہے کہ کلام بیدل کی صورت میں ایک عظیم معنوی دولت ہمارے پاس موجود ہے اور مستفیض ہونے والے کا ذہنی پایہ جس قدر بلند ہوگا ، استفادے میں بھی اسی قدر رفعت ، عظمت اور معنویت پیدا ہو جائے گی ۔ آج کل ہمارے ہاں یہ روایت بن چکی ہے کہ شعر و سخن کا ہر تذکرہ غالب اور اقبال کے فنی اور فکری محاسن کو کسی نہ کسی صورت میں مجملاً یا مفصلاً ، اشارۃً یا کنایۃً ضرور زیر بحث لاتا ہے اور اس طرح اپنی قدر و قیمت کا اثر قاری کے دل پر طاری کرتا ہے ۔ اب یہ دونوں ائمۂ سخن بیدل کو استاد کامل تسلیم کرتے ہیں اور اس کے سامنے بصد ادب و نیاز زانوے تلمذ تہ کرتے نظر آتے ہیں ۔ علامہ اقبال اپنے ''خیالات آوارہ'' (Stray Reflections, p. 54) میں اقرار کرتے ہیں کہ شعر و سخن کے مغربی نظریات قلب و ذہن میں بسا لینے کے بعد ان کے اسلوب اور مزاج کو مشرق کی گرانمایہ روایات سے سرشار رکھنے میں میرزا غالب کے علاوہ بیدل کا بڑا دخل ہے ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بیدل پر جس طرح سے کام کرنا ضروری تھا ، اس طرح انجام پزیر ہو چکا ہے ۔ یاد پڑتا ہے کہ ہفت روزہ 'نصرت' کی ایک اشاعت میں خواجہ عبدالرشید صاحب نے 'بیدل پر کام کی ضرورت' عنوان قائم کرکے اہل علم کو اس عظیم المثال معنوی ورثے کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت بتائی تھی ۔ چنانچہ اسی عنوان کو لے کر ۱۷ جنوری ۱۹۶۰ء کے 'نصرت' میں خواجہ صاحب کی تائید راقم نے بھی ان الفاظ میں کی کہ ۱۸۵۷ء کے عالم آشوب ہنگامے نے مسلمانوں کا تعلق اپنے ماضی سے منقطع کر دیا تھا ۔ حصول آزادی کے بعد اس تعلق کا از سرِ نو قائم کرنا لابدی ہے ۔ ہمیں اپنے تمام ماضی کا دقت نظر سے جائزہ لینا چاہیے اور فکری لحاظ سے چونکہ ۱۸۵۷ء سے پہلے روشنی کا آخری مینار ہمیں بیدل کی صورت میں نظر آتا ہے ، اب اس مقام سے آگے بڑھنے کے لیے جد و جہد شروع کی جائے جہاں بیدل نے ہمیں چھوڑا تھا تاکہ فکری تسلسل قائم رہے ۔

میرا استدلال یہ تھا کہ جس طرح تاج محل محض ایک مرقع حسن ہی نہیں بلکہ ان حسین و جمیل روح پرور رجحانات کی تکمیل ہے جو ملت اسلامیہ کو شروع ہی سے عطا ہوئے تھے (ملت اسلامیہ ابتدا ہی سے اس قسم کے معجزۂ فن کے لیے بیتاب رہی تھی ۔ اس بیتابی کا اظہار تعمیرات اسلامی کی مکمل داستان سے بخوبی ہوتا ہے) ، اسی طرح بیدل ، جن کی سیرت و شخصیت کی تعمیر انہی ایام میں

ہوئی ، جن میں سنگِ مرمر کا یہ پیکر جمیل تعمیر ہو رہا تھا ، محض ایک اعلیٰ درجے کا شاعر نہیں بلکہ اُن علمی اور روحانی میلانات کا نقطۂ عروج ہے جو ملت اسلامیہ اپنے مہد یعنی جزیرہ نمائے عرب سے اپنے ساتھ لائی تھی۔ آپ اپنے سارے ماضی کی معنوی داستان بیدل کے "پرسوز قلب کی زبان سے بوجوہ احسن سن سکتے ہیں۔ بیدل کا فکر ابن سینا کا مرہون منت بھی ہے اور ابن العربی کا ممنون احسان بھی۔ جنیدؒ اور بایزیدؒ کے دل کا گداز بھی ان کے سینے میں موجود ہے اور حافظؒ اور رومیؒ کا سوز بھی۔ اور پھر جس طرح تاج محل میں مسلمانوں کے جمالیاتی رجحانات اپنے کمال پر نظر آتے ہیں ، بیدل کے عجیب و غریب وجدان نے مسلمانوں کے فکر کو ایک محیر العقول شہکار جمیل بنا ڈالا ہے۔ بیدل کی نظم و نثر کمالِ حقیقت آدم کا اظہار ہے اور معرفت النفس کے متعلق اپنے تجربۂ روحانی کی بنا پر انہوں نے ایسے حقائق بیان کیے ہیں کہ وا احقیقت وجودی مفکرین مغرب ان کی گردِ پا کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔

ہفت روزہ 'نصرت' کے اس شمارے میں اس بات پر بھی راقم نے زور دیا کہ ایک اور نقطۂ نگاہ سے بیدل کا مطالعہ ازبس ضروری ہے ' ۱۸۵۷ء کا حادثۂ فاجعہ اس بر صغیر میں اچانک وقوع پذیر ہوا تھا ، بلکہ صاحب نظر لوگ ملی زوال کی پرچھائیں عرصہ' دور سے دیکھ رہے تھے۔ کلام بیدل میں اس ہولناک حادثے سے حیرت انگیز عبرت پروری کے ساتھ آگاہ کیا گیا ہے۔ بیدل کی وفات محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں ۱۷۲۰ء میں ہوئی۔ مگر انہوں نے اپنے ہم عصروں کی بے بصری ، تنگ ظرفی اور ہوس پرستی کو دیکھ کر اورنگ زیب عالمگیرؒ کے زمانے میں اس خطرے کا اظہار کر دیا تھا اور ان کے پوتے جہاندار شاہ کی ننگِ انسانیت حرکات کو دیکھ کر تو انہوں نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا :

روز برہم می خورد این مجمع آثار ننگ
قلتبان تا کے بہادر رلجلب[1] تا چند شاہ

اب بیدل ایسے پیغمبرانہ نگاہ رکھنے والے قادر الکلام شاعر کی زبان سے ایک ملت

۱۔ قلتبان اور رلجلب کا معنی ہے بے غیرت اور دیوث لوگ جو اپنی بیویوں کے احوال قبیحہ سے واقف ہو جانے کے بعد بھی چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔

کے میلان روان کی داستان جس بصیرت افروز پیرائے میں بیان ہو سکتی ہے ، اسے کوئی عام داستان نگار یا مورخ کیا بیان کر سکے گا ۔ عجیب دقت نظر اور بڑے درد دل کے ساتھ بیدل نے اپنے معاشرے کی ایک ایک خرابی کا ذکر کیا ہے اور جی چاہتا ہے کہ ان کی زبانی اس المناک کہانی کو ہم بار بار پڑھتے رہیں تاکہ اپنے موجودہ دور تعمیر میں ہم سنبھل سنبھل کر قدم رکھ سکیں ۔

سطور بالا سے ظاہر ہے کہ بیدل پر کام کیوں ضروری ہے ۔ ان میں اس بات کی طرف اشارات بھی موجود ہیں کہ کن کن راہوں پر چل کر اس بصیرت افروز اور روح پرور کام کو انجام دیا جا سکتا ہے ۔ اسلوب بیدل فی شعر گوئی میں ایک بدیع النظیر تجربہ ہے ۔ اس کے شش مصرات کا تذکرہ جہاں کئی نئی تحریکوں کے سمجھنے میں مد ہو سکتا ہے وہاں اس قسم کی کئی تحریکوں کا نقطۂ آغاز بھی بن سکتا ہے ۔ بیدل کا احساس جمال دنیائے شاعری میں ایک ایسی منفرد حیثیت رکھتا ہے ، تصورات جمیلہ ، حسن کی تمام حیثیتیں ، بیان کی لطافتیں اور طرب افروزیاں اس کے ہاں اس ابداعت اور جامعیت کے ساتھ موجود ہیں ، الفاظ کا استعمال وہ اس خوبی سے کرتا ہے ، جدید ترکیبات کی تخلیق میں اسے وہ مہارت حاصل ہے ، تشبیہات و استعارات اس کے ہاں اس طرح نظر افروز ہیں ، اپنی علامات کو وہ اس طرح معنی پرور بنا ڈالتا ہے ، مختلف صنعتیں وہ اس چابک دستی سے استعمال میں لاتا ہے اور پھر ابلاغ کی ان تمام صورتوں میں وہ اپنی جمیع اور ہمہ گیر شخصیت اس طرح سمو دیتا ہے کہ اگر کوئی سید عابد علی عابد تعمیری انداز فکر اختیار کرکے اس شاعر اعظم کے تجربۂ عمیق کا تذکرہ جدید معاییر تنقید کے مطابق کرے ، تو اردو ادب میں یقیناً کلاسیکی نوعیت کے بے مثل اور بے بہا تنقیدی ادب کا اضافہ ہو جائے گا ۔ اسی طرح بیدل کے فکری ورثے کا حق ہے ۔ اسے جدید علوم کی روشنی میں مربوط طور پر پیش کرنے کے لیے ایک عالی ظرف اور عالی ہمت ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی ضرورت ہے جو ذوق و انہماک سے کام کر کے ایک خوبصورت گلدستۂ فکر تیار کر دے ۔ معمولی دل و دماغ والے انسان ان کے فکر تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے ۔ بیدل خود کہتے ہیں :

معنیٔ بلند من فہم تند می خواہد
سیر فکرم آسان نیست کوہم و کتل دارم

ڈاکٹر رادھا کرشنن[۱] نے 'ویدانت' پر جدید افکار کی روشنی میں کام کرکے کلاسیکی حیثیت کا علمی کارنامہ انجام دیا ہے ۔ بیدل کو ہماری تاریخ فکری میں وہ مقام حاصل ہے کہ ان کے متعلق بھی اسی انداز سے کام کرنا ضروری ہے ۔ ہم صرف اپنے ماضی کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کرکے اپنے مستقبل کا دھارا استوار راہوں پر رواں کر سکتے ہیں ۔ محض علوم مغرب ہماری روح کو منجمد کر سکتے ہیں یہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ بیدل کے افکار میں وجودیت (Existentialism) کا بھی بے حد قابل قدر ذخیرہ موجود ہے ۔ اسے مرتب کیا جائے تو ائمہ وجودیت جیسے پال سارتر وغیرہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جائیں ۔ ساتھ ہی بیدل کو سمجھنے کے لیے اس کے عصر کا جامع ، ذہن افروز اور مبسوط تذکرہ بھی ضروری ہے ۔

میں نے بیدل پر جو کچھ کام کیا ہے اس کی حیثیت ایک خواب کے ذریعے مجھ پر اچھی طرح واضح کر دی گئی ہے ۔ خواب علامت بن کر حقائق کا اظہار بڑی عمدگی سے کیا کرتے ہیں ؟ ایک بار بیدل خواب میں نظر آئے ۔ ایک چٹان کی طرف رخ کرکے زمین پر محو استراحت تھے ۔ اُن کی دائیں ران کے صرف عقبی حصے سے پردہ اُٹھا ہوا تھا ۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے سر اُٹھا کر اور پیچھے کی طرف مڑ کر تیز تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا ، جیسے اُن کے آرام میں خلل واقع ہوا تھا اور وہ کبیدہ خاطر تھے ۔ میرے ذہن میں اس خواب کی یہ تعبیر آئی کہ بیدل کا صحیح سراغ تو مل چکا ہے لیکن ان کی معنویت ابھی تک نگاہوں سے اوجھل ہے اور ان کی معنویت کا پوری آب و تاب کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آنا کوئی سی آسان بات ہے ۔ یہ تو ایک ملت عظیمہ کی معنویت کا معاملہ ہے ۔

بہرحال یہ کہنا درست ہے کہ بیدل کے سلسلے میں میرا تحقیقی کام صرف اشارات پر مشتمل ہے ۔ البتہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ ان اشارات میں وسعت اور

۱۔ یہ فلسفی ڈاکٹر رادھا کرشنن ہیں جو بیچارے بھارت کے راشٹر پتی بنتے ہی آنجہانی ہو گئے ۔ جن کا 'کریا کرم' اس وقت ہوا جب ستمبر ۱۹۶۵ء میں مجاہدین کشمیر کی 'حریت کوشی' کو آنکھوں سے دیکھ کر سرینگر سے واپسی پر راشٹر پتی ڈاکٹر رادھا کرشنن نے کہا : حملہ بہترین دفاع ہے اور پھر بھارت نے پاکستان پر دھاوا بول دیا ۔

جمعیت کے عنصر نظر آتے ہیں ۔ اہل تحقیق ان کو سامنے رکھ کر اپنے لیے بآسانی راہیں متعین کر سکتے ہیں ۔

اپنی تمام خامیوں کے باوجود یہ مجموعہ" مقالات روح بیدل سے ضرور متعارف کرا دیتا ہے ۔ ہر مقالہ جسے غور و فکر اور مطالعے کے بعد قلم بند کیا گیا ہے ۔ کئی مقامات پر تکرار کا احساس ضرور ہوگا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر مقالہ ایک کامل اکائی کی حیثیت سے معرض میں آیا ، اس لیے متعلقہ مواد پیش کرنے سے گریز نہیں کیا گیا ہے ۔ علامات کے سلسلے میں ایک مقالہ ، جس میں حباب اور آئینے پر یک جا خیال آرائی کی گئی ہے ، دو اور مقالات کا خلاصہ محسوس ہوگا لیکن چونکہ اس میں چند ایک ایسی باتیں موجود ہیں جو آن مقالات میں نہیں تھیں اس لیے اسے شامل کرنا ضروری سمجھا گیا ۔ بالخصوص اس مقالے کا وہ پیراگراف جو حباب کے ذریعے حقیقی شخصیت کے حقائق کی طرف رہنائی کرتا ہے ، اپنی نوعیت کی نادر چیز ہے ۔ ضمیمے میں بیدل سے تعلق رکھنے والے اصحاب کا تذکرہ تو ظاہر ہے بڑا ضروری تھا ، لیکن لال کنور پر مقالہ غیر متعلق خیال کیا جا سکتا ہے ، مگر ذرا توجہ سے کام لیا گیا تو فوراً الم نشرح ہو جائے گا کہ لال کنور اس انتہ پرست ، اخلاق باختہ اور بے حمیت معاشرے کے لیے علامت کی حیثیت رکھتی ہے جس میں رہتے ہوئے بیدل نے اسلامیان ہند کی اصلاح کے لیے آواز بلند کی تھی ۔

اختتام پر میں اپنے تین شاگردوں کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے مسودہ صاف کرنے میں میری پوری مدد کی ؛ وہ مسٹر رفیق احمد بی ۔ اے ، چودھری محمد رفیق بی ۔ اے اور مسٹر محمد عزیز بی ۔ اے ہیں ۔ ثانی الذکر اس دوران میں بیمار پڑ گئے تھے ۔ اس لیے اول الذکر بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے مسودے کو صاف کرنے میں مصروف رہے اور اسی طرح بالخصوص ضمیمے کی تسوید مکمل طور پر مسٹر محمد عزیز کی وجہ سے عمل میں آئی ۔

عبدالغنی
گورنمنٹ کالج ، جہلم
٦- جولائی ١٩٦٥ع
بروز سہ شنبہ

صد قطره و موج محو طوفان گردد
کز دریا گوهری نمایان گردد
فطرت عمری کند تگ و تاز هوس
تا نقش ادب بندد و انسان گردد

بیدل

(۱)

مرزا عبدالقادر بیدل پر اپنے عہد کے اثرات

ہر شاعر اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے ۔ اُس کی انفرادیت کی تشکیل اپنے ماحول سے ہوتی ہے اور پھر اُس کی تخلیقی صلاحیتیں اُس کی انفرادیت کا رنگ لے کر اُس کے ماحول کی ترجمانی کرتی ہیں اگر اس کے زمانے کے حالات اُس کی قوت تخلیق میں ایک زبردست تہیج پیدا کر دیں تو پھر وہ اپنے عہد کی بندشوں سے آزاد ہو کر ایک ایسے بلند مقام سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہے جہاں سے ماضی اور مستقبل کے کنارے علیحدہ علیحدہ دکھائی نہیں دیتے ۔ اس مقام سے وہ اس انسان کو مخاطب کرتا ہے جو زماں اور مکاں کی حد بندیوں سے بالاتر رہ کر اپنے جیسی شرف کو قائم رکھنے کے لیے کوشاں ہوتا ہے ۔ ایسے شاعر کی نگاہ فطرت انسانی کی گہرائیوں میں اُترتی چلی جاتی ہے ۔ اُس کا کلام سحر حلال بن جاتا ہے اور دنیا کا کوئی انقلاب اُس کے کلام کی تازگی میں فرق نہیں آنے دیتا ۔ ایسے زندۂ جاوید شعرا انگلیوں پر شمار کیے جا سکتے ہیں اور میرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی میرے نزدیک اُن کے سرتاج ہیں ۔ اس تمہید کے بعد ہم بیدل اور اُن کے ماحول پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں ۔

سلطنت مغلیہ اپنے پورے عروج پر تھی ۔ شاہ جہاں لال قلعہ میں تخت طاؤس پر جلوہ افروز ہو کر داد جہانبانی دے رہا تھا ۔ اورنگ زیب اپنے بھائی دارا شکوہ کی عیاریوں سے تنگ آ کر دکن کی پہلی صوبہ داری سے مستعفی ہو چکا تھا ۔ جب کہ ۱۶۴۴ء میں میرزا عبدالقادر پٹنے[1] کے ایک تصوف پسند گھرانے میں پیدا ہوئے ۔

۱- ۱۷۰۴ء میں شاہزادہ عظیم الشان نے اس کا نام بدل کر عظیم آباد رکھا ۔ گویا بیدل کی زندگی میں یہ شہر عظیم آباد کہلانے لگ گیا ۔

اس وقت تمام ہندوستان میں شاہجہان کی فوجی طاقت کا لوہا مانا جا چکا تھا ۔ ہر طرف امن و امان کا دور دورہ تھا ۔ زراعت اور تجارت بروغ پر تھی اور لوگ خوش حال اور فارغ البال تھے ۔ علوم و فنون میں شاہ جہان اور عالمگیر کی سرپرستی کی وجہ سے غیر معمولی ترقی ہو رہی تھی ۔ پٹنہ اس علاقے میں واقع تھا جہاں ہندوؤں کے عروج کے ایام میں نالندہ یونیورسٹی قائم تھی اور جو اب پھر مسلمانوں کے عروج کے دنوں میں علوم و فنون کا گہوارہ بن چکا تھا ۔ چنانچہ وہاں کے علمی چرچوں کو دیکھ کر شاہ جہان نے کہا تھا : ”پورب شیراز ما است ۔“

ہندوستان کو شروع ہی سے انسان کی باطنی قوتوں سے بڑا شغف رہا تھا ۔ روح کی عظمت اس کے لیے بے حد جاذب نظر تھی ۔ اس لیے جب مسلمان یہاں وارد ہوئے تو انھوں نے اپنے قدم جمانے کے بعد یہاں کی آبادی کے اس نظری لگاؤ کے زیر نظر زیادہ تر اسلام کے روحانی فیوض کے عام کرنے کی کوشش کی اور اسی لیے ہندوستان میں اسلام کی اشاعت سید علی ہجویریؒ ، خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ ، خواجہ نظام الدینؒ اولیاء دہلوی اور ان کے مقلد صوفیوں کی بدولت ہوئی ۔ بہار میں بھی صوفیائے کرام ہی مشعل اسلام لے کر پہنچے تھے اور ان کے روحانی تصرفات قلوب کو مسخر کر رہے تھے ۔ خود میرزا عبدالقادر کا تمام خاندان ایک با کمال بزرگ شیخ کمال کا معتقد تھا اور جب بیدل پیدا ہوئے تو ان کے والد میرزا عبدالخالق کے جس دوست نے حساب جمل کے ذریعے لفظ ”انتخاب“ سے ان کی تاریخ پیدائش نکالی ، وہ بھی ایک صاحب کرامات درویش قاسم نامی تھے اور جس سے بعد میں بیدل کے گہرے مراسم رہے ۔ علاوہ بریں جب ان کے والد ماجد نے وفات پائی تو چچا نے انھیں اپنے دامن تربیت میں لیا ؛ اور وہ بھی صوفی مشرب تھے ۔ ان تمام باتوں سے واضح ہوتا ہے کہ بیدل کا عہد طفولیت دولت و ثروت کی ہماہمی ، علم و فن کی چہل پہل اور تصوف کی باطنی نوازشوں سے گھرا ہوا تھا ۔ دوست کے وفور نے آسے سیر چشم بنایا ۔ ضیائے علم نے صغر سنی ہی میں اس کے ذہن کو روشن کر ڈالا اور تصوف نے اس کے دل میں خدائے لم یزل کی محبت پیدا کی ۔ اس محبت کا ذکر بیدل انوکھے انداز بیان سے کرتا ہے :

آتش پرست شعلۂ اندیشہ ات جگر
آئینہ دار داغِ ہوایِ تو سینہ ہا

اور کہتا ہے وہ بیان ہی افسردہ ہے جس میں حمد الٰہی موجود نہ ہو :

بے زمزمۂ حمد تو قانون سخن را
افسردہ چو خون رگ تار است بیانہا

خدا سے محبت ہندو یوگیوں کو بھی تھی ، لیکن 'ویدانت' نے روح کل کی ہمہ گیری کچھ اس انداز سے بیان کی تھی کہ ہر چیز کو خدا کا درجہ حاصل ہو گیا تھا ۔ اس لیے بعض مسلمان صوفیوں نے بھی جوش محبت میں آ کر وحدت وجود کا دعویٰ کیا تھا ۔ مغربی مستشرقین اسے اسکندریہ کے نو افلاطونی علماء کا اثر بیان کرتے ہیں اور اس رستے سے اس کا تعلق پھر ویدانت سے جا قائم کرتے ہیں ۔ لیکن دراصل مسلمان صوفیوں کے یہ تمام دعوے جذبات و خیالات پر عشق الٰہی کے استیلا کا نتیجہ تھے ۔ ان کا تعلق کسی مربوط فلسفۂ فکر سے نہ تھا ۔ بہرحال ویدانت کے عقیدۂ وحدۃ الوجود ، بعض مسلمان صوفیوں کے نعرۂ انا الحق کو جائز سمجھنے اور اکبر کی ملحدانہ تعلیمات کی وجہ سے ہندوستان میں ایک ایسے مصلح کی ضرورت تھی جو ذات الٰہی کی ماورائیت کو الم نشرح کرے اور گم کردہ راہ مغل شہنشاہ کے اثرات کا قلع قمع کر دے ۔ اس کام کو مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے بوجہ احسن سر انجام دیا اور یہ بات پوری طرح الم نشرح کر دی کہ ذات باری وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے ۔ چنانچہ جب عبدالقادر بیدل پیدا ہوئے تو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے عقیدۂ وحدت شہود کا عام چرچا تھا ۔ بیدل نے بھی اسی عقیدے کو اپنایا اور اسی لیے اُن کے کلام میں جا بجا ذات الٰہی کی ماورائیت کا بیان ہے ۔ کہتے ہیں :

آں کیست شود محرم اظہار و خفایت
آئینہ خورشند عیاں ہا و نہاں ہا

ما را چہ خیال است بآں جلوہ رسیدن
او ہستی و ما نیستی او جملہ و ما ہیچ

در قلزم خیال تو نتواں کنار جست
خلقے در آب آئینہ دارد سفینہ ہا

مجدد الف ثانیؒ نے وحدت شہود کا جو عقیدہ پیش کیا ہے، اس کی صدائے بازگشت جس زور سے بیدلؔ کے ہاں سنائی دیتی ہے، وہ شاید ہی کسی اور شاعر کے ہاں ملے۔

میں نے پہلے عرض کیا ہے، ان دنوں پورب اپنے علمی چرچوں کی بنا پر شیراز کا ہمسر بنا ہوا تھا۔ وہاں شیراز کی طرح فلسفے کا بازار بھی بڑا گرم تھا۔ چناں چہ ملا صدرا اور میر باقر داماد کا فلسفہ وہاں عام طور پر پڑھایا جاتا تھا۔ انھی کے خیالات سے متاثر ہو کر شاہجہاں کے عہد میں ملا محمود جونپوری نے فلسفے پر اپنی ہنگامہ خیز کتاب 'شمس بازغہ' لکھی، جو آج تک درسی کتب کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ اس گرم بازاری کے ہوتے ہوئے بیدلؔ ایسا مشکل پسند طالب علم فلسفے کی موشگافیوں کی طرف متوجہ نہ ہوتا۔ اس کی مثنوی عرفان، اس کے نکات اور اس کی متعدد غزلیات اور اس کی دیگر تصنیفات کے جستہ جستہ مقامات اس بات کے شاہد ہیں کہ اس نے منطق کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اگرچہ وہ عقل سے مایوس ہو کر اقبالؔ کی طرح کہتا ہے:

فسردہ ایم بزندان عقل چارہ کجاست
جنون مگر کہ قیامت گری برآورد از ما

پر عقلی کمال کے ساتھ عشق کی آشفتہ سری کو ضروری سمجھتا ہے:

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدہ‌ای بے جنون مباش

اور کہتا ہے داغ عشق حاصل کرنے کے لیے اپنے سینے کو سوز و گداز کے ہزاروں شعلوں کا نشیمن بناؤ:

تا رسد داغے بکف صد شعلہ می باید گداخت
یافت اسکندر بچندیں جستجو آئینہ را

تاہم یہ حقیقت ہے کہ اگر مابعدالطبیعیات سے متعلق اس کے خیالات کو منظم صورت میں پیش کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔

چوں کہ پورب میں تصوف اور علم و تعلم کا گھر گھر چرچا تھا، اس لیے ہم نے ماحول کے سلسلے میں پہلے زیادہ تر انھی چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن جو چیز بیدلؔ کی دائمی شہرت کا سبب ہے وہ اس کی شاعری ہے۔ تورانی نژاد ہونے کی بنا پر ویسے بھی اسے فارسی زبان سے دلچسپی تھی، لیکن بابوں کے

عہد سے ایران کے ساتھ تعلق نے ہند کے مسلمانوں کا فارسی کے ساتھ رشتہ اور بھی گہرا کر دیا تھا ۔ فارسی زبان کے اساتذہ کا کلام مکاتب میں عام طور سے پڑھایا جاتا تھا ۔ اسی لیے وہ دس سال کی عمر ہی میں اچھے شعر کہنے لگا ۔ بیدل نے جب آنکھ کھولی تو ہندوستان میں لوگ صائب اور کلیم کے 'مثالیہ' کے بڑے مداح تھے ۔ مثالیہ کو کمال فن شمار کیا جاتا تھا ۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ بیدل کے دل میں اول اول اس کا شوق کیسے پیدا ہوا ۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ شروع ہی سے ہر معاملے میں اپنے ہم عصروں اور ہم خیالوں سے گوے سبقت لے جانا چاہتے تھے اور جب انھیں معلوم ہوگیا کہ صنعت تمثیل ہی سے ایک شاعر طغراے امتیاز حاصل کرتا ہے تو انھوں نے اس پر بیش از بیش توجہ صرف کی ۔ چناں چہ اُن کے بے شمار اشعار اسی صنعت کے حامل ہیں اور کئی غزلیں تو تمام کی تمام اسی صنعت میں ڈھلی ہوئی ہیں ۔ اس صنعت میں انھوں نے جو کمال حاصل کیا وہ ایک علیحدہ بحث ہے ، لیکن ہم نمونے کے طور پر چند اشعار پیش کرتے ہیں :

دل آسودۂ ما شور امکاں در قفس دارد
گہر دزدیدہ است ایں جا عنانِ موج دریا را

سوخت پیش از ما دریں محفل چراغ انتظار
دیدۂ یعقوب ناپایست در کنعان ما

عاشقاں در سایۂ برق بلا آسودہ اند
ابرو از تیغ است چشم خوں‌فشانِ زخم را

منزل عیش بہ وحشت کدۂ امکاں نیست
چمن از سایۂ گل پشت پلنگ است ایں جا

کشاد عقدۂ دل بے گداز خود بود مشکل
کہ نگشاید بجز سودن گرہ از کار گوہر ہا

دور مغلیہ اور خاص طور پر عہد شاہ جہانی کے شعرا تازہ گوئی کے لیے شہرۂ آفاق ہیں ۔ سرخوش کے "تذکرۂ کلمات الشعرا" کو اٹھا کر دیکھیے ، بیدل کے ہم عصروں کا بیان ہے ۔ سرخوش ہر شاعر کے سلسلے میں رنگین خیالی اور طرفہ معنی یابی کا ذکر کرتا ہے ۔ عرفی اور ظہوری نے جدید تراکیب کے دریا بہا دیے تھے ۔ خاص کر بیدل کے زمانے میں جدید اسالیب بیان ، تلاش معانی اور رنگین خیالی کی طرف شعرا کی پوری توجہات منعطف ہو چکی تھیں ۔ بیدل نے بھی اپنے زمانے کی روش کا اتباع کیا اور ایسا نظر آتا ہے کہ ان خوبیوں کے مخترع اور ان کو درجۂ کمال تک پہنچانے والے وہی ہیں ۔ اپنے متعلق یہی احساس رکھتے ہوئے وہ کہتے ہیں :

بفکر تازہ گویان گر خیالم پرتو اندازد
پر طاؤس گردد جدول اوراق دیوانہا

اس خیال کی رنگینی کا مشاہدہ کیجیے اور ساتھ ہی مندرجہ ذیل اشعار سے بھی لطف اٹھائیے :

ز خار ہر مژہ صد رنگ موج گل جوشد
بدیدہ گر گذر افتد خیال روے ترا

— — —

یک سر مو خالی از پرواز شوخی نیست حسن
صد نگہ خوابیدہ در تحریک مژگان شما

—

خوشا صبحے کہ شاہ ملک عشرت جلوہ زیر آید
بزیر تخت جام از قصر زنگاریۂ مینا

معنی آفرینی میں بیدل اپنی مثال آپ ہیں ۔ نئے نئے معانی تلاش کرتے ہوئے ان کا خیال عام مشاہدات کو ایسے بدیع انداز سے پیش کرتا ہے اور ایسے ایسے باریک اور لطیف پردے ابرو کی ہلکی سی جنبش سے اٹھا دیتا ہے کہ آج کل کی عجلت پسند نگاہیں ان کی صرف متوجہ ہونے کی فرصت نہیں رکھتیں ۔ حالانکہ وہ تخیل کی جان ہیں ۔ اسی لیے بیدل کو اپنی معنی آفرینی پر بجا ناز ہے :

بیدل از فطرت ما قصر معانیست بلند
پایہ دارد سخن از کرسیِ اندیشہ ما

آن کی سعی آذربینی کے دو ایک شاہکار ملاحظہ فرمائیے :

این قدر تعظیم بیرنگ خم ابروی کیست
حیرت است از قبلہ رُو گردند ان محرابہا

—

زبان تا ک تا دم می زند تبخالہ می بندد
کہ برق می نمی گنجد مگر در خرمنِ مینا

بچشم آئینہ تا جلوہ گر شد چشم عمورت
ز مستی چون مژہ بر یک دگر افتادہ جوہر ہا

سرگرانی لازم ہستی بود بیدل کہ صبح
تا نفس باقیست صندل بر جبین مالیدہ است

—

بیدل کے ہاں تراکیب کی جدت اور تازگی کا اندازہ لگانا ہو تو مکتوبات اکبر الہ آبادی میں سے میرزا سلطان احمد کے نام وہ مکتوب پڑھیے جس میں اقبال کی جدت ادا کا ذکر کرتے ہوئے اکبر مرحوم کو یک لخت بیدل یاد آ جاتا ہے ۔ اقبال کی تعریف کرتے ہوئے اکبر الہ آبادی لکھتے ہیں : ”کیا طرز ادا ہے ، کیا بلاغت ہے ، مغربی لٹریچر کی تکمیل ۔ آس پر یہ رنگ طبیعت کہ بیدل کا دل بھی صدقے ہو ۔“ خود علامہ اقبال نے ایک بار گوجرانوالہ کے ایک غیر معروف شاعر غلام حسین شاکر کو لکھا تھا کہ اگر حسن تراکیب حاصل کرنا چاہتے ہو تو بیدل کا مطالعہ کرو ۔ بیدل کے ہاں جدید اور تازہ تراکیب کا اس قدر وفور ہے کہ کہیں کیا ملے گا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ، حدِ نگاہ تک رنگا رنگ دل آویز پھول کھلے ہوئے ہیں اور نگاہ ابھی ایک کی رعنائی سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہوتی کہ ایک اور دعوت نظارہ دیتا ہے ۔ ذرا مندرجہ ذیل چند تراکیب کو دیکھیے :

بہشت عافیت ، نوبہار عشرت ، صد گل خندہ ، چمن پیکر ، حسن میگون ،

شوخیِ طاؤس ، شعلۂ ادراک ، معنی شکار ، وحشیِ اندیشہ ، شبستانِ خیال ، میلِ گفتگو ، یک جہاں نیرنگ ، دو عالم عبرت ، تہدیدِ دوراں ، غبارِ یاس ۔

جیسا کہ مضمون کے عنوان سے ظاہر ہے ، میرا مقصد بیدل پر ماحول کے اثرات کو نمایاں کرنا ہے ، اُس کی شاعرانہ خوبیوں کا جائزہ مقصود نہیں ۔ اپنی علمی کم مائیگی کے باوجود میں یہ کوشش انشاء اللہ کسی اور موقع پر کروں گا ۔ تاہم ضمناً چند ایسے اشعار پیش کرتا ہوں ، جن سے بیدل کے متعلق (خاص طور پر غالب کے ابتدائی پیچیدہ کلام سے متاثر ہو کر) مشکل پسندی کے بہتان کے بر عکس اُس کے بیان کی صفائی اور بے شاختگی نمایاں ہوتی ہے :

مردہ ہم فکر قیامت دارد
آرمیدن چہ قدر دشوار است

چشم امید ندارم زِ کشت دگران
دل ما دانۂ ما ، نالۂ ما ریشۂ ما

دریای فردوس وا بود امروز
از بے دماغی گفتیم فردا

گر ننالم کجا روم بیدل
شش جہت بے کسی و من تنہا

آرزو خون گشتۂ بیرنگ وضع ناز کیست
غمزہ دارد دور باش و جلوہ می گوید بیا

گہ آہم می رباید ، گاہ اشکم می برد
نقد می یک مشت خاک و این ہمہ سیلابہا

نہ بدامنی رسا رسد نہ بدست کہ دعا رسد
چون رسد بہ نسبت پا رسد کف دست آبلہ دار ما

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو و سمن در آ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدہ ای در دل کُشا بہ چمن در آ

تو کریم مطلق و من گدا چہ کنی جز این کہ بخوانیم
در دیگرے بنما کہ من بہ کجا روم چو برانیم

ان اشعار میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی آمد اور اُن کی در و بست اور حلاوت کی فراوانی کو دیکھیے ! کیا ان کو دیکھنے کے بعد آزاد بلگرامی کا یہ قول صادق نہیں آترتا کہ : ”اگر کلیات بیدل را انتخاب رنند مجموعہ لطیف و مقبول حاصل می شود و خط نسخ بر نسخۂ سحر سامری می کشد۔“

۱۲ ۷ء میں محمد بن قاسم کی ہندوستان میں آمد کے وقت ہی سے عربی و فارسی نے ہندوستانی پراکرتوں پر اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ مختلف تہذیب، مختلف زبان اور مختلف ادبیات رکھنے والی دو قوموں کے مل کر ایک جگہ رہنے سے ایک جدید زبان کا ایجاد ہونا لازم تھا۔ بیدل ۱۶۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ اس نو سو سال کے عرصے میں وہ زبان پیدا ہو کر کئی مراحل حیات طے کر چکی تھی، جو اب اردو کے نام سے دنیا کی سر بر آوردہ زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ بیدل کا زمانہ اردو کا عہد طفلی ہے۔ اگرچہ انھوں نے اظہار خیالات کے لیے فارسی نظم و نثر کو استعمال کیا لیکن اپنے گرد و پیش اس طفلک خوب رو کو دیکھ کر اس کی دل پسند اداؤں سے وہ بھی مسحور ہو گئے۔ چناں چہ ان کے یہ شعر انھی اداؤں کی ترجمانی کرتے ہیں :

شہرۂ[1] حسن سے از بس کہ وہ محجوب ہوا
اپنے چہرے سے جھگڑتا ہے کہ کیوں خوب ہوا

۱۔ میر درد کا شعر ہے جو ان کے دیوان قلمی مملوکہ لنڈن میوزیم میں موجود ہے۔ اس کا عکسی نسخہ (Rotos) ڈاکٹر وحید قریشی کے پاس ہے۔ اس لیے یہ شعر غلط طور پر بیدل سے منسوب ہو چکا ہے۔ (عبدالغنی)

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ، ہم ہیں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ، ہم ہیں

—

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ، ہم ہیں

—

ان اشعار کو دیکھیے ، زبان کس قدر صاف ہے ۔ افسوس ہے ، ان اشعار کے باوجود بیدل کا تذکرہ اُردو کے پہلے دور کے شعرا میں سنہرے حروف میں نہیں لکھا جاتا ۔

۱۶۵۷ء کے سرما کا ذکر ہے ، بیدل کی عمر تیرہ سال کی تھی ۔ والد عمر کے چھٹے سال میں انتقال فرما گئے تھے ۔ یتیمی تھی ، پھر بھی چچا کے سایۂ عاطفت میں بے فکری سے تعلیم حاصل کر رہے تھے ۔ عربی اور فارسی میں کافی مہارت پیدا ہو چکی تھی ۔ لکھنے پڑھنے سے فارغ ہونے تو شعرگوئی سے دل بہلاتے یا صوفیے کرام اور صاحب جذب فقیروں کی صحبتوں میں شریک ہوتے ۔ نگاہ بتدریج حقیقۃ الحقائق کی طرف اٹھ رہی تھی ۔ آنکھیں حسنِ ازل سے دو چار ہو رہی تھیں اور دل میں بھی ایک جلن سی پیدا ہو رہی تھی ۔ اس بات کا تذکرہ پہلے بھی کیا جا چکا ہے ، لیکن چوں کہ تاریخ ایک تہلکہ انگیز کروٹ لے رہی تھی اور اس کی وجہ سے بیدل کے مذکورہ بالا جذبے میں ہلچل مچانے والی تھی ، اس کا از سرِ نو بیان ضروری تھا ۔ بیدل اس طرح زندگی بسر کر رہا تھا ، جب اُس کے اردگرد بڑی دوڑ دھوپ شروع ہو گئی ۔ بہار کا صوبےدار شہزادہ شجاع پٹنے میں رہ کر دہلی کا تخت حاصل کرنے کے لیے فوج بھرتی کر رہا تھا ، شاہ جہاں کی موت کے متعلق پیشین گوئیاں ہو رہی تھیں ۔ بیدل بھی سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا ۔ اُس نے سلیمان شکوہ کے ہاتھوں ۱۶۵۸ء کے آغاز میں شجاع کی شکست دیکھی ۔ اس سال کی گرمیوں میں اُس نے شاہ جہاں کے بیٹوں کے درمیان ساموگڑھ کے میدان میں گھمسان کا رن پڑنے کا حال سنا اور دم بخود رہ گیا ۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ تخت طاؤس کا مالک ، جلیل القدر شہنشاہ شاہ جہاں ، جس نے ایک طرف تو تاج محل اور موتی مسجد اور دہلی کی جامع مسجد تعمیر کرائی تھی اور دوسری طرف خواجہ معین الدین چشتیؒ اور محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا دہلویؒ کے مقبرے تعمیر کرائے تھے ، قید میں ڈال دیا گیا ہے ۔

اُس نے چشمِ مصور سے دہلی کی گلیوں کا وہ زہرہ گداز منظر بھی دیکھا ، جب ۱۶۵۹ء میں لوگ اشک بار تھے اور دارا شکوہ اور اُس کا بیٹا سپہر شکوہ پابجولاں پھر رہے تھے ، اور پھر اس کے سات سال بعد اس ٹریجڈی کا آخری سین بھی اُس کی نظروں کے سامنے سے گزرا جب کہ قلعے کی دیوار کو گرا کر رفیع المنزلت شہنشاہ شاہ جہاں کی میت کو بے کسی کی حالت میں چند خواجہ سرا اُٹھائے ہوئے دفن کرنے کے لیے لے جا رہے تھے ۔ اُس وقت اُس کی عمر ۲۲ سال تھی ۔ اُس نے ایک آہ سرد بھر کر کہا :

یاد آں موسم کہ بے وہم بہار و فصل دی
داشت مینای فلک جام طرب لبریز می
انجمن نازاں ، چمن خنداں طراوت گلفشاں
شاخ گل رقاص و بلبل بستہ در منقار نی
دور سعدی بود و عہد امن و ایام شریف
خلق در حمد خدا از عدل شاہ نیک پی

امن و آرام کے دورِ سعید کا یہ حسرت ناک انجام دیکھ کر اس کے حسّاس دل کو بے حد صدمہ ہوا اور دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا ۔ اُس کی نگاہوں میں اس قسم کے ہزاروں اور زہرہ گداز حادثات بسے لگ گئے ، جو اپنی پوری ہلاکت انگیزیوں کے ساتھ ماضی میں رونما ہوئے تھے ۔ اُس کی آنکھوں کے پردے سب دور ہو گئے ، مستقبل بھی اُسے اسی قسم کی تباہیوں کا حامل نظر آیا ۔ حشمت و دولت اور عزت و جاہ کا اُسے بہرحال یہی انجام دکھائی دیا ۔ اُسے پوری طرح یقین ہو گیا : ''کل من علیہا فان و یبقٰی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام ۔''

اربابِ طریقت کی صحبتوں کی برکت سے وہ پہلے ہی سے خدا سے لو لگا چکا تھا ۔ تحقیق کائنات کے سلسلے میں اُسے منطق نے بتایا تھا کہ حقیقت ثابتہ وہی نورِ ازل ہے ، جس کے جلوے اُس کی آنکھوں کے سامنے موجود تھے ۔ اب اُسے دولت ، عزت ، زندگی ، دنیا ، کائنات ، ہر چیز ہیچ نظر آنے لگ گئی ۔ وہ پکار اُٹھا :

جان ہیچ و جسد ہیچ و نفس ہیچ بقا ہیچ
ای ہستیِ تو لنگ عدم تا بہ کجا ہیچ

دیدی عدم ہستی و چیدی الم دہر
با این ہمہ عبرت ، نشنید از تو حیا ہیچ

اُس نے ایک ایسا انقلاب دیکھا کہ مظاہر کی حقیقت اُس کی نظروں میں کچھ بھی نہ رہی ۔ لوگ اُس پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ دنیا کو بے حقیقت سمجھتا تھا ؛ بالکل ٹھیک ہے ، جو خونیں مناظر اُس نے دیکھے تھے ، اُنھیں جو شخص دیکھتا ، اُس کا ذہنی توازن بالکل بگڑ جاتا ۔ لیکن نہیں ، وہ باہمت اور صاحبِ بصیرت انسان تھا ۔ اُس نے ان خونیں مناظر کے درمیان اُن انوار کو دیکھ لیا جو انسان کو انسان بناتے ہیں اور زندگی کو امن اور ابدی مسرت سے معمور کر دیتے ہیں ۔ اسی وجہ سے اُس کی عظمت ہمارے دلوں پر ثبت ہو جاتی ہے ۔ وہ پہلے صرف صوفی تھا ، اب عارف بن گیا ۔ پہلے وہ نرا شاعر تھا ، اب حکیم ہو گیا ۔ اُس کی تراکیب میں جلت اور شان و شوکت اب بھی موجود تھی ۔ اُس کا کلام رعنائی خیال کا اب بھی بہترین نمونہ تھا ۔ منہ سے گلہائے معانی اب بھی بے ساختہ جھڑ رہے تھے ۔ مثالیں اب بھی از خود اشعار میں وارد ہوکر شعریت کو دوبالا کر دیتا تھا ۔ اور تخیل میں قوت ، بداعت اور رفعت اب بھی پائی جاتی تھی اور ان کا ترنم اب بھی دلوں کو موہ لیتا تھا ، لیکن اب اُس کی شاعری زمزمۂ حمد بن چکی تھی اور جو سوز و گداز اور درد اور خلوص اس کے اندر پیدا ہو گیا تھا ، وہ اپنی جگہ عدیم المثال ہے ۔ اس کے کلام میں اب وہ وصف پیدا ہو چکا تھا ، جو فارسی گویانِ ہند میں مفقود ہے اور جو صرف سنائی[۲۲] اور رومی[۲۳] کے ہاں ملتا ہے ۔ وہ شوق دیدار اور آرزوئے وصل سے بے تاب ہو کر ایک موسیٰ[۲۴] کی طرح کہتا ہے :

ای بہارستان اقبال ای چمن سیما بیا
خضلِ سیرِ دل گزشت اکنون بچشم ما بیا
عرض تضمیمی از نضرتی ہای آداب وفاست
چون نگہ در دیدہ یا چون روح در اعضا بیا
بیش ازین نتوان حریف داغ حرمان زیستن
یا مرا از خود بر آن جا کہ ہستی یا بیا

اور کائنات کے تمام خس و خاشاک کے درمیان اس وقت آسے اپنے مقام سے آشنا انسان کی جو عظمت نظر آتی وہ بیان سے باہر ہے ۔ خود بیدل کی زبان سے سنیے ۔

ما حریفانِ بزمِ اسراریم مستِ جامِ شہود دیداریم

جوش بحر محیط لاہوتیم ۔۔۔ فیض صبح جہان انواریم
اثر و فعل حق ز ما پیداست ۔۔۔ بے گمان عرص سرِّ اظہاریم
جلوہ فرماست حق بکسوت ما ۔۔۔ لا حرم عرصہ رنگھا داریم
برق عشقیم شعلہ می خندیم ۔۔۔ ابر شوقیم نالہ می باریم

دل و دماغ اور روح میں اس زبردست انقلاب کے بعد عام دنیوی اقدار اس کے لیے بالکل ہیچ بن کر رہ گئیں ۔ بادشاہ اور گدا کا فرق دور ہو گیا ۔ شاہزادہ اعظم شاہ نے قصیدہ لکھنے کو کہا تو اس کی ملازمت ترک کر دی ۔ نظام الملک نے دکن آنے کو کہا تو یہ شعر لکھ بھیجا :

دنیا اگر دہند نہ خیزم ز جای خویش
من بستہ ام حنای قناعت بہ پای خویش

اور جب بے پناہ طاقت رکھنے والے بادشاہ گر سید بھائیوں نے شہنشاہ فرخ سیر کو قتل کرا دیا تو ان میں سے چھوٹے بھائی سید حسین علی خاں کے ساتھ دیرینہ مراسم کے باوجود بے دھڑک یہ تاریخ وفات کہی :

سادات بوے نمک حرامی کردند

(۱۱۳۱ ہجری بمطابق ۱۷۱۸ عیسوی)

مندرجہ بالا حقائق سے واضح ہوتا ہے کہ جب بیدل کی قوت بیان پختہ ہو گئی تو اس کے محرکات تخیلی حقیقت حقہ کے مقابلے میں کائنات کی بیچمرزی اور انسان کا طنطراے اسافت تھے ۔ یہی برق قوت اس کے ضخیم دیوان ، اس کی مثنویات ، اس کی نثری تصنیفات ، اس کے قصائد و قطعات اور اس کی رباعیات میں ایک بے پناہ تڑپ پیدا کر رہی ہے اور جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے ، یہ سب کچھ اس کے ماحول کا نتیجہ تھا ۔

عظیم اباد پٹنہ چھوڑنے کے بعد بیدل دہلی اور اس کے قرب و جوار میں پچاس سال سے زائد عرصہ رہے ۔ یہ بڑا طویل عرصہ ہے ، لیکن ان کی انفرادیت نے جو رخ اختیار کر لیا تھا وہ آخر دم تک قائم رہا ۔ ہاں اس کی روشنی میں وہ حلات عالم کا جائزہ لیتے رہے اور حکیمانہ انداز میں شعر کہتے رہے ۔ ان کی بلند سیرت ، ان کی عرفاں پروری ، ان کی وسعت علم اور ان کے کریمانہ اخلاق سے متاثر ہو کر فقرا ، شعرا اور امرا ان کے پاس کھنچے کھنچے چلے آتے تھے ۔ لیکن انھوں نے عزلت و انزوا کو نہ چھوڑا ۔ ان کی شہرت اورنگ زیب؟ کے

کانوں تک بھی پہنچی اور اُس دین پرور شہنشاہ نے اُن کے دیوان کی ایک نقل منگوائی اور مطالعہ کیا۔ چناں چہ رقعات عالم گیری میں بیدل کا مندرجہ ذیل شعر موجود ہے :

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب معاش
آن چہ ما درکار داریم اکثری درکار نیست

بیدل نے پچاس سال سے زائد عرصے کی یہ تمام طویل مدت ایک خاموش مصلح کی حیثیت سے گزاری۔ عہد مغلیہ نے تین مجدد پیدا کیے ہیں ، صوفی مجدد : حضرت احمد سرہندیؒ ، شہنشاہ مجدد : محی الدین اورنگ زیبؒ اور شاعر مجدد : میرزا عبدالقادر بیدلؒ۔ ان کے کلام میں کچھ چیز ورائے شاعری ہے اور اگر اُس کی حقیقت سے آگاہ ہونا مطلوب ہو تو ان کے دیوان اور اُن کی دیگر تصنیفات کی ورق گردانی کرنا چاہیے۔ شاہان مغلیہ کے دارالسلطنت میں جب بیدل پہنچے تو مغل اور ایرانی امرا کی بے راہ روی نے اُنھیں جس قدر تکلیف دی ، اس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سعدی کے بعد امرا اور سلاطین کے اخلاق کی جس قدر شدید مذمت بیدل نے کی ہے ، اتنی اور کسی شاعر نے نہیں کی۔ غالباً اُنھی کی اصلاح کے لیے اُنھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ اُنھوں نے اس طبقے کی درشت مزاجی ، بے مروتی ، غفلت شعاری ، کم ظرفی ، بے مغزی اور دین حق سے لاپروائی ، الغرض ایک ایک بات کو لیا ہے اور عجیب پیرائے میں سرزنش کی ہے اور کہا ہے ، تم اپنے آپ کو عام انسانوں سے کیسے بالاتر سمجھتے ہو :

در حباب[1] و موج این دریا تفاوت بیش نیست
اندکی باد است در سر صاحب اورنگ را

اور پھر اس منفی تنقید کے ساتھ ساتھ مثبت اخلاق کی تلقین کی ہے۔ یہ بیان بجائے خود ایک تصنیف چاہتا ہے۔ اخلاق کی تعلیم دیتے ہوئے فطرت انسانی کی حیرت انگیز نقاب کشائی کی ہے اور نہایت باریک نکتے پیدا کیے ہیں۔ اور پھر اخلاق افلاطون کی طرح مسلک گوسفندی کا نہیں ، بلکہ جواں ہمتی اور مردانگی کا درس دیتے ہیں اور اس طرح معلوم ہوتا ہے گویا روح اقبال کام کر رہی ہے۔ سنیے :

۱- دیکھیے ، عام روش سے ہٹ کر حباب و موج کے نئے معانی پیش کیے ہیں۔

حوادث میں آسائش بود آزادہ مشرب را
کہ موج بحر دارد از شکست خویش جوہر ہا

ای فغان بگزر ز چرخ و لامکان تسخیر باش
چند در زیر سپر کردن نہان شمشیر را

جمع با زینت نگردد جوہر مردانگی
از برش عاری بود گر سازی از زر تیغ را

داغ عشقم نیست الفت با تن آسانی مرا
پیچ و تاب شعلہ باشد نقش پیشانی مرا

گرمیِ ہنگامۂ آدمی موقوف تب است
روز اگر خورشید باشد شمع شب با آتش است

الغرض مسموم اخلاق سے نفرت دلاتے ہیں۔ مردانہ اوصاف حمیدہ کی ترغیب دیتے ہیں۔ عقائد کی اصلاح ہو رہی ہے، اسرار عالم کھولے جا رہے ہیں، عشق الٰہی کا سبق دیا جا رہا ہے۔ حضرت ختمی مرتبت؀ کو عمر کائنات کا گوہر آبدار بتاتے ہیں اور کہتے ہیں :

دو عالم چون صدف در ہم شکستم
کہ آمد گوہر لامش بدستم

اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ بیدل گویا مغلیہ سلطنت کے قلب یعنی دہلی کو ہر قسم کے لعن سے پاک کرکے اس کے اندر ایک صالح روح پھونکنا چاہتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے، صدیوں کے عیش و عشرت کی وجہ سے طبائع اس قدر مضمحل اور بے کار ہو چکی تھیں کہ بیدلؔ اور عالمگیر کی بے لوث مجاہدانہ کوششیں اُن کی اصلاح کرکے اُن کے اندر ایک تڑپتی ہوئی جان نہ ڈال سکیں۔

مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مفلس اور نادار طبقے سے بیدل کے وسیع جذبۂ ہم دردی کا ذکر بھی کر دیا جائے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ

ایک متمول قومی سردار کا فرزند ہونے کے باوجود اور پھر شہزادہ اعظم شاہ کی فوج میں ترقی مناصب کی تمام یقینی توقعات کو چھوڑ کر اُس نے درویشی اختیار کی اور غریب اور نادار طبقے کے ایک فرد کی حیثیت سے بڑے اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کی اور ساتھ ہی احساس کی پوری شدت کے ساتھ ان کے مصائب کو اپنے اشعار میں بیان کیا۔ اُن کی خاموش افسردہ صورتوں کو دیکھا تو کہا :

مفلسان را بیدل از مشق خموشی چارہ نیست
تنگ دستی باز می دارد ز قلقل شیشہ را

اور پھر جب اپنی پریشانیوں کی بنا پر اُنہیں فریاد کرتے سنا تو کہا کہ یہ حق بجانب ہیں :

ہجوم شکوۂ ہر کس ز درد مفلسی باشد
نخیزد نالہ از نی تا بود مغز استخوانش را

اور ساتھ ہی اس ستم رسیدہ طبقے سے کہا ، افلاس اور احتیاج کی بنا پر توانگر لوگوں کے سامنے جا کر ہاتھ مت پھیلاؤ ، نہ ہی مایوسی اختیار کرو بلکہ بن پڑے تو اپنی قوت بازو سے کم لے کر انقلاب پیدا کرو اور زندگی اور زندگی کی رسوا کن رسوم و عادات کا خاتمہ کر دو :

زندگی در بند و قید رسم و عادت مُردن است
دست دست تست بشکن این طلسم تنگ را

اس وسعت نگہ اور جذبۂ دل کی ان پہنائیوں اور گہرائیوں کے ساتھ اپنے معاشرے کی آخری دم تک اصلاح کرتا ہوا ہندوستان میں فارسی زبان کا یہ عظیم الشان شاعر عمر کے ۷۶ سال[1] گزار کر ۱۷۲۰ع میں بہ مقام دہلی محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں راہی ملک بقا ہوا اور پرانے قلعے کے سامنے حضرت یار پران[2] کے مزار کے قریب دفن ہوا۔ شاگرد ایک مدت تک سال بہ سال اس کا عرس مناتے رہے۔

میں نے سطور بالا میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ماحول نے بیدل کی تربیت اور پختگی میں کیا حصہ لیا اور پھر بیدل نے کس طرح اسے متاثر کرنے کی کوشش کی۔ چند باتیں رہ بھی گئی ہیں ، مگر وہ ضمنی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً اپنے عہد کے شعرا کو قصیدہ گوئی سے باز رکھنے کی کوشش ، دکن میں

۱- قمری حساب سے ۷۹ سال - پیدائش ۱۰۵۴ھ اور وفات ۱۱۳۳ھ -

عالم گیری فتوحات پر اظہار مسرت ، اپنے عہد کے مختلف اہم واقعات پر تاریخی قطعات وغیرہ ۔

میرا خیال ہے کہ ان کا تفصیلی ذکر بے جا طوالت پر منتج ہوگا ، لیکن جو کچھ اوپر لکھا جا چکا ہے ، اس کی بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس مضمون میں بیدل کے قلب کی ہر بنیادی لرزش کا ذکر آ گیا ہے اور امید ہے کہ ان سطور کے مطالعے سے قارئین کو روح بیدل آشنا سی معلوم ہونے لگے گی ۔

(مخزن لاہور ، اکتوبر ۱۹۳۹ء)

(۲)

مرزا بیدلؒ کی سیرت و شخصیت

بیدل مکتب میں تعلیم پاتے تھے ؛ دس سال کی عمر تھی ، اس وقت ایک ایسا واقعہ رونما ہوا ، جس نے ان کی زندگی کو یک سر بدل ڈالا ۔ ان دنوں وہ 'کافیہ' ختم کرکے 'شرح ملا' کے اسباق پڑھ رہے تھے ۔ ان کے دو اساتذہ کے درمیان نحو کے کسی مسئلے پر بحث چھڑ گئی ۔ دونوں ایک دوسرے کی تردید کے لیے شد و مد سے دلائل دینے لگے ۔ دلائل کے ترکش ختم ہوئے تو ہاتھا پائی کی نوبت آئی اور دونوں نے ایک دوسرے کو خوب ذلیل کیا ۔ تنگ مزاجی ، خفت عقل اور بداخلاقی کا بڑا افسوس ناک مظاہرہ ہوا ۔ اتفاقاً بیدل کے چچا مرزا قلندر وہاں موجود تھے اور انھوں نے مدرسین کی یہ حرکات مذبوحی اپنی آنکھوں سے دیکھیں ۔ وہ سوچنے لگے ، عمر بھر علوم عربیہ سے شغف رکھنے کا نتیجہ اگر ان سفلہ عادات کی صورت میں نکلتا ہے تو پھر اس بچے کو مکتب میں پڑھانے سے کیا فائدہ ؟ جو تعلیم جوہر انسانیت کی حفاظت نہیں کر سکتی ، اس کے حاصل کرنے کی آخر ضرورت ہی کیا ہے ؟ مرزا قلندر بڑی بلند سیرت کے مالک تھے ۔ امی محض تھے مگر بزرگوں کی صحبت میں حاضر ہونے کا بڑا شوق تھا ۔ روحانیت کی لگن دل میں رکھتے تھے ۔ اولیاء اللہ کی مبارک سیرت کے بڑے دل دادہ تھے ۔ اس لیے انھوں نے سوچا ، کجا ارباب طریقت کی پاکیزہ مشربی اور کجا ان معلموں کی سفلہ مزاجی ۔ وہیں کھڑے کھڑے انھوں نے فیصلہ کیا کہ بیدل کو عربی علوم کے ان اساتذہ کے زیر اثر نہیں رہنے دینا چاہیے ۔ چناں چہ اپنے فرزند عزیز کو انھوں نے مکتب[1] سے اٹھا لیا ۔

۱- کلیات صعدری ، چہار عنصر ، ص ۲۵ - خوش گو ، معارف مئی ۱۹۳۲ء - نشتر عشق ، ق حصہ اول ، ص ۲۰۳ ب ۔

مرزا قلندر کا یہ فیصلہ بڑے دور رس نتائج کا حامل تھا ۔ بیدل کی مکتب کی تعلیم ختم ہوگئی ، عربی علوم کے دروازے ان پر بند ہو گئے ۔ علمائے ظاہر کے متعلق ان کے دل میں مستقل نفرت پیدا ہوگئی ۔ اعلیٰ انسانی اقدار اور اخلاقِ عالیہ کے لیے رجحان پیدا ہوا اور روحانیت ان کا مطمحِ نظر بن گئی ۔

سنہ ۱۰۵۴ھ میں بیدل کی پیدائش کے وقت ایک صوفی بزرگ میرزا ابوالقاسم ترمذی نے از روئے حساب جمل ان کی تاریخ[1] پیدائش علیحدہ علیحدہ 'فیض قدس' اور 'انتخاب' کے الفاظ سے نکالی تھی ۔ بنابریں میرزا قلندر کے علاوہ باقی تمام کنبے کے افراد بھی بیدل کے شان دار مستقبل کے متعلق بڑے پر امید تھے ۔ تمام کا خیال تھا کہ بیدل ایسا انتخاب روزگار انسان بنے گا جو اپنی قدسی صفات کی بنا پر تمام عالم میں مشہور ہوگا ۔ ابھی وہ بچہ ہی تھا کہ بیماروں کے سرہانے بیٹھ جاتا اور یونہی ہونٹ کو ہلا ہلا کر پھونکا کرتا اور اپنے گلے کا تعویذ ان کے گلے میں ڈال دیا کرتا ۔ ہولے ہولے تعویذوں سے دل چسپی بڑھتی چلی گئی اور ایک واقعے کی بنا پر یہ دل چسپی اپنی انتہا کو پہنچ گئی ۔ قادری سلسلے کے ایک پابند شرع بزرگ مولانا کمال نے میرزا قلندر کو ایک اسم[2] بتایا ، جسے پڑھ کر ہاتھ کے انگوٹھے پر پھونکنے سے آسیب کی تکلیف دور ہو جاتی تھی ۔ بیدل نے وہ اسم سن کر اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا ۔ ایک روز وہ اپنے ہم جولیوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ محلے کی ایک عورت کو بھی تکلیف ہو گئی ۔ کئی تدبیریں اختیار کی گئیں ، مگر اس کی طبیعت بحال نہ ہوئی ۔ کھیلتے کھیلتے بیدل نے سوچا ، مولانا کی مبارک زبان سے سنا ہوا اسم آج آزمایا جائے ۔ چنانچہ انھوں نے پڑھ کر پھونکا تو عورت کی تکلیف فوراً دور ہوگئی ۔ مولانا کمال کو جب اس واقعے کا علم ہوا تو بڑے خوش ہوئے اور بیدل کو عملیات اور تعویذات کی اپنی خاص بیاض عطا فرمائی ۔ اس واقعے کی وجہ سے باطنی اثرات کے متعلق بیدل کا اعتقاد اور بھی پختہ ہوگیا ۔ ان کے والد مرحوم میرزا عبدالخالق[3] بھی بڑے بزرگ تھے ۔ اوائل عمر ہی میں ترک ماسواء اللہ کرکے گوشہ نشین ہو گئے تھے ۔ فقر میں بلند پایہ پر پہنچے اور

۱- خوش گو ، معارف ، ۱۹۳۲ء ، کلیات معدری ، چہار عنصر ، ص ۲۶ ۔

۲- کلیات معدری ، چہار عنصر ، ص ۸ ۔

۳- کلیات صفدری ، چہار عنصر ، ص ٦ ۔

مسند ارشاد عطا ہوئی ؛ چناں چہ میرزا قلندر بھی ان کے تربیت یافتہ تھے ۔ اب میرزا ابوالقاسم کی لکھی ہوئی تاریخ پیدائش کے متعلق گھر والوں کے خیال ، والد اور چچا کے اثرات ، بچپنے ہی میں تعویذوں سے لگاؤ ، ڈرامائی انداز سے ترک مکتب ، ان تمام باتوں نے مل کر ان کے لیے بچپنے ہی میں ایک خاص راہ متعین کر دی ۔

وہ ساڑھے چار سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا ۔ چھ سال کے ہوئے تو والدہ ماجدہ بھی رہگرائے عالم بقا ہو گئیں ۔ طفلی ہی میں وہ درد سے آشنا ہو گئے ۔ میرزا قلندر نے ان کی تربیت کی ۔ ترکِ مکتب کے بعد ان کی تعلیم کی یہ صورت تھی کہ دن بھر قدما کی نظم و نثر کا مطالعہ کرتے ۔ میرزا قلندر کی ہدایت تھی کہ مطالعے کے وقت جو اشعار پسند آئیں اور نثر کے جو حصے اثر پرور ہوں ، انھیں علیحدہ لکھ لیا جائے اور شام کے وقت سنایا جائے ۔ امی ہونے کے باوجود میرزا قلندر بڑے صاحب ذوق تھے ۔ فارسی مادری زبان تھی ، اس لیے شام کو جب عرفا کا منتخب کلام بیدل کی زبانی سنتے تو طبیعت اس قدر متاثر ہوتی کہ فی البدیہہ منہ سے اشعار نکلنے لگتے ۔ میرزا قلندر کی یہ الہام آفریں کیفیت بیدل کی ہمت افزائی کا موجب بنتی ۔ وہ سمجھتے کہ یہ کیفیت ان کے اپنے پاکیزہ ذوق کی آئینہ دار ہے ۔ آخر انھی کا انتخاب اتنا اثر انگیز ثابت ہوا ۔ اس لیے وہ دن کو مطالعہ اور بھی زیادہ ذوق و شوق سے کرنے اور کبھی کبھی خود بھی شعر گوئی شروع کر دیتے ۔ ابھی وہ مکتب ہی میں تھے کہ انھوں نے اپنے خوش گل ہم درس کے منہ سے نکلتی ہوئی قرنفل کی بھینی بھینی خوش بو کے متعلق ایک رباعی[1] کہی تھی ، جس کی بڑی تعریف ہوئی تھی ۔ اب میرزا قلندر کی بدیہہ گوئی اور ارباب حال و قال کے اشعار کا مطالعہ انھیں شعر کہنے پر آمادہ کرتا تھا اور رمزی کے تخلص سے وہ شعر کہتے رہتے تھے ۔ ہر شام چوں کہ دن کے مطالعے کا ماحصل میرزا قلندر کی ناقدانہ نگاہوں کے سامنے پیش کرنا پڑتا تھا ، اس لیے لازماً انھیں قدما کے دواوین کی ورق گردانی کرنی پڑتی تھی اور تحقیقات بتاتی ہے کہ آدم الشعرا رودکی سے لے کر امیر خسرو اور جامی تک تمام اساتذہ کا کلام ان ایام میں بیدل نے بہ دقت نظر پڑھا ۔

۱۔ کلیات عنصری ، چہار عنصر ، ص ۶ ۔

ان ایام میں وہ رمزی تخلص کرتے تھے، شاید اس بنا پر کہ انھیں گمان تھا ، ان کا سینہ رموز و نکات کا خزینہ ہے اور ان کے منہ سے نکلے ہوئے اشعار اس خزینے کے گراں مایہ جواہر پارے ہیں ۔ اس تخلص کے ساتھ انھوں نے بڑے اشعار کہے جو کبھی کبھی وہ اپنے مذکورہ بالا شفیق بزرگ مولانا کمال[1] کو بھی دکھا لیا کرتے تھے ۔ مولانا ہمیشہ ان کی تعریف کیا کرتے ۔ اس کے باوجود بیدل نے اپنے ان اشعار کو محفوظ نہ رکھا ۔ مولانا اسم بامسمیٰ تھے ۔ آپ کی ذات علم و اخلاق اور شریعت و طریقت کے کمالات کی آئینہ دار تھی ۔ اس بنا پر بیدل کے والد مرحوم اور میرزا قلندر کے ساتھ ان کے بڑے گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے ۔ ان کا وجود مسعود بہار میں سلسلۂ قادریہ کی شہرت کا موجب بنا ہوا تھا ، جہاں وہ شعر و سخن میں بیدل کی راہنمائی کر رہے تھے، وہاں باطنی طور پر بھی بیدل کی تربیت کی طرف متوجہ تھے ۔ اس لیے ہولے ہولے بیدل کا سوز دروں بھی ترقی پذیر تھا اور عشق الٰہی طبیعت میں حرارت پیدا کر رہا تھا ۔ ایک روز گلستان سعدی کا دیباچہ پڑھتے ہوئے جب بیدل اس مقام پر پہنچے :

عاکفان کعبۂ جلالش بہ تقصیر عبادت معترفند کہ ما عبدناک حق عبادتک و واصفان حلیۂ جمالش بہ تحیر منسوب کہ ما عرفناک حق معرفتک :

گر کسی او زمن پرسد
بیدل از بی نشان چہ گوید باز

تو طبیعت پر اضطرار کی کیفیت طاری ہوگئی ، حال وارد ہوگیا ۔ خداوند تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور محبت کے متعلق دل میں جو احساسات اور جذبات پرورش پا رہے تھے ، یک لخت ابل پڑے ۔ دیر تک بے حال رہے ۔ زبان پر بار بار یہ مصرع آتا تھا :

بیدل از بے نشان چہ گوید باز

ان کا تحت الشعور جن کیفیات اور خیالات سے لبریز تھا اس مصرع کا لفظ 'بیدل' انھیں ان کی پوری پوری ترجمانی کرتا ہوا نظر آیا ۔ وہ سوچنے لگے ، جس معبود حقیقی کی عبادت کا حق ادا کرنا بڑے سے بڑے عبادت گزاروں کے لیے

۱- کلیات صفدری ، چہار عنصر ، ص ۱۴ ۔

ناممکن ہے ، جس کی ذات پاک کا کما حقہ عرفان حاصل کرنا خود انبیا اور اولیا کے لیے امر موہوم ہے ۔ جملہ کمالات کے اس خالق کا وصف وہ ناچیز انسان کیسے بیان کر سکتا ہے ، جو عشق کے پہلے داؤ ہی میں دل ہار بیٹھا اور جس کا پہلو اب دل سے بالکل خالی ہے ۔ ایسے حالات وہ اظہار عجز سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہے ۔ اسی لیے انھیں صاف نظر آیا کہ رمزی تخلص رکھنا بڑی ناقابل عفو جسارت ہے ۔ چناں چہ قصہ پڑھنے کے بعد انھوں نے حافظ شیرازی کی روح پر فتوح سے فال کے ذریعے استمداد لی اور اپنا تخلص[1] بیدل رکھ لیا ۔

تحصیل علم محض کتب بینی تک محدود نہ تھی ، بلکہ انھیں خوش قسمتی سے مولانا کمال کے علاوہ اور بھی کئی اولیاء اللہ[2] کی صحبت میں حاضر ہونے کا موقع ملا اور ان کی مبارک صحبتوں میں رہ کر انھوں نے بہت کچھ سیکھا ۔ میرزا قلندر کو ارباب حال سے بڑی عقیدت تھی ۔ وہ بیدل کو ساتھ لے کر مہسی ، راج محل اور آرے کی طرف آتے جاتے رہتے تھے اور جہاں کہیں اہل اللہ ملتے ، ان کی باطنی توجہ سے خوب مستفیض ہوتے ۔ جب میرزا قلندر بنگال کی طرف چلے گئے تو بیدل اپنے ماموں میرزا ظریف کے ساتھ رہنے لگے ۔ چوں کہ میرزا ظریف کا شغل تجارت تھا ، اس لیے اس سلسلے میں بیدل ان کے ساتھ اڑیسہ کے دارالخلافہ کٹک میں بھی کچھ عرصہ مقیم رہے اور حتی کہ اس سے آگے کھاری تک بھی گئے ۔ یہ سفر بھی بیدل کی ظاہری اور باطنی تربیت کے لیے نمایاں اثرات کا حامل ہے ۔ میرزا ظریف خود فقہ ، حدیث اور تفسیر کے ماہر تھے اور کٹک رہتے ہوئے بیدل کو تفسیر کا درس دیا کرتے تھے ۔ علاوہ بریں کٹک میں بیدل کو شاہ قاسم[3] ھواللہی ایسے قطب الاقطاب کے زیر اثر آنے کا موقع ملا ۔ شاہ صاحب بھی علم تفسیر کے ماہر تھے ۔ ساتھ ہی صاحب حال شعرا کا کلام انھیں ازبر تھا ۔ بیدل کی طبع موزوں کو دیکھ کر انھوں نے بڑی شفقت کا اظہار فرمایا اور کشف الصدور کی بنا پر ان کی باطنی کیفیات سے آگاہ ہونے کے بعد فرمایا :

"او ازاں طائفہ ایست کہ ازلاً با فضل حقیقی خوشیدہ اند ۔"

۱- نشتر عشق اول ق ، ص ۲۰۲ ب ۔

۲- کلیات صفدری ، چہار عنصر ، ص ۳ تا ۳۳ ۔

۳- کلیات صفدری ، چہار عنصر ، ص ۲۹ و ۳۳ ۔

ظاہر ہے کہ پٹنے سے لے کر کٹک تک بہار اور اڑیسہ کے شہروں میں بیدل سے ایسے اوقات عزیز مردم دنیا کی صحبتوں میں نہیں گزارے تھے ۔ جہاں حدیث کاؤخر کے علاوہ اور کوئی تذکرہ ہی یاد نہیں ہوتا ، بلکہ یہ عاشقان الہی کی صحبتیں تھیں ، جو لوگ سر تا پا عشق تھے اور حال حق کی رفتار و گفتار سے ٹپکتا تھا ، بلند نگاہ ، پُر سوز ، خوش اخلاق ، شریعت کے پابند ، صاحب شریعت کی ذات بابرکات پر دل و جان سے فدا ، اسرار معرفت ان کی محفلوں میں کھولے جاتے تھے ۔ وحدت و کثرت ، جبر و حقیقت ، مراتب وجود ، ممکن و وحب اور ممکنات انسانی ایسے بلند مباحث پر ان کی مجالس میں بصیرت افروز تقریریں ہوتی تھیں ۔ ان کا علم و فضل حیرت میں ڈالتا تھا تو ساتھ ہی ان کی خاکساری اور طبیعت کی ہمواری انگشت بدنداں کر دیتی تھی ۔ فاسق و فاجر لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تو کایا پلٹ جاتی تھی ۔ ان کی نگاہوں میں وہ تاثیر تھی کہ بد عقیدہ لوگ صاف باطن ہو جاتے تھے ۔ ان تمام بزرگوں نے بیدل کے ساتھ بے حد شفقت کا اظہار فرمایا اور ان کی محبت اور شفقت کو دیکھ کر بیدل قلبی طور پر ان کے قریب تر ہو گئے ۔ بیدل کو ان کے کئی خوارق و کرامات دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا ۔ بنا بریں اہل اللہ سے ان کی عقیدت درجۂ کمال تک پہنچ گئی ۔ وہ جب محو گفتگو ہوتے تو بیدل سمجھتے ، معارف قرآنی بیان ہو رہے ہیں ، اس لیے ہمہ تن گوش ہو کر ان کے ایک ایک حرف کو سنتے ۔ جب جذب و حال کی کیفیت ان پر طاری ہو جاتی تو بیدل خیال کرتے ، ابراہیم ادھم، بایزید بسطامی، شبلی اور جنید ایسے ائمۂ تصوف کی زیارت نصیب ہو گئی ۔ جب بیدل دیکھتے کہ ان بزرگوں پر محبت الٰہی کا وہی شدید جذبہ طاری ہے ، جو "والذین آمنوا اشد حباً للہ" کا مصداق ہے تو انہیں یقین ہو جاتا کہ ان بزرگوں کا وجود تعلیمات قرآنی کی عملی تعبیر ہے اور وہ کہہ اٹھتے :

وصف این طائفہ تفسیر کلام اللہ ہست

بیدل نے خیال کرنا شروع کر دیا کہ ان بزرگوں کی بدولت وہ روح اسلام سے آشنا ہو چکے ہیں اور اسی لیے زندگی بھر انھوں نے تصوف کو تمام علوم سے افضل بلکہ جملہ علوم کا ماحصل سمجھا ۔ اس کی روح کو اپنے وجود میں جاری اور ساری رکھنے کے لیے انہوں نے مجاہدہ اور ریاضت کی طرف بھی توجہ دی اور ابھی وہ طفل نوخیز ہی تھے کہ انہوں نے کئی مدارج تصوف طے کر لیے اور عجیب و غریب مکاشفات سے بھی بہرہ ور ہونے لگے ۔ ان بزرگوں کے اخلاق حسنہ کا پرتو

اپنے کردار میں دیکھ کر اور ان کے ظاہری اور باطنی فیوض کی بنا پر اپنے علم میں اضافہ اور اپنے حال میں ترقی محسوس کرکے انھوں نے کہا[1] :

صحبت صالح دلان جوہر اکسیر غناست
بی صدف قطرہ محال است کہ گوہر گردد

صوبہ بہار میں ان ایام میں ایسے فاضل اور با کمال بزرگوں کا اجتماع بہ ظاہر بڑا حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے ، لیکن جو لوگ مسلمانوں کے تصوف سے لگاؤ اور ان کی معارف پروری سے بخوبی آگاہ ہیں اور جانتے ہیں کہ عہد مغلیہ میں دہلی سے پورب کی طرف جون پور کے قرب و جوار میں اسلامی علوم و فنون کو کس قدر فروغ حاصل ہوا ، ان کے لیے یہ بات قطعاً تعجب انگیز نہیں ۔ امیر تیمور کے حملہ دہلی کے وقت حفاظت جان کے ارادے سے مفرور ہونے والے اہل علم کی جس طرح سرپرستی جون پور[2] کے شرقی بادشاہوں نے کی ، اور بنابریں بعد میں یہ شہر جس غیر معمولی نوعیت کا علمی مرکز بنا ، اس کے ہمہ گیر اثرات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج کل بھی تہذیب و شائستگی کے لحاظ سے وہاں کے عوام الناس ادھر ادھر کے حصے تعلیم یافتہ لوگوں سے برتری رکھتے ہیں اور بیدل کے زمانے میں تو پورب علوم و فنون کا گہوارہ تھا ۔ اسی لیے شاہ جہان نے بعد تفاخر کہا تھا ''پورب شیراز ماست ۔'' شمس بازغہ جس میں 'شمس بازغہ' ملا محمد جون پوری نے اسی عہد میں لکھی تھی اور اورنگ زیب عالمگیر کے استاد ملا محی الدین مونگیری بھی بہاری ہی تھے ۔ اس لیے بیدل کی تربیت کرنے والے صوفی بزرگوں کا تبحر علمی اس زمانے کی علم پروری سے پوری پوری مطابقت رکھتا ہے ۔ حقیقت سے پتا چلتا ہے کہ ان ایام میں بہار کے رہنے والے مسلمان حصول کمال کے لیے اس طرح بے تاب رہا کرتے تھے جس طرح روشنی حاصل کرنے کے لیے پودا ہوا کرتا ہے ۔ اسی بنا پر بیدل ماحول سے متاثر ہو کر بیدل بھی منزل مقصود کی طرف بڑی بے تابی سے گامزن رہے اور اساتذۂ قدیم اور اپنے عہد کے کامل صوفی بزرگوں سے پوری طرح مستفیض ہونے کے لیے کوشاں رہے ۔

لیکن بہار بیدل کے وسیع تر ماحول کا ایک حصہ تھا ۔ ہندوستان کے عام

۱۔ کلیات منظری ، چہار عنصر ، ص ۳۳ ، ۳۷ ، ۴۸ ، ۵۰ ۔

۲۔ تجلی نور ، جلد دوم ، ص ۹ ، ۲۹ ۔ مآثرالکرام ، جلد اول ، ص ۲۲۱ ۔

حالات بھی اس بچے کی سیرت و شخصیت پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ سنہ ۱۰۳۷ھ میں جہانگیر کی وفات پر شاہ جہاں تخت نشین ہوا۔ بیدل سنہ ۱۰۵۴ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان سولہ سترہ سالوں میں شاہ جہاں کی اسلام[۱] دوستی اور اس کے عظمت و جلال کے قصے زبان زد خلائق ہو چکے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی نے اکبر اور جہانگیر کی حق خلاف اسلام حرکات کی مخالفت میں آواز بلند کی تھی، شاہ جہاں نے تخت نشین ہوتے ہی ان کا خاتمہ کردیا۔ لوگوں کو نورجہاں کے خلاف شکایتیں تھیں کہ مائل بہ تشیع ہے، شاہ جہاں نے حنفی عقائد کی حمایت کی اور دارالضرب میں ایسے سکّے تیار کرائے، جن پر خلفائے راشدین کے اسمائے گرامی درج تھے۔ علاوہ بریں باقاعدہ طور پر شاہی جلوس کی صورت میں خواجہ اجمیریؒ اور خواجہ محبوب الٰہیؒ کے مزارات مقدسہ کی زیارت کی تھی۔ شاہ جہاں کے عساکر بھی تمام محاذات پر فتح مند رہے تھے، اس لیے فساد انگیز عناصر دب گئے۔ ملک میں امن و امان قائم تھا، عدل و انصاف کے چرچے تھے اور تجارت اور صنعت و حرفت کو خوب فروغ حاصل تھا۔ ساتھ ہی بیدل کی پیدائش سے پہلے تخت طاؤس بن چکا تھا۔ شاہ جہاں آباد کی بنیادیں رکھی جا چکی تھیں اور تاج محل بڑی حد تک مکمل ہو چکا تھا، اس لیے لوگ اطراف و اکناف ہند میں شاہ جہاں کی تعریف میں رطب اللسان تھے اور بڑے اطمینان سے خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ظاہر ہے بیدل نے اس ماحول میں پرورش پائی جو شاہ جہاں کا مدح گو تھا اور جو امن و امان کی تمام برکات سے متمتع ہو رہا تھا۔ انہیں حالات جہاں ایک کامیاب حکمراں کی صفات عالیہ کا اسے گہرا شعور حاصل ہوا اور وفور دولت کی وجہ سے اس کے مزاج میں سیر چشمی پیدا ہوئی، وہاں شاہ جہاں کی ذات سے بھی اسے دائمی لگاؤ پیدا ہو گیا۔ چناں چہ سنہ ۱۰۶۸ھ میں فتح سامو گڑھ کے بعد جب اورنگ زیب نے اسے نظربند کیا اور پھر سنہ ۱۰۷۶ھ میں اس کی وفات[۲]

۱۔ فاروقی، مجددؒ کا نظریۂ توحید، باب اول۔ منتخب اللباب، شاہ جہاں، عمل صالح از محمد صالح کمبوہ۔

۲۔ اس موقع پر بیدل نے شاہ جہاں کا مندرجہ ذیل مرثیہ لکھا: اس مرثیے کو پڑھتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ بیدل نے ہمیشہ بادشاہوں کی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اور معذین بڑی بے کسی کی حالت میں ہوئی تو بیدل کو سخت صدمہ ہوا ۔ ایسے محبوب شہنشاہ کے خلاف صف آرائی کی بنا پر بیدل نے عمر بھر شجاع اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ملح گوئی سے اجتناب کیا ۔ اگرچہ وہ ۱۱۳۳ھ میں فوت ہوئے جب محمد شاہ رنگیلا حکم راں تھا اور اورنگ زیب سے لے کر فرخ سیر تک تمام شہنشاہوں نے ان کا احترام کیا لیکن شاہ جہان کے علاوہ اور کسی کی وفات پر انھوں نے مرثیہ نہ کہا :

یاد آن موسم کہ بی وہم بہار و فصل دی
داشت مینای فلک جام طرب لبریز می

انجمن نازان چمن خندان طراوت گلفشان
شاخ گل رقاص و بلبل بستہ در منقار نی

دور سعدی بود و عہد امن و ایام شریف
خلق در حمد خدا از عدل شاہ نیک پی

شاہ شاہان جہان شاہ جہان کز شوکتش
تاج برخاک اوفگندی کسریٰ و کاؤس و کی

از زمین تا آسمان شہباز حکمش کردہ صید
رخش فرمانش ز مشرق تا بہ مغرب کردہ طی

دست جودی داشت چون موسی دل دریا شگاف
تیغ عدلی پای ظلمت کردہ چون خورشید پی

کوہ در فکر وقارش بستہ خون در دل ز لعل
بحر از شرم عطا یائش ز گوہر کردہ خوی

کامران شاہی چو او نگزشتہ در اقلیم دہر
کم تربی چاکرانش بادشاہ مصر و ری

عاقبت رفت آن شہ قدسی نشان بر قصر عرش
سوی اصل خویش می باشد رجوع کل شی

بہر تاریخ وصالش از خرد کردم سوال
گفت بیدل "بر سریر قرب یزدان جای وی"

۱۰۷۶ھ

اورنگ زیب کو معاف نہ کیا ۔

بیدل بہار اور اڑیسہ کی طرف سنہ ۱۰۷۵ھ تک رہے اور اس کے بعد اکبر آباد اور دہلی چلے گئے ۔ ان کے چچا میرزا قلندر غالباً جنگِ تخت نشینی کے حامی اور شاہ جہان کے نظر بند ہونے پر بنگال چلے گئے تھے ۔ ماموں میرزا ظریف کا انتقال سنہ ۱۰۷۵ھ میں ہوا اور بیدل کا کوئی ذریعۂ معاش نہ رہا ، اس لیے انہوں نے واقف کاروں کے مشورے سے شاہانِ مغلیہ کے دارالسلطنت کا رخ کیا ۔ اس وقت عمر اکیس برس کی تھی ؛ عین عالم شباب ، میانہ قد ، کشادہ سینہ ، کھلی جبین ، ابرو کی قوسیں ایک دوسرے سے الحاق پر مائل ، کمال درجے کے حسین تھے ۔ ریش ہمیشہ صاف رہی ، اگرچہ 'تذکرۂ حسینی' کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ زندگی کے کسی مرحلے پر مختصر سی ریش کی عادت بھی ڈال لی تھی ۔ قوم کے مغل ارلاس تھے ۔ آبا و اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا ۔ میرزا قلندر بھی فوج میں ملازم رہ چکے تھے اور بڑے شہ زور اور دلیر تھے ۔ جب شہزادہ شجاع نے جنگِ تخت نشینی کے موقع پر اڑیسے کو اپنے عساکر کا مرکز بنایا تو میرزا قلندر کے ایک رشتہ دار[1] میرزا عبد اللطیف اس کے سپہ سالار تھے ۔ خود بیدل بھی کم عمری کے باوجود اس جنگ میں شامل ہوئے اور جب شجاع کو اورنگ زیب کے ہاتھوں خواجوہ کے مقام پر شکست ہوئی تو ہزیمت خوردہ فوج[2] کی بھاگڑ بیدل نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ۔ وہ بھی جان بچانے کے لیے بھاگے اور میرزا عبداللطیف کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر ترائی کے جنگلوں میں آوارہ پھرتے رہے ۔ اگرچہ ماحول نے بیدل کو تصوف کے لیے وقف کر دیا تھا ، مگر فطرتاً وہ عسکری تھے ۔ سپاہیوں والا مضبوط گٹھا ہوا جسم ، فولادی اعضا اور بادپائی کے لیے مشہور ، بچپن ہی سے سخت مشقت کی ورزش کے عادی تھے اور محض عسکری تربیت کے لیے چچا نے جنگِ تخت نشینی کے ایام میں انہیں اپنے مذکورہ بالا رشتہ دار میرزا عبداللطیف کے ساتھ بھیج دیا تھا ۔ تمام تذکرہ نگار متفق ہیں کہ زور بازو اور شجاعت کے لحاظ سے بیدل اپنی مثال آپ تھے ۔ اس لیے قسمت آزمائی

۱۔ میرزا قلندر بیدل کے والد کے سگے بھائی نہ تھے ۔ ماں دونوں کی ایک تھی ، باپ مختلف ۔

۲۔ کلیات مقتدری ، چہار عنصر ، ص ۱۲۰ ۔

کے لیے جب بیدل اکبر آباد اور دہلی کی طرف روانہ ہوئے ہیں تو ایک ایسا عالی نسب مغل زادہ، شاہان مغلیہ کے پائے تخت کا رخ کر رہا تھا جو شکل و صورت کے لحاظ سے بڑا حسین، قوت بازو کے لحاظ سے رستم ثانی، علم و فضل کے لحاظ سے قدما کی طرح ماہر اور اور پہلو میں ایک ایسا سلیم اور تپش آشنا دل لیے ہوئے جو بایزید[۲] اور جنید[۳] کے سینے میں باعث اضطراب رہا تھا۔

بہار چھوڑنے کے بعد پورے اکیس سال تک بیدل دہلی، اکبر آباد اور متھرا کے درمیان چکر لگاتے رہے اور کسی خاص شہر میں مستقل طور پر اقامت گزین[۱] نہ ہوئے۔ طبیعت کو کہیں بھی سکون میسر نہ آتا تھا۔ ایک بات طبیعت حیر ثابت ہوتی تھی تو دوسری پریشانی کا موجب بن جاتی۔ سنہ ۱۰۷۹ھ میں شادی کی اور انھی ایام میں شاہزادہ اعظم شاہ کی سرکار میں پانصدی عہدے پر ملازم بھی ہوئے، مگر بہت جلد مستعفی ہو گئے۔ ایک بار لگا تار کوئی تین سال کے قریب اکبر آباد میں مقیم رہے اور لوگوں نے انھیں اکبر آبادی الوطن کہنا شروع کر دیا۔ سنہ ۱۰۸۵ھ میں جب اورنگ زیب عالمگیر خوش حال خان خٹک کا ہنگامہ فرو کرنے کے لیے حسن ابدال کو اپنے عساکر کا مستقر بنا چکا تھا تو بیدل بھی ادھر سیر و سیاحت کی غرض سے گئے۔ متھرا کے متعلق بیدل خود اقرار کرتے ہیں کہ محبت کے اوتار کرشن مہاراج کی وجہ سے وارفتگی اور سپردگی کا جو ماحول وہاں موجود چلا آتا تھا، اس سے وہ بے حد متاثر ہوئے۔ اور شاید اسی بنا پر ایک بار وہ وہاں کوئی دو سال ٹھہرے اور بعد میں وہاں اہل و عیال سمیت مستقل طور پر رہائش پزیر بھی ہوئے۔ مگر انجام کار جاٹوں کے فسادات سے تنگ آکر ہمیشہ کے لیے دہلی چلے گئے۔ ان اکیس سالوں میں کبھی تو خدا کی توکل پر درویشوں کی طرح بسر اوقات کیا کرتے تھے، کبھی اپنے منسوبوں کے ہاں ٹھہرتے اور کبھی گزر اوقات کے لیے غالباً حبی قابلیت پر انحصار کرتے۔ لیکن ہمارا موضوع بیدل کی سیرت کی تشکیل اور ان کی شخصیت کے ارتقا کا مطالعہ ہے، اس لیے سوانح نگاری کے بجائے ہم اس طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

شروع شروع میں دہلی اور اکبر آباد میں ہم بیدل کو مجاہدۂ نفس کی خاطر

۱۔ سیرت بیدل (انگریزی) مصنفہ راقم مقالہ، باب دوم۔

صوم وصال کے عادی ہو گئے ہیں ۔ دہلی میں صرف بھنے ہوئے چنے افطاری کے وقت استعمال کرتے تھے اور اکبر آباد میں بھنا ہوا کتیرہ استعمال کیا کرتے تھے ، اور جب وہ ختم ہوا تو فاقوں کی نوبت آئی مگر گداگری مسلکِ فقر کے خلاف تھی ، اس لیے متوکل رہے ۔ حتیٰ کہ خداوند کریم نے اپنی قدرت کاملہ سے ما یحتاج کا خود بخود انتظام فرما دیا ۔ صوفیائے کرام کا مشہور مقولہ ہے کہ ''المشاہدات مواریث المجاہدات'' ۔ یعنی مجاہدہ اور مشاہدہ لازم ملزوم ہوتے ہیں ، اس لیے ان ایام میں بیدل کو عجیب و غریب مشاہدات ، مکاشفات اور رؤیائے صالحہ کا اتفاق ہوا ۔ یہ سلسلہ دراصل بہار اور اڑیسہ ہی میں شروع ہو گیا تھا ۔ جنگِ تخت نشینی کے ایام میں ترہٹ کے علاقے میں چاند پور کے مقام پر دو حادثوں اور دیگر ہمراہیوں سرمست خاں اور مبارز خاں کے ساتھ انہوں نے ایک بہشت سطر بنگلے میں ایک ماوراء الفطرت[1] پیکر جمیل کو دیکھا جس کی زبان سے بڑے دردِ دل کے ساتھ یہ ہوش گداز شعر نکل رہا تھا :

سالہا در طلب روی تکو در بلوم
روی بنا و خلاصم کن ازین در بدری

اور پھر نہ وہ بنگلہ تھا ، نہ وہ پیکر جمیل ۔ کشک رہتے ہوئے جب جذبۂ دل حد سے زیادہ بے تاب کی صورت اختیار کر چکا تھا اور ان کی زبان پر ہر وقت یہ شعر[2] جاری تھا :

از ہو چہ سرائیمت افزونی
خود گوئی چہ گوئیمت کہ چونی

تو ایک رات انہوں نے عالم خواب میں انوار کی بارش کے درمیان مندرجہ ذیل شعر جواب کے طور پر سنا :

از ما با ماست ہر چہ گوئم
ما ہمچو توئی دگر چہ گوئیم

اور پھر سنہ ۱۰۷۶ھ میں دہلی کے کھنڈرات میں جب ایک مجذوب بزرگ شاہ کابلی[3]

۱۔ کلیات صفدری ، چہار عنصر ، ص ۱۲۲ ۔ مجذوں گورکھ پوری اسے بیدل کی اندرونی طلب سے تعبیر کرتے ہیں ، جس نے خارجی پیکر اختیار کر لیا تھا ۔

۲۔ کلیات صفدری ، چہار عنصر ، ص ۶۳ ۔

۳۔ کلیات صفدری ، چہار عنصر ، ص ۲۶۸ ۔

کے ساتھ رات کی انتہائی تاریکی اور خاموشی میں وہ بیٹھے ہوئے تھے اور شاہ موصوف کی تیز نگاہیں ان کی نگاہوں میں پیوست ہو چکی تھیں ، تو شاہ صاحب اچانک وہی شعر پڑھنے لگے جو اُڑیسہ میں اپنی بے تاب مناجات کے جواب میں انھوں نے عالم خواب میں سنا تھا ۔ اگرچہ اُس وقت بیدل خوف زدہ ہوئے ، لیکن اس پُر اسرار ماحول میں شاہ صاحب کی زبانی کشف الصدور کی بنا پر اُڑیسہ کے خواب کی تائید و تصدیق سے انھیں یقین ہو گیا کہ راہِ سلوک پر چلتے ہوئے وہ منزل مقصود کے قریب پہنچ چکے ہیں اور حقیقت ثابتہ کے ساتھ براہ راست رابطہ قائم ہو چکا ہے ۔ چناں چہ رقم طراز ہیں :

وقوعِ آں کیفیت ظلمت ہوار زنگ شبہات از آئینہ یقینم زدود و شکوک یک عالم اوہام از صفحۂ اندیشہ ام پاک نمود :

عالم ہمہ یک برق تجلی دیدم
محمل گردی نداشت لیلٰی دیدم
زاں سرمہ کہ حق کشید در دیدۂ من
ہر جا لفظی دمید معنی دیدم

علاوہ بریں انھی ایام میں ایک رات جب وہ آدھی رات دہلی کے بازاروں میں گشت کرنے کے بعد واپس لوٹ رہے تھے تو انھوں نے ہوا میں اچانک[1] پرواز شروع کر دی ۔ ٹھہرتے تو زمین پر ہوتے ، چلتے تو از خود پرواز شروع ہو جاتی اور ایک نواب صاحب کے محل کے قریب تو وہ ہوا میں اتنی بلندی پر پہنچے کہ صحن خانہ میں ایک پردہ دار خاتون کو شمع کی لو میں کپڑے سیتے بھی دیکھا ۔

معلوم ہوتا ہے ، جونہی بیدل کی عمر بیس سال سے متجاوز ہوئی ہے ، وہ روحانی لحاظ سے بڑی تیزی سے ترقی کرنے لگے ۔ آمد شباب پر جس طرح یک لخت قد بڑھتا ہے اور کیفیات دگرگوں ہو جاتی ہیں ، یہی حالت بیدل کے روحانی ارتقا کی تھی ۔ بیس سال کی عمر میں آناً فاناً ان کے فقر کا شباب شروع ہو گیا اور پھر پختگی پیدا ہونے سے پہلے آٹھ دس سال تک ان کی زندگی بڑی طوفانی کیفیتوں کی حامل رہی ۔ دن رات اپنے خیالات کی پُرخروش انجمن میں محو رہتے تھے ۔ ہنگامۂ عالم سے مکمل بے نیازی تھی ، اس لیے کہ ہنگامۂ دل اپنے اندر عجیب پہنائیاں لیے ہوئے تھا ۔

۱۔ کلیات معقدری ، چہار عنصر ، ص ۱۱٦ تا ۱۱۸ ۔

یہ کیفیت نمایاں طور پر کٹک میں شروع ہوئی تھی اور جہاں تک ہماری معلومات کام کرتی ہیں، اکبر آباد کے سہ سالہ قیام تک جاری رہی۔ وہاں رہتے ہوئے سنہ ۱۰۸۱ھ میں انھوں نے ایک عظیم[۱] خواب دیکھا۔ چند ساعتوں کے لیے وہ جہانِ احدیت کے جمال میں محو رہے، پھر رنگ شیونات نگاہوں کے سامنے گردش کرنے لگا اور ارواح و اشیا کی کیفیات دیکھیں۔ اس کے بعد مراتب عقول اور مدارج نفوس کے اسرار کھلے اور بروج و ثوابت کی سیر کی۔ زحل، برجیس، بہرام، آفتاب، ناہید، عطارد و قمر تمام کے حقائق آنکھ نے دیکھے۔ پھر تنزلات کا سلسلہ آتش، باد، آب، خاک پر منتج ہوا۔ بعد ازاں سلسلۂ ارتقا کا آغاز ہوا اور عالم جمادات، عالم نباتات اور عالم حیوانات میں سے ہر ایک کی استعداد مرئی طور پر نگاہوں کے سامنے آئی اور حقیقت انسان واضح ہوئی۔ اس نظارے کے دوران میں انھوں نے حضور ختمی مرسلت^ص روحی فداہ کی ذات گرامی کو برسر بالیں دیکھا۔ اس طرح کہ بیدل کا سر حضور^ص کے زانوے مبارک پر تھا اور آنجناب^ص کے دامنِ عاطفت میں تمام حقایق کے رموز وا ہو رہے تھے[۲]۔ جب بیدل نے اپنے آپ کو حضور رحمۃ للعالمین کی آغوش تسلی میں دیکھا تو سوء ادبی کی تاب ہر بن مو سے پانی پانی ہو گیا۔ ہزار جان سے چاہا

۱۔ کلیات معدری، چہار عنصر، ص ۱۳۴ تا ۱۳۶۔

۲۔ اس موقع کی کیفیات کے زیر اثر بیدل نے مندرجہ ذیل نعت لکھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیدل کے دل میں جناب سرور کائنات^ص سے کس درجے کی محبت اور عقیدت پائی جاتی تھی:

آن کہ امکاں تا وجوب و واحدیت تا احد
صورت تمثالی از آئینۂ زانوی اوست

رونق این بزم محفل از چراغش پرتوی
جوش این نہ بحر اخضر رشحہ ای از جوی اوست

از سواد ملک ہستی تا شبستانِ عدم
ہر کجا مژگاں کشائی سایۂ گیسوی اوست

ہرچہ آید در خیال و آن چہ بالد در نظر
یک قلم جوش بہارستان رنگ و بوی اوست

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کہ اپنا سر حضورؐ کے زانوئے مبارک سے اٹھا لے ، لیکن وفورِ شرم و حیا کی وجہ سے بے حس و حرکت ہو چکا تھا ؛ سر بدستور کنارِ رحمت میں رہا ، سرور و حضور کا کیا کہنا ! کچھ دیر کے بعد پردۂ مثال پر ایک اور نظارہ دیکھا ؛ بساطِ کبریا پر جناب ولایت مآب علی مرتضیٰؓ متمکن تھے ۔ یہ وہ آستانِ جلال تھا جہاں فرشتوں کے بھی پر کٹتے تھے ۔ جناب مرتضیٰؓ کی ہیبت سے بیدل کا بند بند کانپنے لگا ۔ دور سے جبین نیاز جھکائی ، جرأت نہ تھی کہ آگے بڑھتے ۔ بھاگنا چاہا ، مگر شش جہت سے اس بارگاہ کے دروازے بند تھے ۔ اچانک جناب ولایت مآب نے بصد پیار لطف و کرم خطاب فرمایا اور بیدل ادب کے تقاضوں کی فرصت نہ پا کر بے اختیار آپ کے سایۂ شفقت میں پہنچ گئے ۔ حضور نے دولت اتحاد سے نوازا ، اپنے پہلو میں جگہ دی ۔ بیدل کے پہلو نے اس جگہ جو نرمی اور ملائمت محسوس کی ، اُسے دنیا کی کوئی نرم و لطیف شے بیان نہیں کر سکتی ۔ دل میں وہ تپش تھی کہ آفتاب میں اتنی کہاں ۔ حضور کی غریب نوازی نے جرأت دلائی اور بیدل نے عرض کی کہ ابھی ابھی خواب میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و سلم کی زیارت نصیب ہوئی ہے اور پھر اپنی سوء ادبی پر اظہار تاسف کیا ۔ جناب نے فرمایا :

”حقیقت محمدیہ ہمہ وقت مایۂ الفت لحوال تمت و باطن لبوت ہیچ گاہ دامن تربیت از سرت بر نمی گیرد ہرچند آداب ظاہر از تو بجا نمی آید ۔“ اپنے خواب کی یہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

خواہ مشرق وا شمار و خواہ مغرب کن قیاس
ہر طرف روی نیاز آوردہ باشی روی اوست

کثرتی کز وحدتش خارج شماری باطل است
چار سوئی شش جہت ہنگامۂ یک سوی اوست

موج از دریا و ریگ از دشت بیرون تاز نیست
ہر دو عالم درکنارش محو جست و جوی اوست

آستان او سراغ ہر چہ خواہی می دہد
گر ہمہ دل در بغل گم کردہ ای در کوی اوست

از من بیدل چہ امکان داشت فہم راز غیب
شد یقینم کاین اشارت از خم ابروی اوست

تعبیر سن کر بیدل اس قدر مسرور ہوئے کہ فرط مسرت سے آنکھ کھل گئی۔

اس خواب کی عظمت اور اہمیت اظہر من الشمس ہے۔ فلسفۂ تنزلات کے متعلق عہد حاضر کے مفکرین کا خیال خواہ جو کچھ ہو، مگر اس خواب کے بیان سے ظاہر ہے کہ ابن العربی کے تتبّع میں بالخصوص صوفیائے کرام نے اس فلسفے کو کس ذوق و شوق کے ساتھ مرتب صورت عطا کی تھی۔ عالم خواب میں بھی تخیل کی پوری جولانی کے ساتھ بیدل تنزلات کے صور اور حقائق میں محو تھے۔ ان کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ان کے افکار اسی محور کے گرد گھومتے ہیں۔ اس فلسفے نے سلسلۂ کائنات میں انسان کو وہ عظمت بخشی ہے کہ ہر شے اسی کا مظہر نظر آنے لگتی ہے۔ اور پھر اس کا قلب کائنات کو اپنے ایک عنصر سے کونے میں جگہ دے کر ذات واجب الوجود کو اپنی آغوش میں مکین ہونے کی دعوت دیتا نظر آتا ہے۔ بیدل بھی ارتقائے ذات کے مراحل طے کرتے ہوئے اسی مقام پر پہنچ چکے تھے۔ حال میں ترقی کے ساتھ ساتھ انہوں نے علم تصوف میں بھی بڑی محنت، مستعدی اور تیزی کے ساتھ کامل استعداد بہم پہنچائی تھی۔ چناں چہ ابھی وہ کمسن ہی میں تھے کہ شاہ قاسم ھواللّٰہی کے فرمانے پر فریدالدین عطار کے 'تذکرۃ الاولیا' سے اکابر صوفیا کے اقوال ایک تالیف کی صورت میں اکٹھے کیے تھے اور اس کے شروع میں منظوم[1] دیباچہ بھی قلم بند کیا تھا۔ علاوہ بریں غزالیؒ، ابن العربیؒ، رومیؒ اور مجدد سرہندیؒ کے مطالعے[2] کا ثبوت بھی بیدل کی نظم و نثر سے ملتا ہے۔ غیرمعمولی مکاشفات، مشاہدات اور رؤیا اس مطالعے کو حقیقت کی صورت دے رہے تھے۔ مجددؒ سرہندی جہاں ماورائیت کی تعمیم دیتے تھے، وہاں بیدل کا اپنا حال انہیں ابن العربیؒ کی عینیت کے ساتھ ہم آہنگ بنا دیتا تھا۔ مندرجہ بالا عظیم خواب حقیقت محمدیہ کے دائمی فیوض کے علاوہ ایک اور حقیقت کی بھی تصدیق کر رہا ہے۔ شاہ کابلی نے ایک موقع پر اپنے اور بیدل کے متعلق فرمایا تھا 'ما افرادیم'۔ اب افراد محمد علی[3] تھانوی کی 'اصطلاحات الفنون' کے مطابق حضرت علیؓ کی روح کلی کا مظہر ہوتے

۱۔ کلیات عنصری، چہار عنصر، ص ۵۵۔
۲۔ سیرت بیدل (انگریزی)، باب اول و دوم۔
۳۔ اصطلاحات الفنون، ص ۱۶۷ تا ۲۶۹۔

ہیں۔ اسی لیے اس خواب سے روح مرتضیٰؓ کا روح بیدل سے اتحاد نظر آتا ہے۔

ظاہر ہے ان سالوں میں حال بیدل کے قالب سے چھلک چھلک کر باہر نکل رہا تھا۔ انھی ایام میں بالکل اتفاقی طور پر ایک مردہ کنیز جسے رشتہدار رو پیٹ کر بیٹھ گئے تھے، بیدل کے ایک پُر جوش مکے سے زندہ ہو گئی اور دہلی کے لوگ ان کی یہ کرامت[1] دیکھ کر انہیں ابدال، غوث اور قطب کہنے لگے۔ احوال و کیفیات کے اس وفور سے نجات حاصل کرنے کے لیے انھوں نے فوج کی ملازمت اختیار کی تاکہ طبیعت کسی طرف مصروف ہو جائے اور اعتدال کی صورت پیدا ہو سکے، مگر جب شاہ زادہ اعظم شاہ نے قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی تو انھوں نے سمجھا، ایک اور مصیبت میں پھنس گئے۔ صبر اور مسلک کے خلاف مداحی کرنا ان کے لیے ناممکن تھا۔ ظہیر فاریابی اور انوری کے شاعرانہ کمالات کا اعتراف کرنے کے باوجود وہ ان کی قصیدہ گوئی کو کاسہ گدائی سمجھتے تھے اور اس پیشے سے سخت متنفر تھے۔ صوفی مسلک ترک سوال ہوتا ہے اور قصیدہ نگاری سرتا پا سوال اور گداگری تھی، اس لیے انھوں نے فوراً اعظم شاہ کی ملازمت[2] ترک کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس حال کو انھوں نے دبانا چاہا تھا، وہ زیادہ زور کے ساتھ ابھرا، جس کا ثبوت مندرجہ بالا انفسی اور آفاقی خواب ہے جو فوج سے مستعفی ہونے کے بعد انھوں نے اکبرآباد میں دیکھا۔

سطور بالا میں حسن ابدال کی طرف بیدل کے ایک سفر کا ذکر آیا تھا۔ اس سفر کا خاص طور پر ایک پہلو بیدل کی جامع شخصیت کو سمجھنے کے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ رستے میں ایک برہمن[3] ہم سفر ہو گیا۔ بڑا خوش اخلاق تھا اور بیدل بھی اخلاق عالیہ کی تصویر تھے، اس لیے جلد برہمن کا حسن اعتقاد محبت کی صورت اختیار کر گیا۔ رستے میں اس برہمن نے کہا "آپ کے پیغمبرؐ فرما گئے ہیں، قیامت آنکھ جھپکنے کی دیر میں آئے گی، لیکن ہم ہر روز ہزار بار آنکھ جھپکتے ہیں، مگر قیامت اب بھی بدستور دور ہی دکھائی دیتی ہے۔" اس برہمن کا مطلب یہ تھا کہ اسلام نے جو تصور زمان پیش کیا ہے، وہ بالکل ناقص ہے۔

۱- کلیات صفدری، چہار عنصر، ص ۱۳ -
۲- خوشگو، معارف، جولائی ۱۹۳۲ء -
۳- کلیات صفدری، چہار عنصر، ص ۱۸ -

زماں کے متعلق ہندوؤں کے تصور کو اس نے برتر بنایا اور کہا ''ہماری کتب عقیدہ میں قیامت کے متعلق ایک معین نظریہ موجود ہے ۔ ہمارے عقیدے کے مطابق چار 'جگ ہیں ۔ ان 'جگوں کے برابر دور ختم ہو جائیں تو برھما کی عمر کا ایک روز گزرتا ہے اور جب برھما کی عمر سو سال ہو جاتی ہے تو اُس کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ کائنات بھی ختم ہو جاتی ہے ۔ اب چوں کہ فطرت میں تسلسل موجود ہے ، اس کے حسب اقتضا ایک نیا برھما ظاہر ہوتا ہے جو از سر نو سلسلۂ کائنات شروع کر دیتا ہے ۔''

برہمن کی اس تقریر کو سن کر بیدل نے جواب دیا ''حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ایک بہت بڑی حقیقت نہایت ہی مختصر اور فصیح الفاظ میں بیان ہوئی ہے اور یہی حضورؐ کی فصاحت کا اعجاز ہے ! آنکھ جھپکنے کی دیر ، ایسے الفاظ ہیں جن کی حقیقت تک عام لوگوں کے ذہن نہیں پہنچ سکتے ۔'' بیدل نے برہمن کو بتایا کہ مسلماں جسے مرتبۂ وجوب کہتے ہیں وہ ہندو فلاسفہ کے نزدیک بشن کہلاتا ہے اور عقل کُل کو برہمن اہل فکر برھما کہتے ہیں۔ اب جس طرح برھما کی عمر کے طومار در طومار بشن کے لیے حقیر سے ایک لمحے کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتے ، اسی طرح عقل کُل کی حیثیت جس نے مسلم فلاسفہ کے خیال کے مطابق یہ نظام کائنات قائم کیا ہے ، ذات واجب الوجود کے سامنے بالکل صفر کے برابر ہے ، کیوں کہ ہزاروں ازل اور ابد وجوب کے پہلو میں ایک معمولی سی آن سے بھی زیادہ بے حقیقت ہیں۔ بیدل نے کہا آیت ''وما امر الساعۃ الا کلمح البصر'' وجوب کی زبان سے کچھ مدت کا ذکر استعارے کے طور پر کر رہی ہے لہذا ہم لوگ جو اس حدث سلسلۂ شب و روز کے پابند ہیں ، وقت کے اس دوران بے پایاں سے کیسے آشنا ہو سکتے ہیں ؛

چہ دانی رمز دریا چوں نداری گوش گردابی
کہ کار حار و خس نبود زبان موج فہمیدن

برہمن کی اپنی دلیل اس کی شکست کا موجب بنی ۔ بیدل کی محبت و شفقت نے اس کے دل کو پہلے نرم بنا ڈالا تھا ، چند مزید صحبتوں میں اس کے باقی شکوک اور اوہام بھی رفع ہو گئے اور وہ اسلام کی حقانیت کا دل و جاں سے قائل ہو گیا ۔

بیدل کا یہ مباحثہ ہماری آنکھوں کے سامنے کئی حقائق لا رہا ہے ؛ اولاً ایک سالک کی حیثیت سے بیدل کی شخصیت اس پائے کی تھی کہ غیر مذاہب کے

لوگ بھی حسن اعتقاد رکھتے تھے ۔ ثانیاً ، ان کے اخلاق میں وہ گہرائی تھی کہ معترض بھی اپنے بن جاتے تھے ۔ ثالثاً ، علم اتنا وسیع اور عمیق تھا کہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں تھا ۔ پہلی دو صفات انھوں نے اپنے خاندان اور بہار کے صوفیائے کرام سے حاصل کی تھیں اور علمی عقبیت زیادہ تر ان کی ذاتی کاوش اور دماغ سوزی کا نتیجہ تھی ۔ صوفیائے کرام کی صحبتوں میں رہتے ہوئے وہ مابعد الطبیعیات سے بھی آشنا ہوئے تھے اور جون پور کے قرب نے فلسفے اور منطق کے چرچے ان کے کانوں تک پہنچائے تھے ۔ ابن سیناؒ، غزالیؒ اور ابن العربیؒ[۱] کا مطالعہ دراصل اسی ابتدائی ذوق و شوق کی تکمیل کے سلسلے میں بعد میں کیا گیا تھا ۔ جہاں تک ہندوؤں کے علوم کا تعلق ہے ، انھیں تمام کی تمام مہابھارت ازبر تھی اور بہار میں رہتے ہوئے انھوں نے ایک مجذوب بزرگ شاہ ملوک کی زبان سے ایسے اشعار سنے تھے جن میں مسائل تصوف کو ویدانت کی اصطلاحات[۲] کے ذریعے بیان کیا گیا تھا ۔ ویدانت کی فکری گہرائی سے یہ تعارف بعد میں متھرا کے ماحول کی وجہ سے ان کے ذہن میں زیادہ گہرے نقوش کی صورت میں ابھرا ہوگا ، کیونکہ وہاں کرشن مہاراج کی شخصیت نے صدہا سال گزر جانے کے باوجود عجیب سوز و مستی کی کیفیت پیدا کر رکھی تھی ۔ 'چہار عنصر' میں لکھتے ہیں :[۳]

> ''در سوادکدۂ بلدۂ متھرا کہ سوادش از ہنگام وداع کشی داغیست سیاہی بروں انداختہ و ہوایش بہان وحشت آہی در تلاش مطلب نایاب رنگ تسکین باختہ ۔ سرشک کوپیان ہنوز از آب حسرت اش موج طوفان خیزیست و صدای بانسری تا حال از نی کوچہائش شعلہ آہنگ غبار انگیزی ۔''

یہ تاثرات ظاہر کرتے ہیں کہ بیدل کے نزدیک ہندوؤں کا ماضی خاصا روح پرور تھا ۔ جب اس گوشے سے انھیں دماغ اور دل ہر دو کی تربیت کے اسباب ملتے نظر آئے ، لازماً انھوں نے اس کی طرف زیادہ رجوع کیا ہوگا ۔ بیدل ایسے پر آرزو اور

۱۔ سیرت بیدل (انگریزی) باب اول و دوم ۔

۲۔ کلیات عبدری ، چہار عنصر ، ص ۱۴ ۔

۳۔ کلیات عبدری ، چہار عنصر ، ص ۶۰ ، ۲۵ ، ۱۱۰ ۔

بہت طالب علم سے بیزاری بہ موقع بے جا ہیں۔ لمبی وسیع مطالعے کا نتیجہ رہا کہ مذکورہ بالا برہمن کو انھوں نے دندان شکن جواب دیا۔ بیدل کے علم و فضل کا جائزہ لیتے ہوئے خوشگو کہتے ہیں:

''بالجملہ انتخاب از الٰہیات، ریاضیات و طبیعیات کم و بیش چاشنی بلند کردہ بود، و بہ طبابت و نجوم و رمل و جفر و تاریخ دانی و موسیقی بسیار آشنا بود۔ تمام قصۂ مہابھارت کہ در ہندیان ازان معتبر تر کتابی نیست یاد داشت۔''

علم نجوم، رمل اور جفر کے متعلق خود بیدل نے بھی کہا ہے کہ مشہور نسخوں سے صحیح احکام فراہم کر کے انھوں نے ایک کتاب ''تالیف الاحکام''[1] کے نام سے لکھی تھی۔

بہار کو خیرباد کہنے کے بعد بیدل نے جو وقت گزارا ہے، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ہم نے اب تک اپنی توجہ اس بات پر مرکوز رکھی ہے کہ ذہنی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے بیدل کس قدر آگے بڑھے تھے اور ان کی شخصیت کون سی وسعتوں کو اپنی آغوش میں جگہ دے رہی تھی۔ لیکن ہم نے اشارتاً بھی اس امر کا ذکر نہیں کیا کہ اس طویل مدت میں کون سے لوگوں کے ساتھ ان کا تعارف ہوا۔ عقاب کا نشیمن ہمیشہ بلندیوں پر ہوا کرتا ہے۔ اپنی غیرمعمولی صلاحیتوں کی بنا پر بیدل بھی عقاب تھے، اس لیے بالکل مختصر مدت میں فلک نشین ہو گئے۔ یہ مبالغہ نہیں، صرف ایک حقیقت کو بیان کرنے کے لیے ادبی چاشنی سے کام لیا گیا ہے۔ جب بیدل اول اول دہلی پہنچے ہیں تو نواب عاقل خاں رازی[2] شاہی غسل‌خانے کے داروغہ تھے۔ جوف واقع خراسان کے نامور سادات میں سے تھے اور دربار عالمگیری میں انھیں بڑا اعتماد اور اقتدار حاصل تھا۔ تدین، تصوف، شعر و شاعری اور اخلاق فاضلہ کے لحاظ سے بڑی شہرت کے مالک تھے۔ پتا چلتا ہے کہ عہد عالمگیری میں رومی کا مطالعہ بڑے شغف سے کیا جاتا تھا۔ عاقل خاں رازی بھی رومی کے اسرار پر پوری طرح حاوی تھے اور مثنوی معنوی

۱- کلیات صفدری، دیباچۂ رقعات۔

۲- مرأۃ الخیال، ص۹۰، ۲۸۸ - کلمات الشعرا، ص ۴ - مآثر عالمگیری، ص ۳۰، ۳۷، ۴۷، ۴۸ - مآثرالامرا، جلد دوم، ص ۳۲، ۸۲۱ -

کے نمونے پر ایک مثنوی 'مرقع' کے نام سے لکھی تھی ۔ شاہ برہان الدین راز الٰہی کے مرید تھے ، اس لیے تخلص رازی تھا ۔ سنہ ۱۰۷۲ھ میں عالمگیر سے اجازت لے کر لاہور میں معتکف بھی رہے تھے ۔ فطرت کی اس مناسبت کی بنا پر مردم شناس نواب دو ایک مشاعروں میں بھانپ گئے کہ پورب سے آیا ہوا یہ نوجوان غیر معمولی شخصیت اور قابلیت رکھتا ہے ۔ خوشگو کا بیان ہے کہ بیدل کے تمتہٗ پیشانی پر جمیع کمالات انسانی مرتسم تھے ، اس لیے دیکھنے والی نگاہیں فوراً ان کی عظمت کی معترف ہو جایا کرتی تھیں ۔ بیدل سنہ ۱۰۷۶ھ میں دہلی میں نظر آتے ہیں اور سنہ ۱۰۷۹ھ میں مختصر سے وقت کے لیے وہ فوج میں ملازم ہوئے ۔ ملازمت سے پہلے وہ شاہزادہ اعظم کے ایک درباری ایزد بخش رسا سے ملے ۔ رسا نے اپنے تاثرات اس معنی خیز فقرے میں قلم‌بند کیے ہیں[1] :

''بیدل ہمہ دل را دیدم''

ایک اور موقع پر انھوں نے اپنے رقعات میں پورب کے اس نوجوان کو بیدل سراپا دل[2] بھی کہا ہے ۔ خوشگو اور رسا کے بیانات کو پہلو بہ پہلو رکھ کر عالم تصور میں بائیس تیئیس برس کے بیدل کو دیکھا جائے تو عاقل خاں رازی کا ان سے متاثر ہونا تعجب انگیز نظر نہیں آتا ۔ یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ عاقل خاں رازی ان صوفیوں میں سے نہیں تھے جن کا قلب تصوف کے معمولی سے تذکرے سے مرتعش ہو جایا کرتا ہے ۔ خود آگاہی کا وہ عالم تھا کہ کسی درباری کو خاطر میں نہیں لاتے تھے ۔ اور صاحب مآثر الامرا ان کے متعلق لکھتے ہیں[3] :

''ملازمت بہ لیختر می‌کرد''

بیدل کے رقعات اور قطعات ، اور خوشگو کے بیانات عاقل خاں رازی اور بیدل کے تعلقات پر کافی روشنی ڈالتے ہیں ۔ یہ تعلقات اس وقت ختم ہوئے جب سنہ ۱۱۰۸ھ میں عاقل خاں رازی وفات پا گئے ۔ بیدل نے اپنی مثنوی 'محیط اعظم' چوبیس سال کی عمر میں سنہ ۱۰۷۸ھ میں مکمل کی ۔ بیدل کے ایک رقعے سے پتا چلتا ہے کہ یہ مثنوی اور اپنی منتخب غزلیات انھوں نے عاقل خاں رازی کو حوالہ

۱- رقعات ایزد بخش رسا ، ق ، صفحہ ۲ الف و ۲ ب و ۳ الف ۔

۲- ایضاً ۔

۳- مآثر الامرا ، جلد دوم ، ص ۸۲۱ ، ۸۳۲ ۔

کیں ۔ سنہ ۱۰۸۰ھ میں بیدل نے اپنی مثنوی 'طلسم حیرت' لکھی جسے نواب صاحب موصوف کے نام پر معنون کیا ۔ آپس میں ملاقات کا سلسلہ بھی تھا جو انجام کار باقاعدہ ہفتہ وار ملاقات کی صورت اختیار کر گیا ۔ خوشگو لکھتے ہیں[۱]:

''حضرت میرزا بیدل از صحبت وی این ہمہ سامان استادی و تصوف بہم رسانید و ہرگاہ شعر میرزا را احسنت و تحسین می فرمود ، میرزا برمی‌خواست و تسلیم بجا می آورد ۔ این معنی از روی حرمت و بزرگی بود ، نہ از راہِ شان امارتش ۔''

تعلقات جس بنیاد پر قائم تھے، یہ بیان اس کی توضیح کے لیے کافی ہے ۔ عاقل خان رازی کی تعریف میں بیدل کا ایک قطعہ موجود[۲] ہے ۔ اس قطعے کا مندرجہ ذیل مصرع بتاتا ہے کہ بیدل کی نواب صاحب کے متعلق کیا رائے تھی ۔ یہ مصرع اس نازک مزاج مغل زادے اور بلند مشرب صوفی کا ہے جس نے ممنونِ احسان ہونے کے باوجود شاہزادہ اعظم شاہ کی تعریف میں قصیدہ نہیں لکھا تھا اور ملازمت سے مستعفی ہونا انسب سمجھا ۔ عاقل خان رازی کی صفات بیان کرتے ہوئے بیدل لوگوں کو ترغیب دیتے ہیں :

''دیدہ بکشائید و طوف حضرت انسان کنید''

یعنی ان کے خیال کے مطابق عاقل خان رازی ایسے انسان کامل تھے جن کی ذات بشری کمالات کا بے نظیر پیکر تھی اور اس لیے ایسے انسان کا طواف ہر ایک پر واجب تھا ۔

لیکن عاقل خان رازی نے بیدل کو جو کچھ سمجھا ، اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے اس احترام کا بغور ملاحظہ کیا جائے ، جس کے ساتھ اورنگ زیب عالمگیر بیدل کا ذکر اپنے رقعات میں کرتے ہیں ۔ وہ شہنشاہ جو شعرا کو چنداں درخور اعتنا نہیں سمجھتا تھا ، اپنے عہد کے ایک جوان سال شاعر کے اشعار دوسروں کو نصیحت دینے کے لیے اپنے رقعات میں درج کرتا ہے ۔ مظلوموں کی دادرسی کے لیے بیدل کا یہ شعر لکھا ہے[۳] :

۱- خوشگو ، معارف ، جولائی ۱۹۳۲ع -
۲- کلیات صفدری ، قطعات ، ص ۵۷ -
۳- رقعات عالمگیری - ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے ایک مخطوطے میں یہ شعر بیدل سے منسوب ہے ، حقیقتاً سعدی کا ہے -

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از در حق بہر استقبال می آید

قناعت کا درس ان کے اس شعر سے دیا ہے[۱] :

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب معاش
آنچہ ما درکار داریم اکثری درکار نیست

اور بیدل کے اس شعر سے اعظم شاہ کو سہل انگاری اور سستی ترک کرنے کو کہا ہے :

می تمی گویم زیاں کن یا بفکر سود باش
ای ز فرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

اورنگ زیب عالم گیر ۱۰۹۰ھ میں دہلی سے راجپوتانہ گئے اور وہاں سے دکن چلے گئے اور بقیہ عمر مرہٹوں کی سرکوبی میں بسر کر دی ۔ دہلی کو واپسی کا تو پھر موقع ہی نہ ملا اور نہ بیدل دکن گئے ۔ لازماً اورنگ زیب سنہ ۱۰۹۰ھ سے پہلے بیدل سے متعارف ہو چکے ہوں گے ۔ اب براہ راست تعارف کا بھی کوئی ثبوت ہمارے پاس موجود نہیں ۔ ہاں عاقل خان رازی اورنگ زیب کے ایام شاہزادگی سے معتمد[۲] تھے اور جب وہ دکن گئے تو شاہ جہاں آباد کی حکومت انہی کے سپرد کر گئے ۔ چوں کہ اورنگ زیب عالم گیر بھی فقیر منش تھے ، عاقل خان رازی نے بیدل کے ورودِ دہلی کے بعد ان کے فقر اور ان کی متصوفانہ شاعری کو دیکھ کر اورنگ زیب عالم گیر سے ذکر کیا ہوگا کہ ہمارے اپنے عہد نے ایک اعلیٰ درجے کا صوفی شاعر پیدا کیا ہے جو رومیؒ ، سنائیؒ اور عطارؒ کی صف میں نظر آتا ہے ۔ بنابریں قیاس یہ کہتا ہے کہ عالم گیر کا احترامِ بیدل عاقل خان رازی کے خیالات کی ترجمانی کر رہا ہے ۔

عاقل خان رازی کے علاوہ بیدل کے روابط ان کے سارے خاندان[۳] سے قائم ہوگئے اور محض ہم‌مشربی کی بنا پر نواب شکراللہ خان خاکسار عاقل خان رازی

۱- رقعات عالم گیری ، ص ۲۷ ، ۳۶ -
۲- عاقل خان رازی کے متعلق حوالہ‌ہائے ماسبق ۔
۳- رقعات بیدل ، کلیات مقدری ، قطعات ۔ خوشگو ، معارف ، مئی و جولائی ۱۹۳۲ع -

کے داماد تھے ۔ وہ صوفی‌منش ، علم‌دوست اور سخن‌گو تھے اور اہل‌علم میں رومی کے شارح کی حیثیت سے مشہور تھے ۔ اس لیے جو ذہی الروز ، محبت آمیز اور روح پرور تعلقات بیدل کے ان کے ساتھ شروع ہوئے ، وہ تاریخ ادب میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے نظیر ہیں ۔ مثنوی معنوی کی تصنیف میں مولانا روم اور حسام‌الدین کا اشتراک پوری تفصیلات کے ساتھ ہماری نگاہوں کے سامنے نہیں ، مگر سادات خواف کے ساتھ بالعموم اور نواب شکراللہ خاں کے ساتھ بالخصوص جو خوش عقیدگی پیدا ہوئی اور جو عمق خلوص امتداد زمانہ کے ساتھ بڑھتا چلا گیا ، اس نے بیدل کی تخلیقات میں حسن ، معنویت اور ایک مثبت قسم کا تیقن پیدا کر دیا ۔ عاقل خاں رازی کے بیٹے قیوم خاں فدائی اور نواب شکراللہ خاں کے تینوں فرزند لطف اللہ خاں ، شاکر خاں اور کرم اللہ خاں بھی اُن کے نیازمند تھے ۔ بیدل کے رقعات کی تعداد ۲۷۳ ہے اور ان میں سے ۲۰۷ سادات خواف کے ان افراد کے نام ہیں ۔ بیدل کے متعدد قطعات اور ان کی بہت سی رباعیات بھی ان لوگوں سے متعلق ہیں۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدل بھی اس گھرانے کے ایک معزز رکن تھے، یا یہ کہ بیدل کا کنبہ پھیل کر سادات خواف تک محیط ہو گیا تھا ۔ یہ یگانگت اور محبت بیدل کی وفات تک قائم رہی ۔

شاہ جہاں آباد میں مستقل طور پر اقامت‌گزیں ہونے سے پہلے بیدل کے تعلقات اور بھی کئی قابل ذکر لوگوں سے پیدا ہو گئے ۔ اکبر آباد میں جمدۃالملک جعفر خاں کے بیٹے کامگار خاں[1] ان کے قدر داں تھے ۔ انھی ایام میں انھوں نے مولانا عبدالعزیز عزت[2] کی شاگردی اختیار کی ۔ مولانا علم و فضل کے اعتبار سے سعداللہ خاں علامی کے پائے کے انسان تھے ۔ شہنشاہ انھیں کوئی ممتاز عہدہ دینا چاہتے تھے مگر مولانا عین اس وقت وفات پا گئے جب سب کچھ طے پا چکا تھا ۔ اعظم شاہ کی سرکار میں بیدل کا کئی شعرا سے بھی تعارف ہوا ۔ ان میں سے شیخ

۱- رقعات بیدل ، ص ۸۷ - کلیات صفدری ، قطعات ، ص ۵۱ - خوشگو ، معارف ، مئی ۱۹۳۲ع -

۲- رقعات بیدل ، ص ۶۰ ، ۸۰ ، ۹۷ ، ۹۱ - کلیات صفدری ، قطعات ، ص ۴۷ ، ۵۰ ، ۵۱ -

سعداللہ[1] گلشن بھی شامل ہیں - یہ تمام شعرا آخر دم تک بیدل سے وابستہ رہے -

بیدل ۲۷ جمادی‌الآخر سنہ ۱۰۹۶ھ کو اہل و عیال سمیت[2] دہلی میں مستقل اقامت کے لیے متھرا سے وارد ہوئے - نواب شکراللہ خان نے بہت جلد چھ ہزار روپے سے ایک حویلی[3] خرید دی ، جہاں بیدل نے بقیہ عمر بسر کی - نواب صاحب نے دو روپے یومیہ مقرر کر دیا جو انہیں تا دم مرگ ملتا رہا - یہ وہ زمانہ تھا جب کہ شاہ جہان آباد میں بہترین کاری گر کو پانچ آنے اجرت ملا کرتی تھی اور 'تاریخ مشائخ چشت' میں خلیق احمد نظامی ، شاہ کلیم اللہ[4] جہان آبادی (۱۰۶۰ھ تا ۱۱۴۲ھ/۱۶۵۰ع تا ۱۷۲۹ع) معاصر بیدل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب دو روپے ماہوار میں گھر کا خرچ چلاتے تھے - ظاہر ہے ، یہی یومیہ بیدل کی آسودہ حالی کے لیے کافی تھا - طبعت کی آمدنی اس پر مستزاد تھی - ان کی بنائی ہوئی مختلف قسم کی حبوب دہلی میں خوب فروخت ہوتی تھیں - علاوہ بریں اگرچہ ان کی طبیعت میں حد درجے کا استغنا تھا ، مثال کے طور پر امیرالامرا حسین علی خان بارہہ نے کئی لاکھ روپے[5] بڑے نیازمندانہ طور پر پیش کیے ، مگر انہوں نے بڑی حکمت عملی سے کام لے کر لوٹا دیے - تاہم امرا کی طرف سے آئے ہوئے نذرانے وہ قبول بھی کر لیا کرتے تھے - یہ نذرانے وہ کئی دفعہ اوروں کو عطا کر دیا کرتے تھے - مثلاً نواب ذوالفقار خان کی بھیجی ہوئی دو سو[6] اشرفیاں نواب کرم‌اللہ خان کو عنایت کر دیں اور نواب لطف اللہ خان کا بھیجا ہوا ایک لاکھ روپیہ ایک تباہ حال[7] کابلی تاجر کو عطا کر دیا - ان نذرانوں میں سے بعض وہ اپنے گھر میں بھی استعمال کر لیا کرتے تھے ، بالخصوص روزمرہ کی ضروریات کے لیے - کچھ قناعت اور سیر چشمی کی برکت

۱- خوشگو ، معارف ، ۱۹۳۲ع -
۲- رقعات بیدل ، ص ۹۳ -
۳- خوشگو ، معارف ، مئی ۱۹۳۲ع -
۴- تاریخ مشائخ چشت ، ص ۳۸۷ -
۵- مجموعۂ نغز ، ص ۱۱۷ -
۶- کلیات مصدری ؛ قطعات ، ص ۴۴ - خوشگو ، معارف ، مئی ۱۹۳۲ع -
۷- محمد حسین آزاد ، نگارستان فارس -

تھی اور کچھ یہ فراخ تھے ، اس لیے دہلی میں بسر اوقات خاصی خوش حالی سے ہوتی رہی ۔ اسی بنا پر بڑے کھلے دل سے خیرات کیا کرتے تھے ۔ لڑکا عبدالخالق پیدا ہوا تو بڑے صدقات[1] دیے ۔ زندگی کے آخری ایام میں اپنا ''کلیات چہار مصرع'' لکھوایا تو چودہ سیر وزنی تھا ۔ اس کے برابر زر و جواہرات فال نیک کے طور پر خیرات کیے ۔

کلیات کو ایک پلڑے میں اور زر و جواہرات کو دوسرے پلڑے میں رکھوکر تلوایا تھا ۔ میر جعفر زٹلی نے ایک بار ان کا قصیدہ مدحیہ پڑھنا چاہا مگر دو اشرفی[2] دے کر ٹال دیا ۔ علاوہ بریں اپنا کلام نقل کرانے کے لیے انہوں نے منشی[3] مقرر کیے تھے۔ یہ تمام باتیں ان کی فیاض طبعی اور مرفہ‌الحالی کا ثبوت ہیں۔

پارۂ مافوق میں بیدل کی معاشی حوائج کا ذکر کیا گیا ہے ، لیکن ہم اس بات کو ثانوی حیثیت نہیں دینا چاہتے کہ بیدل کا دہلی میں مستقل طور پر ورود کیا معنی رکھتا تھا ، اس لیے یہاں ذرا رک کر ہم دیکھیں گے کہ متھرا سے جب وہ دہلی وارد ہوئے تو کس شخصیت کے مالک تھے ۔ ان کی شخصیت ہی ان کے ورود کی اہمیت کو اچھی طرح تشریح کر دے گی ۔

اس وقت ان کی عمر قمری حساب سے پورے ۴۲ سال تھی ۔ پختگی کا زمانہ تھا ۔ بچپنے سے دل کی صفائی کی طرف پورے انہماک سے دھیان دیا تھا اس لیے باطن نہایت ہی پاکیزہ تھا اور اخلاق ہر طرح عفتِ قلبی کی عکاسی کرتے تھے ۔ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہوکر محبت الٰہی کو اپنی تمناؤں کا مرکز بنایا تھا ۔ اس لیے رگ رگ نشۂ توحید سے معمور تھی اور نگاہ مئے توحید سے مخمور ۔ زبان سے جو لفظ نکلتا تھا ، توحید کی گرمی سے تفسیدہ ہوتا تھا ۔ علم معرفت روح کی غذا تھی اور علم ظاہری بھی (کتب سے ملا ، ارباب حال سے یا سیر و سیاحت سے ، کتب ہنود اس کا سرچشمہ نظر آئیں یا مسلم اہل فکر کی تصنیفات) انھوں نے بڑے ذوق و شوق سے حاصل کیا ۔ ان تمام امور کی بنا پر نظر کی گہرائی ، باطن کی پاکیزگی اور دل کی تپش اب ان کی ذات میں بدرجۂ اتم موجود تھی ۔

۱۔ خوش گو ، معارف ، مئی ۱۹۳۲ع ۔
۲۔ ایضاً ۔
۳۔ ایضاً ۔

حقائق عالم کے متعلق متقدمین نے جو موشگافیاں کی تھیں ، ان سے پوری طرح آگاہ تھے اور حال کی بہ دولت یہ معلومات خود آگہی کی ایک نادر صورت اختیار کر چکی تھیں ۔ انسان کا مقصد آفرینش اور کائنات میں اس کا مقام اب ان کی نگاہوں کے سامنے واضح تھا اور وہ اپنی پوری استعداد اور ساری باطنی قوت اس حقیقت کو واشگاف طور پر بیان کرنے کے لیے صرف کرنا چاہتے تھے ۔ اپنے عہد نے ان کے نصب العین کی تعمیر میں قابل قدر حصہ لیا تھا ۔ شاہ جہاں کے حسرت ناک انجام اور دارا شکوہ کی الم ناک موت نے انہیں زیادہ شدت کے ساتھ اس بات کا احساس دلایا تھا کہ انسان کا منتہائے مقصود ہمیشہ اپنی حقیقت کو اپنے وجود میں اجاگر کرنا ہونا چاہیے ۔ شعر گوئی جیسے ہی سے ان کا ذریعۂ اظہار تھا ۔ پھر اساتذۂ فارسی کے کلام سے استفادہ کرکے اپنے زمانے کے اہل کمال کے سامنے زانوے تلمذ تہ کرکے اور بہار چھوڑنے کے بعد تازہ گو شعرا کے دواوین کو دیکھ کر انھوں نے اپنے اسلوب میں پختگی پیدا کرلی تھی اور وفور احساسات و جذبات کی بنا پر اور اپنے قوی معتقدات کی وجہ سے نئے سے نئے مطالب بیان کرنے کے لیے اب زبان دری میں وہ اجتہاد سے بھی کام لے رہے تھے ۔ بیدل کی غیرمعمولی شخصیت اور سیرت کے متعلق ان تصریحات کے بعد آپ ان کے نکتہ رس ہندو شاگرد بندرابن داس خوش گو کا بیان پڑھ لیں ۔ خوش گو وہ بالغ نظر انسان ہے جس نے اپنے عہد کے ہزاروں ثقہ آدمی دیکھے تھے ، جس کا ثبوت ان کا مشہور و معروف سفینہ ہے ۔ کہتے ہیں[1] :

> ''قسم بجان من کہ فقیر درین مدت عمر بہ جامعیت کمالات ، حسن اخلاق ، بزرگی و ہمواری ، شگفتگی و رسائی ، تیز فہمی و دور رسی ، و انداز سخن گفتن و آداب معاشرت ، حسن سلوک و دیگر خصائل انسانی ہمچو وی ندیدہ ام ۔''

ان غیر معمولی صفات کا انسان جب دہلی پہنچا تو لازماً بہت جلد تمام کی توجہ کا مرکز بن گیا ۔ دہلی میں اس وقت اور بھی صاحب کمال موجود تھے ؛ مثلاً طریقت کے بدرمنیر حضرت شاہ کلیم اللہ[2] جہاں آبادی لال قلعہ اور

۱- خوشگو ، معارف ، بابت ماہ مئی ۱۹۳۲ء -
۲- تاریخ مشائخ چشت ، ص ۳۶۶ تا ۳۷۶ -

جامع مسجد کے درمیان بازار خانم میں ایک بے قرار اور بے چین قلب اور بے نظیر تحصیلِ علمی کے ساتھ سلسلۂ چشتیہ کی اشاعت، تبلیغ اسلام اور درس و تدریس میں معروف تھے، اور ان کے مبارک اثرات ہند کے گوشے گوشے میں پھیل رہے تھے۔ بیدل کی راہ ذرا الگ تھی؛ وہ بھی دراصل فقرا کی سلک کا ایک انمول موتی تھے اور کامل صوفی ہونے کے علاوہ اقلیم سخن کے تاج دار بھی تھے اور شعر و سخن کے ذریعے اپنے عہد کے غلط کار اور کج اندیش خواص اور عوام کو اعلیٰ اساسی اقدار سے آشنا کرنا چاہتے تھے۔

بیدل کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی ہے جس کی طرف توجہ دینا اشد ضروری ہے۔ مغل زادے تھے اور ارلاس قبیلہ تھا۔ ارلاس لغت میں عقل تاسع کو کہتے ہیں۔ ممکن ہے مورث اعلیٰ غیرمعمولی عقل و فہم کا مالک ہو اور اسی لیے یہ نام مشہور ہو گیا ہو۔ چنگیز خان کے زمانے سے مغل مقتدر چلے آتے تھے۔ بالخصوص اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کے جاہ و جلال نے تو ہندوستان میں رہنے والے مغلوں کو اپنے متعلق عجیب و غریب گن میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس لیے انانیت جس کے عناصر ذکاوت حس اور اشتعال پذیری ہوا کرتے ہیں، بیدل کو ورثے میں ملی تھی۔ مغلوں کی اس صفت کا نام اہل ہند نے میرزائیت رکھا ہوا تھا۔ پھر تربیت جسمانی کی طرف مسلسل توجہ دینے کی وجہ سے بیدل بڑے شہ زور بھی تھے۔ ایک دفعہ جب وہ شاہزادہ اعظم شاہ کی سواری کے ساتھ[1] جا رہے تھے تو ایک شیر اچانک جنگل سے نکل کر حملہ آور ہوا اور اس نے کئی آدمیوں کو ہلاک کر ڈالا۔ یہ دیکھ کر بیدل تب آگے بڑھے اور شیر کا کام تمام کر دیا۔ ان کے اس اظہار شجاعت سے شہزادہ بے حد متاثر ہوا تھا۔ شہ زوری اور شجاعت نے بھی ان کے دل میں جذبۂ انانیت کی پرورش کی۔ اگرچہ اس قوت جسمانی نے ان کے کلام میں بھی توانائی پیدا کی اور لگاتار چار چار ہزار بیٹھکیں نکالنے اور کشتی لڑنے میں کسی کو مدمقابل نہ پا کر توسند[2] اصیل گھوڑوں سے پنجہ آزمائی نے انھیں اس قابل بھی بنا دیا تھا کہ تکان محسوس کیے بغیر متواتر شب و روز ذہنی کاوشوں میں لگے رہتے تھے۔ لیکن

١- گلشن ہند، محمد علی لطف میرزا، ص ٦٣ -

٢- خوش گو، معارف، مئی ١٩٣٢ع -

اس جوہر نے ان کی میرزائی اور بیباکی میں بھی بڑا اضافہ کیا تھا ۔ مزید برآں علمی اور روحانی کامرانیوں نے بھی اس جذبے کو بڑی تقویت بخشی ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تصوف نے ان کی طبیعت میں خاکساری ، انکساری اور ہمواری کو راسخ کر دیا تھا ، مگر جب کبھی ان کے جذبۂ خود داری کو ٹھیس لگتی یا لوگ گھٹیا افعال کے مرتکب ہوتے تو ان کے پہلو میں غم و غصہ اور نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہوتے تھے اور ان کی میرزائیت فوراً بروئے کار آ جاتی تھی اور پھر جو کچھ ہونا ہوتا تھا بڑی عجلت اور بے باکی سے کر گزرتے تھے ۔ اپنے ایک مقطع میں کہتے ہیں :

با کمال سرکشی بیدل تواضع طینتم
ہمچو زلف یار می‌نازد بما افتادگی

یہاں اپنے کمال سرکشی کو تواضع اور افتادگی کے پردے میں چھپانا چاہتے ہیں ۔ لیکن ان کی زندگی میں کئی مواقع ایسے آئے جب انہوں نے انتہا درجے کی سرکشی کا اظہار کیا ۔ ان حقایق سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ یہ موروثی جذبہ بھی پھلتا پھولتا رہا تھا ۔

بیدل کی اشتعال پذیری اور سرکشی کے سلسلے میں صرف ایک واقعے پر اکتفا کیا جاتا ہے ؛ ایک روز وہ نظام‌الملک آصف جاہ کے گھر[1] میں تشریف رکھتے تھے ۔ نظام‌الملک ان کے شاگرد بھی تھے اور معتقد بھی ۔ اچانک وہاں میرزا محمد امین خاں آ گئے جو بڑے سنگ دل تھے اور تاریخ میں امیرالامرا حسین علی خان بارہہ کے قاتل کی حیثیت سے مشہور ہیں ۔ میرزا صاحب نے جب نظام‌الملک کو ہمہ تن احترام دیکھا تو پوچھا ''یہ کون ہیں ؟'' جب انہیں بتایا گیا کہ حضرت بیدل ہیں تو متعجب ہو کر کہنے لگے ''انہیں آپ ولی اللہ کہتے ہیں ، حالاں کہ ڈاڑھی اور مونچھیں بالکل صاف ہیں ؟'' حقارت آمیز کلمہ تھا اس لیے بیدل فوراً مشتعل ہو گئے اور فرمایا :

''ریش خود می تراشم دل کسی نمی خراشم''

اس میں نشتر موجود تھا کہ بے ریش ہوتے ہوئے ہر معترض ہونے والے اخلاق عالیہ سے ایسے بے بہرہ ہیں کہ اپنی گفتگو سے دوسروں کے دلوں کو زخمی کرنے سے

۱- مجموعۂ نغز ، ص ۱۱۸ ، تذکرۂ حسینی ، ص ۷۵ ۔

نہیں چوکتے ۔ اس پر میرزا محمد لیں خاں بگڑ گئے اور خنجر کو سنبھالا ۔ بیدل بھی مٹھیاں بھینچ کر تن گئے اور حملے کے لیے آٹھ پڑے ، مگر نظام الملک نے بیچ بچاؤ کرکے معاملہ رفع دفع کر دیا ۔ ان تمام باتوں کے باوجود ہم جناب بیدل سے بالکل متفق الرائے ہیں کہ ان کی تواضع طبیعتی ان کے کمال سرکشی پر پوری طرح غالب تھی اور ان کی طویل اور واقعات سے لبریز زندگی میں سرکشی کے صرف دو چار واقعات 'النادر کالمعدوم' کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

شاہ جہان آباد کے مستقل قیام نے بیدل کو مغلوں کی معاشرتی زندگی سے پوری طرح آشنا ہونے کے مواقع بہم پہنچائے ۔ بہار میں سنی سنائی باتیں ان کے کانوں تک پہنچتی تھیں ۔ اکبر آباد بھی مغلوں کا ایک اہم صدر مقام تھا ، مگر مغل مزاج صحیح معنوں میں صرف شاہ جہان آباد کی فضاؤں میں نگاہوں کے سامنے آ سکتا تھا ۔ متھرا ہندو معتقدات کی گہرائی کا احساس تو دلا سکتا تھا ، لیکن مغل معاشرت کا رنگ وہاں بڑا پھیکا تھا ۔ اکبر آباد ، دہلی اور متھرا میں کوئی بیس سال تک آتے جاتے رہنے کی وجہ سے اقتدار مطلق سے سرشار مغلوں کے متعلق انھوں نے بہت کچھ معلومات حاصل کر لی تھیں اور اسی لیے ان کے وجود کا 'رواں 'رواں بزبانِ حال پکار رہا تھا :

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از درِ حق بہر استقبال می‌آید

مگر اب تو وہ شاہجہاں آباد میں رہتے تھے جو شہر مغل تمدن کا نقطۂ عروج تھا ۔ اب وہ کنارے پر بیٹھ کر امواج کا نظارہ نہیں کرتے تھے ، بلکہ عین قعرِ دریا میں امواج کے تھپیڑے کھا رہے تھے ۔ ان کے تعلقات عوام کے ساتھ بھی تھے اور خواص کے ساتھ بھی ۔ وہ اپنی حری فطرت کی بنا پر اس بات کے قائل تھے کہ سیلاب کو مردانگی سے سر کرنا چاہیے ۔ اس لیے مغل دارالسلطنت کو جب انھوں نے کئی اخلاقی اور فکری امراض میں مبتلا دیکھا تو ان کے تدارک کے لیے بڑی دلیری اور بے باکی سے کمر بستہ ہو گئے ۔ انھوں نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ ایک حکیم کی نگاہ سے لیا اور ایک پیغمبر کے انداز سے اپنے ہم عصروں کی اصلاح کا عزم اپنے دل میں پیدا کیا ۔ انھوں[1] نے دیکھا کہ زر اندوزی

۱۔ اس کے لیے بیدل کی شہر آشوب غمسات کا مطالعہ کیا جائے ۔ نیز ان کی
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کا خبط ہر دل میں موجود تھا ۔ بہترین انسانی صلاحیتیں حصول مال و زر کے لیے وقف ہو چکی تھیں ۔ ہر شخص محلات کی تعمیر کے خواب دیکھ رہا تھا اور چہتا تھا کہ صاحب حشم و جاہ بن جائے ۔ اس کی ڈیوڑھی پر نقارہ بج رہا ہو اور نام و نگین اس کے لیے وقف ہو چکا ہو ۔ مفلس اور نادار لوگوں کا کوئی ہم درد نہ تھا ۔ ہر ایک ان کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینا چاہتا تھا تاکہ اس کے محل کے در و دیوار زیادہ رنگین نظر آئیں ۔ خود غرضی ، خود بینی ، نخوت اور غرور و تکبر کا دور دورہ تھا ۔ حق پرستی اور دین پروری کا کسی کو ذرا بھر خیال نہ تھا ۔ خال خال حق شناس لوگ موجود تھے ، مگر ان کا وجود صرف اس بات کا اعلان کر رہا تھا کہ انسانوں کا سخت قحط پڑ چکا ہے اور تن پرستی ، عیش کوشی اور نفس پروری روز افزوں ہے ۔

جب سنہ ۱۱۱۸ھ میں اورنگ زیب فوت ہوئے تو وہ روح بھی رخصت ہوگئی جو اس مضمحل ، معطل اور بےکار معاشرے میں کم و بیش جنبش کا موجب تھی ۔ جہاندار شاہ کے عہد میں جب نفس پرستی اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور میرزا تان سین کی اولاد میں سے ایک چھوکری لعل کنور[۱] ملکۂ عالم بنی تو کلاونت لوگ ہفت ہزاری اور پنج ہزاری عہدوں پر ممتاز ہوگئے اور وہ اودھم مچا کہ الاماں والحفیظ ۔ بیدل نے شاہ جہاں کے عہد میں مسلمانوں کی سطوت کو اپنے کمال پر دیکھا تھا اور پھر انھوں نے وہ ایام بھی دیکھے جب مسلمانوں کے اردگرد آفاق کی حدود سمٹتی چلی جا رہی تھیں ، اور مسلمان لوگ ہندو جاٹوں اور مرہٹوں کے ہاتھوں رسوا اور ذلیل ہو رہے تھے ۔ جہاں دار شاہ کے زمانے میں بیدل نے یہ بھی دیکھا کہ تخت طاؤس کا مالک مغل شہنشاہ ، جس کے اجداد کا نام سن کر بڑے بڑے فرعون طبع لوگ کانپ اٹھتے تھے ، ہوس پرستی کی خاطر دہلی کے بازاروں اور میخانوں میں آوارہ گردی کر رہا تھا ۔ ماضی اور حال کے درمیان اس تضاد کو دیکھ کر وہ سخت افسردہ ہوئے اور انھوں نے بہ صد تاسف کہا :

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

غزلیات کے ان اشعار پر غور کیا جائے جن میں وہ اپنے عہد کی سیاسی زندگی کا ذکر کرتے ہیں ۔

۱- منتخب اللباب ، جلد دوم ، ص ۷۱۵ تا ۷۲۸ ۔

ز بی معری شکوہ سلطنت شد تنگ کسّاسی
بجای استخوان گُہ خوردہ می گردد ہما اینجا

'شکوہ سلطنت' کی ترکیب شاہ جہان اور اورنگ زیب عالم گیر کی حشمت و شوکت کے مناظر نگاہوں کے سامنے لا رہی ہے اور 'بے معزی' اور 'تنگ کتاسی' کے الفاظ جہاندار شاہ اور لعل کنور کو دہلی کے بازاروں میں گھومتے ہوئے دکھاتے ہیں۔

مندرجہ بالا حقائق سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغل معاشرہ نیچے سے لے کر اوپر تک مکمل طور پر بگڑ چکا تھا۔ ان‌دنوں حالات کوئی بھی صاحب بصیرت انسان خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ بیدل کی معنوی زندگی جس معنویت سے لب ریز تھی وہ کس طرح اس غلط کار اور گمراہ معاشرے سے ہم آہنگ رہ سکتی تھی؟ چنان چہ اپنے خارجی ماحول سے ایسے متصادم ہونا پڑا اور اسی تصادم نے انہیں ان بلندیوں پر پہنچایا جو ہر شاعر کو نصیب نہیں ہو سکتیں۔ ان کے شاعرانہ کمالات میں زیادہ درخشندگی پیدا ہوئی اور ان کے افکار زیادہ روح پرور اور حیات آفریں بن گئے۔

بیدل کے اس طویل قیام دہلی کے دوران میں حصول تاج و تخت کے لیے تین جنگیں لڑی گئیں؛ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات پر، بہادر شاہ کے فوت ہونے پر اور تیسری جہاں‌دار شاہ اور فرخ سیر کے درمیان۔ علاوہ بریں فرخ سیر کو قتل کرانے کے بعد سادات بارہہ نے دو تین سال کے لیے ایک مسلسل خلفشار بھی پیدا کیا۔ بالخصوص دہلی میں رہنے والوں کو اس قسم کے انقلاب انگیز ہنگامے خوف و خطر سے کیسے محفوظ رہنے دیتے تھے۔ ایک بار تو مقتول فرخ سیر کی تاریخ وفات[1] کہنے کی وجہ سے خود بیدل کو بھی جان کے لالے پڑ گئے اور وہ بھاگ کر نواب عبدالصمد خان صوبے دار لاہور کے ہاں پناہ گزیں ہوئے۔ علاوہ ازیں سادات خواف، جن کے ساتھ انہیں بے حد وابستگی تھی، ان جنگوں میں کسی نہ کسی فریق کی طرف سے شریک ہوتے تھے اور پھر بیدل کو ان کی وجہ سے سخت متفکر رہنا پڑتا تھا۔ بیدل کے اور بھی کئی تعلق دار اور مخلص احباب تھے، وہ بھی بہ امر مجبوری ان جنگوں میں حصہ لیتے تھے۔ ان کی وجہ سے بھی ان کے اوقات تلخ ہو جاتے تھے۔ طویل عرصے تک مسلسل پریشانی سے دو چار رہے اور قتل و

۱- سرو آزاد، ص ۱۴۹ -

خوں ریزی کے متعدد و افسوس ناک واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود نوع بشری کے شرف کے متعلق جو عقیدہ ان کے دل میں راسخ ہو چکا تھا ، اس میں ذرا بھر کمی واقع نہ ہوئی ، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کا ہر واقعہ اس عقیدے کو زیادہ راسخ کر دیتا تھا اور اصلاح کے لیے ان کے عزم کو دوبالا کر دیتا تھا ۔ سادات بارہہ کے ہنگامے کے بعد سخت پریشانی کے ایام گزار کر وہ لاہور سے لوٹے اور دہلی پہنچتے ہی جلد فوت ہوگئے ۔ ان کی آخری غزل[1] جو بعد از وفات ان کے تکیے کے نیچے سے دست یاب ہوئی تھی ، اس عزم کا اظہار کرتی تھی اور اس بات کا اعلان کہ اپنی اصل کے اعتبار سے انسان بے نظیر شرف کا مالک ہے ۔ اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

قلم بہ صد دشت و در کشادی ز نالہ در گوشہا فتادی
عنان بہ ضبط نفس نہ دادی طبیعت نی سوار خود را
بہ خویش گر چشم می کشودی چو موج دریا گرہ نبودی
چہ سحر کرد آرزوی گوہر کہ غنچہ کردی بہار خود را
تو شخص آزاد پرفشانی قیامت است این کہ غنچہ مانی
فزود خودداریت برنگی کہ سنگ کردی شرار خود را
وداع آرائش نگین کن ز شرم دامان حرص چین کن
مزن بہ سنگ از جنون شہرت چو نام عنقا وقار خود را

اس قسم کے ہلاکت آفرین اور شرم ناک واقعات وہ شاہ جہان کی نظربندی کے زمانے سے دیکھ رہے تھے ، مگر ان تمام اندوہ ناک حالات کے باوجود وہ انسان سے مایوس نہ ہوئے ۔ زمانے نے انہیں بڑے شنیع حادثات دکھائے ، مگر ان کی روح ان سے مغلوب نہ ہوئی ۔ الٹا اپنے مقصد رفیع اور عزم بلند کی بنا پر وہ اپنے عہد پر غالب نظر آتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تذکرہ نگار ان کی ہمواریِ طبع کی تعریف کرتے ہیں ۔ جو مبارک روش انہوں نے اختیار کی تھی ، زمانے کے تغیرات اور انقلابات اس میں تبدیلی پیدا نہ کر سکے ۔ حالات مختلف سے مختلف ہوتے چلے گئے ، مگر میلِ سبک خرام کی طرح ان کی فطرت اور طبیعت بڑی یکسانیت کے ساتھ ایک ہی روش پر قائم رہی ۔ اس سے ان کی روح کی عظمت

۱- خوشگو ، معارف ، مئی ۱۹۴۲ء ۔

اور بزرگی ظاہر ہوتی ہے۔

معاصر بھی ان کی بزرگی اور عظمت کے قائل تھے۔ ان کے عرفان و تصوف اور ان کی شخصیت سے ہر کس و ناکس بے حد متاثر ہوتا تھا۔ وہ کسی کے دروازے پر نہیں جاتے تھے، مگر ہفت ہزاری امرائے عم دار اور علما و فضلا اور شعرا ان کی خدمت میں حاضر[۱] ہوا کرتے تھے۔ ان کی خدمت میں باریاب ہونے والوں کے اقوال ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ محمد افضل سرخوش لکھتے[۲] ہیں: ''مرور در دارالخلافہ کوس رستمی نوارد'' اور ان کی شاعری کے متعلق رقم طراز ہیں: ''درین عہد شاعر غرا چون او نیست۔'' سراج الدین علی خان آرزو کا بیان[۳] ہے:

''از صحبت بزرگان و سیر کتب صوفیہ آن قدر مایہ در رہود کہ در سرومین شعر تمام تخم تصوف می کاشت۔ امرا و عمد ہارا حق سبحانہ بردر او فرستاد۔ فقیر آرزو دوبار بحبت این بزرگوار رسیدہ و مستفید گردیدم۔''

بیدل کے ایک امیر کبیر اور فاضل شاگرد اللہ رام مخلص[۴] کہتے ہیں:

''بر در مخلوق تشریف نہ فرمودند۔ بعد از امیر خسرو دہلوی مثل میرزا از خاک پاک ہند برنخواست۔ از برگزیدگان جناب الٰہی بود و بہ طریق توکل و استقامت معاش می فرمود۔''

ان کی انھی صفات کی بنا پر خوشگو لکھتے[۵] ہیں: ''در متاخرین ہیچ شاعری باین عزت و آبرو بسر نبردہ کہ او داشت۔'' اور یہ کہنا بھی درست ہے کہ متقدمین سے بھی دو ایک شعرا کو وہ عزت اور آبرو حاصل ہوئی ہوگی جو بیدل کے حصے میں آئی تھی۔ امیر خسرو[۶] نے متعدد بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور

۱۔ تذکرۂ بیدل، مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین، بابت اپریل ۱۹۵۳ء۔
۲۔ کلمات الشعراء، ص ۱۵۔
۳۔ مجمع النفائس ق، ص ۵۰ الف۔
۴۔ مخلص کے ہاتھ کا لکھا ہوا ورق مقبوضہ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم۔
۵۔ خوشگو، معارف، مئی و جولائی ۱۹۳۲ء۔
۶۔ سیرت امیر خسرو، بزبان انگریزی۔

ہر زمانے میں انھیں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا گیا ۔ لیکن ان کے احترام کا دار و مدار زیادہ تر ان کے قصائد پر تھا ۔ سلطان محمود غزنوی کے دربار میں عنصری جس شان سے رہتے تھے ، اس کا تصور بھی آنکھوں کے سامنے چکاچوند پیدا کر دیتا ہے ، لیکن عنصری کی شان و امارت بھی قصیدہ گوئی کی مرہون منت تھی ۔ ادھر بیدل نے زندگی بھر دنیوی اغراض سے اعراض اور قصیدہ گوئی سے احتساب کیا ۔ شہزادہ اعظم شاہ[1] نے اضافۂ منصب اور خطاب خانی کا وعدہ کیا ، مگر انھوں نے جہانِ معنی کا خان خاناں بننا قابل ترجیح سمجھا اور شہزادے کی ملازمت سے مستعفی ہو گئے ۔ شہنشاہ بہادر شاہ نے اپنے وزیر نواب منعم[2] خان خاناں کی معرفت ممدوح کا شاہ نامہ لکھنے کی کئی بار درخواست کی ۔ نواب صاحب سے مراسم بھی بڑے مخلصانہ تھے مگر بیدل نہ مانے اور آخری بار تو کہلا بھیجا :

"اگر خواہ مخواہ مزاج پادشاہ بدیں پلہ است ، من فقیرم ، جنگ نمی توانم کرد ۔ ترک ممالک محروسہ نمودہ بولایت می روم"۔

استغنا اور قناعت کا یہ عالم تھا کہ میر عنایت اللہ خان شاکر خان فرزند نواب شکر اللہ خان نے شہنشاہ سے دکن میں جاگیر[3] لے کر دی ، مگر بیدل نے اس پر لات مار دی ۔ شہنشاہ فرخ سیر[4] نے کنایۃً ملاقات کے لیے آرزو کا اظہار کیا ، مگر بیدل خاموش رہے ۔ ایک زنجیر فیل اور دو ہزار روپے مرحمت ہوئے ، مگر بیدل نے اپنی وضع کے مطابق استغنا کا اظہار کیا ۔ روپے تو کسی طرح پہنچ گئے مگر ہاتھی لانے کے لیے بیدل کی طرف سے کوئی آدمی نہ گیا اور کہتے ہیں متصدی لوگ اڑا گئے ۔ اسی طرح ایک بار نظام الملک آصف جاہ نے حق شاگردی ادا کرنے کے ارادے سے دکن آنے کی دعوت دی ، مگر بیدل نے جواب[5] میں لکھا :

۱- خوشگو ، معارف ، مئی ۱۹۳۲ء ۔
۲- خوشگو ، معارف ، مئی و جولائی ۱۹۳۲ء ۔
۳- رقعات بیدل ص ۳۵ ، ۳۱ ، ۷۱ ۔
۴- خوشگو ، معارف ، مئی ۱۹۳۲ء ۔
۵- سرو آزاد ، ص ۱۴۹ ۔ خزانۂ عامرہ ، ص ۵۳ ۔

دلہا اگر دہند لب چشم ز جای خویش
من بستہ ام حنای قناعت بہ پای خویش

جس شاعر کے استغنا کا یہ عالم ہو اور جو اس قدر سیرچشم اور قانع ہو ، اس کے سامنے انوری ، ظہیرفاریابی یا عہد مغلیہ کے فیضی کا ذکر کرنا بالکل ناموزوں ہے ۔ ان الفاظ سے اساتذۂ قدیم کی تنقیص مقصود نہیں ، صرف یہ ظاہر کرنا مطلوب ہے کہ سیرت و شخصیت کی جو عظمت و برتری ہمیں بیدل کے ہاں نظر آتی ہے ، وہ نوادرات میں شامل ہے ۔ صوفی شعرا میں سے سنائیؒ کے حالات زندگی کم یاب ہیں ۔ رومیؒ اور جامیؒ کے متعلق ہماری معلومات مقابلتاً زیادہ ہیں ۔ اہل نظر ان دونوں حضرات کو آنکھوں پر بٹھاتے ہیں ۔ بالخصوص رومیؒ ادبیات فارسی تو بجائے خود ادبیات عالم کے گل سرسبد ہیں اور ان کا ذکر کرتے ہوئے انسان ہمہ تن احترام بن جاتا ہے ۔ تاہم میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ بیدل کی شخصیت جس قدر پُر وقار اور ہموار ہے اس قدر رومی رحمت اللہ علیہ کی نہیں ۔ حالت جذب میں حضرت رومیؒ کا شوق رقص ہم کو معلوم ہے ۔ اس لیے یہ کہنا اس واقعہ کے خلاف نہیں کہ متقدمین میں کیا اور متاخرین میں کیا بیدل منفرد شخصیت کے مالک ہیں ۔

جہاں اس عارف کامل کی بزرگی لوگوں کو متحیر اور مرعوب کر دیتی تھی وہاں اس کی خوش اخلاقی باعث کشش تھی ۔ ناظرین کرام اس ضمن میں بھی دو ایک آرا ملاحظہ فرما لیں ۔ سرخوش جذبۂ رقابت رکھنے کے باوجود بے اختیار ہو کر کہتے ہیں[1] :

''بیدل بسیار خوش حلق و آرمیدہ ست ۔''

تذکرۂ مرآۃ الخیال کے مصنف شیر خان لودھی ''انہیں فرشتہ خو'' اور ''صاحب دل'' لکھتے ہیں اور ان کے چہرے پر بشاشت کا ذکر کرتے ہیں[2] ۔ اسی طرح سفینۂ بے خبر کے مصنف میر عظمت اللہ[3] بے خبر ، بیدل سے ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے ان کے تصوف اور حافظے کے علاوہ ان کی خوش اخلاقی کی بڑی تعریف

۱- کلمات الشعرا ، ص ۱۵ ۔
۲- مرآۃ الخیال ، ص ۳۹۱ ۔
۳- سفینۂ بے خبر ، ق ، ص ۲۳ الف و ب ۔

کرتے ہیں اور جیسا کہ پیسر اوپر بھی ہم نقل کر چکے ہیں ، خوشگو تو حسن اخلاق ، شگفتگی ، آداب معاشرت اور حسن سلوک کے لحاظ سے انھیں اپنے عہد میں لاثانی سمجھتے تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ دہلی میں ان کا گھر ہر درجے کے بادوں اور علم دوست اصحاب کے لیے کشش کا باعث تھا ۔

معمول یہ تھا کہ عام طور پر تمام روز گھر کے اندر رہا کرتے تھے۔ شعر گوئی جاری رہتی یا کتب کا مطالعہ کرتے ۔ حبوب سازی کی طرف بھی غالباً اسی وقت توجہ دیتے ہوں گے ۔ دہلی رہتے ہوئے خاصا کنبہ تھا ۔ مرزا عباد اللہ ماموں زاد بھائی تھے ۔ ان کے بیٹے محمد سعید بیدل کے ہاں رہتے تھے اور حبوب سازی کا کام غالباً انھی کے ذمہ ہوگا ، کیوں کہ بیدل کی وفات کے بعد محمد سعید کی گزران کا دارو مدار ان کی معجون حبوب کی فروخت پر تھا ۔ ورزش کے لیے بھی باقاعدگی سے وقت نکالتے رہے ۔ یہی تین چار ہزار بیٹھکیں لگاتے اور ایک تنومند گھوڑے سے کشتی لڑتے جو اسی غرض کے لیے پال رکھا تھا کیوں کہ قوی ہیکل سے قوی ہیکل پہلوان بھی ان سے مقابلے کی تاب نہ لا سکتا تھا ۔ جوانی میں خوراک سات آٹھ سیر تھی ، بعد میں دو تین سیر ہو گئی ۔ جوانی کے زمانے میں نفس کشی کے لیے بڑی جہد کشی کی تھی ۔ لیکن جب متھرا اور بعد میں دہلی مستقل اقامت اختیار کی ہے تو پھر اس قسم کے مجاہدات کا تذکرہ نہیں ملتا ۔ مسکّی اشیا سے پرہیز تھا ۔ خود کہتے ہیں :

شادم کہ قطرتم لیست تریاکی تمین
وہمی کہ می فروشم بنگ است و گاہ گاہ است

تصوف میں ملامتیہ فرقے کی روش پسند تھی جو ظاہرداری سے گریز کرتا ہے اور لوگوں کی مدح و ستایش سے بچنے اور اپنے نفس کو طعن و ملامت کا ہدف بنانے کے لیے ایسی باتیں اختیار کرتا ہے جنھیں ظاہر بین لوگ پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے ۔ ممکن ہے اسی بنا پر گاہ گاہ بنگ نوشی کا ارتکاب ہوتا ہو ۔ دن ان مشاغل میں گزر جاتا تھا ، شام کو دیوان خانے میں تشریف فرما ہوتے ۔ صاحب ، شاگرد اور دل دادگان سخن جمع ہو جاتے ۔ غلام کا نام مضمون[1] تھا ، جو حقہ تازہ رکھتا تھا ۔ بیدل اپنی زندگی کے بصیرت افروز تجارب بیان کرتے ، ساتھ ساتھ

۱- خوشگو ، معارف ، مئی ۱۹۳۲ع ۔

موزوں اور مناسب حکایات بھی بیان فرماتے ۔ سخن فہمی ، شعر گوئی اور تصوف کے تذکار جاری رہتے ۔ دوران گفتگو میں کہہ اٹھتے ''بھئی اب عبادت الٰہی کرنی چاہیے ۔'' اپنا کلیات اٹھا لیتے اور بلند آواز کے ساتھ اشعار سناتے ۔ اس طرح کہ گلی سے گزرنے والے بھی سنا کرتے ۔ باری باری حاضرین میں سے ہر ایک کو مخاطب کرتے ۔ اس طرح آدھی رات تک یہ محفل جمی رہتی تھی ۔

یہ محفل کیا تھی ؟ فیوض اور برکات کا سرچشمہ تھی ۔ ادب ، شعر اور تصوف کے ایسے ایسے نکات بیان ہوتے تھے کہ حاضرین حیرت زدہ رہ جاتے تھے ۔ اساتذۂ قدیم کے اسالیب ، تازہ گو شعرا کے محاسن اور عیوب ، تصوف کے مختلف مکاتب فکر ، آئمہ متصوفین کے تذکرے ، اولیاء اللہ کی کرامات اور ان کی مبارک صفات ، یہ تمام باتیں ایک ایسے بزرگ کی زبان سے بیان ہوتی تھیں جس کی وجہ سے اساتذۂ قدیم کی تصدیق اور تحقیق روایات زندہ ہوئی تھیں ، جو خود علم تصوف میں مہارت تامہ رکھتا تھا اور اس کے اعمال کا پابند ہو کر اس کی روح سے پوری طرح آشنا ہو چکا تھا ، اس لیے بیدل کی محفل شبانہ نادرۂ روزگار چیز تھی ۔ ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق مستفیض ہوتا تھا ۔ خوشگو لکھتا[1] ہے :

'' اکثر خورد و بزرگ شہر سر شام بمجلسش می رفتند و

انواع چیزہا بر می داشتند ۔''

اب آپ حاضرین محفل کے کسب فیض کا اندازہ لگائیں ؛ بیدل کے ایک شاگرد لالہ سکھراج سبقت تھے ۔ انھوں نے جب دیکھا کہ ادب و شعر کے متعلق فنی کتب کے مطالعے سے اچھے اچھے صاحب ذوق لوگوں کے لیے جو کچھ حاصل کرنا از قبیل ناممکنات ہے ، وہ اس بزرگوار کی محفل میں پہنچ کر ہر کس و ناکس حاصل کر سکتا ہے ، تو انھوں نے ایک رباعی[2] کہی ، جس میں اس حیات کا اظہار کیا کہ ایک عبدالقادر احیاے دین کے لیے پیدا ہوئے تھے ، دوسرے اب احیاے کلام کے لیے تشریف لائے ہیں ۔

ان شبانہ محفلوں میں بیدل کی شخصیت مجسم طور پر نگاہوں کے سامنے

۱۔ خوشگو ، معارف ، بابت ماہ مئی و جولائی ۱۹۳۲ع ۔
۲۔ خوشگو ، معارف ، بابت ماہ مئی و جولائی ۱۹۳۲ع ۔

آ جاتی تھی ۔ نظر آتا تھا کہ ایک سرفراز اور بے لیار بزرگ تشریف فرما ہیں ، عصمت و وقار کے آسمان کے لیے الٰہی کی ذات خورشید کی حیثیت رکھتی ہے ، آسمان کمال کا شکوہ انھی کی ذات سے قائم ہے ، قدرت الٰہی کا یہ مظہر کامل ہیں ، حال اور قال کا ایک جہان ہے جس کی وسعتیں اس بابرکت ہستی کی بدولت حاضرین کی نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہیں ۔ لوگوں کو نظر آتا تھا کہ فصاحت و بلاغت کا اگر کوئی قبلہ ہے تو وہ اسی بزرگ کی ذات ہے اور حقایق و معانی کا کوئی کعبہ ہے تو یہی قدسی صفات ۔ خوشگو نے ان مبارک محفلوں کے ملفوظات[1] از خود قلم بند کیے ۔ افسوس ہے وہ گنجینۂ معارف و حقائق نایید ہے ۔ تاہم ان مجالس کے متعلق یہاں جو کچھ لکھا گیا ہے تذکرۂ خوشگو سے ماخوذ ہے اور بنیادی طور پر الفاظ بھی وہی ہیں ۔

یہ محفلیں اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے میں شروع ہوئیں اور محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں بیدل کی وفات پر ختم ہوئیں ۔ ہر طبقے کے لوگ ان میں شامل ہوتے رہے ۔ امیر و غریب اور ہند و مسلم کی تمیز نہ تھی ، صلائے عام تھی ۔ اس چشمۂ صافی سے ہر ایک حصۂ وافر لے سکتا تھا ۔ ہم نے اپنے مقالہ ‘‘ذکری اور تذکرۂ بیدل’’ کے عنوان سے اورینٹل کالج میگزین کی اشاعت بابت اپریل سنہ ۱۹۵۳ع میں ان تمام دلدادگان سخن کا ذکر کر دیا ہے جو مختلف سلاطین مغلیہ کے عہد میں بیدل کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے یا ویسے انھیں ان کے ساتھ واسطہ پڑا ۔ اس قسم کے اکثر اصحاب کو تاریخ بھلا چکی ہے ، مگر بیدل کی نیازمندی نے دنیای ادب میں انھیں حیات دوام کی نعمت عطا فرما دی ہے ۔ موجودہ مقالے میں ان کا ازسر نو ذکر کرنا تحصیل[2] حاصل ہے ۔ علاوہ بریں یہاں ہمارے مدنظر صرف یہ بات ہے کہ بیدل کی معیاتی ساخت اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو مناسب وضاحت کے ساتھ بیان کریں ۔ اس لیے اب ہم اس بات پر غور کریں گے کہ مختلف قسم کے اصحاب سے تعلقات رکھتے ہوئے بیدل کی شخصیت کے کون سے پہلو بے نقاب ہوئے ۔

چوں کہ ہر انسان بنیادی طور پر ایک مخصوص خاندان کا فرد ہوتا ہے اس

۱- ایضاً ۔

۲- یہ مقالہ ضمیمے میں دیکھیے ۔

لیے پہلے ہم بیدل کے اپنے رشتہ داروں سے متعلقات کا ذکر کریں گے ۔ ان کے والد ماجد میرزا عبدالخالق رحمۃ اللہ علیہ بیدل کی صغر سنی ہی میں وفات پا گئے تھے ۔ والد بزرگوار سے جدائی کا درد ان کے پہلو میں عمر بھر رہا ۔ اکتالیس برس کی عمر میں جب انھوں نے اپنی نثری تصنیف 'چہار عنصر' کا آغاز کیا تو اس وقت بھی اس درد کی ٹیسیں محسوس ہو رہی تھیں ۔ اور دل میں حسرت موجود تھی کہ کیوں زمانے نے چشم زدن میں انھیں والد کی شفقت سے محروم کر دیا تھا ۔ کہتے ہیں[1] :

"ازانجا کہ ورق گردانی نسخہ احوال کمی اندیش تامی نیست باندک تحریکی از نسیم فرصت والد مجازی بسر گلشن حقیقت شتافت و از شکست خمار کثرت حضور نشاۂ وحدت دریافت ۔ آشوب گرد یتیمی جوہر آئینہ اشتہار گردید و پریشانی غبار بے کسی بردامن جمعیت اعتبار پیچید ۔

خورشید خرامید و فروغی بنظر ماند
دریا بہ کنار دگر افتاد و گہر ماند
آتش کدہ ای رفت و ز گرہ ریخت شراری
دل آب شد و قطرۂ خونی ز جگر ماند
آن سایہ گزشت از اثر دست نوازش
این لقش قدم داغ شد و خاک بسر ماند

بیدل نے اپنے والد ماجد کا مرثیہ لکھا ہے ۔ قابل توجہ امر یہ ہے کہ والد کو وفات پائے کوئی چوبیس سال گزر چکے تھے ، اس عرصے میں وہ خود شاعر اور صوفی کی حیثیت سے بڑی نام وری حاصل کر چکے تھے ، پھر بھی اپنے والد بزرگ وار کو بیدل باطنی اور ظاہری کمالات کے لحاظ سے افضل اور برتر سمجھتے تھے ۔ والد کو خورشید جہاںتاب کہتے ہیں اور اپنے آپ کو معمولی سی کرن ۔ فرماتے ہیں ۔ وہ تو دریائے معرفت تھے اور میں معمولی سا گوہر ہوں ۔ اسی طرح عشق حقیقی نے انھیں جو سوز عطا کر رکھا تھا اس کے لحاظ سے بیدل انھیں آتش کدہ سے تعبیر کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ادنیٰ سا شرارہ کہتے ہیں ۔ حالانکہ ایک عالم جانتا ہے کہ بیدل اپنے والد کے مقابلے میں ہر لحاظ سے بلرجہا فایق تھے ، لیکن یہ ان کی

۱- کلیات صقدری ، چہار عنصر ، ص ۴ تا ۶ ۔

سعادت مندی ہے کہ اپنے اور اپنے والد کے درمیان انھیں ہے ایام پختگی میں بھی وہ فرق نظر آیا جو ذرے اور آفتاب کے درمیان ہوتا ہے ۔ مرثیے میں بظاہر ایک بزرگ کی رحلت اور ایک کم‌سن بچے کی یتیمی کا ذکر ہے ، لیکن بین السطور جو لکنے سے پتا چلتا ہے کہ باپ بیٹے کا فرق مراتب بیان کیا جا رہا ہے ۔ یہ انداز بیان کی خوبی ہے کہ بہ یک وقت دو مفہوم ادا ہو رہے ہیں ۔ اپنی والدہ[1] کے سلسلے میں بھی بیدل اسی قسم کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں ۔ خوشگو کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی والدہ کا نام مریم[2] تھا ۔ خوشگو احترام کے طور پر مریم زمانی کہتا ہے۔ والدہ نے بیدل کو عمر کے چھٹے سال کے چھٹے مہینے میں درس میں بٹھایا اور ان کی تربیت سے بیدل نے صرف سات ماہ کے عرصے میں قرآن مجید ناظرہ طور پر ختم کر لیا ۔ 'چہار عنصر' میں بیدل اپنی والدہ کی شفقت اور ان کی پاکیزہ صفت کا ذکر بھی کرتے ہیں اور اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ والدہ کی تربیت ان کے لیے بڑی مبارک ثابت ہوئی ۔

رشتہ داروں کے سلسلے میں بیدل کے چچا میرزا قلندر کا ذکر بیشتر ازیں آ چکا ہے ۔ بیدل میرزا قلندر کو اپنے اساتذۂ معنوی میں شمار کرتے ہیں ۔ کہتے ہیں[3] :

> ''تربیت فقیر بیدل بعد از رحلت والد مرحوم تا ادراک نشأۂ
> بلوغ بعہدۂ التفات خود داشت و باشفاق ربوبیت در تعلیم
> مراتب آداب و تدریس معانی اخلاق کمال توجہ می گماشت ۔
> قطع نظر از عرض دیگر فوائد لمعہ' نظمی کہ امروز رونق افزای
> قانون تخیل است ، از پرتو اقتباس ہای طبع خداداد اوست ۔''

اسی ہے جذبہ' امتنان و تشکر کی عجیب کیفیت کے ساتھ بیدل نے میرزا قلندر کا ذکر چہار عنصر میں مستقل عنوان[4] قائم کرکے اور ضمناً بھی کئی مقامات پر خاصی تفصیل کے ساتھ کیا ہے ۔ جب میرزا قلندر سنہ ۱۰۷۶ھ میں وفات پا گئے تو بیدل نے مرثیہ لکھا ۔ اسی خلوص ، حق شناسی اور نیازمندی کا اظہار بیدل

۱- کلیات صفدری ، چہار عنصر ، ص ۴ تا ۶ ۔
۲- خوشگو ، معارف ، مئی ۱۹۳۲ع ۔
۳- کلیات صفدری ، چہار عنصر ، ص ۴ تا ۶ ۔
۴- کلیات صفدری ، چہار عنصر ، ص ۲۷ تا ۲۸ ۔

اپنے ماموں میرزا ظریف[1] کے سلسلے میں بھی کرتے ہیں ۔ میرزا ظریف تاجر پیشہ تھے ، حدیث و تفسیر میں بڑی دسترس رکھتے تھے اور مزاج پر فقر غالب تھا ۔ جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے ، وہ بھی بیدل پر بڑے مہربان تھے اور بڑی شفقت سے اپنے ہونہار بھانجے کی تربیت کیا کرتے تھے ۔ ان امور سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ بیدل کی پرورش محبت پرور ماحول میں ہوئی تھی ، وہاں یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اس ماحول نے ان کے دل میں محبت اور خلوص کے جذبات پیدا کر دیے تھے ۔

سنہ ۱۰۷۹ھ میں ان کی شادی ہوئی ۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ شادی کون سے خاندان میں ہوئی ، لیکن جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے متعلق اپنی تصنیفات میں سیکڑوں تفصیلات چھوڑی ہیں وہاں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اپنی متاہل زندگی کے متعلق صرف دو بار ذکر کیا ہے ۔ ایک بار[2] جب شادی ہوئی ہے تو ''بشگفت گل حدیقۂ یمن'' (۱۰۷۹ھ) سے تاریخ نکالی ہے اور شادی کی وجہ اور غرض و غایت کا ذکر کیا ہے ۔ بیدل فطرتاً تجرد پسند اور آزاد منش تھے اور عالم وارفتگی میں دہلی متھرا اور اکبرآباد آتے جاتے رہتے تھے ۔ جب عمر ۲۵ برس ہو گئی تو ان کے اپنے بیان کے مطابق آشنایان یگانہ مشرب کے ایک ہجوم نے متحد ہو کر انہیں مجبور کر دیا کہ تجرد کو تعلق کی صورت دیں ۔ ممکن ہے وہ رضامند نہ ہوتے ، مگر :

''شبی کہ عقد ترویج گوہر آرائی رشتہ اتفاق می گردید
در عالم معاملہ بمکاشفہ طبع متحیر رسید کہ گل کردن آثار این
کیفیت مقتضی مصلحتی است'' ۔

اس مکاشفے نے انہیں ازدواج کے لیے آمادہ کر دیا ۔ شادی کے بعد یہ تو پتا چلتا ہے کہ حصول معاش کے لیے منصب آبا کا اتباع کرتے ہوئے سپہ گری اختیار کی ، مگر اپنی بیوی کے متعلق کچھ بھی نہیں لکھتے اور اس پردہ داری سے کام لیتے ہیں جو اس نگہبان اسرار حق کے شایان شان ہے ۔ گھر کے پردہ داروں کا ذکر

۱۔ کلیات صفدری ، قطعات ، ص ۳۸ ۔
۲۔ کلیات صفدری ، چہار عنصر ، ص ۶۶ ۔

دوسری بار[1] وہ نواب شکر اللہ خاں کے نام اپنے ایک رقعے میں کرتے ہیں ، جب وہ جاٹوں کے فسادات سے تنگ آ کر سنہ ۱۰۹٦ھ میں متھرا سے دہلی چلیوں پر پہنچے ہیں - رستے میں آمادۂ فساد جاٹوں کے آوارہ گروہوں کی وجہ سے بیدل کے قافلے کو سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا - نواب شکر اللہ خاں کو لکھا ہے کہ ''پاہا شکستہ چند'' دہلی وارد ہوا ہوں - یہ الفاظ صرف اُس پریشانی کا اظہار کر رہے ہیں جو اس غریب‌سند مغل اولاس کو ان پُر آشوب ایام میں پردہ دار عورتوں کی ہمراہی کے باعث لاحق ہوئی تھی - اورنگ زیب دکن میں مصروف جہاد تھے اور ان کی عدم موجودگی میں دہلی اور متھرا کے قرب و جوار میں جاٹوں نے اودھم مچا رکھا تھا - ایسے خطرناک سفر کا ذکر کرتے ہوئے اپنی عورتوں کے متعلق صرف 'پاشکستہ' کی ترکیب استعمال کرنا جہاں بیدل کے فکر و تردد کا اظہار کرتا ہے وہاں ان کی حمیت اور عالی ہمتی کا بھی پتا دیتا ہے اور ظاہر ہے اہل حالہ کے سلسلے میں یہ انداز فکر و عمل ایک صحت مند ذہنیت کی طرف انگشت نمائی کر رہا ہے -

یکم رجب سنہ ۱۱۲۰ھ کو بیدل کا پہلا اور آخری بچہ شادی سے پورے اکتالیس سال[2] بعد پیدا ہوا اور وہ بے حد مسرور ہوئے - کھلے دل سے خیرات کی ، کئی دن خوشیاں مناتے رہے اور پوری دس تاریخیں کہیں ، دوستوں کو خطوط لکھے - نواب شکر اللہ خاں ثانی دکن میں شہزادہ کام بخش کی بغاوت فرو کرنے میں مصروف تھے - انھیں وہاں یہ مبارک خبر پہنچائی - مولود کا نام عبدالخالق رکھا گیا - بچہ جب مرض چیچک میں مبتلا ہوا تو سخت گھبرائے - چہرے پر

۱- رقعات بیدل ، نولکشوری ایڈیشن ، ص ۸۱ تا ۸۲ -

۲- شادی سے اتنے طویل عرصے کے بعد بچے کی ولادت اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ نکاح ثانی یا ثالث ہوگا - خوشگو چار حرموں کا ذکر کرتے ہیں - ''پاشکستہ چند'' کے الفاظ خوشگو کی تائید کر رہے ہیں ، مگر اہل حالہ کے سلسلے میں بیدل کا سکوت مسلسل اس گتھی کو سلجھنے نہیں دیتا - بچے کی پیدائش کے سلسلے میں حوالے : رقعات بیدل ، نولکشوری ایڈیشن ، ص ۱۲۸ - خوشگو ، معارف ، مئی ۱۹۳۲ع - ہدیہ انیس کابل ، ص ۲٦ تا ۳۰ -

آبلے دیکھ کر یہ دعائیہ[1] رباعی کہی :

پر جا اثر آبلہ کردست غلو
معراج جمال گشتہ در خاک فرو
یا رب تو ز آتش امان دہ ہمہ را
کاین شکل نزلد درخور یاست لہ رو

جب مرض شدت اختیار کر گیا تو بیتاب[2] ہو کر کہا :

ای چرخ بحق جوش این میخانہ
یعنی بخروش عاقل و دیوانہ
بیرون نبری ز انجمن شمع مرا
آتش نزنی بخانہ پروانہ

بعد میں جب عبدالخالق ۹ ربیع الثانی سنہ ۱۱۲۳ھ کو داغ مفارقت دے گیا تو باوجودیکہ بیدل بڑے صبر و تحمل سے تجہیز و تکفین کے انتظامات کرتے رہے اور رونے والوں کو تسلی دیتے رہے ، مگر دل پر جوگزری اس کا اندازہ لگانے کے لیے وہ درد انگیز مرثیہ پڑھا[3] جانے جو اس موقع پر انھوں نے لکھا ۔ کابل میں سرور خاں گویا مجھ سے کہنے لگے کہ قدرت نے عبدالخالق کو محض اس لیے پیدا کیا تھا کہ اس مرثیے کی تخلیق عمل میں آئے ۔ مرثیہ شان دار ادبی شہ پارہ ہے اور خلوص کا اعلیٰ نمونہ ۔ یہ واقعات بتاتے ہیں کہ بیدل کا آبگینہ دل کتنا نازک تھا اور وہ کس قدر شفیق اور محبت نواز تھے ۔

ان کے باقی رشتہ داروں کے بہت کم حالات معلوم ہیں ۔ رقعات بیدل سے دو ماموں زاد[4] بھائیوں میرزا عبداللہ اور میرزا روح اللہ کا پتا چلتا ہے ۔ غالباً میرزا شریف

۱- بدیہہ الیس کابل ، ص ۲۳ ، ۲۵ ، ۲۷ - کلیات بیدل ، کتاب خانہ معارف کابل ، ص ۱۰۸۸ - ۱۱۰۰ ۔

۲- ایضاً ۔

۳- یہاں مرثیہ کے اٹھارہ بندوں میں سے صرف ایک بند نمونتہً درج کیا جاتا ہے :

بیہات چہ برق پر فشان رفت کآشوب قیامتم بجان رفت
گر تاب بود ور توان رفت طلسم زین کہنہ خاکدان رفت
بازی بازی بر آسمان رفت

۴- رقعات بیدل ، ص ۲۳ ، ۲۸ ، ۳۵ ، ۵۹ ۔

کے لڑکے تھے ۔ بیدل ان دونوں کو سگے بھائیوں کی طرح عزیز سمجھتے تھے ۔ بڑے شوق سے انہیں محبت بھرے خطوط لکھتے اور بڑی تشویش اور فکرمندی کے ساتھ ان کے جوابات کا انتظار کیا کرتے تھے، انہیں تحفے تحائف بھی بھیجا کرتے تھے ۔ جیسا کہ پیشتر ازیں ذکر کیا جا چکا ہے، مرزا عباد اللہ کا لڑکا مرزا محمد سعید بیدل کے ہاں رہا کرتا تھا ۔ غالباً اس لیے کہ اس بچے سے دل بہلا رہے گا ۔ اپنے اعزا اور اقارب سے موالست اور محبت ایک ایسے بلند فطرت اور پُر خلوص انسان کا پتا دیتی ہے جو دنیا میں منازل عروج طے کرنے کے بعد بھی اپنے دیرینہ گھریلو ماحول کو حقیقی مسرت کا سرچشمہ سمجھتا ہو اور چاہتا ہو کہ جس خاندان نے اسے جنم دیا ہے وہ اس کی کامیابی اور کامرانی کے ثمرات سے متمتع ہوتا رہے ۔

رشتہ داروں سے بیدل کے تعلقات کے متعلق ہمارے پاس صرف یہی معلومات تھیں ۔ اب ہم اساتذہ سے ان کے تعلقات کا ذکر کریں گے ۔ بیدل کے اساتذہ کی فہرست خاصی لمبی ہے ۔ اپنے اساتذۂ معنوی کا ذکر انھوں نے 'چہار عنصر'[1] کے آغاز میں باتفصیل کیا ہے اور جس طرح شیخ فریدالدین عطارؒ نے ''تذکرۃ اولیاء'' میں کیا تھا، بیدل بھی ہر نئے بزرگ کا ذکر مقفیٰ اور مسجع تعریفی کلمات سے شروع کرتے ہیں ۔ ہر لفظ اور ہر فقرے سے ان کی نیازمندی اور عقیدت کا پتا چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کس ذوق و شوق کے ساتھ انھوں نے ان بزرگوں سے اکتساب فیض کیا ۔ ان اساتذۂ معنوی کے علاوہ عاقل خان رازی اور عبدالعزیز عزت سے بھی انھوں نے بہت کچھ سیکھا ۔ اور مقالہ ہذا میں بتایا جا چکا ہے کہ عاقل خان رازی کا کس قدر احترام بیدل کے دل میں پایا جاتا تھا ۔ جہاں تک مولانا عبد العزیز عزت کا تعلق ہے، ان کے نام بیدل کے رقعات پڑھنے سے استاد شاگرد کے باہمی خلوص کا اچھی طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ بیدل انہیں '' سالک اور واصل '' سمجھتے تھے اور اپنے آپ پر ان کا احترام واجب جانتے تھے ۔ ائمہٗ تصوف اور اساتذۂ قدیم کے سلسلے میں بھی بیدل کی روش یہی تھی ۔ ان کی زبان یا قلم سے جو لفظ بھی نکلا وہ اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ بیدل سر تا پا نیاز تھے ۔ میر جعفر زٹلی[2] نے اپنے مخصوص انداز میں

---

۱ ۔ کلیات صفدری، چہار عنصر ۔

۲۔ خوش گو، معارف، مئی ۱۹۳۲ء ۔

جب ان کی مدح میں کچھ شعر کہے اور ان کے سامنے یہ مصرع پڑھا :

چہ عرفی چہ فیضی یہ پیش تو ہیچ

تو وہ سخت کبیدہ خاطر ہوئے اور فرمایا میں اساتذۂ قدیم کی شان میں گستاخی برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ان کے ایام جوانی میں ایک بار[1] آکبر آباد میں میر کام گار کے ہاں چند شاعروں نے شعرائے قدیم کے متعلق استخفاف آمیز لب و لہجہ اختیار کیا تو انہیں سخت ناگوار گزرا ۔ اساتذہ کے سلسلے میں ان کے اگر تمام بیانات کو سامنے رکھا جائے تو یقین ہو جاتا ہے کہ نیازمندی روح بیدل کے لیے غذا کا کام دیتی تھی اور عقیدت بال و پر بن کر انہیں فضائے قدس میں پرواز کے قابل بناتی تھی ۔

معاصر شعرا سے ان کے تعلقات کئی[2] قسم کے تھے ، بعض کے ساتھ ان کے بڑے گہرے مخلصانہ مراسم تھے ۔ وہ انہیں تدوانے پیش کیا کرتے تھے اور یہ انہیں مخمسے دیا کرتے تھے ۔ کئی ایک کو انہوں نے تخلص عطا کیا اور ان کے کلام کی اصلاح کی ۔ بعض شعرا کی انہوں نے مغل امرا کے پاس سفارش کی تاکہ ان کے روزگار کی کوئی سبیل پیدا ہو جائے ۔ جب کسی شاعر میں کوئی خوبی دیکھتے تو کھلے دل سے اس کی تعریف کیا کرتے تھے ۔ حاجی محمد اسلم سالم کا دیوان تلاش کرا کے زیر مطالعہ رکھا ۔ عاشق محمد ہمت کے متعلق لکھا کہ چمن طراز فطرت ہے ۔ میرزا سہراب رونق کے متعلق کہا کہ ان کی نثر جمیل ہے اور نظم متین اور میر عبدالصمد سخن کو یہ دعا دی :

رنگینئی بہار سخن لا یزال باد

بعض شاعر ان کے ہم طرح بنے اور ان کے ساتھ مخلصانہ روابط بھی رکھے ۔ بعض نے نظم و نثر میں ان کا تتبع کیا ، اگرچہ باقاعدہ طور پر شاگرد نہیں تھے ۔ معاصرین میں سے نعمت خان عالی وہ خوش نصیب شاعر ہیں جن کے رسالہ حسن و عشق کا انتخاب بیدل نے اپنی بیاض میں درج کیا ۔ اس بیاض کے نسخے لندن میوزیم میں موجود ہیں ۔ ان تمام احباب کے ساتھ دعوتوں میں بھی شامل ہوتے تھے جو رنگین صحبتوں کی صورت اختیار کر جاتی تھیں ۔ بعض شعرا ، مثلاً میر عظمت اللہ

١۔ کلیات صفدری ، چہار عنصر ، صفحہ ٩٣ ۔

٢۔ دیکھیے تذکرۂ بیدل مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین ۔

بے جعفر اور میر جعفر روحی ان کی شہرت سن کر ملاقات کے لیے آئے ۔ یہ تمام تفصیلات ظاہر کرتی ہیں کہ کمالات وافرہ اور اخلاق حسنہ کی بنا پر بیدل کو معاصر شعرا کے درمیان مرکزی حیثیت حاصل تھی ۔

معاصرین میں بیدل کے رقیب[1] اور معترض بھی نظر آتے ہیں ۔ سب سے بڑے رقیب شیخ ناصر علی سرہندی تھے ، مگر چوں کہ پیری کے باعث ان کے قوائے دماغی مضمحل ہو چکے تھے اور بیدل کے فکری عروج کا زمانہ تھا ، وہ کچھ کر نہ سکے ۔ اس لیے شیخ صاحب نے اپنے دیرینہ رفیق محمد افضل سرخوش کا سہارا[2] لیا ، مگر سرخوش بھی بیدل کے کامیاب مدمقابل نہ ہو سکے اور یہ ان کی حوش ذوق کا ثبوت ہے کہ اپنے تذکرۂ کلمات الشعرا میں انھوں نے بیدل کو بحر بے ساحل کہا ہے اور اعتراف کیا ہے کہ اس عہد میں کوئی شاعر ان کے پائے کا نہیں ۔ رقیب صرف یہ دو تھے ۔ بیدل کو بھی ان کی رقابت کا احساس تھا ۔ اس کے باوجود سرخوش سے جب بھی ملاقات ہوتی تھی ، سکون طبع اور حوش خلقی کا اظہار کیا کرتے تھے ۔ شیخ ناصر علی سرہندی نے غالباً آخری دم تک بیدل کی عظمت کا اعتراف نہیں کیا ۔ اسی لیے ان کے ساتھ چوٹیں جاری رہیں ۔ ایک بار شیخ صاحب نے اپنی ایک[3] غزل کے متعلق دعویٰ کیا کہ شاہجہاں آباد کا کوئی شاعر اگر اس کے مقابلے میں غزل کہے گا تو میں اسے نصم روِ سخن کا بادشاہ تسلیم کروں گا ۔ بیدل نے اپنے ایک شاگرد احمد عبرت سے کہا کہ اس زمین میں غزل کہے ۔ یہ دونوں غزلیں ''تذکرۂ مرآۃالخیال'' میں موجود ہیں ۔ حالات و واقعات بتاتے ہیں کہ شیخ ناصر علی سرہندی کے متعلق سیرا بیدل کے سینے میں خاموش جذبہ استہلا مستقل طور پر کام کرتا رہا ۔

معترض کئی قسم کے تھے ، بعض کو بیدل کے بےریش و بروت ہونے پر اعتراض تھا ، بعض کہتے تھے کہ جب خاندان شکر اللہ خاں تمام کا تمام بیدل کے شاگردوں پر مشتمل ہے تو پھر بیدل اس کے افراد کو اپنے محسن اور ممدوح کیوں کہتے ہیں ۔ اور بعض کہتے تھے کہ بیدل کا روزمرہ اساتذۂ فارسی کے مطابق نہیں ۔

۱- مرآۃالخیال ، ص ۲۹۲ تا ۳۰۵ ۔ کلمات الشعرا ، تذکرۂ بیدل ۔
۲- ایضاً ۔
۳- مرآۃالخیال ، ص ۳۷۲ ، ۳۸۳ ۔

بیدل نے مناسب مواقع پر تمام کا دندان شکن اور مسکت جواب دیا ۔ ریش کے سلسلے میں ایک واقعہ پیش تر ازیں درج کیا جا چکا ہے ، دو مزید واقعات یہاں نقل کیے جاتے ہیں : بیدل ایک بار اکبر آباد میں پالکی پر سوار جا رہے تھے ۔ عبدالرحیم نامی ایک شاعر نے مندرجہ ذیل شعر لکھ کر[1] پالکی میں پھینکا :

چہ خطا در خط استاد ازل دید آیا
کہ بہ اصلاح خط و ریش بہ ناز اقتاد است

بیدل نے فی‌البدیہہ یہ جواب لکھ دیا :

مختصر کن بہ تامل ہوس جنگ و جدل
مد سر رشتۂ تحقیق دراز افتاد است

ایک اور ظریف نے بھی ایک بار اسی طرح کیا ۔ میرزا بیدل عام طور پر دستار کی بجائے پٹکا پر اکتفا کرتے تھے اور ایک موقع پر چھوٹی چھوٹی ریش بھی چہرے پر موجود تھی ۔ اس ظریف نے پارۂ کاغذ[2] پر مندرجہ ذیل شعر لکھا اور چھوڑ کر چلتا بنا :

پٹکہ و ریش میرزا بیدل
بچۂ ریش و بچۂ دستار

جوں ہی میرزا کی نظر کاغذ پر پڑی ، انہوں نے پشت پر یہ رباعی لکھ دی :

ای مغز خرد غبار تشویش مباش
عامہ و بزرگی اندیش مباش
گر یک سرموست آدمیت کافیست
چوں خرس ز فرق تا قدم ریش مباش

ریش کے سلسلے میں تینوں واقعات سامنے رکھے جائیں تو بیدل کا نقطۂ نگاہ واضح طور پر ذہنوں کے سامنے آ جاتا ہے ۔ امرا کو وہ کہتے تھے کہ میرے بے ریش ہونے کو نہ دیکھو بلکہ اس بات پر غور کرو کہ تمہارے مظالم کی وجہ سے مخلوق ۔ کس طرح نالاں ہے ۔ ارباب تحقیق کو وہ کہتے تھے کہ ڈاڑھی کا مسئلہ کون سا اتنا اہم ہے جس کے متعلق تم اس قدر کتب بینی اور دماغ سوزی

۱۔ خوش گو ، معارف ، مئی ۱۹۳۲ء ۔
۲۔ تذکرۂ حسینی ، ص ۸۸ ۔

کرتے ہو۔ اگر عزم تحقیق دل میں ہے تو ان حقائق پر غور کرو جن کی وسعتیں غیر محدود ہیں۔ عوام الناس کو مخاطب کرکے وہ فرماتے تھے کہ ریش و فش اور عمامے کی بزرگی میں کیا دھرا ہے۔ اگر ہو سکتا ہے تو زیادہ نہ سہی اپنی ذات میں سرمو آدمیت پیدا کر لو، یہی کافی ہو رہے گی۔ دوسرے الفاظ میں بیدل نے ان اجارہ داران مذہب کے خلاف بغاوت شروع کی ہوئی تھی جو روح مذہب سے بالکل ناآشنا ہوتے ہیں، دل و دماغ کی تہذیب کی طرف قطعاً مائل نہیں ہوتے اور مذہب کو چند رسمی امور تک محدود سمجھتے ہیں۔

خاندان نواب شکر اللہ خاں کے احترام کے سلسلے میں اعتراض کرنے والے شاہجہان آباد کے ایک تنقدر شاد تھے۔ جب شاد نے بار بار یہی اعتراض دہرانا شروع کیا تو میرزا بیدل کو بھی طیش آیا اور ان کی میرزائیت نے جذبہ انتقام میں یہ بھی نہ سوچا کہ کون سی بات کہنی ہے۔ شاد کو ایک رقعہ[۱] لکھا جس میں اسے یوں مخاطب کیا:

> "بوزینہ حق ناشناس، مائدۂ مفت خواری، خرس خول، دنگ سسلہ، نسناس آثار، موچینہ رہارستان، اجتماع عیوب، گندہ دہاں، ہرزہ بیان، میں شاید نا مرغوب در پناہ سرچنگہائے خیالات فاسد مخذول و منکوب باشند۔"

رقعے میں اسی انداز تخاطب کے موزوں اور مناسب مزید باتیں بھی لکھیں اور ساتھ ہی کہا میں کہاں کا معلم ہوں، اگر شکر اللہ خاں اور شاکر خاں از راہ خاکساری اپنے آپ کو میرے شاگرد کہیں اور حسن اخلاق کا اظہار کریں تو میں بے حیا نہیں کہ جو لوگ میرے مربی ہیں ان کی استادی کا دعوے دار بن بیٹھوں:

> "ہر گاہ مکاتیب این کرم مینشان بہ آں ہمہ ایثار و احسان مشعر عبودیت و زمین بوس باشد فقیر محتاج را در جواب اگر خاک شدن میسر نیاید در آب گشتن چہ مانع است۔"

اور آشفتگی اور برہمی مزاج کے مزید اظہار کے بعد رقعہ ان الفاظ پر ختم کیا:

> "معنیٰ ما مضی بعد ازیں باستغفار باید کوشید و گرنہ میدانید کہ بیدل عبدالقادر است۔"

۱- رقعات بیدل، نولکشوری ایڈیشن۔

قادر مطلق کی صنعت قدرت بیدل کی شہ زوری کی صورت میں بھی ظاہر ہوئی تھی اور بیدل کا اسی طرف اشارہ تھا ۔ رقعے میں حقیقت حال کو بھی اچھی طرح واضح کر دیا گیا تھا ۔ مزید براں بیدل فطرت شناس اور مرتبہ داں تھے ۔ جس حیثیت کا انسان تھا مجبور ہو کر اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا ۔

روزمرہ فارسی میں اجتہاد برتنے کے سلسلے میں لوگوں کو میرزا بیدل کی زندگی میں بھی اعتراض تھا اور اب بھی ہے ، لیکن میرزا صاحب کا مطالعہ اس قدر وسیع تھا کہ وہ اساتذۂ قدیم کے کلام سے سند پیش کرکے معترضین کو خاموش کر دیا کرتے تھے ۔ ایک دفعہ "تاریخ فرخ شاہی" کے مصنف ناظم خاں نے میرزا بیدل کو دعوت پر بلایا ۔ بعد از طعام ناظم خاں نے کہا "میرزا صاحب ! آپ کے شعر میں[1] روزمرہ بڑا تازہ ہے ۔

توانگری کہ دم از فقری زند غلط است
بہ موی کلمۂ چینی تمد نمی باشد

میرزا صاحب نے اپنی تائید میں جب عسجدی، فرخی، معزّی، مسعود سعد سلمان، خواجہ سلمان وغیرہ کا کلام پیش کیا تو ناظم خاں ان کے معتقد ہو گئے ۔ ان تصرفات کے متعلق اعتراضات کا جواب اس زمانے کے ماہرین فن اور بلند پایہ شعرا نے بھی دیا ۔ سراج دین علی خاں آرزو اس ضمن میں پیش پیش ہیں ۔ شیخ سعد اللہ گلشن بھی بیدل کے بڑے مداح تھے اور کہا کرتے تھے کہ وقت آئے گا جب ان تصرفات کو لوگ سند کے طور پر پیش کیا کریں گے ۔ بہرحال بیدل جب زندہ تھے تو مدح و ستائش کے عام غلغلے میں نعرہ اعتراض بھی بلند ہوتی تھی ۔ لیکن مدح کرنے والوں میں دارالخلافہ اور وسعت آباد ہند کے اہل با اثر اور اہل الرائے لوگ شامل تھے کہ معترضین کی آواز بے اثر رہی ۔ مدح و ستائش کا سلسلہ اب بھی جاری ہے اور بلند طبع لوگ آج بھی کلام بیدل کو حرز جاں بناتے ہیں ۔

رشتہ داروں ، اساتذہ ، عام شعرا اور معترضین کے ساتھ بیدل کے تعلقات جس قسم کے تھے ، اس کے مطالعے کے بعد ہمیں چاہیے کہ اپنے شاگردوں سے ان کے تعلقات کی جو نوعیت تھی اس پر بھی کچھ دیر کے لیے غور کر لیں ! حالات اور واقعات بتاتے ہیں کہ بیدل کے شاگرد محض شاگرد نہیں تھے ، بلکہ ان

۱- خوش گو ، معروف ، مئی ۱۹۳۲ء ۔

کے فرزند تھے ۔ وہ ان کے ساتھ بے نظیر خلوص اور محبت کے ساتھ پیش آتے تھے ۔ ان کی خوشی ان کے لیے روح افزا اور دل نواز ثابت ہوتی تھی اور ان کی تکلیف انھیں وقف حزن و ملال کر دیتی تھی ۔ اس سلوک میں امیر اور غریب کی تمیز نہ تھی ۔ سنہ ۱۱۲۴ھ میں میر کرم اللہ عاقل خان عاشق فوت ہوئے ۔ چوں کہ ان سے بڑی محبت تھی ، بیدل کو بڑا صدمہ ہوا اور دیر تک[1] روتے رہے ۔ یہ ایک امیر شاگرد سے محبت کا عالم تھا ۔ سنہ ۱۱۲۵ھ میں احمد عبرت فوت ہوئے جو معمولی دف نواز تھے مگر چوں کہ محبوب شاگرد تھے ، بیدل کافی دیر تک اشک بار[2] رہے ۔ شاگردوں کو اپنی خاص خاص چیزیں بطور یادگار عطا کیا کرتے تھے ، مثلاً عطاءاللہ عطا کو قلمدان دیا اور کل محمد معنی یاب خان شاعر کو عصا اور شمشیر ۔ علاوہ بریں تلامذہ کے ایک وسیع حلقے کو اصلاح دینے کا خان گدار فریضہ بھی بصد انبساط انجام دیا کرتے تھے ۔

ان کے تمام معمولات کو سامنے رکھا جائے تو یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان مصروفیتوں کے لیے وہ کس طرح وقت نکال لیا کرتے تھے ۔ الفاظ کی نوک پلک درست کرنا ، فصاحت اور بلاغت کے تقاضوں سے ہر ایک کو آگاہ کرنا ، مختلف اسالیب بیان کے متعلق واقفیت بہم پہنچانا ، مطالعے کے لیے موزوں اور مفید کتب تجویز کرنا ، اپنے عارفانہ اور حکیمانہ کلام کی تشریح اور ترتیب دواوین میں راہ نمائی ، یہ تمام کام وقت چاہتے تھے اور بیدل بڑی کشادہ دلی اور مستعدی کے ساتھ ان تمام کاموں کو انجام دیا کرتے تھے ۔ چوں کہ ان کا ہر عمل ان کی عظمت اور بزرگی اور ان کے خلوص و محبت کا آئینہ دار ہوتا تھا ، اس لیے تمام شاگرد دل و جان سے ان پر فدا تھے اور عمر بھر ان کے وفادار رہے ۔

بیدل کے وہ شاگرد اور نیازمند جو طبقۂ امرا سے تعلق رکھتے تھے ، اس لحاظ سے بڑے خوش نصیب ہیں کہ ان کی شخصیت ، قابلیت اور خلوص کے مطابق بیدل نے ان کے متعلق قطعات لکھے جو شفقت اور محبت سے سرشار ہوتے تھے ۔ عہد عالم گیری تک جن امرا کو مہمات عظیمہ کی انجام دہی

۱- خوشگو ، معارف ، مئی ۱۹۳۲ع ۔
۲- خوشگو ، معارف ، جولائی ۱۹۳۲ع ۔ مرآۃ الخیال ، ص ۳۴۲ ، ۳۴۳ ۔

کے لیے منتخب کیا جاتا تھا ، وہ بالعموم بڑی حویلیوں کے مالک ہوتے تھے۔ ان مبارک صفات کا اثر بعد میں بھی موجود رہا اس لیے ان کی ذہنی ، قلبی اور اخلاقی صفات کے مدنظر بیدل نے جب کبھی انھیں مخاطب کیا تو نظم و نثر کا ایک ایک لفظ حسین تصورات ، پُرخلوص جذبات اور گہرے مطالب کا آئینہ دار ہوتا اور یہ سب کچھ وہ بزرگانہ شفقت کے اظہار کے لیے کیا کرتے تھے۔ امیرالامرا حسین علی خان کے پیش کردہ تین لاکھ روپے قبول نہ کرنے کا واقعہ بیان ہو چکا ہے۔ ادھر یہ بے نیازی تھی اور ادھر شفقت و محبت کا یہ عالم تھا کہ جب امیرالامرا دکن میں تھے تو برسبیل استفسار حالات ایک قطعہ[1] لکھا جو حسن بیان اور خلوص کی جان ہے۔ استفسار کا انداز دلربا مندرجہ ذیل شعر میں دیکھیں :

می در قدحی ، گل بسری ، جام بدستی
رنگ چمنی ، موج گلی ، جوش بہاری

مسرور اور شادکام انسان کی تصویر اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے ؟ اپنے نیازمند امرا کے نام بیدل کے قطعات محبت اسی طرح کے ہیں۔ رنگین اور جذبات پرور۔ بعض تو ندرت خیال اور لطافت بیان کا شاہکار ہیں۔ ایک قطعہ[2] میں میر عنایت شاکر خان کو انتہائی شاعرانہ انداز میں کہتے ہیں ، میں مہجور آپ کے سفر میں بھی ہر جگہ آپ کے ساتھ رہا :

پیش می‌آمد بہر جا در رہت برگ گلی
پردہ بود آئینہ از دیدۂ حیران من
بہر پابوس تو ہر جا سبزۂ سر می کشید
داشت باخود نسخۂ از حسرت مژگان من
ہر کجا می خورد آواری بگوش نازکت
باطپش سر می کشید آنجا دل نالان من

میر عنایت اللہ شاکر خان پر بیدل بہت مہربان تھے۔ ان کے متعلق جتنے بھی قطعات ہیں ، حقیقت ہے آب کوثر سے ڈھلے ہوئے ہیں اور احساس کی طراوت ہے

۱- کلیات صفدری ، قطعات ، ص ۵۳ -
۲- کلیات صفدری نیز رقعات بیدل -

کہ ہر مصرع سے عقیدت ہی دل پذیر طریقے سے ٹپک رہی ہے ۔ ان کی آمد کی خوشی میں ایک قطعہ[1] لکھا ہے ۔ اس کے یہ دو شعر پڑھیں :

گلشن باغ امیدم نور چشم آورد بار
آنچہ در دل داشتم در دیدۂ تر یافتم
سر بزانو داشتم گفتند شاکر خان رسید
چشم وا کردم بہشتی را مصور یافتم

فارسی ادب میں ان قطعات کی نظیر تلاش کرنا مشکل ہے ۔ امرا نے خلوص دل سے ان کے سامنے اظہار نیازمندی کیا اور اس کا صلہ جہاں انہیں فیوض علمی کی صورت میں ملا ، وہاں ایسے حسین قطعات لکھ کر بیدل نے ان کے لیے لطیف و جمیل ادبی تاج محل تعمیر کر دیے ، جن میں وہ بڑے لطف سے ابدالآباد تک محو استراحت رہیں گے ۔

تعلقات کی اس وسعت اور گوناگونی کی بنا پر یہ امر از بس ضروری ہو چکا ہے کہ ہم بیدل کے جذبۂ بے نیازی پر از سر نو طائرانہ نگاہ ڈال لیں ، تاکہ کوئی مغالطہ باقی نہ رہ جائے ۔ اس جذبے کے مراحل ارتقا ایک بڑا دل چسپ موضوع ہیں ۔ عامۃالناس کے درمیان ، ارباب علم و فضل کی خدمت میں اور اولیاء اللہ کے حضور یہ شکستہ دلی ، عجز و نیاز اور خلوص و عقیدت کی صورت میں نظر آتا ہے ۔ جب ارباب ناز یعنی امرا سے واسطہ پڑتا ہے تو اگرچہ شفقت و محبت خلوص و ہم دردی کے جذبات اس کے ساتھ شامل رہتے ہیں ، لیکن وہاں یہ اپنی اصلی آب و تاب کے ساتھ دکھائی دینے لگتا ہے ۔ جہاں مقدم‌الذکر حضرات بیدل کو اپنا ممنون احسان سمجھتے تھے اور بیدل بھی اپنے ہر قول اور فعل سے یہی ظاہر کرتے تھے کہ دل و جان سے شکر گزار ہیں ، وہاں امرا کے دل میں یہ احساس موجود نظر آتا ہے کہ عبداللہ بیدل ایسے بے نیاز بزرگ نے ہماری طرف ملتفت ہو کر ہم پر احسان عظیم کیا ہے ۔ ان کی بے نیازی اب ایک قدم آگے بڑھتی ہے ۔ شاہان مغلیہ کے ساتھ معاملات میں اس کے ساتھ جلال اور بے اعتنائی کے عناصر شامل ہو جاتے ہیں ۔ سکندر اعظم کے ساتھ روایتی سور پر حکیم دیو جانس کلبی نے جس بے اعتنائی اور بے نیازی کا اظہار کیا تھا وہ زندہ وقار

۱- کلیات صفدری ، قطعات ، ص ۴۴ ، ۴۵ ، ۵۵ -

اور اتنی ہی بے غرضی کے ساتھ ہمیں بیدل کے ہاں اس مرحلے پر دکھائی دیتی ہے ۔ بیدل کا یہ جذبۂ ذہنی ارتفاع ، ان کی روحانی عظمت اور طبع سلیم کا بہت بڑا ثبوت ہے ۔

بیدل کی شخصیت کے صرف ایک اور پہلو کی طرف توجہ دے کر ہم اپنے طویل بیان کو ختم کرتے ہیں ۔ ان کی طبیعت میں ظرافت اور مزاح کے عناصر بھی موجود تھے ۔ ہاتھ میں لوہے کا ایک عصا[1] رکھا کرتے تھے جس کا وزن ۲۵ سیر تھا ۔ اس کا نام بولاس رکھ دیا تھا ، جس کے معنی ہیں شاخ نازک ۔ اس نام میں ظرافت کا پہلو پایا جاتا ہے ۔ ایک بار گھر سے نکلے ، ہاتھ میں یہی عصا تھا ، رستے میں ایک صاحب شیخ کبیر سے ملاقات ہوئی ۔ ان سے کوئی تیس سال سے مخلصانہ مراسم چلے آتے تھے اور تقریباً ہر روز ملاقات ہو جایا کرتی تھی ۔ شیخ صاحب نے از راہ تعجب اس شاخ نازک کا ذکر چھیڑ دیا ۔ میرزا صاحب نے بھی ظرافت کا پہلو اختیار کیا اور فرمایا :

"ست الاثبات ، زینت الصنحاء ، مونس الاعمی ، مدالضعفاء دافع الاعداء ۔"

ان پُر شکوہ الفاظ کے پس منظر کے طور پر میرزا صاحب کی آنکھوں میں ظرافت کی چمک صاف طور پر دکھائی دے رہی ۔ یہ ہلکی ہلکی ظرافت ہزل گوئی کی صورت بھی اختیار کر جاتی تھی اور بعض ہزلیات جن میں میرزائیت کا غلبہ ہے بڑی تلخ ہیں ۔ عطاء اللہ عطا کو ہرزہ گوئی کا چسکا تھا ، ان کے آنے پر میرزا صاحب اپنا موحدانہ کلام رکھ دیا کرتے تھے اور دیوان ہزلیات اٹھا کر فرمایا کرتے ۔ "تمام شاگردوں میں سے عطا کو اس دیوان کے تتبع کا حق حاصل ہے ۔" اس قسم کی ایک رباعی[2] سنیں :

غیبت حسی فعل ِ ربولت ایست
مغرور ِ کمالی و جسولت ایست
بعد از ریدن بشست و شو رنج مکش
از خبثِ دلی بشو کونت اینست

یہ کسی مولوی کا ذکر خیر تھا جو مغرور طبع ہونے کے علاوہ غیبت شعار بھی تھے ۔

۱۔ خوش گو ، معارف ، مئی ۱۹۴۲ء ۔
۲۔ کلیات صمدری ، قطعات ۔

بیدل کو لطف طبع موسیقی کی طرف بھی مائل کر دیا کرتا تھا اور خوش گو کا بیان ہے کہ انھیں فن موسیقی میں بڑی دسترس حاصل تھی، لیکن یہ ظرافت، یہ بزلہ گوئی اور موسیقی کے ساتھ یہ لگاؤ صرف چاشنیِ طبع کے لیے تھا۔ بہرحال ان کا وجود اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے، کہ بیدل اپنی عظمت کے بار گراں کے تلے دبے ہوئے نہیں تھے، بلکہ جس طرح چشمہ صاف سے آب شیریں لطف خرام کے ساتھ جاری رہتا ہے، حضرت بیدل کی تمام خوبیاں بھی ان کی فطرت نابغہ سے اسی طبعی روانی کے ساتھ ظاہر ہوتی رہتی تھیں اور یہی ایک عظیم انسان کی سب سے بڑی علامت ہے۔

(مجلہ انجمن عربی و فارسی دانش گاہ پنجاب، مئی و اگست، ۱۹۵۹ء)

---

(۳)

مزار بیدل

میرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی کا مزار ان دنوں[1] علمی دنیا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے ۔ ہند و پاک اور کابل کے کئی اہل علم اس مسئلے کے متعلق بڑی متانت سے غور کر رہے ہیں ۔ یہ بیدل کی پائیدار عظمت کی دلیل ہے کہ جب کہ اکثر خاصے بلند پایہ شعرا کے تمام حالات زندگی چند صفحات میں سما جاتے ہیں اس شاعر اعظم کی ایک ایک بات طویل بیان چاہتی ہے اور صرف مزار بیدل کے موضوع پر بڑی خامہ فرسائی ہو رہی ہے ۔ میں نے میرزا بیدل کے حالات زندگی دریافت کرنے میں بڑی تحقیق اور جستجو سے کام لیا ہے اور اس سلسلے میں کابل جانے کا اتفاق بھی ہوا ۔ اس لیے اپنی معلومات اہل علم کے سامنے پیش کر دینا ضروری سمجھتا ہوں ۔ ممکن ہے بعض باتیں ایسی نکل آئیں جن تک دوسروں کی رسائی نہ ہو سکی ہو یا کم از کم اس طرح باقی اصحاب کی بہت سی معلومات کی تائید و تصدیق ہو جائے ۔ نیز چوں کہ اپنے مقالہ[*] انگریزی میں مزار بیدل کے متعلق میں نے بہت سی تفصیلات نظر انداز کر دی تھیں ، اس لیے اس مستقل مضمون میں اب ان کا شامل کر دینا ممکن ہوجائے گا ۔ یہ امر ذہن نشیں کر لینا ضروری ہے کہ میرزا صاحب مرحوم کے مزار کا تذکرہ لکھنے کے لیے ہمیں اس وقت سے آغاز کرنا ہوگا جب وہ متھرا سے شاہجہان آباد مستقل اقامت کے لیے پہنچے ہیں ۔ اور پھر آج کل کے ایام تک ان تمام حالات و کوائف کا بیان کر دینا ضروری ہوگا جن سے کہ مختلف ادوار میں مزار بیدل دو چار رہا ۔ بیان کی اس ترتیب سے انشاءاللہ حقیقت ازخود ظاہر ہو جائے گی ۔

۱- یہ ۱۹۵۷ـ۵۸ء کی بات ہے جب کابل کے بعض اہل قلم ثابت کرنا چاہتے تھے کہ مزار بیدل وہاں ہے ۔

جب اورنگ زیب عالم گیر دکن میں مصروف جہاد تھے اور شمالی ہند کا نظم و نسق درہم برہم ہو چکا تھا ، آگرہ ، متھرا اور دہلی کے نواح میں ہندو جاٹوں نے فساد انگیزی کا آغاز کر دیا ، ہر طبقے کے مسلمانوں کے جان و مال غیر محفوظ ہو گئے اور ان کے لیے گھروں سے نکلنا بے سر کرنا حضرات کو دعوت دینے کے مترادف ہو گیا ۔ اگر ان جگر سوز حالات کا مطالعہ کیا جائے تو ۱۹۴۷ع میں تقسیم ہند کے دنوں کے الم ناک واقعات آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں ۔ جب اورنگ زیب عالم گیر نے مہم دکن کا آغاز کیا تو بیدل اپنے اہل و عیال سمیت متھرا میں قیام پذیر تھے اور بظاہر اپنی بقیہ زندگی وہیں بسر کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے ۔ متھرا کا نام اورنگ زیب نے اسلام آباد رکھ دیا تھا ۔ اور ممکن ہے متھرا کی بُت پرور فضاؤں میں صدائے توحید بلند کرنے کے لیے اس شاہ دین دار نے کچھ انتظامات کیے ہوں مگر بیدل کو تو ان فضاؤں میں بانسری کی وہ صدائے دل نواز سنائی دیتی تھی جو وفور شوق کی بنا پر وہاں صدیوں پہلے سری کرشن جی کی روح کی گہرائیوں سے بلند ہوئی تھی ۔ اس لیے وہ متھرا کے متعلق کہتے ہیں :

در زمینی کہ محبت اثری کاشتہ است
گرد او خرمن چندین طپش الپاشتہ است

لیکن جب ہندو جاٹوں کا تعصب ظاہر ہوا تو بیدل کی یہ رواداری وسیع مشربی بھی کام نہ آئی ۔ دو سال کا عرصہ انھوں نے سخت مصیبت اور پریشانی کی حالت میں گزارا ۔ متھرا کی گلی گلی غیر محفوظ ہو چکی تھی ؛ دن کو چین تھا نہ رات کو آرام ۔ مضافات سے جاٹوں کے ہاتھوں مسلم شرفاء اکابر علم و اتقیا کی توہین و تعذیب کی داستانیں برابر پہنچ رہی تھیں ۔ بیدل کے لیے وہاں زندگی بسر کرنا ایک مسلسل عذاب کی صورت اختیار کر گیا ۔ اس لیے لوگوں کے منع کرنے کے باوجود رستے کے خطرات سے بالکل بے نیاز ہو کر، اپنے اہل و عیال اور گھر کے اثاثے کو کرایہ کی بہلیوں پر لے کر عازم دہلی ہو گئے ۔

اس طرح میرزا صاحب اپنے کنبے کے ساتھ ۲۷ جمادی آخر ۱۰۹۱ھ مطابق ۳۱ مئی ۱۶۸۰ع کو دہلی وارد ہوئے ۔ وہاں پہنچنے کے بعد انھوں نے اپنے محب نواب شکراللہ خان کو ایک رقعہ لکھا ، جو ان دنوں بیراٹ کی طرف جاٹوں کی سرکوبی میں مصروف تھے ۔ باقی امور کے علاوہ اس تاریخی رقعے میں انھوں نے

ایک تو متھرا کے ترک کرنے کی وجہ لکھی :

"فریاد رسا ! حسب انقلاب احوالِ عالم حاصہ تھلکہٴ نواح اسلام آباد کہ دریں ایام ناموس صاحب قدرتاں ہم دراں سرزمیں بے معذری نیست تا بہ غرباء چہ رسد بے دست و پا چہ رسد ۔ معاونت فضل ایزدی را شامل حال خیریت مآل اندیشیدہ با پا شکستہ چند کہ بار گردن زندگی اند ، رخت سلامتی بیروں کشید و بست و ہفتم جمادی الآخر داخل دارالخلافت گردید ۔"

اور اپنے ورود کی وجہ بیان کرنے کے بعد یہ بھی لکھا کہ اب زندگی کے باقی ایام یہیں دارالخلافہ میں گزارنے کا ارادہ ہے ۔ اس لیے ایک مستقل مکان کا انتظام ضروری ہے ۔ فرماتے ہیں :

"ہرچند رزق مقدر در ہمہ حال و ہمہ جا معین و مقرر است ، اما آشیان جمعیت پریشانی مفقود و نا میسر ۔ گر دریں سواد موضعی کنار دریا یا لب شہر بہ سہولیت در اتفاق کشاید یا تکیہٴ اختیار نماید ، ما بقی مدت مہلتی کہ از نظر یقین مخفی است بی تشویش تعمیر مکان بسر برد ۔ اگر احیاناً طالع بیدل از دور اصلی بر نگردد دامن ارض اللہ واسعۃ زنجیر پائی ہرزہ جولانی نیست ۔"

صد عمرم چوں نگہ بیدل بحیرانی گزشت
گوشہٴ چشمی نہ شد پیدا کہ جا پیدا کنم

اب جن لوگوں کو علم ہے کہ سید نواب شکراللہ خاں اور ان کے تینوں فرزند نواب لطف اللہ خاں ، نواب شاکر خاں اور نواب کرم اللہ خاں بیدل کے کس قدر عقیدت مند تھے اور ان کے فکر اور شاعری کے کس طرح دل و جان سے مداح اور شیدائی تھے ، وہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بیدل کا دہلی میں ورود ان سب کے لیے کس قدر بہجت و مسرت کا باعث بنا ہوگا اور کس بے تابی سے انھوں نے کوشش کی ہوگی کہ جناب بیدل کے لیے مکان کا جلد از جلد انتظام ہو جائے ۔ رقعے میں اس بات کی طرف بھی اشارہ تھا کہ اگر مکان نہ ملا تو پھر کسی اور شہر کا رخ کرنا پڑے گا ۔ خاندان شکراللہ خاں بیدل کی وارفتہ مزاجی اور آزادمشی سے بھی پوری طرح آگاہ تھے ، اس لیے ان سب کو یقین تھا کہ اگر

دہلی میں مناسب اور موزوں مکان نہ مل سکا تو یہ مرد آزاد لازماً اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے گا اور یہ نعمت عظمیٰ ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے جاتی رہے گی۔

بایں‌ہمہ نواب شکراللہ خاں اور ان کے فرزند نواب شاکر خاں نے ایک نہایت ہی موزوں مکان تلاش کر لیا۔ بیدل چاہتے تھے کہ ان کا بسیرا دارالخلافہ کے ہنگاموں سے الگ ایک پُرسکون مقام پر دریائے جمنا کے کنارے ہو۔ ان کا فکر، ان کی تخلیقی دلچسپیاں اور ان کا پُرسکون مگر حلیم احساس جمال، یعنی ان کی شخصیت کے تمام تقاضے ایک اسی قسم کے گوشۂ تنہائی کو پسند کرتے تھے؛ چناں‌چہ وہ انھیں مل گیا۔ ان کے عزیز شاگرد اور رفیق بندرا بن داس خوشگو جنھیں کہ کم و بیش ایک ہزار بار مجلس بیدل میں باریابی کا شرف حاصل ہوا، اپنے 'سفینہ' میں لکھتے ہیں:

"بدارالخلافۂ شاہجہاں آباد رسیدہ کنج عزلت گزید۔ نواب شاکر خاں و نواب شکراللہ خان بیرون دہلی دروازہ و شہر پناہ در محلۂ کھیکریاں بر کنار گزر گھاٹ لطف علی حویلی مبلغ پنج ہزار روپیہ خریدہ نذر نمود۔ دو روپیہ یومیہ مقرر کردند کہ تا روز مرگ بہ ایشاں می رسید۔ بقیۂ عمر در آں مکان بفراغ سی و شش سال اوقات عزیز بسر برد۔"

خوشگو کے اس بیان سے پتا چلتا ہے کہ بیدل نے اپنی زندگی کے باقی چھتیس سال اسی مکان میں بسر کر دیے۔ یہ امر ہمارے لیے تعجب انگیز نہیں، اس لیے کہ وہ اس سے پہلے پورے اکتیس سال شمالی ہند کے مختلف شہروں میں چکر لگاتے رہے تھے۔ پنجاب میں حسن ابدال تک بھی آئے اور صبح و شام کے متواتر سفر کی وجہ سے اب وہ تنگ آ چکے تھے۔ ایام جوانی میں سیر و سفر موجب تفریح تھا مگر عمر کے زیادہ ہونے اور ذمہ‌داریوں کے بڑھ جانے سے اب مصیبت اور تکلیف کا موجب تھا۔ بیدل کے محولہ بالا رقعے کا آخری شعر ظاہر کرتا ہے کہ طویل مدت کی آوارہ گردی سے گھبرا کر وسعت آباد عالم میں ایک مختصر سا گوشۂ انزوا حاصل کرنے کی کتنی شدید آرزو ان کے دل میں موجود تھی، اس لیے جب ایسا گوشہ انھیں میسر آیا تو ایسے زمین گیر ہوئے کہ ہلنے کا نام تک نہ لیا۔ ہاں جب سادات بارہہ نے فرخ سیر کو عذاب دے دے کر ۱۱۳۱ھ میں قتل کر دیا اور بیدل نے بصد اندوہ و ملال یہ تاریخ کہی:

دیدی کہ چہ با شاہ گرامی کردند
صد جور و جفا ز راہ خامی کردند
تاریخ چو از خرد جستم فرمود
سادات بوی نمک حرامی کردند

تو سادات بارہہ ان کے غالب ہو گئے اور وہ خوف‌زدہ ہو کر ۷۷ سال کی عمر میں لاہور میں نواب عبدالصمد خاں کے پاس چلے گئے اور جب ۶ ذی الحج ۱۱۳۲ھ مطابق ۹ اکتوبر ۱۷۲۰ع کو امیرالامراء سید علی حسن خان بارہہ دکن میں طورہ کے مقام پر قتل ہوئے اور ان کے برادر اکبر قطب الملک سید حسن علی خان کو شکست ہوئی اور اس طرح سادات بارہہ کا اقتدار ختم ہوا اور محمد شاہ رنگیلے کا تخت و تاج محفوظ ہوگیا اور ملک میں از سرنو امن و امان قائم ہوا تو بیدل واپس شاہ جہان آباد پہنچے ۔ لیکن غالباً صعوبت سفر نے ان کی توانائی کو ختم کر دیا تھا ، اس لیے مراجعت کے چند روز بعد تپ محرقہ کے عارضے سے جمعرات ۴ صفر ۱۱۳۳ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۷۲۰ع کو وہ جہان فانی سے راہیٔ ملک بقا ہوئے ۔ خوشگو کہتے ہیں :

”قصہ مختصر در سال یازدہ ہزار و سی و سوم در ایامیکہ ابوالفتح ناصر الدین محمد شاہ پادشاہ غازی بر سادات بارہہ مظفر و منصور شدہ . . . . حضرت بیدل را در ماہ محرم عارضہ تپ روی داد . . . . یوم پنج شنبہ چہارم ماہ صفر سہ گھڑی روز برآمدہ ہمای روح پر فتوح آن زندہ بعیش سرمدی ار آشیانہ تن بال و پر افشاندہ بر ساکنان عرش معلی سایہ انداخت و بوصال حقیقی کامیاب گردید ۔ رحمۃ اللہ علیہ ۔“

خوش‌گو نے اس موقع پر دو تاریخیں کہیں ۔ ایک تو یہ سادہ تاریخ تھا :

یوم پنج شنبہ چہارم ماہ صفر

اور دوسری مندرجہ ذیل رباعی تھی :

افسوس کہ بیدل از جہان روی نہفت
وان جوہر پاک در تہ خاک نجفت
خوشگو چو ز عقل کرد تاریخ سوال
”از عالم رفت میرزا بیدل“ گفت
۱۱۳۳ھ

سراج الدین علی خاں آرزو ، عطاء اللہ عطا اور دیگر شاگردان بیدل نے بھی تاریخیں کہیں ۔

میرزا مرحوم کو ان کی خواہش کے مطابق اپنے گھر کے صحن میں ہی دفن کیا گیا ۔ خوشگو کہتے ہیں :

”در ہمان حویلی اقامت گاہ کہ چبوترہ برائے قبر خود از مدت ده سال راست کردہ بودند بخاک سپردند ۔“

خوشگو کے اس بیان کی تائید تمام تذکرہ نویس کرتے ہیں ۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی جو ۱۱۱۶ھ میں پیدا ہوئے اور اس لحاظ سے بیدل کے ہم‌عصر ہیں ، اپنے تذکرۂ سرو آزاد میں تحریر کرتے ہیں :

”(بیدل) در صحن خانۂ خود مدفون گردید“

اپنے تذکرہ 'خزانۂ عامرہ' میں بھی وہ اپنے اسی بیان کا اعادہ کرتے ہیں ۔ انند رام مخلص جو بیدل کے شاگرد تھے اور ۱۱۶۴ھ میں فوت ہوئے ، اپنے قلم سے ایک تحریر چھوڑ گئے ہیں ، جو مولانا ڈاکٹر محمد شفیع صاحب کے پاس ہے[۱] اور جس کا عکس انھوں نے اورینٹل کالج میگزین بابت ماہ نومبر ۱۹۴۹ع میں شائع کرایا تھا ؛ اس میں درج ہے :

”در سال یک ہزار و یک صد و سی و سہ ودیعت حیات سپردند و در صحن حویلی بیوتت قبر ایشان است ۔“

حسین قلی خان عظیم آبادی نے اپنا تذکرہ 'نشتر عشق' ۱۲۳۳ھ میں مکمل کیا ، وہ بھی رقم طراز ہیں :

”(بیدل) در صحن مکان خودش بر لب آب جون مدفون شد ۔“

مندرجہ بالا تمام بیانات سے مزار بیدل کا محل وقوع متعین ہو گیا ہے ۔ دہلی دروازہ اور شہر پناہ کے باہر ، دریائے جمنا کے کنارے ، کھیکریوں کے محلے میں لطف علی کی حویلی کے صحن میں بیدل دفن ہوئے ۔ ان تفصیلات کو سامنے رکھ کر ان کی قبر کو اب بھی تلاش کیا جا سکتا ہے ۔ اس وقت ان کو وفات پائے سن عیسوی کے لحاظ سے پورے ۲۳۸ سال (۱۹۵۸ - ۱۷۲۰) گزر چکے ہیں ۔ خواہ اس طویل عرصے میں ان کی قبر کے نشانات مکمل طور پر بھی کیوں نہ مٹ

۱۔ یہ مقالہ لکھا گیا تو مولانا محمد شفیع زندہ تھے ۔

چکے ہوں ، صاحب ملاش دہلی ایسے شہر میں اس کا محل وقوع اب بھی ڈھونڈ سکتا ہے ۔ لیکن ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ تاریخی نقطۂ نگاہ سے بیدل کا مزار کن ادوار میں سے گزرا ۔ یہ بیان بڑا بصیرت افروز ہے اور اس میں کئی عبرتیں پنہاں ہیں ۔

بیدل کی وفات دارالخلافہ دہلی کا ایک معمولی سانحہ نہ تھی ۔ امرا ، شعرا اور عوام الناس میں ایک تہلکہ رونما ہو گیا ۔ سب لوگ اس بلند شخصیت والے انسان کو ہاتھوں سے کھو کر سخت غم زدہ تھے ، جو علم و فضل ، حکمت و تصوف ، ادب و شعر ، اخلاق و کردار کی ان تمام روایات کا زندہ پیکر تھا ، جو فکر انسانی نے اس وقت تک قائم کی تھیں ۔ نگاہیں اب اس مرد کامل کو ڈھونڈتی تھیں ، جو شجاعت و ہمت میں رستم زماں تھا ، جذب و شوق کے اعتبار سے بایزید وقت ، مسائل تصوف کو زبان شعر میں بیان کرنے کے لحاظ سے اپنے عہد کا سنائی[۳۳] ، فارسی زبان کا ابن العربی[۳۴] ، زبان پر قدرت رکھنے کے اعتبار سے خاقانی دوراں ، حسن بیان میں سعدی زماں ، درد و سوز سے حافظ کی طرح لبریز ، لطافت ذوق کے لحاظ سے بے مثل و بے نظیر ، استغنا اور کردار کی بلندی کے خیال سے حکمائے یونان کا مثیل ، دقت نظری میں فکر ہندی کا پرور اور رومی[۳۵] کی طرح للہیت کا زندہ نمونہ ۔ اور پھر ان تمام صفات عدیدہ اور اس عظمت کے باوجود نہایت ہی متوسع اور منکسر المزاج ، امیر و غریب کا غمگسار ، محتاجوں اور مسکینوں کا ہم درد ، مسلم اور ہندو کا دوست ۔ خوش گو اپنی مندرجہ بالا رباعی میں انہیں 'جوہر پاک' کہتے ہیں ، یعنی تمام خوبیوں کا نہایت ہی پاکیزہ نچوڑ ۔ ایک اور موقع پر کہتے ہیں :

"بہ جامعیت کمالات ، حسن اخلاق ، بزرگی و ہمواری ، شگفتگی و رسائی ، تیز فہمی و زود رسی ، و انداز سخن گفتن و آداب معاشرت و حسن سلوک و دیگر خصائل انسانی ہمچو وی ندیدہ ام ۔"

اور پھر بیدل کی شخصیت کا طبائع پر جو اثر پڑتا تھا ، اس کے متعلق کہتے ہیں :

"غنچۂ پیشانی وسیع داشتند کہ گوئی قلم تقدیر جمیع کمالات انسانی برو مرتسم کردہ ۔"

یہ اس صاحب نظر کے خیالات ہیں جو دوسرے بے شمار اصحاب کی طرح متواتر سالہائے دراز تک مجالس بیدل کا زلہ ربا رہا تھا اور ملفوظات بیدل کے نام سے ان مجالس کے اذکار طیبہ کی از خود تدوین کی تھی ۔ اس لیے جب یہ بزرگ وار رہگرائے عالم جاودانی ہوئے تو بزم دہلی اپنی تمام رونقوں کے باوجود ان کے نیازمندوں کے لیے سونی ہو گئی ۔ وہ جوہر پاک پردۂ غیب کے پیچھے پنہاں ہوگیا جس کی محفل ہائے شانہ روزے چھتیس سال تک ان کے لیے قلب و نظر کی زندگی کا موجب بنی رہی تھیں ۔ ان کے عقیدت مندوں کے لیے اب صرف ایک بات وجہ تسکین ہو سکتی تھی اور وہ یہ کہ ان کی مبارک یاد کو تازہ رکھنے کے لیے سال بہ سال عرس بیدل منایا جائے ۔ چناں چہ ان کے ماموں زاد بھائی میرزا عباداللہ کے فرزند میرزا محمد سعید کو بیدل کا سجادہ نشین مقرر کیا گیا جن کے ذمے مزار بیدل کی حفاظت اور عرس کے انتظامات کی تکمیل تھی ۔ اس طرح ایک ایسی تقریب کا آغاز کر دیا گیا ، جو دہلی کی علمی اور ادبی زندگی کے لیے بے حد اہمیت کی حامل تھی اور جس کے بڑے دور رس نتائج برآمد ہوئے ۔ اب ہم دیکھیں گے کہ رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ عرس بیدل کی کیا کیفیت و حالت رہی ۔

بندرا بن داس خوشگو نے اپنا 'سفینہ' دو جلدوں میں ۱۱۴۷ھ میں مکمل کیا ۔ اس میں عرس بیدل کا ذکر بھی موجود ہے ، یعنی وفات بیدل کے بعد تیرہ سال تک ان کا عرس جس اہتمام سے منایا جاتا تھا ، اس کا بیان ہم خود خوشگو کی زبانی سن سکتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ عرس کے موقع پر کلیات بیدل مزار کے پہلو میں رکھ دیا جاتا تھا ۔ یہ کلیات خود بیدل نے اپنی زندگی میں لکھوایا تھا ۔ ایک سطر میں چار مصرعے تھے ، کل ننانوے ہزار شعر اس میں درج تھے ۔ وزن چودہ سیر تھا ۔ کلیات کے ساتھ قبر کے پہلو میں تبرک کے طور پر بیدل کا عصا بھی موجود ہوتا تھا ۔

عصا کا نام 'پولاس' تھا جس کا مطلب ہے شاخ نازک ۔ اس ''شاخ نازک'' کا وزن ۳۵ سیر شاہجہانی تھا ۔ مضبوط پنجے رکھنے والے لوگ دونوں ہاتھوں سے بزور تمام اٹھا سکتے تھے ۔ خوشگو لکھتے ہیں :

''لیکن کسی حمل بر اغراق و مبالغہ کند باید کہ بیاید و
بہ چشم عبرت بین ملاحظہ قدرت قادر قوی نماید :
بیا بسم اللہ اینک گوی و میدان''

قدرت قادر قوی سے پوری طرح لطف صرف اسی وقت اٹھایا جا سکتا ہے جب یہ بات ذہن میں رہے کہ میرزا صاحب کا اسم گرامی عبدالقادر تھا اور طاقت و شجاعت کے لحاظ سے وہ رستم ثانی تھے ۔ اسی لٹھ کے متعلق خوشگو ایک لطیفہ بھی لکھتے ہیں ؛ کہتے ہیں کہ ایک روز میرزا مرحوم لٹھ لیے گھر سے باہر نکلے ۔ شیخ کبیر راستے میں مل گئے ۔ شیخ صاحب دیرینہ ہم صحبت اور آشنا تھے اور بلاناغہ متواتر تیس سال تک ان کی زیارت سے مستفیض ہوتے رہے تھے ۔[1] شیخ صاحب نے برسبیل ظرافت اس میک سی چھڑی کا ذکر چھیڑ دیا ۔ بیدل نے زیر لب مسکراتے ہوئے مندرجہ ذیل پانچ مقفی فقرے عصا کی تعریف میں فی البدیہہ کہہ دیے :

''سنت الانبیاء ، زینت الصلحاء ، مونس الاعمیٰ ، مد الضعفاء ، دافع الاعداء ۔''

اور اس کے بعد فرمایا کہ شر اعداء کے دفعیے کے لیے مضبوط عصا چاہیے ۔ یہ واقعہ جب ہوا ہے ، میرزا صاحب کی عمر ستر سال سے یقیناً متجاوز تھی ۔

خوشگو اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں : عرس کے روز مزار بیدل کے پاس مذکورہ بالا قلمی کلیات اور عصا دونوں رکھ دیے جاتے تھے ۔ لوگ سمجھتے تھے کہ ایسا ماحول پیدا ہو چکا ہے جو بیدل کی یاد تازہ کرنے میں مد ہو سکتا ہے ۔ شعرا کا مجمع ہوتا تھا ۔ شہر کے تمام نازک خیال اکٹھے ہو جاتے تھے ۔ پہلے 'کلیات بیدل' سے ایک غزل پڑھی جاتی تھی اور پھر ہر ایک باری باری اپنی داتی جوہر کا اظہار کرتا تھا ۔ اپنا اپنا تازہ کلام سنایا جاتا اور ایک نہایت ہی پر لطف مجلس شعر المقاد بزیر ہوتی تھی ۔ میرزا محمد سعید جانشین بیدل مجلس آرائے عرس ہوا کرتے تھے ۔ خوشگو اس پُر رونق اور روح پرور محفل کو دیکھ کر دعا دیتے ہیں :

''چشم بد تمرقہ ازاں مجمع رنگین دور باد''

مجمع رنگین کی ترکیب اس مجلس کی ہیئت اور حقیقت کو اچھی طرح واضح کر رہی ہے ۔

۱۔ میرزا صاحب دہلی میں مستقل طور پر ۳۰ سال کی عمر میں رہائش پذیر ہوئے اور پھر وہاں شیخ کبیر سے متواتر تیس سال تک ملاقات ہوتی رہی ۔

بیدل کی زندگی میں ان کی مجلس شبینہ نے شعر فہمی اور شعر گوئی کا اعلیٰ درجے کا مذاق پیدا کرنے میں جو مسیحائی اثر دکھایا ہے ، اسی کے زیر نظر لالہ سکھراج سبقت شاگرد بیدل نے مندرجہ ذیل رباعی کہی تھی ؛

آں ذات احد قدرت تنزیہہ مقام
عبدالقادر نمود تشبیہش نام
شد زندہ ازو بہر مسیحائی دین
آمد دگر اکنوں پی احیای کلام

فرماتے ہیں ایک عبدالقادر مسیحائی دین کے لیے پیدا ہوئے اور اب دوسرے احیائے کلام کے لیے تشریف لائے ہیں - لیکن اب عرس بیدل کی روئداد پڑھ لینے کے بعد یہ اضافہ کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ جس طرح صوفیائے کرام کے نزدیک حضرت عبدالقادر جیلانی اپنے وصال کے بعد بھی روحانی تربیت فرماتے ہیں ، جناب عبدالقادر بیدل بھی عالم بقا کو سدھار جانے کے بعد عرس کے ذریعے شعر و شاعری کو زندگی بخشنے کا موجب ثابت ہوئے -

سفینۂ خوشگو نے ہمیں ۱۱۴۷ھ تک کے حالات سنائے ہیں - اب ہمیں آگے بڑھنا چاہیے اور کسی اور ماخذ سے استفادہ کرنا چاہیے - ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۹ء میں ہندوستان پر نادر شاہ حملہ آور ہوئے - محمد شاہ رنگیلے کی بے بسی ، دہلی کا قتل عام اور دارالخلافہ کی لوٹ کھسوٹ ہر ایک کو معلوم ہے - ان روح فرسا ایام میں تدارک احوال کے لیے نظام الملک آصف جاہ دکن سے دہلی آئے - ان کے ساتھ ان کا ایک جوان سال درباری نواب درگاہ قلی خان بھی تھا - نواب موصوف کے حالات خزانۂ عامرہ ، گل رعنا اور تذکرۂ بے نظیر سے پڑھے جا سکتے ہیں - وہ تلوار کے دھنی ہونے کے علاوہ اردو اور فارسی کے صاحب ذوق شاعر بھی تھے - دہلی کی اس وقت کی مجلسی زندگی اور معاشرت کے متعلق انھوں نے ایک کتاب فارسی زبان میں 'مرقع دہلی' کے نام سے لکھی - وہ خود شاعر تھے اور ان کے مخدوم نظام الملک آصف جاہ شاعر ہونے کے علاوہ بیدل کے تلمید بھی تھے ، اس لیے قدرتی طور پر ہر دو نے عرس بیدل سے خاص دلچسپی کا اظہار کیا ہوگا - یہی وجہ ہے کہ 'مرقع دہلی' میں اسی سلسلے میں کافی معلومات موجود ہیں ، اس لیے ہم ان سے استفادہ کرتے ہیں -

نواب درگاہ قلی خان مزار بیدل کے متعلق ایک عجیب فقرہ لکھتے ہیں :

"تربت سوروں ایشاں در دہلی کہنہ در حویلہ مختصر برنگ معنی خاص در الفاظ رنگین واقع شدہ۔"

اس فقرے کا ایک ایک لفظ معنی خیز ہے اور اس حقیقت کی طرف بلیغ اشارہ کر رہا ہے کہ تربت بیدل کی غور و پرداخت ان کے نیازمند بڑی توجہ اور اہتمام سے کیا کرتے ہیں۔ اس فقرے کو پڑھنے سے ذہن میں یہ نقشہ ابھرتا ہے کہ ایک مختصر سی مگر خوب صورت حویلی تھی، جس کو آراستہ کرنے کے لیے ذوق جمال کا اظہار بڑی ادا شناسی سے کیا گیا تھا۔ اس کے وسط میں تربت تھی جس کا تعوید اور رنگ و روغن اپنے حسین ماحول سے ایسی مناسبت رکھتا تھا گویا الفاظ رنگیں میں معنی پر کیرہ اپنی آب و تاب دکھا رہا ہے۔ اسی لیے تربت کا لفظ زبان پر لاتے ہی نواب موصوف کا خیال معاً اس کی موزونیت کی طرف منتقل ہوگیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مزار بیدل ان دنوں اپنے پورے جمال و جلال کا اظہار کر رہا تھا اور اگرچہ اس کا کوئی گنبد تعمیر نہیں کرایا گیا تھا، تاہم مزار اور اس کا ماحول دونوں فن آرٹ کا ایک دل کش نمونہ تھے۔

نواب درگاہ قلی خاں عرس بیدل کا ذکر کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہے ہیں اور وہاں طبیعت کو جو سرور حاصل ہوا تھا، اس کا اظہار کر رہے ہیں اور آنکھوں دیکھنے میں شک ہی کیا ہے۔ نظام الملک ایسا معتقد اور مداح بیدل دہلی میں موجود ہو اور عرس میں اپنے رفقاء کے ساتھ حصہ نہ لے، یہ کیسے ممکن ہے۔ تاریخ جہاں کشائے نادری کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ نادر شاہ ۷ صفر ۱۱۵۲ھ کو شاہ جہان آباد میں ستاون روز قیام کے بعد سرہند کے راستے واپس لوٹا۔ لہٰذا اس تاریخ سے پہلے نظام الملک کے شاہ جہان آباد کو خیر باد کہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے ۳، ۴ صفر ۱۱۵۲ھ کو جب کہ عرس بیدل منایا گیا ہوگا، نظام الملک وہیں دارالخلافے میں موجود تھا۔ علاوہ بریں تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ نظام الملک نادر شاہ کی مراجعت کے بعد کم و بیش ڈیڑھ سال تک دہلی میں رہا، اس لیے نواب درگاہ قلی خاں کا بیان بالکل عینی شہادت پر مبنی ہے۔

نواب صاحب لکھتے ہیں کہ ماہ صفر کی تیسری تاریخ کو عرس منایا جاتا ہے۔ بیدل کے تلامذہ اور شہر کے تمام موزوں طبع لوگ ان کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ قبر کے اردگرد مجلس ترتیب دی جاتی ہے۔ ان کا کلیات

جو بڑا خوشخط لکھا ہوا ہے ، حلقے کے درمیان رکھ لیا جاتا ہے ۔ شعر خوانی کا افتتاح اسی میں سے ہوتا ہے ۔ کلیات کے عنوان پر مندرجہ ذیل رباعی مرقوم ہے :

اے آئینۂ طبع تو ارشاد پذیر
در کسب فوائد تنزّل تقصیر
مجموعۂ فکر ما صلائے عام است
میری کن و دست تسلی بر گیر

اس کے بعد تمام شعراء کی طرف سے علیٰ قدر مراتب اپنے تازہ افکار حاضرینِ مجلس کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں ۔ غزل خوانی کی ابتدا بیدل کے شاگرد رشید معنی یاب خاں کے کلام سے ہوتی ہے اور :

"حلاوت طرفہ بحصول می پیوندد و انبساط خاص بحضار عاید می گردد ۔"

نواب صاحب مزید لکھتے ہیں کہ بیدل کے برادر زادہ محمد سعید جو معنی یگانہ کی طرح میرزا کی نسبت معنوی سے یگانہ ہیں ، حاضرین مجلس کی خاطر تواضع اور شمع و چراغ کا انتظام کرنے میں بڑی مستعدی اور عرق ریزی کا اظہار کرتے ہیں ۔ میرزا محمد سعید کی معیشت کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کا تمام تر دار و مدار ان معاجین اور حبوب کی فروخت پر ہے ، جن کی اختراع میرزا بیدل نے کی تھی جو او قبیل کیمیا ہیں اور دہلی بھر میں انگشت نما ۔

سطور مافوق میں معنی یاب خاں کا ذکر آیا ہے ۔ ان کا مکمل نام گل محمد معنی یاب خاں ہے اور محض شاعر تھا ۔ آزاد بلگرامی اور خوشگو نے بھی ان کا ذکر کیا ہے ۔ انہیں بیدل کے شاگردوں میں امتیاز حاصل تھا ۔ میرزا کو ان سے بڑی محبت تھی ۔ میرزا کی وفات کے بعد معنی یاب خاں ان کے متعلقین کی خدمت بڑی باقاعدگی سے کرتے رہے ۔ جب تک زندہ رہے ، ان کی وجہ سے میرزا کے عرس کا ہنگامہ پوری طرح گرم رہا ۔ ان کی وفات ۱۱۵۷ھ میں ہوئی ۔ اس طرح ہم مزار بیدل کے حالات قلم بند کرتے ہوئے اس سال تک پہنچ جاتے ہیں ۔

عرس بیدل کے سلسلے میں نواب درگاہ قُلی خاں ، سراج الدین علی خان آرزو کا ذکر بھی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مشتاقان دید کو ان کی زیارت اتفاقی طور پر نصیب ہوتی ہے مگر عرس کے روز بیدل کی نسبتِ شاگردی کی بنا پر خاص طور پر بزم آرا ہوا کرتے ہیں اور ایک عالم کو اپنے پاکیزہ افکار سے مستفیض

اور ممنون احسان کیا کرتے ہیں ۔ خود خان آرزو نے اپنے تذکرہ 'مجمع النفائس' میں عرس بیدل کا ذکر کیا ہے ۔ کہتے ہیں :

''کلیاتش روز وفات او کہ چہارم از شہر صفر باشد و ہمیں تاریخ وفات اوست و مردم ہندوستان آن روز چراغاں کنند و طعام پختہ بخلایق دہند و عرس نامند پیوستہ زیارت کردہ می شود ۔''

کلیات کا ذکر جیسا کہ سطور بالا سے معلوم ہوتا ہے ، خوشگو اور نواب درگاہ قلی خاں نے بھی کیا ہے ۔ نواب موصوف نے عرس کی تاریخ سوم صفر لکھی ہے اور خان آرزو نے چہارم ۔ چوں کہ وفات بیدل ۴ صفر کو ہوئی تھی اور نواب صاحب بھی عرس میں شرکت کرنے والوں میں سے نظر آتے ہیں ، اس لیے جیسا کہ عام طور پر تمام بزرگوں کے عرس کا حال ہوتا ہے ، عرس بیدل بھی دو یوم کے لیے منایا جاتا ہوگا ۔ ۳ صفر کو ابتدائی مجلس منعقد ہوتی ہوگی اور ۴ صفر کو دوسری اور آخری ۔ علاوہ بریں یہ بھی ممکن ہے کہ نواب صاحب اپنی سیاسی مصروفیتوں کی وجہ سے صرف ۳ صفر کی مجلس میں شامل ہوتے ہوں ۔ بہرحال دونوں تاریخیں درست اور قرین قیاس نظر آتی ہیں ۔ خان آرزو نے چراغاں کرنے اور طعام پکانے اور تقسیم کرنے کا ذکر بھی کیا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے لوگ عرس بیدل دھوم دھام اور پوری عقیدت کے ساتھ منعقد کیا کرتے تھے ۔

بیدل کے ایک اور ممتاز شاگرد آنند رام مخلص بھی عرس کا ذکر اپنی مذکورہ بالا تحریر میں کرتے ہیں ۔ لکھتے ہیں :

''قبر ایشاں زیارت گاہ معتقدان و ہر سال محفل عرس منعقد می شود ۔''

مخلص نے لفظ زیارت گاہ کا اضافہ کیا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محض شعرا اور شاگرد وہاں حاضر نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ وہ لوگ بھی ، جو بیدل کی روحانیت کے بھی قائل تھے ۔ خان آرزو کا چراغاں کرنے اور طعام پختہ غربا میں تقسیم کرنے کا بیان بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد بیدل کو عارف کامل سمجھتے ہوئے ان کے مزار مقدس کی زیارت کرنے کے لیے آیا کرتی تھی اور حصول ثواب کے لیے وہاں خیرات بھی تقسیم کرتی تھی ۔ آنند رام مخلص ۱۱۶۴ھ میں فوت ہوئے اور خان آرزو ۱۱۶۹ھ میں ۔ اس سے ہم

یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ بیدل کی وفات کے بعد ان کے عرس کی تقریبات میں کم از کم تینتیس چونتیس سال تک خود ان کے شاگرد حصہ لیتے رہے۔ ہم نے عمداً عرصہ کم رکھا ہے کیوں کہ خان آرزو اپنی زندگی کے آخری ایام میں دہلی کو خیرباد کہہ گئے تھے۔

لیکن شاگردوں کے فوت ہو جانے کے باوجود عرس بیدل برابر جاری رہا۔ ان کے سجادہ نشین محمد سعید کا ذکر بعد میں کوئی تذکرہ نگار نہیں کرتے۔ معلوم ہوتا ہے، فوت ہو گئے ہوں گے یا سیاسی افراتفری سے خوف زدہ ہو کر چلے گئے ہوں گے۔ ان کی اولاد میں سے اردو زبان کے ایک شاعر میرزا فضل اللہ کا ذکر مجموعۂ نغز میں ملتا ہے، جو پانی پت کے متوطن تھے۔ ممکن ہے میرزا محمد سعید یا ان کے اخلاف دہلی کے سیاسی انقلابات سے ڈر کر پانی پت ہجرت کر گئے ہوں۔ جہاں تک عرس کا تعلق ہے، یہ کم و بیش مزید بیس سال تک ضرور جاری رہا۔ غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنا تذکرہ 'خزانۂ عامرہ' ۱۱۷۶ھ میں مکمل کیا۔ اس میں وہ عرس بیدل کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انھوں نے دیوان بیدل کا نسخہ اس کلیات سے نقل کیا ہوا خریدا، جو مزار بیدل پر موجود رہتا تھا۔ آزاد بلگرامی میر عبدالولی عزلت کی زبانی بیدل کی ایک کرامات کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ سرو آزاد میں درج ہے کہ میر صاحب موصوف شاہجہان آباد میں پہلی بار ۲۰ جمادی الاول ۱۱۶۳ھ کو پہنچے ہیں۔ اس لیے عرس بیدل میں وہ ۳، ۴ صفر ۱۱۶۵ھ سے پہلے شامل نہیں ہو سکتے۔ میر صاحب کا بیان ہے کہ عرس کے موقع پر بیدل کی قبر پر گیا، شاہجہان آباد کے تمام شعرا جمع تھے۔ میرزا کا کلیات حسب معمول لائے تھے اور مجلس میں کھولے بیٹھے تھے۔ اس نیت سے کہ آیا میرزا مرحوم کو ہماری آمد کا علم بھی ہے یا نہیں، میں نے کلیات کو کھولا۔ پہلے صفحے پر ابتدا میں یہ مطلع تھا:

چہ مقدار خوں در عدم خوردہ باشم
کہ بر خاکم آئی و من مردہ باشم

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، نادر شاہ ۷ صفر ۱۱۵۲ھ کو دہلی سے واپس ہوئے۔ اپنے قیام دہلی کے دوران میں ارتکاب خوں ریزی کے علاوہ انھوں نے ہندوستان کی دولت بھی جی بھر کر لوٹی۔ چناں چہ شہرۂ آفاق تخت طاؤس کے ساتھ وہ بے اندازہ زر و جواہرات بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ تاریخ جہان کشائی نادری کا مصنف

اس تمام دولت کے سہرے کے سلسلے میں لکھتا ہے:

"حاصل بحر و کان و ظروف زرین و سیمین و اوانی و اسباب مرصع جواہر ثمین و اجناس نفیسہ چنداں بقلم ضبط در آمد کہ محاسبان اوہام و دفتر نویسان افہام از حصر و احصائے آں عاجز آمدند۔ از آنجملہ تخت طاؤسی بود۔"

لیکن اس تمام قتل اور لوٹ کھسوٹ کے باوجود بھی دہلی جو عہد تیموریہ کا حصن تھی، منتشر نہ ہوئی۔ نہ اہم ناک صورت حالات اس وقت پیدا ہوئی جب نادر شاہ سے بیس بائیس سال بعد احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر پے در پے حملے شروع کر دیے اور بالآخر سلطنت دہلی بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی۔ مغل امراء ہوس اقتدار میں باہم دست و گریباں ہوئے۔ مرہٹہ گردی شروع ہو گئی۔ روہیلوں نے عجیب طوفان بدتمیزی بپا کیا اور انجام کار غلام قادر روہیلہ نے امیر تیمور کے فرزند شاہ عالم ثانی کی آنکھیں ظالمانہ طور پر نکلوا دیں اور تیموری مخدرات کو عریاں ناچنے[1] پر مجبور کر دیا۔

مولانا محمد حسین آزاد 'آب حیات' میں لکھتے ہیں کہ احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے ہندوستان کو تہ و بالا کر دیا، اور میر تقی میر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ سلطنت کی تباہی اور مرہٹہ گردی میں شرفاء مفلوک اور تباہ ہو گئے۔ اور خدا جانے کیسے لوگ پریشان ہو کر دلی سے نکل کھڑے ہوئے۔ کوئی فرخ آباد گیا، کوئی لکھنؤ اور کوئی اور آگے بڑھ گیا۔ 'تذکرۂ گل رعنا' کے مصنف عبدالحی بھی یہی اندوہ ناک داستان بیان کرتے ہیں اور اگرچہ دہلی کی اسی عام تباہی اور بربادی کا شکار آخرکار مزار اور عرس بیدل بھی ہو گیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ چوں کہ عرس بیدل میں تہذیب و ثقافت اور مسلمانان ہند کی ادبی اور علمی روایات کی مشعل فروزاں کی صورت اختیار کر گیا تھا، اس لیے اس مشعل کو باد مخالف کے جھونکوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی گئی۔ حالات انتہا درجے کے ناسازگار تھے لیکن عرس بیدل پھر بھی منعقد ہوتا تھا۔ اور ادب اردو میں عرس کے ان ایام کے ساتھ ایک خاص واقعے کی یاد وابستہ ہو گئی ہے۔ مولانا ندرت کشمیری

۱۔ اہل تحقیق اس واقعے کو آخری حد تک افترا قرار دیتے ہیں اگرچہ علامہ اقبال نے اسے بے حد درد دل کے ساتھ 'بانگ درا' میں نظم کیا ہے۔

اور میرزا محمد رفیع سودا کی باہمی چپقلش سے تاریخ ادب اُردو کے تمام طالب علم بخوبی آگاہ ہیں ۔ عرس بیدلؔ پر مولانا ندرت نے میرزا سودا کی ہجو میں ایک فارسی غزل پڑھی ۔ آبِ حیات کے بیان سے اندازہ لگاتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا مطلع یہ تھا :

خونِ معنی تا رفیع بادہ پیما ریختہ
آبروی ریختہ از حوش سودا ریختہ

میرزا سودا نے اس غزل کو مخمس کرکے ندرت کشمیری پر اُلٹ دیا اور اس غریب کی ہجو میں ایک اور مخمس بھی کہا جس کے مندرجہ ذیل بند میں عرس بیدلؔ کا ذکر ہے :

ایسی غزل کا عرس میں تم سے جو انصرام ہو
جو میں جس کی ہر طرح شبہ خاص و عام ہو
تقطیع اس کی جس کے صبح سے تا بشام ہو
اس کی طرف سے آخرش تم کو یہی پیام ہو
گھوڑے کو دو نہ دو لگام مجھ کو تنک لگام دو

’آبِ حیات‘ میں دیے ہوئے حالات و واقعات کی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ میرزا سودا دہلی کے حالات سے تنگ آ کر ۱۱۸۵ھ کے لگ بھگ[1] دہلی سے نکلے ۔ پہلے فرخ آباد پہنچے اور پھر لکھنؤ گئے جہاں بقول خواجہ منظور حسین دہلی کی بہار سے بزم سخن آراستہ ہو رہی تھی[2] ۔ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ۱۱۸۵ھ مطابق ۱۷۷۱ع تک ہمارے پاس عرس بیدلؔ منائے جانے کے شواہد موجود ہیں ۔

لیکن جب عرس منانے والے ہی جان بچانے کی خاطر دہلی سے بھاگ رہے تھے ، عرس کیسے قائم رہتا ۔ اس لیے جب غلام ہمدانی مصحفی نے ۱۱۹۹ھ یعنی بارھویں صدی ہجری کے اختتام پر اپنا تذکرہ عقد ثریا لکھا تو حضرت بیدلؔ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

۱- لگ بھگ سے مراد یہ ہے کہ کئی سال پہلے سودا ۱۱۸۵ھ یا ۱۱۸۶ھ میں فرخ آباد سے فیض آباد گئے ۔ ۱۱۸۹ھ یا ۱۱۹۰ھ میں لکھنؤ آئے ۔
۲- رسالہ اُردو ، جنوری ۱۹۵۸ع ، ص ۵۲ ۔

تربتش در صحن خانۂ خود کہ حالا خانۂ ویران محض است واقع شد ۔''
الله الله جس قبر کے متعلق نواب درگاہ قلی خاں کہتے ہیں کہ ''در محوط مختصر برنگ معنیٔ مضمون در الفاظ رنگین واقع شدہ'' اور جہاں شب و روز کوئی پچاس سال سے زیادہ عرصے تک معتقد لوگوں کا ہجوم رہتا تھا اور جس کے متعلق عکس ہے، عام عقیدہ ہو کہ عارف باللہ کی قبر ہے، ابد تک محفوظ رہے گی، وہ انقلابات زمانہ کے ہاتھوں اب ویران ہو چکی تھی اور معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ ہم دیکھیں گے کہ اگلی صدیوں میں بالکل نابید ہو جائے گی اور اہل علم کے درمیان جھگڑا شروع ہو جائے گا کہ کہاں تھی؟ کہاں ہے؟ کہاں نہیں؟ اور کہیں ہے بھی یا نہیں ۔ ایک اعلیٰ درجے کے شاعر، فلسفی اور صوفی کی قبر کا یہ انجام بڑا افسوس ناک ہے ۔ لیکن افسوس کرنے یا آگے بڑھنے کی بجائے ہمیں تھوڑی دیر کے لیے عرس بیدل کی اہمیت پر غور کر لینا چاہیے ۔

بیدل دہلی میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہونے کے لیے ۱۰۹۶ھ میں وارد ہوئے اور ۱۱۳۳ھ میں آپ کی وفات ہوئی ۔ یعنی کوئی ۳۷ سال لگاتار مسکن بیدل دلدادگان شعر و سخن کا مرجع بنا رہا ۔ اس طویل مدت میں بڑے بڑے باکمال لوگوں نے بیدل ایسے بے نظیر استاد فن سے استفادہ کیا ۔ آپ کے سینکڑوں شاگرد تھے اور آپ کا دولت کدہ صحیح معنوں میں ایک عظیم دارالتربیت تھا، جس نے اچھے اچھے اہل فن پیدا کیے ۔ سعداللہ گلشن، خان آرزو، نظام امسنگ، انند رام مخلص، خوشگو وغیرہ وغیرہ تمام ماہرین فن یہیں کے تربیت یافتہ تھے اور پھر جب بیدل فوت ہوئے تو ان کے مزار مقدس نے وہی حیثیت اختیار کر لی، جو پہلے ان کے مبارک مسکن کو حاصل تھی ۔ اگر ہم میرزا سودا کے دہلی سے روانگی کے سال کو عرس بیدل کا آخری سال فرض کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ۵۰ سال کے طویل عرصے تک مزار بیدل شعرائے دہلی کی تربیت گاہ بنا رہا جہاں دہلی بھر کے شعراء جمع ہوتے تھے، ایک فقیدالنظیر اجتماع ہو جایا کرتا تھا اور شعر و سخن کی بڑی پُر رونق محفل منعقد ہو کرتی تھی جس میں 'کلیات بیدل' سے استفادے کو بیش از بیش اہمیت دی جاتی تھی ۔ اس کا مزید مطلب یہ ہوا کہ ۱۰۹۶ھ سے لے کر ۱۱۸۵ھ تک یعنی نوے سال تک دہلی میں شعر و سخن کے لحاظ سے بیدل کے اثرات باقاعدگی سے نفوذ کرتے رہے ۔ ضمناً اس بات کی طرف بھی توجہ دینا ضروری ہے کہ پہلے سادات

بربہ کی شورش اور بعد میں سکھ اور مرہٹوں کی وجہ سے ہندوستان بھر سے اہل کمال بالخصوص مشرق اور جنوب سے ہجرت کرکے دہلی میں جمع ہو گئے تھے۔ دوسرے الفاظ میں ان باکمال لوگوں کے ایک ہی مرکز پر جمع ہو جانے کی وجہ سے بزم تیموریہ منتشر ہونے سے پہلے ایک دفعہ بڑی پُر رونق ہو گئی اور چوں کہ ایک مستقل ادارے کی وجہ سے بیدل کے اثرات کی اشاعت ہو رہی تھی اس لیے عام نظر آتا ہے کہ کوئی ادیب یا شاعر بیدل سے متاثر نہ ہوا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایران سے شیخ علی حزیں ہندوستان وارد ہوئے تو انہوں نے بیدل کو شعر و سخن کے میدان میں غالب دیکھا اور ان کے اثر کی ہمہ گیری کو کم کرنے کے لیے ان کے انداز بیان پر شدید اعتراضات کیے جن کا مسکت جواب خان آرزو نے اپنے رسالہ 'داد سخن' میں دیا۔

بیدل کے کم و بیش نود سالہ اثرات کے سلسلے میں اب ہم ذرا زیادہ گہرائی میں جائیں گے اور ایسے نتائج سے روشناس ہوں گے جن کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ مختصر الفاظ میں بیدل کی وجہ سے قائم شدہ بزم سخن ہی وہ گہوارہ ہے جس میں زبان اردو نے اپنا عبوری دور گزارا اور ولی دکنی اور ان کے مکتب سخن کے شعراء کے مقابلے میں دہلی کے شعرائے اردو کی زبان اگر یک لخت اس قدر صاف اور فصیح ہو جاتی ہے تو وہ اسی بزم سخن کی بدولت ہے۔ بیدل کی حسین اور دل پذیر تراکیب، ان کی تشبیہات اور استعارے ایسا سرمایہ ہیں جن سے اس دور میں اردو نے فصاحت و بلاغت کا ایک گراں مایہ خزانہ حاصل کیا۔ اور یہ کہنا بے جا نہیں کہ بڑی حد تک اسی بنا پر دہلی کی زبان کو اردوئے معلی کا خطاب ملا اور دہلی اردو زبان کی ٹکسال بنی اور نئی نئی تراکیب اور نئی نئی اصطلاحیں ایجاد و اختراع ہوئیں۔ دہلی کے ٹکسال ہونے کے متعلق یہ خود مولانا محمد حسین کا دعویٰ ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد طبعاً بیدل کے خلاف رہے۔ اُن کے نیم شعور میں ذوق اور غالب کی باہمی رقابت کے رستے بیدل سے نفرت کا جذبہ جاگزیں ہو گیا تھا۔ غالب کو عظیم شاعر قرار دیتے ہوئے بھی وہ صحیح معنوں میں ان کی عظمت کے قائل نظر نہیں آتے اور اسی عقیدے کی بنا پر وہ غالب کے تمام تر اسقام کی ذمہ داری بیدل پر عاید کرتے نظر آتے ہیں اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ غالب نے

بیدل سے جو مثبت فوائد حاصل کیے ہیں وہ ایسے وقیع ہیں کہ کوئی صاحب نظر نقاد ان کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا ۔ بالخصوص غالب کے پہلو دار اشعار کلام بیدل کے مقامات مخصوصہ کی آئینہ داری کرتے ہیں ۔ تاہم یہ ایک علیحدہ بحث ہے ۔ فی الحال یہ عرض کیا جا رہا تھا کہ مولانا محمد حسین آزاد بیدل کی تنقیص کرتے ہیں ۔ سخن دان پارس میں تو بالکل کھل کر انھوں نے اپنا ما فی الضمیر واضح کر دیا ہے ۔ اس کے باوجود 'آب حیات' کو اٹھا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ غیرشعوری طور پر وہ بیدل کے اردو زبان پر احسانات کے معترف ہیں ۔ ایک جگہ فرماتے ہیں :

"اردو کا درخت اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی سرزمین میں اگا مگر فارسی کی ہوا میں سرسبز ہوا ہے ۔ البتہ مشکل یہ ہوئی کہ بیدل اور ناصر علی کا زمانہ قریب گزر چکا تھا ۔ ان کے معتقد باقی تھے ۔ وہ استعارہ اور تشبیہ کے لطف سے مست تھے اس واسطے گویا اردو بہشت میں استعارہ اور تشبیہ کا رنگ آیا ۔"

لفظ 'البتہ' اور 'گویا' لکھ کر مولانا آزاد مرحوم جو نتائج اخذ کرتے ہیں ان کی طرف اشارہ پارۂ ہذا کی ابتدائی سطور میں کر دیا گیا ہے ۔ ہمارا مدعا تو یہ ہے کہ خود انھی کی زبان سے بیدل کے ان اثرات کی تعریف و توصیف سنی جائے ۔ 'آب حیات' میں آگے چل کر فرماتے ہیں :

"بہر حال ہمیں اپنے بزرگوں کی اس صفت کا شکریہ ہی ادا کرنا چاہیے . . . . انھوں نے فارسی کو اس (ہندی بھاشا) میں داخل کرکے استعارہ و تشبیہ سے مرصع کر دیا جس سے وہ خیالوں کی نزاکت اور ترکیب کی پختگی اور زور کلام اور تیزی و طراری میں بھاشا سے آگے بڑھ گئی اور بہت سے نئے الفاظ اور نئی ترکیبوں نے زبان میں وسعت بھی پیدا کی ۔"

بیدل کے معتقدوں کے ذریعے اردو زبان نے بیدل سے جو فائدہ حاصل کیے مولانا آزاد کس بلاغت سے اس کا اعتراف کرتے ہیں ۔

بیدل فارسی زبان کے شاعر تھے ، لیکن وہ بہار میں رہتے ہوئے اپنے عہد طفولیت میں ہی اردو زبان سے آشنا ہو چکے تھے ۔ وہ ۱۰۷۵ھ میں ۲۱ سال کی

عمر میں بہار کو خیرباد کہہ کر ہمیشہ کے لیے دہلی کی طرف آ گئے ۔ لیکن ان کی تحریرات ثابت کرتی ہیں کہ اس زبان سے وہ بہار ہی میں متعارف ہو چکے تھے جہاں اسے ریختہ کے نام سے پکارا جاتا تھا ۔ امیر تیمور کے حملے کے بعد مشرقی بادشاہوں کی وجہ سے جونپور اسلامی علوم کا ایک شاندار مرکز بن گیا تھا اور اس کی یہ حیثیت عرصہ دراز تک قائم رہی ۔ اس لیے اسلامی علوم کی اشاعت اور ترویج سے پورب میں ایک ایسا ماحول پیدا ہو گیا تھا جو اردو کی نشو و نما کے لیے بڑا سازگار تھا ۔ چونکہ بہار بھی ان علاقوں میں شامل ہے جنہیں اردو کی قربت کے لحاظ سے اولیت کا درجہ حاصل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۰۵۴ھ میں بیدل کی عظیم آباد پٹنہ میں پیدائش تک اردو زبان نے بہار میں ارتقاء کے متعدد قابل قدر مراحل طے کر لیے تھے اور اسی لیے وہاں کے رہنے والے لوگوں کی زبانی بیدل نے اردو کے اشعار بھی سنے ۔

ایک دفعہ ابھی وہ کم عمر تھے کہ ایک مجذوب بزرگ شاہ ملوک سے راج ساگر کے قریب ان کی ملاقات ہوئی ۔ شاہ صاحب آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہے تھے ۔ بیدل نے توجہ سے سنا تو معلوم ہوا کہ وہ ریختہ کے اشعار ہیں ۔ شاہ صاحب کی زبان سے ایک ایک مصرع نکلتا تھا، جنہیں بیدل نے قلم بند کرنا شروع کر دیا ۔ اس طرح فقر اور تصوف کے متعلق ریختہ کے چالیس اشعار جمع ہو گئے، جن میں ویدانت کی اصطلاحات استعمال کی گئی تھیں ۔ اس واقعے کی تفصیل بیدل نے اپنی نثری تصنیف چہار عنصر میں درج کی ہے ۔ یہ واقعہ جہاں اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ زبان اردو اپنی نشو و نما کے لیے ارباب تصوف کی بے حد مرہون منت ہے، وہاں اس امر کے متعلق بھی شہادت مہیا کرتا ہے کہ ان دنوں بہار کے لوگ اردو زبان میں شعر کہنے لگے تھے ۔ علاوہ بریں جب بیدل بہار کو الوداع کہنے لگے ہیں تو آخری ملاقات کے لیے اپنی مہربان ایک کنجڑن کے ہاں گئے، اس وقت انہوں نے فی البدیہہ کہا:

سر پر حب کوئی ہیں سب دشمن آپ کیس
پٹنہ نگری چھاڑ دیں اب بیدل چلے بدیس

اس کا جواب کنجڑن نے بھی فی البدیہہ دیا:

سر پر مایہ رم ہے پن کا ہدے بے صبری
بیدل بھی کر مت چھاڑو ہوتا آپن نگری

یہ شاد عظیم آبادی[1] کا بیان ہے ۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ابتدائے شباب میں خود بیدل کی زبان پر بہار میں مروجہ اشعار بے ساختہ وارد ہو جایا کرتے تھے اور یہ سب کچھ ماحول کی وجہ سے تھا ۔ لیکن دہلی رہتے ہوئے انہوں نے بعد میں جو شعر اُردو زبان میں کہے ہیں وہ زیادہ صاف ہیں اور نسخ اور غالب کے انداز بیان کی طرف واضح طور پر انگشت نمائی کرتے دکھائی دیتے ہیں ، مثلاً[2] :

شہرہ حسن سے از بس کہ وہ محبوب ہوا
اپنے چہرہ سے جھگڑتا ہے کہ کیوں خوب ہوا[3]

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم ہیں
اس تخم بے نشان کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں

ان اشعار کے علاوہ مجھے اُردو میں بیدل کا اور کوئی شعر نہیں مل سکا اور تذکرۂ طور کلیم کا یہ بیان مجھے بالکل غلط نظر آتا ہے کہ جب ۱۱۳۳ھ میں ولی دکنی کا دیوان دہلی پہنچا تو دوسرے شعراء کے علاوہ میرزا عبدالقادر بیدل نے ان کی تقلید کی ۔ اس لیے کہ بیدل محرم کے کاذب ایام تپ محرقہ میں مبتلا رہنے کے بعد ۴ صفر ۱۱۳۳ھ کو فوت ہوئے ۔ اس لیے ظاہر ہے انہیں ولی کی تقلید کا

۱۔ شاد عظیم آبادی کے بیان کو اگر غیر معتبر سمجھا جائے تو بیدل کے اپنے مندرجہ بالا بیان کی تردید ممکن نہیں جس میں وہ شاہ سوک کے ہندی اشعار کا ذکر کرتے ہیں ۔

۲۔ پہلا شعر میر درد کا ہے ، جو اُن کے غیر مطبوعہ کلیات موجود برٹش میوزیم میں پایا جاتا ہے اور جس کے Rotos عکس ڈاکٹر وحید قریشی کے پاس راقم نے خود دیکھے ہیں ۔

۳۔ جیسا کہ پیشتر ازیں صراحت کی جا چکی ہے ، یہ شعر میر درد کا ہے لیکن بعد کے دونوں بیدل کے ہیں ۔

موقع ہی نہیں ملا ۔ علاوہ بریں فارسی گو کی حیثیت سے اُن کا رتبہ اتنا بلند تھا کہ انھیں اپنی بقائے دوام کا حتمی یقین ہو چکا تھا ۔ کہتے ہیں :

معنی تا در جہاں باقیست از معنوی آزادم
زبان گفتگو ہا بال پرواز است عنقا را

اس لیے انھیں کسی کی تقلید کی اس وقت ضرورت ہی نہیں رہی تھی ۔ جو صاحب فن کا سند فارسی زبان کے اساتذۂ قدیم کی فہرست میں شامل ہو چکا تھا وہ اب کسی نئے شاعر کا اتباع کیسے کرتا ۔ بہرحال اُردو زبان میں بیدل کے یہی تین چار شعر ملتے ہیں ۔ اس لیے اُردو زبان پر بیدل کا جو اثر ہے وہ بالواسطہ ہوا اور وہ بھی ان کی مجالس شبینہ اور پھر اُن کی وفات کے بعد ان کی تقریبات عرس کی وجہ سے ۔ مسلسل ۹۰ سال تک دہلی کی مجالس ادب و شعر بیدل کے اثرات قبول کرتی رہیں اور پھر متعدد انقلابات کے باوجود یہ اثرات وہاں تا دیر موجود رہے ۔ اسی حقیقت کا انکشاف مولانا آزاد کے مرقومہ بالا بیان سے ہو رہا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جب بیدل کی وفات سے ۷۵ سال بعد غالب پیدا ہوئے تو شہر دہلی ابھی ان اثرات سے معمور تھا ۔ اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں اس وقت بھی بیدل کی دو مثنویاں 'محیط اعظم' اور 'طور معرفت' موجود ہیں ، جو آغاز شباب میں غالب کے قبضے میں رہ چکی ہیں ۔ ان پر مہر غالب ثبت ہے اور ان کے اپنے ہاتھ سے ان مثنویوں کی تعریف میں لکھے ہوئے دو اشعار بھی دیکھے جا سکتے ہیں ۔

جن خاص اصحاب اور ارباب فن کی وجہ سے اُردو زبان پر بیدل کا بالواسطہ اثر ہوا ہے ان کا یہاں مجملاً ذکر کر دینا ضروری ہے ۔ شیخ سعداللہ گلشن ، سراج الدین علی خاں آرزو ، عمدہ الملک نواب امیر خاں انجام ، رائے آنند رام مخلص ، شاہ فصیح الفصحا ، محمد امین منصب دار بادشاہی ، یہ چھ بزرگ بیدل کے ان شاگردوں میں سے ہیں جنھوں نے اُردو زبان میں شعر کہے ہیں ۔ علاوہ بریں اول الذکر دو بزرگوں نے براہ راست اردو شاعری کو بے حد متاثر کیا ۔ شیخ سعداللہ گلشن کو خرقۂ خلافت بیدل نے عطا فرمایا تھا اور ان کے فیض یافتہ تھے ۔ ولی دکنی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا محمد حسین آزاد فرماتے ہیں :

"(شمس ولی دکنی) دلی میں آئے ۔ یہاں شاہ سعد اللہ گلشن کے مرید ہوئے ۔ شاید ان سے شعر میں اصلاح لی ہو ، مگر دیوان کی ترتیب فارسی کے طور پر یقیناً اُن کے اشارے سے کی ۔"

دیکھیں حضرت بیدل کا ایک تربیت یافتہ ''نغمہ اردو کی نسل کے آدم'' کا خضر راہ بنا ۔ یہ وہ خطاب ہے جو مولانا آزاد نے ولی دکنی کو عطا کیا ہے ۔ اب خان آرزو کی زبان اردو پر احسانات کا اعتراف جناب مولانا آزاد ان الفاظ میں کرتے ہیں :

> ''خان آرزو کو زبان اردو پر وہی دعویٰ پہنچتا ہے جو کہ ارسطو کو فلسفہ و منطق پر ہے ۔ جب تک کہ کل منطقی ارسطو کے عیال کہلائیں گے تب تک اہل اردو خان آرزو کے عیال کہلائیں گے ۔ ان کا دل حسب حال قابل تحریر تھا لیکن چوں کہ فارسی تصنیفات کی مہموں نے انھیں کوئی دیوان اردو میں نہ لکھنے دیا ، اس لیے یہاں ان کے باب میں اسی قدر لکھنا کافی ہے کہ خان آرزو وہی شخص ہیں جن کے دامن تربیت سے ایسے شائستہ فرزند تربیت پا کر اٹھے ، جو زبان اردو کے اصلاح دینے والے کہلائے اور جس شاعری کی بنیاد جگت اور ذو معنی لفظوں پر تھی اسے کھینچ کر فارسی کی طرز اور ادائے مطالب پر لے آئے ۔ یعنی میرزا جان جاناں مظہر ، مرزا رفیع ، میر تقی ، خواجہ میر درد وغیرہ ۔''

کتنے کھلے دل سے خان آرزو کے اردو زبان پر احسانات کا اعتراف کیا گیا ہے ۔ مولانا محمد حسین آزاد تمام اہل اردو کو خان آرزو کے عیال کہہ رہے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ شعراء جنھوں نے زبان اردو کی اصلاح کی ، تمام کے تمام خان آرزو کے تربیت یافتہ تھے ۔ اب خود خان آرزو کو براہ راست جناب بیدل سے شرف تلمذ حاصل تھا اور سطور بالا میں ہم نواب قلی خان کی زبانی معلوم کر چکے ہیں کہ عرس بیدل کے موقع پر نسبت شاگردی کی وجہ سے خان آرزو کس طرح بزم آراء ہوا کرتے تھے ۔ اب آپ بیدل کے بلند مقام کا یہی اندازہ لگائیں اور اس بات پر بھی توجہ دیں کہ بالواسطہ بیدل نے زبان اردو پر بالخصوص اس کے عبوری دور میں کتنا عظیم اثر ڈالا ۔

مندرجہ بالا بصیرت افروز اقتباسات کے لیے ہم مولانا محمد حسین آزاد کے خاص طور پر مرہون منت ہیں ۔ ان میں بیان کردہ حقائق تک مولانا کی نگاہ اس لیے پہنچ رہی ہے کہ انھوں نے دہلی میں اپنی زندگی کے کافی ایام اس زمانے میں بسر

کہے جب وہاں اردو کے ابتدائی اساتذہ کے قصے زبان زد عوام و خواص ہے - بہت سی باتیں انہوں نے اپنے استادوں کی زبان سے سنی تھیں اور جیسا کہ وہ خود 'آب حیات' میں تسلیم کرتے ہیں ، سینہ میں محفوظ کر لی تھیں - یہی وجہ ہے کہ زبان اردو کے ارتقاء کو سمجھنے کے لیے 'آب حیات' بڑی مفید ہے - بیدل کے اثرات کے سلسلے میں مولانا کا ایک اور بیان بھی کسی حد تک معنی خیز ہے - وہ شاہ حاتم کو بیدل کے شاگرد عمدۃالملک امیر خاں انجام کی مصاحبت میں عزت اور فارغ البالی بلکہ عیش و عشرت سے زندگی بسر کرتے دکھاتے ہیں اور بعد میں شاہ حاتم کے اپنے حوالے سے یہ بھی بتاتے ہیں کہ شعر فارسی میں وہ میرزا صائب کی پیروی کرتے تھے اور ان کے شاگردوں میں میرزا رفیع اور سعادت یار خاں رنگین بھی شامل ہیں - شاہ حاتم ۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوئے اور بعدۂ ۱۱۳۳ھ میں فوت ہوئے - ویسے بھی وہ امیر خاں انجام شاگرد بیدل کے مصاحب تھے - اس لیے ان کے بیدل سے متاثر ہونے کے کافی امکانات نظر آتے ہیں - جہاں تک میرزا صائب کا تعلق ہے اُن کی شاعری کی عمارت زیادہ تر مثالیہ کے کامیاب استعمال پر قائم ہے اور جن لوگوں نے بیدل کا مطالعہ کیا ہے وہ خوبی جانتے ہیں کہ بیدل مثالیہ کے استعمال میں کس قدر دسترس رکھتے تھے - تاہم اگر ہمیں شاہ حاتم کے کلیات ، اُن کے دیوان زادہ[1] اور دیوان فارسی کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہوتا تو ہمارے لیے حتمی طور پر یہ کہنا ممکن تھا کہ انہوں نے بیدل کا کس قدر اثر قبول کیا ہے -

اردو زبان پر بیدل کے اثرات کے سلسلے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے - بس اب ہم دو ایک مزید نہایت ہی اہم باتوں کا ذکر کرکے اپنے اصل موضوع یعنی مزار بیدل کی تاریخ کی طرف عود کر جائیں گے - ان اثرات کے متعلق بھی ہرگز ہرگز خامہ فرسائی نہ کی جاتی اگر مزار بیدل پر عرس کی تقریبات عرصہ دراز تک نہ منائی گئی ہوتیں -

جس طرح عمق فکر ، حیات پرور تعلیمات اور عصر آفریں خیالات کی وجہ سے عصر حاضر اقبال سے مختص ہو چکا ہے اور کوئی ادیب ور شاعر ایسا نہیں ہو

۱- دیوان زادہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے ، مگر مصنف ابھی تک اسے دیکھ نہیں سکا -

اقبال سے کسی نہ کسی حد تک متاثر نہ ہوا ہو ، بالکل اسی طرح بیدل کی حالت ہے ۔ اُن کے فکر میں وہ عظمت ہے اور اُن کے خیالات ایسے حیات آفریں ہیں ، ساتھ ہی ان کے اسلوب میں وہ طرفگی رعنائی ، تخیل اور اثر انگیزی موجود ہے کہ تمام متعلقہ تذکرے اس حقیقت کی تائید کرتے نظر آتے ہیں کہ بیدل بھی عصر آفریں تھے ۔ موجودہ زمانے میں ملک الشعراء بہار جو زبان فارسی کے عہد بہ عہد کے اسلوبی تحولات اور تغیرات سے کما حقہٗ آگاہ تھے ، یہی خیال رکھتے ہیں ۔ اُن کا ایک مصرعہ ہے :

بیدلے چوں رفت اقبالے رسید

یعنی اُن کے خیال کے مطابق عصر اقبال کے شروع ہونے تک عصر بیدل کا دور رہا اور جہاں تک خود علامہ اقبال کا تعلق ہے وہ کہیں تو بیدل کو استاد کامل کہتے ہیں اور کہیں مفکر شعر ۔ یعنی علامہ اقبال بیدل کے فن کے بھی مداح ہیں اور فکر کے بھی ۔ علامہ موصوف نے ایک بار گوجرانوالہ کے ایک شاعر غلام حسین شاکر کو لکھا تھا کہ اپنے بیان میں حسن پیدا کرنے کے لیے بیدل کا مطالعہ کیجیے ۔ اس لیے اب تک بیدل کے اثرات کے متعلق جو کچھ کہا جا چکا ہے ، اس کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فنی لحاظ سے کیا اور فکری لحاظ سے کیا ، تمام فارسی گو شعراء کی بہ نسبت زبان اردو پر بیدل کا اثر بہت زیادہ ہوا ہے ۔ بنابریں اہل علم کو اسی نقطۂ نگاہ کو لے کر مزار بیدل پر عرس کی تقریبات کا جائزہ لینا چاہیے ۔

غالب اور اقبال پر بیدل کے اثرات کے متعلق یہاں بہت کم لکھا گیا ہے ۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ فنی اور فکری لحاظ سے یہ اثرات اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کی وضاحت کے لیے علیحدہ مقالوں کی ضرورت ہے اور ہمارا موضوع اس طویل بحث کی اجازت ہی نہیں دیتا ۔ اس جگہ صرف اس امر کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ بیدل کے تمام افکار پر اُن کا تصوف غالب تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تصوف کی وجہ سے ان افکار کی قدر و قیمت میں کمی واقع ہو گئی ہے ، بلکہ جیسا کہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ''فکر اقبال'' میں اردو شاعری کی اقسام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔ ''تصوف بھی اعلیٰ درجے کی شاعری کو جنم دیتا ہے جس میں حکمت بالغہ اور عشق الٰہی کی آمیزش اور تزکیۂ نفس کی ترغیب ہوتی ہے'' ۔ ہم موجودہ مبتذل اور مضحک تصوف کو دیکھ کر بدک

جانے ہیں مگر سنائی ، عطار ، رومی اور بیدل کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تصوف عالیہ کے عناصر ترکیبی حیات افروزی کا موجب ہیں ۔ وہی عناصر عموماً ہی پر اقبال ارتقائے ذات کے لیے زور دیتا ہے ۔ یہ علیحدہ سوال ہے کہ ہر صوفی شاعر نے زمانے کے تقاضوں کی وجہ سے خاص خاص عناصر پر زیادہ زور دیا ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ اس نقطۂ نگاہ سے بھی غالب اور اقبال پر اپنی اپنی فطرت کے مطابق بیدل کا بڑا مستحسن اثر ہوا ہے اور اردو شاعری کو اس کی وجہ سے بڑی جلا نصیب ہوئی ۔

جیسا کہ پیشتر ازیں ذکر کیا جا چکا ہے ، غلام ہمدانی مصحفی نے اپنا تذکرہ عقد ثریا ۱۱۹۹ھ میں لکھا اور وہ بیان کرتے ہیں کہ اس وقت بیدل کا مکان جس کے صحن میں آن کی تربت تھی ، ویران محض ہو چکا تھا ۔ دہلی کے ان الم ناک حالات کا مجملاً ذکر کیا جا چکا ہے جن کی بنا پر لوگوں نے اسے ترک کرنا شروع کر دیا تھا ۔ حتیٰ کہ وہ دن بھی آ گیا جب جہاں آباد کے سب سے بڑے محب اور مداح میر تقی میر بھی ۱۱۹۷ھ میں اسے بہ صد حسرت و یاس[1] الوداع کہنے پر مجبور ہو گئے ۔ باقی اہل علم اور ارباب فن تو پہلے ہی اسے چھوڑ چکے تھے ۔ جب علم و ادب سے تعلق رکھنے والے لوگ دہلی کو چھوڑ کر چلے گئے ۔ تو مزار بیدل کو کوئی پوچھنے والا نہ رہا اور اس لیے پہلے یہ ویران ہوا بعد میں بالکل ناپید ہو گیا ۔ چناں چہ جب سرسید احمد خاں نے اسلاف کے کارناموں کی یادگار رکھنے کے لیے آثار الصنادید تصنیف کی اور بڑی محنت اور جاں فشانی سے کام لے کر دہلی کے آثار کے متعلق تفاصیل قلم بند کیں اور مرزا غالب مرحوم نے دیباچہ نگاری کی تو اس کتاب میں مزار بیدل کا ذکر نہ آ سکا ۔ باد و باراں کی وجہ سے استدادِ زمانہ کے ساتھ اس کا تعویذ ٹوٹ پھوٹ گیا ۔ خود مزار زمین کے ساتھ ہموار ہو گیا اور انجام کار اس کا نام و نشان بھی جاتا رہا ۔ چوں کہ میرزا

۱۔ میر صاحب کے بہت سے اشعار دہلی کی تباہی سے متعلق ہیں ۔ ایک شعر ہے :

اب خرابہ ہوا جہان آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

آپ مصحفی کے لفظ ویران محض اور میر تقی میر کے خرابہ پر غور کریں ۔

غالب بیدل کے بڑے معتقد تھے ، اُن کے دل میں عمر بھر بیدل کے لوح مزار کو دیکھنے کی حسرت رہی ۔ کہتے ہیں :

گو ملے حضرت بیدل کا خط لوح مزار
اسد آئینۂ پرواز معانی مانگے

میرزا غالب کے بعد لوگ مزار بیدل کو بالکل بھول چکے تھے مگر قدرت کو ابھی ایک طرفہ تماشہ دکھانا منظور تھا ۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم و مغفور نے جب نواب درگاہ قلی خاں کی مذکورہ بالا تصنیف مرقع دہلی کا اردو زبان میں ترجمہ تو عرس بیدل کا ذکر پڑھ کر ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ مزار بیدل تلاش کیا جائے ۔ چناں چہ اپنے ۲۲ اپریل ۱۹۳۷ء کے مراسلے میں دفتر آل انڈیا چشتی پارٹی دہلی سے راقم سطور کو لکھتے ہیں :

''میں نے اس کتاب (مرقع دہلی) کا اردو زبان میں ترجمہ شائع کیا تو اس پر نوٹ لکھا کہ معلوم نہیں میرزا بیدل کا مزار کہاں ہے ۔ یہ نوٹ پڑھ کر حضرت مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواری؎ نے مجھ کو لکھا کہ بیدل کا مزار پرانا قلعہ دہلی کے سامنے حضرت ملک نورالدین یار پران؎ کے مزار کے قریب ہے ۔ میں خود وہاں گیا ۔ مزار بے نشان ہو چکا تھا ، مگر جگہ مل گئی تب حضور نظام کو لکھا اور انھوں نے دو ہزار روپے بھیج کر مزار بنوا دیا اور کتبہ بھی لگوا دیا۔''

اس موقع پر مزار پر جو کتبہ لگوایا گیا تھا اس کی عبارت حسب ذیل ہے :

''مرقد عبد القادر بیدل تاریخ وفات ۳ صفر ۱۱۳۳ھ اس کی ضروری تعمیر و ترمیم اعلیٰ حضرت پر نور آصف جاہ سابع دکن کی توجہات شاہانہ سے ۱۳۵۹ھ میں کرائی گئی ۔''

اب قطع نظر اس بات کے کہ تاریخ وفات ۴ صفر کی بجائے ۳ صفر درج ہو گئی ہے ، جن لوگوں نے دہلی کو اچھی طرح دیکھا ہے وہ مزار بیدل کے محل وقوع کے متعلق خوش گو ، آزاد بلگرامی ، حسین قلی خان اور مصحفی کے محولہ بالا بیانات کو پڑھ کر فوراً کہہ اٹھیں گے کہ مولانا حسن نظامی نے بیدل کا مزار جدید بالکل غلط جگہ پر بنوایا ہے ۔ دہلی سے دور بیٹھے ہوئے بھی قدیم دہلی کا نقشہ سامنے رکھ کر ہر شخص بہ ادنیٰ تامل کہہ دے گا کہ مولانا نے سخت غلطی کھائی ہے ۔

مولانا مزار بیدل پرانے قلعہ کے سامنے بتاتے ہیں ، حالانکہ خوش گو کے بیان کے مطابق وہ شہر پناہ اور دہلی دروازے سے باہر تھا یعنی پرانے قلعہ کی نسبت دہلی دروازہ سے زیادہ قریب تھا ۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے تقریباً تین میل دور واقع ہیں اور پھر مولانا مزار بیدل کو یار پران کے مزار کے قریب بتاتے ہیں ۔ اب جو عالم ستہ کی تصنیف مزارات اولیائے دہلی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یار پران اور ان کے بالمقابل ابوبکر طوسی کے مزارات شاہان سنجی کے زمانے سے چلے آتے ہیں ۔ مگر خود بیدل ، ان کے کسی معاصر یا ان کے مزار کے زائرین میں سے کسی نے بھی کبھی یہ نہیں کہا کہ یہ اہم مزارات مسکن بیدل یا مزار بیدل کے قریب ہیں اور یہ اتفاق اس نہیں ہو سکتا ، محل وقوع کا ذکر کرتے ہوئے قریب کے معروف مقامات از خود زبان پر آ جایا کرتے ہیں ۔ با ایں ہمہ نتیجہ اخذ کرنے میں ہم بالکل حق بجانب ہیں کہ چوں کہ یہ مقامات قریب نہ تھے کسی نے بھی بیدل کے مزار کے سلسلے میں ان کا ذکر نہیں کیا ۔ علاوہ بریں آثارالصنادید ۱۸۴۷ء میں لکھی گئی تھی اور مولانا حسن نظامی کی وجہ سے ۱۹۳۱ء مطابق ۱۳۵۹ھ میں مزار بیدل کی تعمیر و ترمیم ہوئی ۔ ظاہر ہے جس مزار کے نشانات ۱۹۳۱ء میں مل سکتے ہیں وہ تقریباً ایک صدی پیشتر یقیناً بدرجہا بہتر حالت میں ہوگا اور اس صورت میں سرسید اور غالب اس کا ذکر آثارالصنادید میں ضرور کرتے جب کہ بالخصوص غالب بیدل کے والہ و شیدا تھے اور سرسید کی اس اہم کتاب کا مقصد وحید ایسے اہم آثار کا محفوظ کرنا تھا ۔ ساتھ ہی قدیم دہلی سے تعلق رکھنے والی کوئی اور جدید کتاب مثلاً 'عبرت نگار' واقعات دارالحکومت دہلی وغیرہ بھی کسی مقام پر مزار بیدل کا ذکر نہیں کرتی ۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مزار بیدل دست برد ایام سے ایسا بے نشان ہوا کہ صفحہ ارض پر اس کا تلاش کرنا محال ہو چکا ہے اور مولانا حسن نظامی نے اسے بالکل غلط مقام پر تعمیر کرا دیا ہے ۔

لیکن معاملہ یہاں ختم نہیں ہو جاتا ۔ کوئی چار سال گزرے کابل میں اس بات کا دعویٰ کیا گیا کہ مزار بیدل کابل میں ہے ۔ اس سلسلے میں مولانا ڈاکٹر محمد سمیع صاحب ڈائرکٹر اردو انسائیکلو پیڈیا اسلام نے بندہ کو ۲۲ جنوری ۱۹۵۰ء کو تحریر فرمایا کہ کابل کے تاریخی رسالوں میں انہی دنوں میں لکھا گیا ہے کہ مزار بیدل اور ان کے ماں باپ کی قبریں کابل میں ہیں اور مزید ارشاد فرمایا کہ اگر آپ اس بات میں

دل چسپی رکھتے ہیں تو آقائے عبدالحی حبیبی اعظمی کو کراچی لکھیں ۔ چناں چہ میرے مراسلے کے جواب میں آقائے حبیبی نے نہایت ہی حقیقت افروز پیرائے میں تحریر فرمایا :

"در مجلۂ آریانا سہ شمارۂ اخیر مقالاتی بر بیدل و مزارش چاپ شدہ و سید محمد داؤد حسینی خطاط معروف افغانی مدعی گردیدہ کہ استخوان بیدل را در عصر احمد شاہ ابدالی بہ کابل انتقال دادہ اند و در حوالۂ رواش شمالی کابل مدفون است وی مدعیست کہ مزار میرزا ظریف ماما و اقارب دیگر بیدل و قوم چغتائی در قریہ ایست کہ آں را "یکہ ظریف" گویند ۔ در ہمیں سلسلہ یک نوشتۂ سنگ قدیم ۹۰ سال قبل راہم عکس برداشتہ اند کہ گویا شاعری بہ تخلص بیدل آں را نوشتہ بود و دراں می گوید کہ قبر بیدل در یکہ ظریف خواجہ رواش کابل است ۔ ولی من چوں آں فوٹو را دیدم آثار جعل و تزویر دراں نمایاں است ۔ بعد ازاں آقائے خلیلی و آقائے علم شاہی در ساں مجلۂ آریانا دو مضمون نوشتہ و دوستۂ بہاں سنگ قدیم و ادعائی سید داؤد را در کردند و با دلائل واضح ساختند کہ قبر بیدل در کابل نیست ۔ درین بارہ مرحوم ہاشم شائق معلومات کافی داشت و در اوقات حیات شاں من با ایشاں دوست و ہم کار بودم ولے فاضل مرحوم ابداً از وجود قبر بیدل در کابل خبری نداشت ۔ بہر صورت ادعائے سید داؤد بکلی بے اساس است ۔

اما قبر یکہ در دہلی از طرف حسن نظامی تعین و تعمیر شدہ نیز حقیقی ندارد زیرا آخریں خبر قبر را مصحفی ۳۶ سال بعد وفات بیدل دادہ کہ در حانۂ مخروبہ اش در دہلی بود ۔ و تعین مصحفی ابداً با قبریکہ حسن نظامی شہرت دادہ موافقت ندارد و در صورتیکہ ۳۶ سالاً بعد وفات قبرش در دہلی بود ادعائی بودن آں در کابل نیز بے اساس است ۔ بہر صورت اکنوں تعین در دہلی کار جستجو کنندگاں و محققین تاریخ است ۔ خودم

گماں دارم کہ برخی از کابلیاں در مسیر عداوت شدید عقیدت با بیدل خواستہ اند بہ جعل و تزویر مقام رمسِ او را بکابل قرار دہند۔ ولی این ادعا ابداً و اصلاً با حقائق تاریخی و رویہ تحقیق منافی است۔"

آقائے حبیبی، جو نامور افغان ادیب ہیں اور آج کل[1] کراچی میں مقیم ہیں، کی ان تصریحات کے بعد مزید کسی اضافے کی گنجائش نہیں رہ جاتی، مگر بعض امور ذرا وضاحت سے بیان کر دیے جائیں تو مفید رہے گا۔ احمد شاہ ابدالی ۱۷۶۱ء (مطابق ۱۱۷۵ھ) میں پانی پت کے میدان میں معرکہ آرا ہوئے اور ویسے ۱۷۶۷ء تک ہندوستان پر حملہ آور ہوتے رہے۔ اب مصحفی نے اپنا تذکرہ ۱۷۸۵ء (مطابق ۱۱۹۹ھ) میں لکھا ہے۔ اس لیے اگر احمد شاہ ابدالی بیدل کی عظام رمیم کابل لے گئے ہوتے تو مصحفی یہ کبھی نہ لکھتے کہ بیدل کی تربت ان کے خانۂ ویران میں موجود ہے۔

علاوہ بریں خود راقم مقالہ کو صرف بیدل کے متعلق تحقیق کے سلسلے میں ۱۹۵۱ء کے گرما میں کابل جانے کا اتفاق ہوا تھا اور وہاں آقائے سردار فیض محمد خان زکریا، آقائی سرور خان گویا، استاد خلیلی، جناب ہاشم شائق آفندی، سید محمد داؤد حطامہ اور دیگر کئی افغان ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات کا موقع ملا۔ قدرتی طور پر ہمیشہ موضوع بیدل ہی ہوا کرتا تھا۔ مگر خود سید محمد داؤد نے بھی یہ کبھی نہ کہا کہ بیدل اب کابل میں مدفون ہیں اور بیدل کی قبر کا وہاں پایا جانا کوئی معمولی بات بھی نہ تھی کہ جس کا انکشاف اچانک ۱۳۴۲ھ کے قریب سید صاحب موصوف پر ہو گیا ہو۔ مولانا حسن نظامی اپنے متذکرہ بالا مراسلے میں لکھتے ہیں کہ افغانستان گیا تو وہاں دیکھا کہ سارا ملک بیدل کا اتنا دل دادہ ہے جتنے کہ آج کل ہندوستان کے لوگ غالب و اقبال کے دل دادہ ہیں۔ راقم سطور نے بھی افغانستان کے لوگوں کو بیدل کا بے حد والہ و شیدا پایا۔ ریڈیو پر بیدل کی غزلیں پڑھی جاتی ہیں۔ عموماً مجالس میں بیدل کا تذکرہ ہوتا ہے۔ کتب خانوں میں زیادہ تر بیدل کے نادر قلمی کلیات موجود ہیں۔

۱۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب کہ آقائے حبیبی ابھی کراچی میں تھے۔ بعد میں مراجعت فرما کر کابل ہوئے۔

مطبع صفدری بمبئی کا ۱۲۹۹ھ میں مطبوعہ کلیات بیدل ان دنوں وہاں سات سو روپے افغانی (یک صد پاکستانی) میں فروخت ہو رہا تھا ، اور اکثر پڑھے لکھے افغانوں کے پاس اس کی جلدیں موجود تھیں ۔ بیدل کی غزلیات پر میں نے کابل کے رسائل میں ملک الشعراء قاری عبداللہ خان اور صوفی عبدالحق بے تاب کی مخمسات دیکھیں ۔ بیدل کے اشعار پر تضمین اور ان کی مخصوص زمینوں میں کئی غزلیں پڑھیں ۔ مکتب بیدل اور فسلفۂ بیدل پر لکھے ہوئے مضامین کا مطالعہ کیا ۔ ان کا اتباع کرنے والے افغان شعراء کے حالات کابل کے مجلہ رسائل میں دیکھے ۔ خود احمد شاہ ابدالی کے فرزند تیمور شاہ کے دربار میں بیدل کے متبع ایک شاعر عاجز افغان تھے ، جن کے متعلق حافظ نور محمد خان نے کابل میگزین میں ایک مضمون چار قسطوں میں لکھا جس میں عاجز پر بیدل کے اثرات کا ذکر کیا گیا تھا اور انھیں بیدل ثانی کا خطاب دیا گیا تھا ۔ قاری صاحب موصوف کا تالیف کردہ تذکرۂ شعراء ، جس کا نام "ادبیات" ہے ، میری نظر سے گزرا جس میں بیدل کا ذکر کافی صفحات پر پھیلا ہو ہے ۔ اب جہاں بیدل اس قدر معروف اور مشہور ہوں ، وہاں ان کے جسد خاکی کا احمد شاہ ابدالی ایسے افغانستان کے مایۂ ناز فخ اور شاعر کے ذریعے پہنچنا اور مدفون ہونا کس طرح ایک نہایت ہی معمولی اور غیر اہم واقعہ شمار ہو سکتا ہے ، جس کا انکشاف کوئی دو سو سال گزرنے پر اب آ کر ہوا ہو اور وہ بھی صرف سید محمد داؤد پر ۔

البتہ جب میں وہاں تھا تو بعض لوگوں نے ایک ایسا شگوفہ چھوڑ رکھا تھا جو ظاہر کرتا تھا کہ عقیدتِ بیدل نے انھیں بالکل غلط راستے پر ڈال دیا ہے اور وہ دم نہیں لیں گے ، جب تک کہ بیدل کو عظیم آبادی کی بجائے افغانی ثابت نہ کر لیں ۔ اور غالباً اسی جذبے کی بنا پر بقول آقای حبیبی میرزا بیدل کے سلسلے میں جعل و تزویر سے کام لیا گیا ہے ۔ ان لوگوں میں بھی سید محمد داؤد پیش پیش تھے ۔ سید صاحب کابل کے کتب خانۂ معارف میں مجھ سے آ کر ملے اور کہنے لگے :

"در بدخشان قریب فیض آباد در قریۂ ارگو قشلاق بیدل دارای یک هزار خانه است ۔ آن ها این هم افتخار دارند که بیدل در ارگو ولادت یافت ۔"

علاوہ ازیں جب میں وہاں حافظ نور محمد خان کے کتب خانے کا جائزہ لے رہا تھا کہ

مطبع معدری کے کلیات بیدل میں جلد والے سعید کاغذات پر میں نے سید سرور حان باہا ابن سید جعفر باہا کی تحریر دیکھی ، جو سید ہدایت اللہ چاہ پاہی کی زبانی درج ہوئی تھی ؛ لکھا تھا :

> "بیدل صاحب از چند بدخشان است کہ نزدیک فیض آباد باشد..... بیدل صاحب با پدر و مادر و کاکا و فرزندان خود تماماً ہارادۂ زیارت بیت اللہ شریف عازم گردیدہ اند و چون حسب قضائے شان در دہلی وفات یافتہ می شود ایشان از طریق وفا و ادب کہ بہ پدر بزرگوار خود داشتہ در دہلی سکونت فرمودہ اند۔"

اب اگر ان باتوں کو درست اور صحیح مان لیا جائے تو خود بیدل اور دوسرے متعدد تذکرہ نگاروں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب کا سب بالکل غلط ہو جاتا ہے ۔ یہ ایسی بے سروپا باتیں ہیں کہ مزار بیدل کے کابل میں واقع ہونے والے مسئلے کی طرح ان میں سے ایک بھی تاریخی مسلمہ حقائق سے مطابقت نہیں رکھتی ۔ اس سلسلے میں فی الحال صرف یہ عرض کر دینا مناسب ہو گا کہ قارئین کرام میرا مقالہ تذکرۂ بیدل (اورینٹل کالج میگزین) مطالعہ فرمائیں ، جو ۱۹۵۳ء میں شائع[1] ہوا تھا اور پھر میری انگریزی تصنیف 'سیرت بیدل' کی طباعت[2] کا انتظار فرمائیں جس میں حالات بیدل پر پوری تحقیق و تدقیق کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے ۔ بیدل عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے ۔ والد بچپنے میں ہی وفات پا گئے ۔ ۲۱ برس کی عمر تک بہار اڑیسہ میں رہے ۔ کوئی بیس اکیس سال تک درویش خدا مست کی حیثیت سے آگرہ ، متھرا اور دہلی کے درمیان چکر لگاتے رہے ۔ پنجاب میں حسن ابدال تک بھی ایک بار سفر کیا ۔ پھر مستقل طور پر دہلی میں مقیم ہو گئے ۔ حج کی سعادت انھیں نصیب نہیں ہوئی ۔ نہ اس بات کا ہمیں علم ہے کہ ان کے والد کہاں فوت ہوئے اور نہ ان کی کوئی اپنی اولاد تھی ۔ صرف ایک

۱۔ یہ مقالہ اس مجموعے کے ضمیمے میں شامل ہے ۔

۲۔ یہ کتاب پبلشرز یونائٹڈ نے چھاپی تھی اور ۱۹۶۱ء سے بازار میں فروخت ہو رہی ہے ۔

لڑکا عبدالخالق پیدا ہوا تھا جو کم سنی ہی میں فوت ہو گیا ۔ اس لیے مندرجہ بالا تمام بیانات بالکل غلط ہیں ۔ میں نے افغان ادیبوں کو اس ضمن میں تحریری اور قطعی ثبوت بھی پیش کرنے کو کہا مگر انہوں نے اظہار عجز کیا ۔ آقای سرور خاں گویا سے جب میں نے ۲ اگست ۱۹۵۱ء کو اُن کے مکان واقع کارتہ چار کابل میں ان قصوں کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگے : ”شنیدہ ایم ثبوت نداریم“ اور آقای سرور خان گویا فارسی زبان کے وہ نامور ادیب ہیں جن کے متعلق سید سلیمان ندوی اپنے کتابچے 'سفر کابل' میں لکھتے ہیں کہ اساتذہ کے کلام کی زندہ بیاض ہیں ۔ بیدل کے مولد و منشاء کے متعلق ان بے سر و پا باتوں کے علاوہ کابل میں مزار بیدل کی بابت کسی افغان شاعر یا ادیب نے راقم سطور کو کچھ نہ بتایا ۔ محولہ بالا 'سیرت بیدل' میں ان کے موجودہ مزار کے میں نے جو عکس شائع کیے ہیں وہ آقای سرور خان گویا کے عطا کردہ ہیں ، جو وہ ۱۹۵۱ء کے اوائل میں دہلی سے لائے تھے اور اس وقت تک ہر ایک کا خیال یہی تھا کہ اصل مزار بیدل اسی مقام پر تھا جہاں مولانا حسن نظامی نے تعمیر کرایا ہے ۔ یہ امر کہ اُن دنوں کابل میں یہ خیال عمومی حیثیت رکھتا تھا ، سید سرور خاں پاچا کی مذکورہ بالا تحریر سے بھی ثابت ہوتا ہے ۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں :

”و زیارت خود شان و تمام افراد خاندان شان در حصۂ شہر
سیم دہلی در زیارت یکی از اولیای عظام آن جا بودہ و دفن
شدہ اند ۔“

ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ مزار بیدل کے متعلق بعض اہالیان کابل کا ذہنی انتشار خود میرا پیدا کردہ ہے ؛ بیدل کے سلسلے میں ضروری معلومات اور اقتباسات حاصل کرنے کے بعد میں ۱۹۵۱ء میں ہی واپس پاکستان چلا آیا تھا ۔ ۱۹۵۳ء کے موسم بہار میں آقای سرور خان گویا لاہور تشریف لائے ۔ اُن کے سفر کا مقصد بھارت کے کسی ثقافتی اجلاس میں افغان مندوب کی حیثیت سے شامل ہونا تھا ۔ اس موقع پر پنجاب یونیورسٹی نے انہیں چائے پر بھی مدعو کیا ۔ ان دنوں میرا بیدل پر انگریزی میں مقالہ مکمل ہو چکا تھا ۔ دوران گفتگو آقای موصوف سے میں نے عرض کیا کہ فلاں فلاں وجوہات کی بنا پر خیال پیدا ہوتا ہے کہ مولانا حسن نظامی نے بالکل ایک غلط مقام پر مزار بیدل تعمیر

کرا دیا ہے ۔ اس سفر کے بعد جناب گویا جب واپس کابل پہنچے ہوں گے تو انہوں نے میرے ان خدشات کا ذکر وہاں کیا ہوگا ۔ وہاں کے لوگ بیدل کے متعلق معمولی سی بات سننے کے لیے بھی سخت بے تاب ہو جایا کرتے ہیں ، دل دادگی کا یہ عالم ہے ۔ اس لیے یہ خدشات جلد ادھر اُدھر پھیل گئے ہوں گے اور جو لوگ پہلے سے بیدل کو افغانی ثابت کرنے کے درپے تھے ۔ اُن کو اب مزار بیدل بھی کابل میں ثابت کرنے کا موقع مل گیا ۔ یہ خیال بالکل قرین قیاس نظر آتا ہے کیوں کہ مزار بیدل کے کابل میں مانے جانے کے متعلق یہ تمام تحریریں آقای سرور خاں گویا کے ۱۹۵۳ء والے سفر ہند و پاک کے بعد آنے لگی ہیں ۔ افغانوں کے اس ذہنی انتشار کا علم ہمیں پہلے پہل اس وقت ہوا جب ۱۹۵۴ء میں استاد گرامی قدر ڈاکٹر محمد باقر صاحب ابن سینا کی ہزار سالہ برسی میں شرکت کے بعد ایران سے مراجعت فرما ہوئے اور انہوں نے ارشاد فرمایا کہ بعض افغان ادیب مزار بیدل کابل میں ظاہر کر رہے ہیں ، اس لیے اپنے انگریزی مقالے میں سے متعلقہ حصص ٹائپ کرکے بھیج دو تاکہ کابل کے انصاف پسند اور حق پژوہ اہل علم کے پاس روانہ کر دیے جائیں ، کیوں کہ وہ صحیح صورت حال سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں ۔ غالباً سرور خاں گویا اس برسی کے موقع پر ڈاکٹر صاحب قبلہ سے ایران میں ملے تھے اور انہوں نے ان سے متعلقہ معلومات حاصل کرنے کی استدعا کی تھی ۔ چناں چہ وہ حصص اس طرح کابل پہنچ گئے اور ممکن ہے انھی کی بنا پر وہ تردید شائع ہوئی ہو جس کا ذکر آقای حبیبی نے اپنے مکتوب میں کیا ہے ۔

بہرحال جو کچھ بھی ہوا بعض افغان اہل قلم کا بیدل کو افغانی ثابت کرنے کی سعی کرنا اور اُن کا مزار کابل میں دکھانا علمی نقطۂ نگاہ سے سخت غیر ذمہ دارانہ فعل ہے ۔ بیدل سے عقیدت کے اظہار کا بہترین طریق یہ تھا کہ وہاں بیدل اکاڈمی قائم کی جاتی ۔ ان کے کلام کو علیحدہ علیحدہ مجلدات کی صورت میں جدید فنی خوبیوں کے ساتھ طبع کرایا جاتا ۔ شہزادہ نصراللہ خان مرحوم نے غزلیات بیدل کا جو مہتم بالشان کام کابل میں شروع کیا تھا اور ردیف 'د' تک ان کی غزلیات کا ایک بےنظیر نسخہ طبع کرایا تھا ، اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا جاتا ۔ بیدل کی شاعرانہ حیثیت کو اہتمام سے اجاگر کیا جاتا اور بتایا جاتا کہ کس طرح پاک و ہند اور افغانستان و ترکی کی اکثر و بیش تر ادبی تحریکیں اس شاعر عظیم سے اثر پذیر ہوئی ہیں ۔ جدید علوم اور تازہ معلومات کی روشنی میں

بیدل کے ہمہ گیر اور حیات پرور فسفہ٭ حیات سے اہل عالم کو روشناس کرایا جاتا اور اس حقیقت کو عالم آشکارا کیا جاتا کہ شیکسپیئر اور رومی کا ہم پایہ ایک تورانی الاصل شاعر گیارھویں صدی ہجری میں سلطانان ہند کے درمیان پیدا ہوا ، مگر افسوس کہ سیاسی طوفانوں نے اسے نگاہوں سے اوجھل رکھا ۔ اگر اس قسم کی کوئی کوشش کی جاتی تو بڑی مستحسن ہوتی ۔ اہل علم داد دیتے اور کہتے فی الواقعہ تقاضاے عقیدت یہی ہوا کرتا ہے ۔ موجودہ صورت میں بے معنی اور بے حقیقت باتوں کو ہوا دینے سے کیا حاصل ہوتا ہے ۔

بیدل کے حالات کو جاننے والا ہر صاحب عقل سلیم اس بات پر متفق ہوگا کہ جہاں تک اصل اور آبائی وطن کا تعلق ہے ، بیدل پر اہل کابل کی نسبت اہل بخارا کا زیادہ حق ہے ۔ وہ چغتائیوں کے ارلاس قبیلے سے تھے اور آن کے آبا و اجداد بخارائی تھے ۔ اور ترکستان میں بھی بیدل اتنا ہی مقبول ہے جتنا افغانستان میں بلکہ اس سے بھی زیادہ ۔ کابل میں بیدل کے اکثر قلمی کلیات میں نے ترکستان کے شہر سبز سے آئے ہوئے دیکھے ۔ بعض تو امیر بخارا نے امیر کابل کو تحفے کے طور پر بھیجے تھے ۔ مرحوم ہاشم شائق آفندی نے ، جو امیر بخارا کی حکومت میں وزارت تعلیم پر فائز رہ چکے تھے اور اشتراکی انقلاب کے بعد کابل ہجرت کر آئے تھے ، مجھے بتایا کہ کس طرح موسم بہار میں بادام کے نو شگفتہ درختوں کے نیچے وہاں کے لوگ ذوق و شوق سے بیدل خوانی کیا کرتے تھے ، اور بیدل خوانوں کا وہاں ایک خاص طبقہ تھا جو جتھوں کی شکل میں چل پھر کر لوگوں کو کلام بیدل سنایا کرتا تھا ۔ حال ہی میں اسی سال یعنی ۱۹۵۸ع کے ماہ جنوری میں مذاکرۂ اسلامی میں شرکت کے لیے روسی مندوب کی حیثیت سے ڈاکٹر ابراہیم موصوف لاہور تشریف لائے ۔ ڈاکٹر صاحب ترکستان کے رہنے والے ہیں ۔ انھوں نے جناب ڈاکٹر محمد باقر صاحب صدر شعبۂ فارسی دانش گاہ پنجاب کے زیر صدارت اسلامیہ کالج لاہور میں ۱۲ جنوری کو بیدل کے متعلق ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں انھوں نے بتایا کہ بیدل ترکستان میں اب بھی اتنے ہی مقبول ہیں جتنے کہ پہلے تھے ۔ بلکہ اشتراکی انقلاب میں مزارع ، دستکار اور مفلس لوگوں کے متعلق بیدل کے خیالات نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے ، اور یہی وجہ ہے کہ انھی سالوں میں روسی زبان میں بیدل پر دو ایک کتابیں ماسکو میں شائع ہوئی ہیں ۔ ترکستان میں اتنی مقبولیت کے باوجود بیدل کے متعلق وہاں کے لوگوں نے ایسی

مطعیت کا اظہار کبھی نہیں کیا جو ہم کابل کے بعض ادیبوں کی طرف سے دیکھ رہے ہیں۔ میں نے کابل میں ایک کتاب 'تحفۃ الاحباب فی تذکرۃ الاصحاب' دیکھی جو تاشقند میں ۱۳۳۲ھ میں طبع ہوئی تھی ۔ اس میں بیدل کا اتباع کرنے والے وسط ایشیا کے شعراء کا بھی ذکر موجود تھا ، مگر یہ کہیں درج نہیں تھا کہ مزار بیدل کابل میں پایا جاتا ہے ۔

مندرجہ بالا تمام بیانات کی بنا پر ہم حتمی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ بیدل اب بھی دہلی میں دفن ہیں ، البتہ ان کے مزار کا محل وقوع ان لوگوں کی تحریرات کی روشنی میں ڈھونڈنا چاہیے جنھوں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اور دہلی میں رہتے ہوئے یہ کام بآسانی انجام دیا جا سکتا ہے ۔

مزار بیدل کے متعلق راقم اپنی معروضات پیش کر چکا ! آپ دیکھیں مزار بھی صاحب مزار کی طرح عظمت کا حامل ہے اور جس طرح بقول بیدل :

نہاں ماندیم چوں معنی بچندیں لفظ پیدائی

وہ خود ہمارے لیے راز سربستہ بنے ہوئے ہیں ، ہماری اتنی طویل گفتگو کے باوجود ان کا مزار بھی پردۂ اسرار میں چھپا ہوا ہے ۔

(اردو ، کراچی ، ۱۹۵۸ء)

---

(۴)

بیدل اور غالب

غالب کے اردو دیوان کو وید کے بعد ہندوستان کی دوسری الہامی کتاب کہنے والے ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری اپنے شہرۂ آفاق دیباچے میں جب اس مقام پر پہنچتے ہیں جہاں انھوں نے غالب کے تصوف پر بحث کی ہے ، تو جوش عقیدت میں کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ تمام باریک مسائل اور انسان کی اصل کے متعلق یہ تمام حیات افروز افکار غالب نے کہاں سے لیے ؟ وہ اپنے اس جملۂ استفہامیہ سے یہ استدلال کرنا چاہتے ہیں کہ یہ تمام الہامات تھے ، جو غالب کے قلب پر وارد ہوئے ۔ ان کا صریر خامہ نوائے سروش تھا اس لیے گہرے مسائل کے متعلق کوثر سے ڈھلے ہوئے اشعار صفحۂ قرطاس پر جلوہ گر ہو گئے ۔

میں نہ تو ڈاکٹر بجنوری کے علم و فضل سے انکار کرتا ہوں اور نہ ہی تخلیقاتِ شعری میں اس جذبے کی اہمیت سے انکار کر سکتا ہوں جو الہام سے مماثلت رکھتا ہے ، اور شعر کہتے وقت شاعر پر طاری ہوا کرتا ہے ۔ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ شاعر کی شخصیت ، جس کا اظہار وہ الہام کی زبان میں کرتا ہے ، اس قدر سادہ نہیں ہوتی جس قدر ڈاکٹر بجنوری نے تصور کر لی ہے ۔ ہر شاعر اپنی عظمت کے باوجود اپنی شخصیت کی تعمیر کے لیے مختلف عوامل کا مرہون منت ہوتا ہے ۔ شاعر کے تاثرات اور اس کی معلومات کے ریشے بہت دور تک پہنچتے ہیں ۔ اور بڑی پیچیدہ راہوں سے ہو کر شاعر کی اس باطنی کیفیت کو متاثر کرتے ہیں جو اس کا امتیازی جوہر کہلاتی ہے ۔ غالب کا حال بھی یہی ہے ۔ ایک طالب علم کا فرض ہے کہ وہ ان تمام عوامل کا بہ نظر غائر مطالعہ کرے جن کی وجہ سے غالب کی شخصیت صورت پذیر ہوئی ، ورنہ وہ اس تسلسل کو کھو بیٹھے گا جو علم و ہنر میں ہر لمحہ ارتقاء کی منازل طے کرتا نظر آتا ہے ۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے وہ اس مسافر کی طرح آوارہ بھٹکتا پھرے گا جو کسی بیابان میں راستہ کھو بیٹھا ہو ۔

مرزا غالب کے تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ بالخصوص ابتدا میں وہ مرزا عبدالقادر بیدل سے بڑے متاثر ہوئے ۔ مرزا بیدل کی وفات سے لے کر اب تک گزشتہ اڑھائی سو سال میں ہمارے یہاں تمام بلند فطرت اور ذہین لوگ ان کے بڑے مداح چلے آئے ہیں ۔ خود مرزا غالب کا یہ حال تھا ، اور پھر جن دنوں میں آج سے ایک صدی پہلے غالب زندہ تھے ، اس بزم کی روایات دہلی میں مقدس صحیفے کے عام دہرائی جاتی تھیں جو بیدل کی وجہ سے وہاں قائم ہوئی تھیں ۔ اورنگ زیب سے لے کر فرخ سیر تک شاہان مغلیہ اور ان کے مقتدر درباریوں کی بیدل سے نیازمندی ، اس شاعر اعظم ، عارف کامل اور مفکر بے بدل کی مجالس شبینہ ، ان کے عرس پر مشاعروں اور لاتعداد شاگردوں کے تذکرے انیسویں صدی کے وسط میں بھی دہلی کے لوگوں کی زبان پر موجود تھے ۔ غالب کے زمانے کے لوگ ابھی مکمل طور پر مغل روایات کے ماحول میں زندگی بسر کر رہے تھے ۔ علاوہ ازیں بیدل کو وفات پائے پورے اسّی سال نہیں ہوئے تھے کہ غالب پیدا ہوئے ۔ اس لیے جس ماحول میں انھوں نے آنکھ کھولی ، جس ماحول میں انھوں نے تربیت اور پرورش پائی اور اپنے ایام جوانی گزارے وہ بیدل کی مدح سے لبریز تھا ، اس لیے قدرتی طور پر انھوں نے سب سے پہلے بیدل کی طرف توجہ کی ؛ ان کے کلام کا مطالعہ کیا اور چوں کہ طبع بلند لے کر پیدا ہوئے تھے ، بڑے انہماک اور بڑے ذوق و شوق کے ساتھ انھوں نے بیدل کا تتبع شروع کر دیا ۔

جب میں بیدل کے متعلق تحقیقات کر رہا تھا تو غالب کے 'مطالعۂ' بیدل کے متعلق مجھے ایک حتمی ثبوت ملا ؛ اس ثبوت کا ذکر میں نے اپنے مقالہ' انگریزی 'سیرت بیدل' میں بھی کیا ہے ؛ اس ثبوت کے متعلق مجھ سے معلومات حاصل کرنے کے بعد خواجہ عباداللہ اختر نے بھی اپنی تصنیف 'بیدل' میں غالب کے اس استفادے کا ذکر دو ایک سطور میں کیا ہے ، لیکن میرا خیال ہے کہ جب تک اس حتمی ثبوت کا ذکر مناسب تفصیل کے ساتھ نہیں کیا جائے گا ، غالب کے طالب علموں کی معلومات ناقص رہیں گی ۔ اور وہ غالب کی شخصیت کے ارتقاء کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہ کر سکیں گے ۔ چوں کہ ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے سامنے یہ حقائق نہیں تھے اس لیے انھوں نے غالب سے اظہار عقیدت تو بڑے جوش و خروش سے کر دیا ، مگر وہ کوئی فکر انگیز بات نہ کہہ سکے ۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں بیدل کی دو مثنویاں 'محیط اعظم' اور

'طور معرفت' کے قلمی نسخے موجود ہیں - یہ اس لحاظ سے بے حد اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کے اصلی مالک میرزا اسداللہ خاں غالب ہیں - یہ دونوں نسخے ایک مخطوطے کی صورت میں محفوظ ہیں - 'طور معرفت' کے پہلے صفحے پر غالب کی مُہر کا نشان موجود ہے جس پر تاریخ ۱۲۳۱ھ درج ہے - اس مُہر کے اوپر غالب نے اپنے ہاتھوں سے شکستہ نستعلیق میں اس مثنوی کی تعریف میں مندرجہ ذیل شعر لکھا ہے :

ازین صحیفہ بنوعی ظہور معرفت است
کہ ذرّہ ذرّہ چراغان طور معرفت است

اسی طرح غالب نے مثنوی 'محیط اعظم' کی تعریف میں مندرجہ ذیل شعر لکھا ہے :

ہر حبابی را کہ موجش گل کند جام جم است
آب حیوان آب جوی از محیط اعظم است

یہ مخطوطہ غالب کے طالب علموں کے لیے اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں - ان دونوں مثنویوں کے مطالب اور ان کے اسلوب و انداز بیان کا گہرا مطالعہ ہمیں غالب کے ذہنی ارتقا کے متعلق بڑی اہم معلومات بہم پہنچا سکتا ہے -

غالب ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے تھے اور یہ دونوں مثنویاں ۱۲۳۱ھ میں ان کے زیرمطالعہ تھیں - ۱۹ کا سن تھا ، 'ہر آرزو غالب بیدل کے دو شاہکاروں کا مطالعہ کر رہے تھے - اس سن میں ہر انسان اور بالخصوص ہونے والا ایک بلند پایہ شاعر انفعال کی جس کیفیت سے گزر رہا ہوتا ہے ، اس کا اندازہ اہل دل بہ خوبی لگا سکتے ہیں - اس بنا پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اثر پذیری کے اس دوران میں ان مثنویوں کے مطالعے سے بیدل روحِ غالب کے ریشے ریشے میں سما گیا - دیوان غالب کے 'نسخہ حمیدیہ' میں غالب کا اپنا بیان درج ہے کہ انھوں نے بیدل کا تتبع عمر کے پچیسویں سال تک کیا اور ایک دیوان مرتب کر ڈالا - اب جب یہ بات پایہ' ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ غالب نے بیدل کا مطالعہ اور تتبع کم از کم چھ سال تک کیا ، تو پھر بعد میں وہ کیسے اپنے دل و دماغ سے بیدل کے اثرات کو خارج کر سکتے تھے ' بالخصوص جب کہ ہم جانتے ہیں کہ اس شاعر اعظم کے خیالات ہمارے دور میں اقبال ایسے دانائے مشرق کے لیے بھی بصیرت افروز ثابت ہوئے ہیں - بنابریں حالی 'یادگار غالب' میں بجا طور پر فرماتے

ہیں کہ اگرچہ اشعار میں سادگی پیدا کرنے کے لیے غالب نے بعد میں عرفی اور نظیری کا تتبع کیا ، لیکن ان کے مزاج فکری پر بیدل کا اثر آخر دم تک رہا ۔ میرزا غالب نے غزل گوئی میں بیدل کی غزلیات کو بھی بہ طور نمونہ سامنے رکھا ہے اور یہ حقیقت ان کے دیوان کے مطالعے سے واضح ہو جاتی ہے ، لیکن جیسا کہ پیش تر ازیں عرض کیا جا چکا ہے ، بیدل کے مطالعے کا حتمی ثبوت ہمارے پاس مذکورہ بالا مخطوطہ ہے ، جو غالب کے قبضے میں رہ چکا ہے ، اس لیے غالب کے مزاج فکری کو سمجھنے کے لیے ان مثنویوں کے مطالب پر طائرانہ نظر ڈال لینا ضروری ہے ۔

مثنوی 'طور معرفت' کوئی بارہ سو اشعار پر مشتمل ہے ۔ یہ مثنوی بیدل نے دو روز میں لکھی تھی ۔ انھیں موسم برسات میں میوات کے ایک کوہستانی مقام بیراٹ کے نظر افروز مناظر دیکھنے کا اتفاق ہوا ۔ سیاہ بادلوں ، موتی جیسے آب دار بارش کے قطروں ، بجلی کی چمک ، بادلوں کی گرج ، ٹھنڈی ٹھنڈی لطیف ہوا ، نتھری نتھری فضا ، قوس قزح ، رنگین پروں والے موروں اور دھلے ہوئے چمک دار رنگا رنگ پتھروں کو دیکھ کر بیدل ایسے مسحور ہوئے کہ ان مناظر کو بیان کرنے کے لیے انھوں نے دو دنوں میں بارہ سو اشعار پر مشتمل ایک دل ربا شاہ کار تیار کر لیا ۔ منظر نگاری ، معنی آفرینی اور حسن بیان یہ محاسن سخن اس مثنوی میں اپنے کمال پر دکھائی دیتے ہیں ۔ جہاں بیدل پتھروں کو دیکھ کر پکار اٹھتے ہیں کہ :

سیاد این جا زنی بر سنگ دستی
کہ مینا در بغل خفت است مستی

وہاں انھیں ہر قطرے میں بحر ، ہر خار میں گلشن ، ہر ذرے میں بہار کی رنگینی اور ہر کف خاک میں ایک عالم بسیط پنہاں نظر آیا ۔ آپ ہی بتائیں ، جو مثنوی اس قسم کا فنی اور علمی شاہکار ہو وہ کس طرح غالب کے تصورات سے نکل سکتی ہے ۔ اب اس مثنوی کے مطالب کو لے کر آپ غالب کے دیوان کا مطالعہ کریں ۔ کیا ہر صفحے پر بیدل بولتا سنائی نہیں دیتا ۔ غالب کا ایک ہی شعر لیں :

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

کیا اس شعر میں مثنوی 'طور معرفت' کی صدائے باز گشت سنائی نہیں دیتی ؟

اب ہم مختصراً مثنوی 'محیط اعظم' کا ذکر کرتے ہیں ؛ بیدل کی یہ مثنوی خاصی طویل ہے جس کے چھ ہزار اشعار ہیں ۔ اس مثنوی کی کئی حیثیتیں ہیں ؛ یہ ساقی نامہ بھی ہے، بہاریہ بھی ، مابعدالطبیعیات کے مسائل بھی اس میں موجود ہیں اور اسرار تصوف بھی ۔ اور اس کی ان چاروں حیثیتوں میں حس کو بھی آپ لیں اس میں بیدل کا تخیل اپنے اوج پر دکھائی دیتا ہے ۔ افسوس ہے ہمارے ہاں شعرا کا مطالعہ ان خطوط پر نہیں کیا جاتا جن پر مغرب کے شعرا کا ذکر ہوتا ہے ۔ اگر یہاں بھی اپنے شعرا کا ہم اسی اہتمام اور اسی مربوط انداز فکر کے ساتھ مطالعہ کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ فکر و بیان کے اعتبار سے ہمارے شعرا کو وہ مقام حاصل ہے جو شیکسپیئر ، گوئٹے اور دانتے کے لیے بھی باعث فخر ہو سکتا ہے ۔ بیدل کی یہ مثنوی بڑی بلند اور فکر انگیز ہے ۔ بڑے بڑے مطالب مختصر سے حسین اشعار میں بیان کر دیے گئے ہیں ۔ مثلاً انسان کے عالم اصغر ہونے کے متعلق بیدل کہتے ہیں :

به معنی محیط و به صورت نمی
ز موج نفس در قفس عالمی

اس شعر کی پہنائیاں تصور میں ڈوب جانے سے نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہوتی ہیں اور پھر آنکھیں بے اختیار بیدل کی عظمت کے سامنے جھک جاتی ہیں ۔ اس مثنوی کی خوبیوں پر مفصل بحث کرنے کا یہاں موقع نہیں ۔ اسی ایک شعر سے آپ اندازہ لگا لیں گے کہ اس مثنوی میں تصوف اور مابعدالطبیعیات کے بڑے بڑے مسائل کس خوبی اور پاکیزگی سے بیان کیے گئے ہیں ۔

اس کے مطالب کے سلسلے میں ان اشارات سے واضح ہو جاتا ہے کہ تصوف کے متعلق غالب کی معلومات کا کم از ایک ماخذ بیدل کی یہ مثنوی بھی تھی ، اور ہمیں اس بات کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ ان دونوں مثنویوں کے انداز بیان میں جو شگفتگی پائی جاتی ہے ، اس سے غالب کس حد تک متاثر ہوئے ہوں گے ۔

ان معروضات پر غور کرنے کے بعد آپ ان اشعار کی ماہیت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جو غالب نے بیدل کی ان مثنویوں کی تعریف میں کہے ہیں ۔ میں نے اپنے انگریزی مقالے 'میرث بیدل' میں مثالیں دے کر اس بات کو واضح کیا ہے کہ احساس حسن ، حسن بیان ، معنی آفرینی اور تصورات کے لحاظ سے غالب

پر بیدل کا اثر ساری زندگی رہا ۔ یہ ایسے مثبت اثرات ہیں کہ کوئی منصف مزاج انسان ان کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا ، اور دیکھا جائے تو غالب کی عظمت کے عناصر اربعہ بھی یہی ہیں ۔ اس بات سے میرا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ غالب کی تنقیص کی جائے ۔ جہاں تک غالب کے ذاتی اجتہاد کا تعلق ہے اس کی جدت طرازی اور خوبی و رعنائی کا قائل نہ ہونا انتہائی کم ظرفی کے مترادف ہے ۔ غالب ایک ایسا لباس فطرت ہے جس کا قلم حقیقت نگار اپنی تازگی اور توانائی کبھی کھو نہیں سکتا ۔ میرا مطلب صرف یہ تھا کہ غالب کی شخصیت کے ارتقا میں مثبت طور پر بیدل کا بہت بڑا دخل ہے اور یہ بات غالب کی عظمت کے منافی نہیں ۔ دوسرے کہا یہ ناانصافی نہیں ہے کہ بیدل کا تتبع کرتے ہوئے غالب کے کلام میں جو اغراق پیدا ہوا ، اس کی منفی حیثیت کو تو بار بار المشرح کیا جائے ، لیکن بیدل کے مطالعے سے غالب نے اسلوب اور افکار کے اعتبار سے جو مثبت فوائد حاصل کیے ہیں ان کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے ۔ جب غالب کے شاگرد رشید مولانا حالی اس بات کے قائل ہیں کہ غالب کے مزاج پر بیدلی عمر بھر طاری رہی تو پھر غالب کے ہر طالب علم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ ان فوائد کا نگاہِ عمیق سے استقصا کرے ، جو غالب نے بیدل سے حاصل کیے ۔

غالب بیدل کا تتبع کیوں کامیابی سے نہ کر سکے ۔ یہ سوال بھی بڑا دل چسپ ہے ۔ میرے خیال کے مطابق غالب نے بیدل کے رنگ میں غزل کہنا اُس وقت شروع کیا جب کہ وہ ابھی نومشق تھے ؛ فکر پختہ نہ تھی اور ان کی روح ان تجارب سے نا آشنا تھی جو تصوف کی عملی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے بیدل کو حاصل ہوئے تھے ۔ علاوہ بریں علمی لحاظ سے بھی جو وسعت نظر اور عمیق نگاہ بیدل کو میسر تھی ، وہ غالب کے حصے میں نہ آئی ۔ اور پھر زمانے کے حالات بھی مختلف تھے جن سے بیدل ایک طرف تو فکری اور عملی لحاظ سے عظمت اور سربلندی کے علم بردار بنے اور دوسری طرف جہاں دار شاہ اور مغل امرا کی پستیٔ فطرت کو دیکھ کر انہیں ایک حیات افروز انقلاب کا داعی بننا پڑا ۔ غالب کے سامنے ایک از کار رفتہ ، بے کار اور معطل معاشرہ تھا جس کی مایوس کن تہ حالی کے زیر نظر غالب کو گوشۂ عافیت کی تلاش کے بغیر اور کچھ سوجھتا ہی نہ تھا ۔ دونوں کے مخصوص زمانوں نے دونوں کی طبائع میں بنیادی طور پر اختلاف

پیدا کر دیا تھا اور غالباً اسی بنا پر علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ غالب نے بیدل کو سمجھا ہی نہیں ۔ بیدل کا تصوف حرکی ہے اور غالب کا سکونی ، یا جیسا کہ وہ فرماتے ہیں ، بہتر الفاظ میں اسے مائل بہ سکون کہا جا سکتا ہے ۔ یہ بہت بڑا اختلاف ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ۔ ان تمام حقائق کو مدنظر رکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ کیوں غالب اپنی پوری کوشش کے باوجود بیدل کا تتبع کامیابی سے نہ کر سکے ۔

ہم یوم غالب[1] کے سلسلے میں مختصر سے وقت کے لیے جمع ہوئے تھے ۔ غالب اور بیدل کے سلسلے میں جن مطالب کو میں نے چھیڑا ہے ، وہ نہایت ہی اہم اور وقیع ہیں ۔ وقت کی تنگی کے باعث میں ان پر سیر حاصل بحث نہیں کر سکا ۔ پھیلتے ہوئے مضامین کو یک لخت سمیٹنا پڑا ہے ۔ تاہم اس مختصر سے وقت میں اور اس غیر مکمل مقالے سے یہ بات ضرور واضح ہو گئی ہے کہ بیدل اور غالب کے سلسلے میں نئے خطوط پر کام کرنے کی اشد ضرورت ہے کیوں کہ غالب پر بیدل کے مثبت اثرات[2] ایسی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں کہ ان کو سمجھے بغیر غالب کو صحیح طور پر سمجھنا تصور میں نہیں آ سکتا ۔

(ادبیات ، چکوال ، جولائی ۱۹۶۰ع)

۱- ۱۹۵۶ع کے موسم سرما میں دانش کدۂ چکوال (جہلم) میں یہ تقریب منائی گئی تھی ۔

۲- جیسا کہ دیباچے میں بیان کیا گیا ہے ، اس ضمن میں سید عابد علی عابد نے اپنی شان دار فنی مہارت اور سخن فہمی کی بنا پر ایک بے حد کامیاب کوشش کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ غالب کے اشعار کا مطالعہ ہم مختلف اور متنوع مقامات سے کر سکتے ہیں اور یہ فیضان بیدل ہے ۔ دیکھیں 'نئی تحریریں' : مطبوعہ لاہور ، حلقۂ ارباب ذوق ، صفحہ ۶۵ (عنوان غالب اور بیدل)

(۵)

مثنوی طُور معرفت

شاعر کی زبان شعر کہتے وقت تخلیقی تجربے کا صرف وہ حصہ بیان کرتی ہے جو صوتی صورت اختیار کر سکتا ہے ۔ تخلیقی تجربے کے وقت جذبات ، احساسات اور خیالات میں جو تموج پیدا ہوتا ہے ، اس کی وسعتیں نا پیدا کنار ہوتی ہیں ۔ شاعر اپنے اشعار کے ذریعے سے اس تموج کے بارے میں بعض اشاروں پر اکتفا کرتا ہے اور اگر پڑھنے والا ان اشاروں کی مدد سے اپنے آپ پر وہی تخلیقی ہیجان طاری کر لے جو خود شاعر پر طاری ہوا تھا تو اس کا قلبِ ماہیت ہو جاتا ہے اور کم از کم اس تجربے کے دوران وہ اپنے آپ کو بالکل ایک نئی مخلوق سمجھتا ہے اور اپنے ضمیر کے تار و پود کو یک سر مبدل پاتا ہے ۔

اس مثنوی 'طور معرفت' کو لکھتے وقت میرزا بیدل پر ایک عجیب و غریب تخلیقی ہیجان طاری ہوا تھا ۔ اس بات کا اندازہ آپ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ کم و بیش بارہ سو اشعار کی یہ مثنوی صرف دو دن میں پایۂ تکمیل کو پہنچی ۔ واردات اور کیفیات میں جو طوفان بپا ہوا اُس کے لیے یہی کہہ دینا کافی ہے کہ مثنوی کے خاتمے تک ہر تازہ شعر جذبات اور خیالات میں ایک نئے عروج کا اعلان کرتا ہے ، اور جوش بیان ہے کہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے ۔ پھر بھی بیدل جب دیکھتے ہیں کہ واردات کی فراوانی حدود شعر میں نہیں سما سکتی تو ایک حقیقی فن کار کی طرح تڑپ اُٹھتے ہیں اور کہتے ہیں :

ز گلگشت حقیقت تر زبانم
بصد منقار مستی بالد بیانم
نوای ساز مطلب شور خیز است
ولی کلک رقم خط سرمہ ریز است

اگر از خط نمی شد سرمہ آلود
معانی شور چندیں حشر می بود

واقعی بیدل کی فطری کوتاہیوں نے کتنے ہی لطیف اور بوقلموں مطالب کو ہم تک نہ پہنچنے دیا اور قلب و نظر کو ان کی رنگینیوں سے محروم رکھا۔ یا ہم جو مطالب بیدل ایسے فقیدالمثال شاعر نے اپنے بے نظیر حسن بیان کے ساتھ اس مثنوی کے ذریعے ہم تک پہنچائے ہیں ، اس صحبت میں انھی کا تذکرہ مقصود ہے۔

بیدل ۹۹ ۱ھ کے بعد اپنے محب نواب شکراللہ خاں کے ساتھ میوات کے علاقے میں گئے ۔ وہاں بابجی رام نروکا نے ایک مدت سے اودھم مچا رکھا تھا اور شہنشاہ عالمگیر نے نواب موصوف کو متعین کیا تاکہ وہ وہاں جا کر شرارت کا خاتمہ کریں ۔ بابجی رام تاب مقاومت نہ لا کر چلے تو راہ فرار اختیار کر گیا لیکن بعد میں میدان کارزار میں لڑنے آزما ہوا اور شکست فاش کھائی ۔ اس کے بھاگ جانے پر یک قطعے میں بیدل نے خوش ہو کر یہ تاریخ کہی تھی ۔ ”دل نروکہ بشکست ، ۱۰۹۷ھ ۔“ لیکن جب اگلے سال نواب شکراللہ خاں کو میدان جنگ میں فیصلہ کُن فتح حاصل ہوئی تو بیدل نے کہا : ”غزوۂ عجیب“ اور ”فتح شگرف ۔“ ان دونوں سے علیحدہ علیحدہ ۱۰۹۸ھ ہجری تاریخ نکلتی ہے ۔ اس وقت بیدل کی عمر قمری حساب سے ۴۵ سال سے زائد تھی ۔ بیدل ان فتوحات کے بعد نواب صاحب موصوف کے ساتھ میوات گئے تھے ۔ برسات کا موسم بیدل نے وہیں گزارا ۔ نتھری نتھری پہاڑی فضا تھی ، بادل اُمڈ اُمڈ کر آ رہے تھے ۔ بارش کی کثرت نے اس فضا کی لزبت اور لطافت کو دوبالا کر دیا تھا ۔ شفق اور قوس قزح کی رنگینیاں تمام وسعتوں پر چھائی جا رہی تھیں ۔ حسن کے ان جلوؤں کو دیکھ کر ایک شاعر کب خاموش رہ سکتا تھا ۔ بیدل کے احساس جمال میں ایک بے پناہ ہل چل پیدا ہو چکی تھی اور اس نے وہیں اس پہاڑ یعنی کوہ بیراٹ کے آب و رنگ کو اپنے آب دار اشعار کا جامہ رنگین عطا کر دیا ۔ نواب شکراللہ بھی سخن سنج و سخن گو تھے ۔ انھوں نے بھی طبع آزمائی کی لیکن بیدل نے تو ان مناظر کو ایک ایسے شاہکار کی صورت میں محفوظ کر لیا کہ جب تک ادب زندہ ہے ، اس کی رنگ آمیزی اور جلوہ پروری اہل دل کو دعوت نظارہ دیتی رہے گی ۔ بیدل خود اپنے ایک رقعے میں اس مثنوی کو ”ایک عالم چراغاں و

صد ہزار گوہر معنی بداماں" کہتے ہیں اور غالب نے جب ۱۲۳۱ ہجری میں بیدل کی وفات سے تقریباً ایک سو سال بعد اس مثنوی کو پڑھا تو بے اختیار ہو کر کہا :

ازیں صحیفہ بتوعی ظہور معرفت است
کہ ذرہ ذرہ چراغان طور معرفت است

فارسی شاعری شیراز کے حسین و جمیل مناظر کے درمیان پھولی پھلی ، کنار آب رکنا باد اور گلگشت مصلیٰ کے تذکرے اس کی روح و رواں ہیں ۔ ہندوستان کے مغل شہنشاہ اور مغل امرا بھی جمالیات کے بڑے دل دادہ تھے ۔ کشمیر جنت زار میں بار بار پہنچنے کے لیے جو تڑپ ان کے دل میں تھی ، وہ سب پر عیاں ہے ! اور پھر ان لطیف اور نظر افروز مناظر کو جس طرح انھوں نے اپنی عبارات میں منتقل کیا ، وہ ایک تاریخی یادگار ہے ۔ نزہت و لطافت کا پیکر یعنی تاج محل جب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا تو بیدل کی عمر تیرہ برس تھی ۔ ان دنوں مغلوں کا ذوق جمال اپنے شباب پر پہنچ کر ایک عالم کو مسحور کر رہا تھا ۔ بیدل بھی مغل نژاد تھے ۔ حسن و جمال کا یہ تمام سرمایہ نگاہ بیدل کو بچپن ہی میں ورثے کے طور پر ملا ۔ اس سرمائے کے گوہر ہائے آب دار بیدل کی تمام نظم و نثر میں بکھرے پڑے ہیں ۔ لیکن تاج محل کی طرح اگر اسے یک جا دیکھنا مطلوب ہو تو مثنوی "طور معرفت" کے اشعار کا مطالعہ کرنا چاہیے ۔ اگرچہ جیسا کہ بعد میں ذکر ہوگا ، بیدل نے اس مثنوی میں جابجا حقائق اور معانی کو بھی بیان کیا ہے ، لیکن مندرجہ ذیل شعر سے واضح ہے کہ بیراٹ میں کوہ بیراٹ کے صرف حسین مناظر ہی تھے جو محرک تخلیق ثابت ہوئے :

کنون در کوہ بیراٹ آب و رنگ است
کہ ہر سنگش بدل بردن فرنگ است

جیسے چند اشعار میں بیراٹ کی سیرگاہوں کا عام منظر بیان کیا ہے :

مقامے یافت شوق جستجو ساز
کہ گردش با تحیر بود دم ساز

برنگ بادہ یکسر نشہ پرور
طلسم کوبسارش خط ساغر

ز طوفانِ بہار الہساطش
زمین تا آسمان موج نشاطش

بنازد عرصی بر سبزہ زارش
ببالد سرکشی از کوہسارش

درین گلزار چون انبار گندم
تیابی دالہ را بے تبسم

شگفتن بس کہ لبریز است این جا
زمین تا چرخ گل خیز است این جا

تصور ہر طرف می بندد احرام
ہمہ برخندۂ گل می‌زلد گام

آخری شعر کی لطافت اور حسن آفرینی پر غور کیجیے ۔ غالب کے الہامی دیوان میں مندرجہ ذیل قطعہ بند اشعار کو پڑھ کر چغتائی کے موقلم نے ایک نہایت ہی سکون ریز اور طراوت خیز منظر پیش کر دیا تھا :

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہو گئی ہے سرتاسر
روکش سطح چرخ مینائی

یہی جو موج نشاط طوفانِ بہار کی وجہ سے زمین سے آسمان تک بیدل کے ہاں ملتی ہے اور زمین اور چرخ بریں جس طرح ادھر گل خیز اور تبسم آفریں دکھائی دیتے ہیں ، ایسے غالب کے ہاں بھی نہیں ۔

اس عام منظر کو بیان کرنے کے بعد معنی نوازی اور حقیقت پژوہی کے ساتھ ساتھ بیدل حسن آفرینی اور منظر نگاری بھی کرتا چلا جاتا ہے ۔ باریک بیں نگاہ معمولی جزئیات کو بھی آجاگر کر دیتی ہے ۔ بادل گھرے ہوئے ہیں ، بارش کے قطرے گر رہے ہیں ۔ دیکھتا ہے تو کہتا ہے :

اگر ابر سیاہی قطرہ پیماست
کواکب ریزی دامان شبہاست

وگر ابر سفید آلقی عنان است
بہار صبح طرب شبنم نشان است

اور :

سپہری زیرش سیارہ خرمن
شبستان چراغان زیر دامن

گہی از برق بر آفاق خندد
گہی بر خاک سیل گریہ بندد

بہ تیغ کوہ گاہی سینہ مالد
گہی گیرد رہ دشت و بنالد

ہجوم قطرہ کی غلطانی دیکھیے :

گہرہای محیط عالم پاک
ز غلطانی روان تا دامن خاک

جہان روشن چراغ بزم اقبال
ازین پروانہ ہای بی پر و بال

بہ آہنگ چکیدن بستہ محمل
ز اوج بی خودی یک کاروان دل

ہمہ گوہر متاع سینہ صاف
کل جمعیت بی اختلاف

بہ تعمیر دل مستان روانہ
شکست یک جہان آئینہ خانہ

شرر ہا جستہ از دل داغ گرمی
گہر ہا در گرہ پیچیدہ نرمی

ان اشعار میں تشبیہات کی بہار قابل ملاحظہ ہے :

آسمان پر شفق دکھائی دیتی ہے تو اس کے جلال اور جمال کو دیکھ کر بیدل بے اختیار ہو جاتا ہے ۔ آپ نے یہ نظارہ کئی شعرا کے ہاں دیکھا ہوگا لیکن اب آپ اسے اس بے نظیر مصور فطرت کے ہاں بھی دیکھیے :

نمی دانم باین شوخی کہ زد چنگ
کہ شد بے پردہ حسن عالم رنگ

کہ وا کرد است بر آئینہ آغوش
کہ عکسش کرد عالم را چمن پوش

ز حیرت کاریِ این باغ قدرت
لگہ بوسد کف صباغ قدرت

تصور ہا بیادش جنت احرام
خیال از رنگ تصویرش گل اندام

شکوہش دست گاہ قدر گردون
چو شاہان را جلال از رختِ گلگون

نشستہ عالمی زین موج لیرنگ
چو برگ گل بزار چشمہ رنگ

ہمیں جوش بہار انبساط است
ہمیں گلگونہ حسن نشاط است

مجھے یقین ہے کہ اس کے مطالعے کے بعد آپ شیلے اور ورڈز ورتھ سے قطع تعلق کر کے حفیظ کے ہم نوا ہو کر کہہ اٹھیں گے :

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

اب آپ قوس قزح کے رنگوں کی بہار بھی دیکھیے :

گر از وصف قزح گیرد بیان رنگ
بیالد از زمین تا آسمان رنگ

چگویم چیست این نقش تحیر
کہ خم شد این زمان دوش تفکر

رگِ ابرِ بہارستانِ نیرنگ
طلسمِ ریشہ فردوس در چنگ

پرِ طاؤس صرفِ رشتہ دام
خیالِ لعلِ تو خط برلبِ جام

کشیدہ خامہ نقاشِ فطرت
خطوطِ امتحانِ رنگِ قدرت

ادای ابروی رنگ آفرین است
کہ ابروی طرب را وسمہ این است

کیا آپ اس حسنِ خیال کی داد دے سکتے ہیں ۔ لبِ جام پر لعلِ لو حط کے ہلکے سے عکس کو قزح کہنا کتنا لطیف خیال ہے ۔ نگاہ کی ادنیٰ سی جنبش سے

ایک دزک تار کی طرح اس کا معدوم ہو جانا یقینی ہے ۔ لیکن بیدل اپنی رنگین خیالی سے اسے حیاتِ دوام عطا کر دیتا ہے اور ہمارے لیے جنت نگاہ کا سامان مہیا کرتا ہے ۔ یہاں آپ اس بات کو نہ بھولیے کہ میں نے چیدہ چیدہ اشعار جستہ جستہ مقامات سے لیے ہیں ، اور اگرچہ گلدستہ اپنی جگہ بہت حسین ہوتا ہے لیکن کھلے ہوئے پھولوں کی جو بہار گلستان میں ملتی ہے ، وہ گلدستے میں کہاں ؟ اس بہار کو دیکھنے کے لیے خراماں خراماں سیرِ گلستاں ہی کے ارادے سے نکلنا چاہیے ۔ اس مقام پر یہ بات بھی ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ جلوۂ حسن صرف طور تک محدود نہیں :

برقِ گفتگوی آتشِ طور
دماغِ حسرتی می سوزی از دور
گلفت آن برق ای غافل ز تمہید
چراغانِ دگر ہم می توان دید
بچشمت ہرکجا خشت و سفالیست
زیارت گاہِ عشق و جمالیست

صحیح ذوقِ جمال خشت و سفال کو بھی مرقعِ حسن سمجھتا ہے ۔ بیدل نے پتھروں پر نگاہ ڈالی تو ان میں سے اسے شراروں کے عجیب پری زاد جھانکتے دکھائی دیے ۔ کہتے ہیں :

براہِ انتظار ماست دل تنگ
پری زادِ شرر در شیشۂ سنگ
شویم آتش زنِ شوقِ شرارش
بر آریم از طلسمِ انتظارش
شرر در سنگ پر دقت فروز است
چراغانِ تصوّر تیرہ سوز است

بیدل کے نزدیک پتھر کے ہر ٹکڑے میں ایک مہ لقا مستور ہے جس کا آنچل ایک طرف سرکا کر اس کا حسنِ جہاں تاب دیکھا جا سکتا ہے ۔ اسے ہر ذرۂ خاک ایک قطرۂ نور نظر آتا ہے اور یہ احساسِ جمال کا کمال ہے ۔

لیکن بیدل کی حسن آفرینی یہیں ختم نہیں ہو جاتی ۔ وہ حسن ہی کیا جو زلزلہ نہ ہو اور احساسات سے عاری ہو ۔ بیدل کا تخیل حسنِ کامل کی تلاش میں

پیکرانِ آب و گل کو زندگی کی رعنائیوں سے معمور دیکھتا ہے :

یقینم شد کہ در ہر قطرہ جانیست
نہانش در ہر کفِ خاکی جہانیست

فلسفۂ جدید سنگ و حشت کو بھی توانائی کا مظہر سمجھتا ہے ۔ بیدل ایک بلند پایہ فلسفی بھی تھا ، لیکن وہ اس نظریے تک اپنی حس آفرینی کی بدولت پہنچا ۔ اسے پتھروں میں بھی شدید احساس کی فراوانی نظر آئی ۔ اِسی احساس کے باعث پتھر بھی اسے درد کی ٹیسوں سے مضطرب دکھائی دیتے ہیں :

بہ غفلت گلِ این دو کاشِہ مرد
کہ دارد درد اگر سنگ است بے درد ؟

نہالِ نالہ در آب و گلِ کیست ؟
شررِ پروردۂ داغِ دلِ کیست ؟

بجوشِ چشمہ چندین چشمِ نمناک
ز اعضای کہ افتادہ است بر خاک ؟

بدل خونِ کہ تصویرِ لعل بستہ است
کہ در زیرِ غبارِ دل نشستہ است ؟

دماغِ کیست مستِ گریۂ ابر ؟
کہ دارد زیرِ تیغِ بے امان صبر

یہاں شاعرانہ توجیہات کا سحر ملاحظہ فرمائیے ۔ ہمارا دل شاعر کی رائے سے متفق ہو چکا ہے ۔

شاعر کا سینہ تجلی زار حسن ہوتا ہے ۔ حسنِ فطرت کی خامیاں وہ اپنے سینے کے آب و رنگ سے دور کرتا ہے ۔ اس کا تخیل فطرت کے کسی مظہر کو کسی لحاظ سے حسن سے عاری نہیں رہنے دیتا ۔ لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس کے سینے کا آب و رنگ بھی مظاہر فطرت کو وہ حسنِ مثالی عطا نہیں کر سکتا جس کی اسے تلاش ہوتی ہے ۔ حسن گریز پا ہے ۔ جب شاعر دیکھتا ہے کہ مشہودات سے حسن ہمیشہ وراء الوراء ہی رہتا ہے تو وہ اپنے تخیل کے تار و پود کو فضائے لامتناہی میں بکھیر دیتا ہے اور اس طرح جمال و جلال کے پیکرِ مثالی کو محیط ہو جانا چاہتا ہے ۔ کوہِ بیراٹ کے حسین مناظر جب بیدل کے ذوقِ جمال کی تسکین نہ کر سکے تو اس نے ایک خیالی جنت آباد کرنے

کی سعی کی :

چہ گلزار آیتِ صبح الٰہی
مصورِ عالمِ عرفان نگاہی
تجلی گہِ برقِ طورِ اعجاز
فروغ آبادِ شمعِ جلوتِ راز
بہارش بسکہ تخمِ رنگ می کاشت
ہوا تا ہر زند موجِ شفق داشت
فضایش بسکہ بود از جوشِ گل تنگ
فتادی سایۂ گل بر سرِ رنگ

اگر طوفانِ رنگ و نور دیکھنے کی آرزو ہو تو اس طویل بند کا مطالعہ کیجیے - جس طرح تاج محل مغل آرٹ کا منتہائے کمال ہے ، بیدل کا آرٹ بھی اس گلزار کے بیان میں اپنے عروج کے انتہائی نقطے پر پہنچ گیا ہے -

ایک گل بدن اور شیریں ادا اگر جامۂ سفید بھی زیب تن کرے تو جامے کی سفیدی ہی رنگینیوں کا حشر برپا کر دیتی ہے - اسی طرح حسین خیال جب سادہ اشعار میں بیان ہوتا ہے تو اشعار کی سادگی بھی آئینہ دارِ رنگینی و زیبائی بن جاتی ہے - مثنوی 'طورِ معرفت' کو دیکھیے ، سادہ سی رواں بحر ہے - انداز بیان نہ مرصع ہے ، نہ اس میں شوکت و تجمل کا اہتمام کیا گیا ہے ، لیکن لطیف و جمیل خیالات نے تمام اشعار کو ایسی رنگینی اور رعنائی عطا کر دی ہے کہ کیا کہنا - تشبیہات کو دیکھیے ، ایک سے ایک زیادہ رنگین ہے - طاؤس کو محو پرواز دیکھ کر بیدل بیان میں عجب حسن پیدا کر دیتے ہیں :

ز طاؤسانِ رعنا گہ پرواز
بہشتی بر ہوا بود آشیان ساز

تراکیب اور تشبیہات میں جدت ، ندرت اور دل فریبی جو بیدل کے ہاں ملتی ہے ، بے مثل ہے - اور پھر لطف یہ ہے کہ ان کے لیے بیدل کو فکر عمیق کی ضرورت نہیں پڑی کہیں آورد کا نام نشان نہیں اور یہ اپنی تخلیق کے ساتھ خلوص کے عشق اور روحانی وابستگی کا سب سے بڑا ثبوت ہے -

بیدل جب شفق کی رنگینیاں بیان کرتا ہے تو اس کی جہاں تابی کا ذکر کرتا ہے اور تخیل کی لطافت اپنی معراج پر پہنچ جاتی ہے - جب کہتا ہے کہ

ہوا سے دو عالم کا آب و رنگ اور شعلہ و دُود حل کر کے گردوں پر چھڑکا دیا ہے ، طبیعت اس بیان سے پھر بھی سیر نہیں ہوتی - اپنے عجز کا اظہار ایسے نادر الفاظ میں کرتا ہے کہ ناطقہ انگشت بدنداں رہ جاتا ہے :

بیاں در وصف او نالش کمند است
عبث دامن مزن آتش بلند است

دیکھیے دوسرے مصرع پر فصاحت ختم ہو جاتی ہے لیکن بیدل فصاحت اور بلاغت کا وہ سرچشمہ ہے کہ جس کی لطافت اور تازگی اور جس کا جوش روانی کبھی ختم نہیں ہوتا - ''عبث دامن مزن آتش بلند است'' کی موزونیت پر طبیعت جھوم رہی ہوتی ہے کہ دو اشعار کے بعد فوراً یہ بلند شعر آ جاتا ہے :

کدامین بسمل این جا پر فشان شد
کہ خونش رفتہ رفتہ آسمان شد

میری طاقت نہیں کہ ''خونش رفتہ رفتہ آسمان شد'' کا حسن ناظرین پر ظاہر کر سکوں - اسی طرح پوری کی پوری مثنوی حسن بیان کا شاہکار ہے اور دل دادگانِ ادب کو دعوتِ مطالعہ دے رہی ہے -

لگے ہاتھوں آپ جدتِ خیال اور حسنِ بیان کا ایک اور نمونہ بھی دیکھ لیجیے - یہ کہنا مطلوب ہے کہ بہار دنیا میں آسانی سے اپنی محفل رنگین آراستہ نہیں کرتی ، صریرِ خامہ یوں نوائے سروش بن کر ہمارے کانوں تک پہنچتی ہے :

پس از عمری قضا می بندد این نقش
بصد خونِ جگر می خندد ایں نقش

ہوا این جا نفسی دُزدد چہ مقدار
کہ بوی گردد از طبعش نمودار

بصد خاک آب بے تابی فرو شد
کہ گردد خون و بارنگی ہم‌وشد

چمن عمری فسردن نقش بندد
کہ یک لب در نقابِ گل بخندد

یقیناً بیدل کے انداز بیان کے سلسلے میں میری طرف سے ایک بہت بڑی خامی رہ جائے گی ، اگر میں یہ نہ کہوں کہ وہ خیالی اور غیرمحسوس چیزوں کو بھی

نظر بروز محسوس اشیا کی صورت میں پیش کرتے ہیں ، اور پھر خوبی یہ ہے کہ موجودہ دور کے ترقی پسند شعرا کی طرح نہ ابہام ہے اور نہ طلسماتی تخیل ۔ محولہ بالا خیالی تکرار کے ذکر میں مندرجہ ذیل اشعار دیکھیے :

دمی کز وصف رنگش پرفشان بود
نفس طاؤس فردوس بیان بود
حدیث سبزہ اش زیب بیان شد
سخن تاگل کند توتی عیان شد
ز مہتابش اگر گیرد سخن تاب
چکد از جبہۂ حسن بیان آب

نفس کو طاؤس فردوس بیاں کہنا ، سخن کا توتیٔ سبز پوش ہی جانا اور حسن بیاں کی جبیں سے آب دار قطروں کا نمودار ہونا ، میرے دعوے کی تائید کے لیے کافی ہیں ۔ یہ مبالغہ ہی سہی ، لیکن آپ انصاف نہ کریں گے ، اگر آپ کہیں گے کہ مبالغہ حسن بیاں کی جان نہیں ۔ شاعر مبالغے کی اہمیت سے بخوبی واقف ہوتا ہے اور اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ اس کی جائز حدود کیا ہیں ۔

شاہ جہاں اور عالم گیر کے زمانے کے شعرا تازہ گوئی کے لیے مشہور تھے ۔ تازہ گوئی میں بیدل کو جو ملکہ حاصل تھا ، اس کا اندازہ طبع سلیم سطور بالا سے کر سکتی ہے ۔ لیکن بیدل اپنی معنی آفرینی کو اپنا امتیازی وصف سمجھتے ہیں ۔ ایک ہی بات سے نئے نئے معانی پیدا کرتے ہیں اور پھر معنی آفرینی کا جوش ہے کہ ایک چابک دست مصور کی طرح موقلم کی ذرا سی جنبش سے ایک حسین منظر دکھا کر ، اور پھر ایک قادرالکلام شاعر کی حیثیت سے چند اور تشبیہات سے کام لے کر دُردانے معانی بکھیرنے لگ جاتے ہیں ور آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ ان معانی کی بہار کو دیکھیے یا حسن نظارہ سے دل و نگاہ کی سیری کرے ۔ جیسا پہلے عرض کیا جا چکا ہے ، بیدل اسی سے اپنی اس مثنوی کو یک عالم چراغاں اور صد ہزار گوہر معنی بداماں کہتا ہے ۔ گویا ایک طرف جلوہ ہائے طور دعوت نظارہ دیتے ہیں اور دوسری طرف کلیم کا لطف کلام موجود ہے ۔ مجھے بیدل کے ہاں معنی آفرینی اور نظارہ پروری گھلی ملی دکھائی دیتی ہے ۔ ایک شے دوسری کے اندر تحلیل ہو کر رہ گئی ہے اور ایک کو دوسری سے جدا کرنا محال ہے ۔ اپنی ان دو حیثیتوں کا بیدل کو اچھی طرح احساس ہے اور اس مثنوی

میں بھی اگر ایک جگہ کہتے ہیں :

بہر سو لمعۂ نظارہ تیز است

تو دوسری جگہ فرماتے ہیں :

ز تنزیہش معانی حسن بی تنگ

بیدل کے حوشِ بیان کا رنگ دیکھیے ۔ نمی کی بہتات کا ذکر کرتے ہیں :

چو بوکِ گل در و دیوار نم خیز
ز سیرابی زمین یک جام لبریز

لب بام از رطوبت ابر معراج
حصیر صحن طوفان باف امواج

بوصفش گر نماید خامہ اقبال
لگردد خشک تحریرش بصد سال

ز سیرابیش گر حرف نوشتی
توان در جوی مسطر راند کشتی

وضوی گر کند زاہد بایں آب
عصا فوارہ گردد سبحہ دولاب

درین وادی کہ طوفان اوج دارد
نہ تنہا جادہ حکم موج دارد

کہ این جا تا نشان پا حبابیست
بہ رنگ چشم عاشق برج آبیست

زندگی ایک غیر منقسم وحدت ہے ۔ اگر کوئی شخص اس وحدت کے اجرائے ترکیبی میں سے کسی ایک کو لے کر صرف اسی میں محو ہو جاتا ہے اور ادھر ادھر نگاہ نہیں دوڑاتا تو یہ اس کی تنگیِ ظرف کی دلیل ہے ۔ ہمہ گیر نگاہ اس وحدت کو غیر منقسم صورت میں دیکھتی ہے اور اس کے ایک پہلو پر توجہ صرف کرتے ہوئے باقی پہلوؤں کو نظرانداز نہیں کرتی ۔ جہاں یہ ہمہ گیری نظر نہیں آتی وہاں دراصل تفکر کی کمی ہوتی ہے ۔ خیالات محدود ہوتے ہیں ۔ اسرار کائنات کی طرف نگاہ کبھی متوجہ نہیں ہوتی ۔ یہ ادنیٰ درجے کے فن کاروں اور ادنیٰ درجے کے شعرا کا حال ہے ۔ لیکن گوئٹے کے خیال کے مطابق ایک عظیم المرتبت شاعر ایک عظیم الشان مفکر بھی ہوتا ہے ۔ اس کی پختہ کار فکر اس کی تخلیق

اور کائنات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کر دیتی ہے اور ایک تسلسل قائم ہو جاتا ہے ۔ اس کا فن حیات کو اپنا منتہائے مقصود سمجھتا ہے ۔ وہ فن برائے فن کا قائل نہیں ہوتا کیونکہ وہ اسے ذہنی عیاشی سے تعبیر کرتا ہے ۔ بیدل ایک عظیم المرتبت شاعر کی حیثیت سے جہان حسن کے جلووں کا دل دادہ ہے ، بیان میں رنگینی پیدا کرنا چاہتا ہے ، اسالیب بیان میں جدت اور دل فریبی پیدا کرتا ہے ، لفظی اور معنوی رعایتوں کو ملحوظ خاطر رکھتا ہے ، وہاں حکیمانہ انداز میں اسرار کائنات بھی کھولتا چلا جاتا ہے ۔ اور لطف یہ ہے کہ دقیق سے دقیق فلسفیانہ خیالات بیان کرتے وقت بھی شاعرانہ خوبیوں کے بلند ترین معیار کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا ۔

انسان دنیا میں جب نگاہ دوڑاتا ہے تو اسے کثیرالتعداد مناظر دکھائی دیتے ہیں ، ایک سے ایک مختلف اور متضاد ۔ کہیں آفتاب کی نور آفرینی ہے تو کہیں راتوں کی ہمہ گیر تاریکی ۔ ادھر باغ و راغ ہیں تو ادھر بے آب و گیاہ صحرا ۔ ایک طرف پہاڑوں کے بلند ہوتے ہوئے سلسلے ہیں تو دوسری طرف ہموار چٹیل میدان ۔ اس اختلاف اور تجدد میں اسے کسی جگہ وحدت نظر نہیں آتی ۔ وہ حیران ہو جاتا ہے ۔ اس وقت بیدل اُس کی یوں راہ نمائی کرتا ہے :

دوئی حرف است و ما تمثال حرفیم
کہ در صد مطلب نایاب صرفیم

درین تمثال یا شخصی است موجود
کہ صد تمثال پیدا کرد و ننمود

لباس جلوہ بیرون از قیاس است
دو عالم شوخیِ رنگ لباس است

تجدد کسوت شان وجود است
ہمین است آنچہ سامان نمود است

یہ وحدت وجود نہیں جیسا کہ 'صد تمثال پیدا کرد و ننمود' سے واضح ہے ۔ یہ وحدت شہود ہے ۔ تمام مظاہر حروف کی مانند ہیں جن سے ایک معنی خیز عبارت پیدا ہوتی ہے ۔ یہ سب کچھ ایک بے مثل وجود کی طرف بلیغ اشارہ ہے ۔ اسی مقدس وجود کی شان زیبائی ہے جو ہر چیز سے ہویدا ہے :

بہار برقی کہ از جوش لطافت
بگل رنگ است و در آئینہ حیرت
برنگ قطرہ از ابر آشکار است
بطبع سنگ نام او شرار است

اس طرح بیدل کثرت میں وحدت پیدا کر دیتے ہیں۔

انسان اس ورطۂ حیرت سے نکلتا ہے تو ایک اور دام میں گرفتار ہو جاتا ہے ؛ گل ہائے رنگا رنگ اس کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں ۔ طیور نغمہ‌سنج اسے اپنا والہ و شیدا بنا لینا چاہتے ہیں ۔ شب ماہ کی ضیا گستری اپنے جلووں سے اسے مدہوش کر دیتی ہے ۔ اس کی نگاہ حسن کے ہر سطر کی طرف والہانہ اٹھتی ہے ۔ وہ اگر نگاہ نہیں اٹھاتا تو اپنے وجود کی طرف ۔ اس طرح وہ اپنے حسن عالم ترتیب سے بالکل بے خبر رہ جاتا ہے ۔ بیدل انسان کو اس کی اپنی رعنائیوں کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں :

قضا روزی کہ در بنیاد امکان
ز شور لالہ و گل رخت طوفان
مرا ہم رنگ و بوی دلبری داد
بہ رعنایان گلشن ہم سری داد
ز ہر برگم ہزار آئینہ در پیش
ولی من بے خبر از جلوۂ خویش

اس بے خبری کی بنا پر اپنی ذات کے ہزارہا جلوے اس کی آنکھوں سے مستور رہے ۔ انسان خوبان چمن کا نظارہ کرتا رہا اور انہی کے عشق میں گرفتار رہا ۔ بیدل انسان کی شکایت کرتا ہے کہ اس کی نگاہ اسے دوسروں کا جلوۂ حسن تو دکھاتی رہی مگر اسے اپنے جمال جہاں آرا سے خبردار نہ کر سکی ، اس لیے :

بہ جرم امتیاز غیر داغم
وگرنہ من ہم از خوبان باغم

وہ اسے پُر زور الفاظ میں کہتا ہے کہ تم ایک راز سربستہ ہو ، اپنے آپ کو پہچانو :

معمائی معمائی معما
اگر خواہی کشودن چشم بہ‌کشا

خود شناسی کے لیے آنکھ کھولنا لازم ہے۔ چشم بصیرت سے اگر دیکھا جائے تو معمولی سی بات سے ہزارہا راز منکشف ہوتے ہیں :

بہر سازی کہ چشم شوق شد باز
برنگ نغمہ شد غوّاص آن ساز

تامل ہر کجا آئینہ گردید
بطبع قطرہ گوہر می توان دید

تامل از کمی بحر آفرین است
جہانی کش نہایت نیست این است

نگہ را قانع یک جلوہ مپسند
قدح کم نیست اے خمیازہ خورسند

ہماری قناعت پسندی اور طبیعت کی افسردگی ہزارہا حقائق کو مستور رکھتی ہے اور کائنات کی رونق کو ختم کر دیتی ہے :

گر از چشم تو جوشد بے نگاہی
نشیند انجمن ہا در سیاہی
دمی کائینہ پنہاں گشت در زنگ
ستم ہر جلوہ رفت ای سر بسر رنگ

اس لیے بیدل انسان کو سمجھاتے ہیں کہ نگاہ پر شوق کے ساتھ دل بے تاب بھی طلب کرنا چاہیے :

شوی تا محرم خود دل طلب کُن
بہ لیلی تا رسی محمل طلب کُن

لیلی کے لیے محمل چاہیے اور وہ محمل دل ہے۔ حسن لیلی مانا ہزاروں بیرنگیوں کا آئینہ دار ہے لیکن عشق کا مقام بھی کم تر نہیں :

مگو حسن این قدر بیرنگ دارد
جنون عاشقان ہم رنگ دارد

جنون عشق کی رنگینیاں خاص جاذبیت اور خاص اقدی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان سے بے خبر نہ رہنا چاہیے۔

خود شناسی بہت بڑی دولت ہے لیکن خود گدازی کے بغیر اس میں ایک بہت بڑا خلا رہ جاتا ہے۔ خود گدازی سے دل میں عالم گیر ہم دردی کے جذبات

پیدا ہوتے ہیں ، ورنہ دل پتھر کی طرح سخت رہتا ہے اور کائنات بھی سنگین نظر آتی ہے :

دل سنگین گداز و شیشہ پرداز
وگرنہ دہر کہسار است کہسار

بیدل کہتے ہیں انسان کے دل میں سنگ دلی پیدا ہونے کا سب سے بڑا سبب افراطِ زر ہے :

اگر منعم بتمکین گشت مغرور
بحکم ہوش معذور است معذور
کہ زر دار است و زر از سنگ خیزد
ز سنگ آخر گرانی رنگ ریزد

لیکن بیدل زر کو برا نہیں کہتے ۔ اگر یہی زر ایک عالم کی نفع رسانی کے لیے صرف ہو تو اس کی ماہیت ہی تبدیل ہو جاتی ہے ۔ یہ اس وقت مومیائی کی صورت اختیار کر لیتا ہے ، جو اگرچہ پتھر سے نکلتی ہے لیکن زخموں کے لیے مرہم بن جاتی ہے ۔ اس وقت صاحب زر بھی متواضع بن کر محراب کی طرح مسجود عالم ہو جاتا ہے ۔ بیدل کو تو صرف زرپرستی سے مخالفت ہے :

اگر طبع تو سیم و زر پرستیست
بہ ہستی رو کہ دنیا سخت پستیست

زر پرستی انسان کو پست فطرت بنا دیتی ہے ، اس لیے بیدل حرص و ہوا اور طمع کی سخت مذمت کرتے ہیں ۔ انسان خود اس قدر گراں قیمت ہے کہ دنیا بھر کا مال و زر اس کے مقابلے میں پاسنگ بھی نہیں ۔

قلب و نظر کو یہ پاکیزہ صفات عطا کرنے کے علاوہ بیدل یہ بھی کہتے ہیں کہ گوشہ نشینی چھوڑ کر حرکت اور جدوجہد کو اپنا شعار بناؤ ۔ زمین گیری دل کو مردہ بنا دیتی ہے ۔ اور معلوم ہے جدوجہد کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ :

در آن معرض کہ باشد جہد درکار
گداز کوہ کاری نیست دشوار
بہر کاری کہ جہدش راہبر بود
عرق از چہرہ تا ریزی گہر بود

یہ تمام مطالب مختلف مناظرِ قدرت بیان کرتے ہوئے ضمناً آ گئے ہیں ۔ الفاظ او

تشبیہات وہی ہیں جن کا تعلق کوہ بیرٹ کے ماحول سے تھا ۔ زبردستی کا ذکر چالدی کی کان سے چھڑ گیا جو کوہ بیراٹ میں موجود تھی ۔ مقصود یہ تھا کہ اپنے عہد کے عیش پرست سنگ دل امرا کو تنبیہ ہو جائے ، جو اپنی بداعمالیوں کے نتائجِ بد سے بالکل غافل ہو چکے تھے ۔ اسی طرح جب حباب کا ذکر کرتے ہیں تو بہت سے مسائل تصوف بیان کرنے لگ جاتے ہیں ۔ حباب ایک صوفی کی طرح سر تا پا حیرت ہوتا ہے ۔ شرم و حیا کی یہ دولت ضبط نگاہ کا پابند ہے ۔ اگر اس کی نگاہ کسی طرف اٹھتی ہے تو صرف اپنی حقیقت کے مشاہدے کے لیے ۔ صفائے سینہ جو حباب میں موجود ہے اور کہاں ۔ اس کائنات کی تمام دل کشیوں اور دلچسپیوں کے درمیان رہتے ہوئے ، ان سے بے نیاز ہو کر ، وہ بڑی سبک روی سے اپنا وقت گزارتا ہے اور ان تمام خوبیوں سے بالا تر وہ اپنے اندر نفس موزاں رکھتا ہے جو ایک صوفی کا امتیازی وصف ہے ۔ یہ انداز بیان ومزیت کی معراج ہے اور مشرقی شعرا اس میں ید طولیٰ رکھتے ہیں ۔

الغرض اور بھی بہت سے مطالب ہیں جنھیں میں خوف طوالت سے بیان نہیں کر سکتا ۔ لیکن دیکھیے کیسے حیات بخش اور حیات افروز خیالات ہیں ۔ جار و حس ہٹا کر ہمارے سامنے ایک ایسا دل فریب اور روح پرور رستہ کھول دیا گیا ہے کہ طبیعت اس کو اختیار کرنے پر خود بخود مائل ہو جاتی ہے ۔ خیالات میں اقبال سے مماثلت ہے ۔ اس فطری مناسبت کی بنا پر علامہؒ مرحوم بیدل کے بڑے مداح تھے اور نوجوانوں کو بیدل کے مطالعے کی دعوت دیتے تھے ۔

لیکن افسوس ہے کہ اپنے زمانے میں بیدل کی حقیقت سے لوگ نہایت ہی قلیل تعداد میں باخبر ہو سکے ، حالاں کہ ان کی تمام نظم و نثر کا صرف ایک منتہائے مقصود تھا ۔ ― انسان کو اس کے مقام سے آگاہ کرکے اسے دو عالم کی سروری کے قابل بنانا ان دنوں انسانی طبائع بری طرح بگڑ چکی تھیں ۔ انھوں نے جب اپنے عہد کے انسانوں کے حالِ زار پر اپنے آپ کو تنہا گریہ کناں پایا تو اس مثنوی میں بعد تاسف کہا :

که می نالی و کس محرم نوا نیست
بحرلت ہیچ گوشی آشنا نیست

ان کے اپنے عہد میں محمد افضل سرخوش نے ان کی نظم کو دیکھا تو زیادہ سے زیادہ ہم طرح بننے کی کوشش کی ۔ اور شیخ علی حزین نے جب ان کی نثر کو پڑھا تو کہا :

”بہم نمی آید اگر مراحعب ایران دست دہد برای ریشخند بزم احباب رہ آوردی بہتر ازین نیست“۔ لیکن بیدل کے بعد ایک صدی گزرنے پر جب غالب نے اسی نثر کا قدردان نگاہوں سے مطالعہ کیا تو اس سے استفادہ کرکے ایک جدید طرزِ نگارش کا موجد بنا ۔ اور جب ایک صدی مزید گزر گئی تو اقبال نے بیدل کے کلام سے ایسے اسرار سیکھے کہ وہ جمشید کا ہم نشین بن گیا ۔ اس طرح ہر صدی کے خاتمے[1] پر جب کبھی کوئی عدد فن اور بلند فطرت حکیم پیدا ہوگا تو وہ بیدل سے فیض یاب ہو کر اپنے عہد آفریں کارنامے سرانجام دے گا ۔

مزن لاہور ، اگست ۱۹۵۰ع

۱۔ ذہنی ارتقا کے ابتدائی دور میں تحریر میں توازن بہ مشکل بحال رہتا ہے ۔

(۹)

بیدل کی ایک جمالیاتی علامت

تخت طاؤس محض لعل و زمرد اور جواہرات کا معجزۂ فن ہی نہیں جس پر چوبیس رنگین و جمیل طاؤس ، زمرد کے بارہ ستونوں پر نظر افروزی کرتے دکھائی دیتے تھے ، بلکہ یہ نادرۂ زماں تخت ایک عہد کی ذہنی کیفیت کی بھی عکاسی کرتا ہے ۔ شاہ جہاں نے اگر تاج محل کا مرمریں حسن خواب پرور نگاہوں کے سامنے موجود کر دیا اور جامع مسجد دہلی کی صورت میں مرمریں عمارت تعمیر کی تو یہ دراصل ایک مخصوص عہد کے جمالیاتی عہد کی ترجمانی تھی جو ان فنی شاہکاروں نے بڑی خوبی سے کی ۔ اس احساس سے مسلمانوں کو بہرۂ عظیم ملا تھا ۔ اس کا اظہار انھوں نے فن تعمیر کی صورت میں خصوصیت سے کیا اور عہد شاہجہانی میں تو فن تعمیر کا ہندی ایرانی اسلوب اپنے اوج کمال پر دکھائی دیتا ہے ۔ علاوہ بریں مغل مصوری بھی رنگینی اور رعنائی کے اعتبار سے بلند پایہ رکھتی تھی ۔ مغلوں کو چمنستانوں سے خاص لگاؤ تھا ۔ اس کا اثر ان کی مصوری پر پڑا ۔ اسی بنا پر سی ۔ براؤن مغل مصوری کی امتیازی خصوصیت رنگینی بیان کرتا ہے ۔

جب عہد شاہ جہانی میں اس طرح فن تعمیر اور مصوری کے ذریعے ہندوستان میں مسلمانوں کے اعلیٰ و ارفع جمالیاتی ذوق کا اظہار ہو رہا تھا ، تو ۱۰۵۴ھ میں بیدل عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے ۔ ان کی ولادت سے دس سال پہلے تخت طاؤس بن چکا تھا اور حاجی محمد جان قدسی نے ''اورنگ شہنشاہ عادل'' سے تاریخ نکالی تھی ۔ تاج محل کا سال تعمیر ۱۰۵۳ھ ہے ۔ اسی طرح جامع مسجد دہلی ، موتی مسجد آگرہ اور شاہدرہ میں مقبرۂ جہانگیر کے حسین تعمیر کو سامنے رکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ جب اس برصغیر میں تیشہ' معمار ، سنگ مرمر کے حسن پرور اور حسن خیز امکانات اپنی لطیف اور خیال افروز ضربوں سے بروئے کار

لا رہا تھا تو بیدل کی ولادت ہوئی ۔ لاممکن تھا کہ احساسِ جمال کی اس بہار آفریں سے بیدل ایسا طباع اور ذہین شاعر متاثر نہ ہوتا ۔ بیدل کے کلام میں جمالیاتی ذوق کا مطالعہ کرتے ہوئے محض فارسی شاعری کی روایتی حسن پروری کے اثرات کا کھوج نہیں لگانا چاہیے ۔ ان اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ حقیقت یہ ہے کہ بیدل کے احساسِ جمال کو شعلے کی طرح ملتہب کرنے میں زیادہ دخل ان کے اپنے عہد کا ہے ۔ ان کے عہد کے مذکورہ بالا مرمریں شاہکاروں نے ان کے دل میں سنگ و خشت کو خاص طور پر حسن و جمال سے متعلق کر دیا تھا ۔ فرماتے ہیں :

بہشت ہر کجا خشت و سرا نیست
زیارت گاہِ عشق و جبیست

اسی طرح ایک اور جگہ پر کہتے ہیں :

ز آب و رنگ ہر سنگ و خشتی
نقابی چہرۂ زارِ بہشتی
دلِ ہر ذرہ اش عمرِ بہاری
کجا سنگ و چہ خشت آئینہ زاری

یہ مثنوی 'طورِ معرفت' کے اشعار ہیں ۔ کوہسارِ بیراٹ واقع وسطِ ہند کے متعلق مثنوی لکھتے ہوئے بیدل نے سنگ و خشت کی حسن پروری کا بڑی لطافتِ ذوق کے ساتھ جائزہ لیا ۔ ذرا مندرجہ ذیل اشعار کا بھی مطالعہ کریں اور چشمِ تخیل سے بطنِ سنگ میں حسینوں کو بڑے ناز کے ساتھ محوِ خواب دیکھیں :

و ہر سنگی عیاں بے تیل و قالی
سرِ مستی و زانوی خیالی

مباد این جا زنی بر سنگ دستی
کہ مینا در بغل خفتہ است مستی

براہِ انتظار ماست دل تنگ
پری زاد شرر در شیشۂ سنگ

لیکن بیدل کا احساسِ جمال اپنے اوجِ کمال پر اُس وقت نظر آتا ہے ، جب اپنے

جسمانیت کا نام و نشان نظر نہیں آتا اور یہ کہسار سر تا پا حسین و حسیں روح کی صورت اختیار کر لیتا ہے :

سبک تر ران درین کہسار محمل
مبادا شیشہ را بشکنی دل
ز بس آئینہ ات طبع درشت است
حباب را کہ بینی سنگ پشت است
تو جسم اندیش و این جا غیر جان نیست
ہمہ مینا است سنگی درمیان نیست

دیکھیں حسن آفرینی میں بیدل اپنے عہد کے معاصروں سے آگے نکل گئے ہیں اور مظاہر فطرت کی جاں نوازی اور روح پروری کو یوں اجاگر کرتے ہیں کہ کوئی فطرت پرست شاعر کیا کرے گا ۔

سنگ و خشت کے علاوہ عہد بیدل کی حسن پروری ایک اور صورت میں بھی ظاہر ہوئی ہے ۔ شعر و شاعری کو فن تعمیر اور مصوری پر جو فوقیت حاصل ہے ، ظاہر ہے ۔ قادرالکلام شاعر استعارہ و تشبیہ اور رمز و کنایہ سے کام لے کر حسن و جمال کے وہ پیکر لطیف نگاہوں کے سامنے موجود کر دیتا ہے ، جنھیں مصور مو قلم یا سنگ تراش کے مہین سے مہین اوزار چھو تک نہیں سکتے ۔ یہی وجہ ہے کہ جب عہد مغلیہ میں مسلمانوں کے بے نظیر جمالیاتی احساس کو غیرمعمولی فروغ حاصل ہوا تو اس کا بہترین اظہار اس عہد کی شاعری میں ہوا ۔ عہد مغلیہ کے شاعر اپنے اسلوب شاعری کو تازہ گوئی کا نام دیتے ہیں اور یہ کہنا صحیح نہیں کہ تازہ گوئی ایک سیدھے سادے اسلوب تغزل کا نام ہے ۔ اس کے بعض مخصوص عناصر ہیں ، جو فارسی کے دوسرے اسالیب سخن میں اس طرح یکجا اور یوں اپنے عروج پر نظر نہیں آتے ۔ ان عناصر میں رنگیں خیالی کو امتیازی حیثیت حاصل ہے ۔ تازہ گو شعرا نازک اور طرفہ استعارے استعمال کرکے اس طرح رنگیں بیانی سے کام لیتے ہیں کہ مبصر فوراً کہہ اٹھتا ہے ، ان حسین تصنیفات کا عہد تخت طاؤس اور تاج محل کے عہد تعمیر کے بغیر اور کوئی نہیں ہو سکتا ۔ غنی کشمیری تازہ گو شاعر ہیں ۔ ان کی تاریخ وفات ۱۰۷۹ھ ہے ۔ ان کا مندرجہ ذیل شعر پڑھیں ۔ آپ اس بات کی از خود تصدیق فرمائیں گے کہ فی الواقعہ تازہ گوئی کی امتیازی خصوصیت رنگیں خیالی ہے ۔ فرماتے ہیں :

جلوۂ حسنِ تو آورد مرا بر سرِ فکر
تو حنا بستی و من معنیِ رنگین بستم

میرزا بیدل بھی عہد تازہ گوئی کے نام ور شاعر ہیں ۔ لازماً رنگین خیالی ان کا طرۂ امتیاز ہے ۔ جنت و فردوس ، گل و نرگس ، طاس و حنا ، یوسف و شریں وغیرہ استعارات و تلمیحات سے کام لے کر وہ اپنے تخیل رعنا و توانا سے اس طرح حسن آفرینی کرتے ہیں کہ انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ گل و شمشاد کے مناظر سے قطع نظر کرکے صرف بیدل کی چمن ایجادی سے جشن نگاہ کا ساماں حاصل کرتے رہیں ۔ غالب اسی لیے بیدل کی طرز بہار ایجادی کے والہ و شیدا تھے ۔

ڈاکٹر یوسف حسین[1] کے قول کے مطابق اگر غالب رنگ کی طلسماتی دل فریبی سے متاثر ہیں اور یہ ان کے کلام میں شعری محرک کے طور پر موجود ہے تو یہ زیادہ تر بیدل کا رنگ ہے ۔ اپنی شاعری کے اس پہلو کی طرف بیدل اس طرح اشارہ کرتے ہیں :

بیدلاں چند خیالِ گل و شمشاد کنند
خوش شوند این ہمہ کز خود چمن ایجاد کنند

اپنے تخیل کی اس حسن پروری کا میرزائے موصوف کے دل میں شدید احساس پایا جاتا تھا ، اس لیے وہ اپنے معاصر تازہ گو شعرا کو خاطر میں نہیں لاتے تھے ۔ ان کا ایک شعر ہے :

بفکرِ تازہ گویاں گر خیالم پرتو اندازد
پرِ طاؤس گردد جدولِ اوراقِ دیواں ہا

فرماتے ہیں کہ بیدل کے چمن آفریں تخیل کا عکس بھی اگر تازہ گو شعرا کی فکر پر پڑ جائے تو ان کے دیوانوں کی جدول پرِ طاؤس کی طرح رنگین ہو جائے ۔ کلام بیدل کا مطالعہ کرنے والا کوئی انسان ان کی رنگیں بیانی سے

١۔ ڈاکٹر یوسف حسین 'اردو غزل' صفحہ ١٣٠ ، ذیلی حاشیہ ۔ اس ضمن میں غالب کا یہ مقطع بڑا معنی خیز ہے :

اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہار ایجادیِ بیدل پسند آیا

متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ حوصلہ اور ہمت درکار ہے۔ ان کے باریک معانی حوصلہ شکن ضرور ہیں۔ خود کہتے ہیں :

عیب ما رنگینی خیالان معنی باریک ماست
عرض نقصان تا دہد از رگ زبان دارد عقیق

لیکن اگر مستقل مزاجی سے ان کے کلام پر نگاہ ڈالی جائے تو دامن خیال گل ہائے رنگا رنگ سے اس طرح رشک فردوس بن جاتا ہے کہ پھر مشرق و مغرب کے کسی اور شاعر کے کلام کے مطالعے کی احتیاج نہیں رہ جاتی۔

جہاں تک حواس خمسہ کا تعلق ہے، بیدل بصارت سے زیادہ کام لیتے ہیں اور جہاں تک رنگوں کا تعلق ہے اگرچہ بیدل سبز رنگ سے بھی بڑی دل چسپی رکھتے ہیں لیکن انھیں نسبتاً حنائی اور ارغوانی رنگ سے زیادہ وابستگی ہے۔ حنا کے متعلق ان کا مندرجہ ذیل شعر دیکھیے۔ جذبے کی وارفتگی، بیان کی شگفتگی اور موسیقی کے آہنگ نے جو سحر پروری کی ہے وہ صرف بیدل کا حصہ ہے :

صفیر رنگ لالہ ہم شکن شے جام گل بہ زمین فگن
بہ بہار دامن ناز زن زحنای دست نگار ما

اسی طرح حسن گلابی کے متعلق ان کا یہ شعر پڑھیں :

شب بیاد تو گلی چوں غنچہ پیچیدم بخویش
صبح بیدل در کنارم یک گلستان رنگ بود

ضمناً 'یک گلستان رنگ' کی ترکیب کا حسن بھی دیکھ لیجیے۔ لیکن جب بیدل رنگوں کا مجموعی تاثر بیان کرنا چاہتے ہیں تو انھیں طاؤس سے بہتر اور کوئی استعارہ نظر نہیں آتا۔ جب وہ طاؤس رعنا کی ترکیب استعمال کرتے ہیں تو ان کے خیال میں رنگوں کا امتزاج اور حسن و مستی کا اجتماع موزونیت کے اعتبار سے اپنے عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ اسی لیے طاؤس کے حوالے سے انھوں نے بیسیوں شعر کہے ہیں اور وہ بہ انداز تفاخر کہتے ہیں :

چہ رنگ ہا کہ نبستیم در بہار خیال
طبیعت پر طاؤس عالمی دارد

مستی کے عالم میں جب طاؤس بال و پر پھیلا کر رنگوں کی ایک دنیا نگاہوں کے سامنے موجود کر دیتا ہے اور گل نرگس سے مشابہت رکھنے والے بے شمار خوب صورت حلقوں کا مظاہرہ کرتا ہے اور گھوم گھوم کر اہل عالم کو دعوت نظارہ

دیتا ہے تو کون سی نگاہ ایسی ہوگی جو مسحور نہیں ہو جاتی ۔ بیدل طاؤس کی اس کیفیت سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں اور بڑے گراں مایہ اور دقیق معانی اخذ کرتے ہیں ۔

بیدل ۱۰۷۵ھ تک بہار اور اڑیسہ کی طرف رہے ، یعنی اکیس سال کی عمر تک انہیں آگرہ یا شاہجہاں آباد کی طرف آنے کا اتفاق نہیں ہوا ، اس لیے جب تک بیدل ادھر رہے انہوں نے اسلوب اور خیالات کے اعتبار سے کلاسیکی شعراء کا اتباع کیا ۔ اس لیے ابتدا میں ان کے کلام میں فن تعمیر اور شعر و شاعری کی اس بہار آفرینی کا پورا پورا عکس نظر نہیں آتا ، جو آگرہ اور شاہ جہاں آباد میں حوادث کی ایک حسین و جمیل دنیا وجود میں لا رہی تھی ۔ صوبہ بہار کو چھوڑنے کے بعد ۱۰۸۲ھ تک ان مغل مراکز میں رہتے ہوئے انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو خوب استعمال کیا ہے ۔ غزلیات کے علاوہ دو مثنویاں ''محیط اعظم'' اور ''طلسم حیرت'' لکھیں اور امیر خسرو کا تتبع کرتے ہوئے ایک قصیدہ ''سواد اعظم'' بھی تصنیف کیا ۔ ان میں بہاریہ اشعار ہیں ، رنگیں بیانی ہے ، چمن پروری اور چمن آفرینی کا مظاہرہ ہے ، مگر تازہ گو شعراء کے واضح اثرات کہیں بھی دکھائی نہیں دیتے ۔

جہاں تک لفظ طاؤس کا تعلق ہے ، قصیدہ ''سواد اعظم'' میں تو ایک شعر بھی ایسا نہیں جس میں یہ موجود ہو ۔ مثنوی ''محیط اعظم'' میں یہ لفظ صرف ایک بار[1] وارد ہوا ہے اور مثنوی ''طلسم حیرت'' میں دو بار[2] ۔ ۱۰۸۲ھ کے لگ بھگ بیدل نے نثر میں ایک مقالہ 'سرمہ' اعتبار' کے عنوان سے لکھا اور اس میں

۱۔ اس شعر میں :

دماغ بہار آن قدر سرخوش است
کہ تا بالِ طاؤس ساغرکش است

۲۔ پہلی بار قوت واہمہ کی خلاقی کا ذکر کرتے ہوئے ان اشعار میں :

نگہ شد گو دلیل سیر باغش
زبود اندیشہ یک سینہ داغش

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

آگرہ کے پیک گلستان زہرہ کا حسن بڑی معنی آفرینی کے ساتھ بیان کیا۔ لیکن اس میں بھی لفظ طاؤس محض رسمی طور پر مندرجہ ذیل شعر میں موجود ہے:

بہ کاشی کہ کشاید نقاب گردش رنگ
تعبیر از پر طاؤس رونما گیرد

صاف ظاہر ہے کہ اس لفظ نے اس وقت تک ان کے ذہن میں نمایاں اہمیت اختیار نہیں کی تھی۔ اس کی تین وجوہ نظر آتی ہیں: ایک تو یہ ہے کہ ابھی ان کی فطرت تازہ گو شعراء کے اثرات سے پوری طرح سرشار نہیں ہوئی تھی، اور سرشاری کے بعد ہی تخلیق کا درجہ آتا ہے۔ دوسرے روایتی طور پر تو وہ طاؤس کے حسن و جمال سے آگاہ تھے لیکن اس کی شان تجمل کا پوری طرح مشاہدہ انھوں نے آگرہ اور دہلی کی طرف آ کر اس وقت کیا جب وہ بندرا بن کے جنگلوں میں گھوما کرتے تھے، اور بعد میں کئی سال تک متھرا میں قیام پذیر بھی رہے۔ یہ علاقہ اس خوب صورت پرندے کا وطن ہے۔ فضاؤں میں بڑی رعنائی کے ساتھ پرواز کرتا ہے اور جنگلوں اور سبزہ زاروں میں اپنے قیامت آفریں رنگوں کا عجیب انداز میں مظاہرہ کرتا ہے۔ تیسرے ابھی ان کی ذات منازل ارتقا طے کر رہی تھی اور اپنے باطنی حسن و جمال سے بیدل پوری طرح آگاہ نہیں ہوئے تھے جس کے لیے لفظ طاؤس بعد میں علامت کی صورت اختیار کر گیا۔ بعد کی تخلیقات میں لفظ طاؤس کا کثرت سے استعمال اسے ان تینوں امور سے وابستہ کر دیتا ہے۔

بیدل نے اپنی مثنوی "طور معرفت" جسے وہ اشارۂ نیرنگستان حسن رنگ و بو کہتے ہیں، ۱۰۹۹ھ کے قریب لکھی۔ جب وہ متھرا کو ہمیشہ کے لیے

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

فروغ شمع گردیدی بفانوس
بصورِ نقش بر آوردی چو طاؤس

اور دوسری بار فرح بھی مسرت کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح:

کشاد جبہ اش دامانِ صحرا
خضورش موج صد گلشن تماشا
رگ گل جادۂ دشت سراغش
گلستان یک پر طاؤس باغش

خیرباد کہہ کر شاہ جہاں آباد میں مستقل طور پر آ چکے تھے ، اس وقت ان کی عمر ۵۰ سال تھی ۔ ذہنی اور روحانی اعتبار سے وہ ارتقاء کی تمام منازل طے کر چکے تھے ۔ ان کا فن بھی تکمیل کے نقطۂ عروج پر تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ یہ مثنوی انہوں نے دو روز میں لکھی لیکن اس میں اپنی ذات کی جامع معنویت انہوں نے پوری طرح منتقل کر دی ۔ بیراٹ جانے کا اتفاق ہوا تھا اور وہاں کے کہستانی مناظر کی تصویر کھینچتے ہوئے انہوں نے احساس جمال کی وہ لطافت و پاکیزگی اور ہمہ گیری دکھائی کہ کیا کہنا ۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس میں لفظ طاؤس کئی بار بڑی آن بان کے ساتھ استعمال کیا ۔ کہستانِ بیراٹ کے متعلق کہتے ہیں :

طلسم خلد می‌بندد نمایش
پرِ طاؤس می ریزد ہوایش

بہشت از بال طاؤسش مثالی
شب و روز از چراگاہش غزالی

پارۂ ماسبق میں جو شعر درج ہے ، اس میں پرطاؤس ادنیٰ حیثیت رکھتا ہے لیکن یہاں اسے خلد بریں پر بھی فوقیت حاصل ہے ۔ یہ متھرا کے اثرات اور بیدل کی اپنی روز افزوں ذہنی رعنائی اور رنگینی کا نتیجہ تھا ۔ شفق کا حسن بیان کرتے ہوئے روح لطافت کو آبگینۂ شعر میں اس طرح اتارتے ہیں :

پرِ طاؤس صرف رشتۂ دام
خیالِ لعلِ تو خط بر لبِ جام

مجھے معلوم نہیں کہ کسی اور شاعر نے شفق کی رنگینیوں کو اس خوبی سے بیان کیا ہو ۔ ایک جگہ کہتے ہیں کہ حسن مطلق شرارہ ہائے سنگ میں بڑی لطافت کے ساتھ چشمک زنی کرتا ہے اور ہر سنگ ریزہ محض سنگ ریزہ نہیں بلکہ نگارستان اسرار ہے اور یہاں ہر بیضہ میں طاؤسان رعنا پر افشانی کر رہے ہیں :

بہ آہنگِ پر افشانی مہیا
درونِ بیضہ طاؤسانِ رعنا

اور ایک خیالی گلزار کا نقشہ کھینچتے ہوئے طاؤس کا ذکر مندرجہ ذیل اشعار میں کرتے ہیں :

دمی کز وصفِ رنگش پر فشان بود
نفس طاؤس فردوس بیان بود

ز طاؤسانِ رعنا گاہِ پرواز
بہشتی پر ہوا بود آشیان ساز

چنان طاؤس صحنش مست می گشت
کہ پر بالش قلح در دست می گشت

مثنوی ''طور معرفت'' کے ان اسعار میں عنصر وجود رکھنے والی اشیاء کے حسن پرور امکانات کا ذکر در اصل اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ شاعر کے ذہن پس منظر میں اپنی ذات کا احساس موجود ہے اور اسے اس بات کا ادعان حاصل ہے کہ نسبتاً معمولی ابتدا کے باوجود اس کی ذات کو کس قدر پُر اسرار پہنائی حاصل ہوتی ہے ۔ اپنے عہد کے لاارہ گو شعراء کی طرح ہمارے شعر نے خیالی امور کو محسوس صورت میں بھی پیش کیا ہے ۔ علاوہ بریں ان اشعار کو پڑھ کر بندراہن کے جنگلوں کا نقشہ ذہن میں کھنچ جاتا ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ کوہستان بیراٹ کا ذکر کرتے ہوئے بندراہن کے مناظر شاعر کی نگاہوں کے سامنے موجود تھے جنھیں وہ دو تین سال پہلے چھوڑ چکا تھا اور اب اس حسین فضا کی پیاری پیاری یادیں ، تشبیہ اور استعارہ کا روپ دھار کر ادبِ فارسی میں منتقل ہو رہی تھیں ۔

ہمارے نقطۂ نگاہ سے بیدل کا ایک اور مقالہ بڑی اہمیت رکھتا ہے ، جو انھوں نے ۱۱۰۰ھ کے لگ بھگ قلم بند فرمایا ۔ اس کا نام ''بہارستان حسن'' ہے ۔ یہ نثر میں بہاریہ ہے اور ان کی نثری تصنیف ''چہار عنصر'' کے عنصر سوم میں موجود ہے ۔ جب انہوں نے ۱۰۷۸ھ میں مثنوی ''محیط اعظم'' تصنیف کی تھی تو اس میں بہار کا نقشہ اشعار میں کھینچا تھا ۔ اب احباب کے اصرار پر نثر میں اسی موضوع کو چھیڑا ۔ لیکن غور فرمائیں ، موضوع ایک ہے مگر چوں کہ درمیان میں بائیس برس کا طویل وقفہ ہے اور اس مدت میں بیدل کے خیالات اور ان کے فن میں ایک انقلاب عظیم رونما ہوا ہے ، اس کا اثر ان کے اسلوب نگارش میں بھی ظاہر ہوتا ہے ۔ جیسا کہ پیشتر ازیں ذکر کیا جا چکا

ہے ، 'محیط اعظم'' کے سر تا پا رنگینیوں سے لبریز مثنویہ میں لفظ طاؤس صرف ایک بار استعمال ہوا اور وہ بھی اس طرح کہ بال طاؤس سے زیادہ وابستگی ثابت نہیں ہوتی ۔ لیکن جب بیدل نے ۱۱۰۰ھ کے قریب نثر کا یہ نسبتاً بڑا کل مختصر سا ٹکڑا تحریر کیا تو پورے سات بار طاؤس کا لفظ زبان قلم پر آیا اور وہ بھی والہانہ انداز میں ۔ گویا روح قلم طاؤس کی رنگینیوں سے مسحور ہو چکی تھی ۔ اس شذرہ سے آپ نثر کے متعلقہ فقرات پڑھیں :

(۱) عشق اوج تقدس در کسوت رنگ آشیاں طاؤس می طرازد ۔

(۲) دیوارہا از عکس گل بال طاؤس گل کردہ ۔

(۳) چشم پوشیدہ چوں بیضہ' طاؤس آئینہ خانہ ایست در بستہ ۔

از بس کہ ہوا آئنہ در رنگ نہاں کرد
صبح از نفس خود پر طاؤس بچنگ است

(۴) اندیشہ برنگ طاؤس چنداں کہ بال برہم زند مقیم گلزار ۔

اس نثر میں سعدی اور ظہوری ترشیزی کے ملے جلے اثرات کم کر رہے ہیں ۔ تخیل کی لطافت بیدل کی ذاتی شے ہے جس نے اسلوب کو حسن تر اور شگفتہ تر بنا دیا ہے اور جیسا کہ پہلے بھی ہم دیکھ چکے ہیں فکری امور رنگوں کا جامہ زیبا اوڑھ کر حسن نگاہ بن گئے ہیں ۔ دہلی کے دو اشعار بھی اسی شذرہ میں موجود ہیں ۔

کسوتی نیست کہ بے رنگ توان پوشیدن
ذرۂ موج ہوا لیز پر طاؤس است

قلم تا حرف رنگش می نگارد
رقم جوش پر طاؤس دارد

بالخصوص اس مقالے یعنی 'بہارستان حسن' نے حتمی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ بیدل کو لفظ طاؤس سے وابستگی بعد میں پیدا ہوئی جب وہ اپنے مولد و منشا کو چھوڑ کر آگرہ اور دہلی کی طرف چلے آئے ، اور انہوں نے آ کر دیکھا کہ ان شہروں میں رنگین خیالی اور رنگین بیانی نے ایک قیامت بپا کر دی ہے ۔ اب ہم ذیل میں ذرا زیادہ تفصیل سے اس بات کا مطالعہ کرتے ہیں کہ احساس جمال نے

ہمارے شاعر کی فطرت کو کس قدر رنگین بنا ڈالا تھا اور اس کا اظہار انہوں نے لفظ طاؤس کے ذریعے کس طرح کیا ۔

رنگیں خیالی ہمارے شاعر کی فطرت کا خاصہ ہے ۔ اس کی فطرت کی تخمیر رنگیں خیالی سے ہوئی ہے اس لیے جو سانس اس کے اندر سے ہو کر باہر آتی ہے وہ نگاہوں کے سامنے فردوس رنگ بن کر موجود ہو جاتی ہے ۔ اس کی آرزوئیں بھی سر تا پا رنگیں ہیں اور جب ان میں تہیج رونما ہوتا ہے تو ہمارے شاعر کے ضمیر میں موج رنگ بال طاؤس کی طرح متحرک ہو جاتی ہے :

نفس تا می‌کشم فردوس در پرواز می‌آید
برنگ بال طاؤس آرزوها در قفس دارم

آرزوها بس کہ در جیب نفس گم کردہ ام
بال طاؤس است اگر موج است در دریای من

رنگیں فطرت شاعر کا غبار بھی اگر ہوا میں بکھر جائے تو سارا جہاں پر طاؤس کی طرح رنگیں بن جائے ۔ اس کی خاکستر میں بھی طاؤس پر افشاں ہوئے ہیں ۔ اسی بنا پر تمام عالم چمنستان بن چکا ہے ۔

جہان گرفت برنگینیِ پر طاؤس
غبار من کہ ندانم کہ داد سر بہ ہوا

بہ گردی ای شرار کاغذ از ہم مشربان غافل
کہ در خاکستر ما ہم پرافشان بود طاؤسی

چمن طراز شکوہ جہان نیرنگم
مسلم است چو طاؤس سکۂ رنگم

اپنی فطرت رنگیں کے باعث آنکھ کھولے بغیر اپنے آپ کو رنگینیوں سے محصور دیکھتا ہے ۔ اس کے بستر ناز کا تار و پود رگ گل سے تیار ہوا اور اس کا بالیں پر طاؤس سے ۔ ایسے بہار پرور مناظر کی سیر کے لیے باہر جانے کی ضرورت نہیں ، اس کی خلوت راز میں تمام رنگینیاں جمع ہیں :

مژہ نگشودہ چندین رنگم از خود می برد بیدل
رگ گل بستر نازی بر طاؤس بالینی

غنچہ جہدم نشود قافلہ و سیر بہار
بال طاؤسم و صد محمل رنگین دارم

خلوت رازم بہشت غیرت طاؤس گشت
رنگ‌ها چون حلقہ بیرون درم گل کرد و ریخت

بیضۂ طاؤس کی طرح شاعر اپنی آنکھ بند رکھتا ہے لیکن اگر اسے ذرا بھی وا کر دے تو سیلاب رنگ حیرت افزا ہو۔ اسی طرح اگر وہ اپنی آنکھ کھولے تو بہار الفاظ دیدنی ہو، لیکن اس کی خاموشی بھی چراغاں سے کم نہیں اور اس کا ضمیر چشمک ہائے رنگین رکھتا ہے:

برنگ بیضۂ طاؤس چشم بستہ دارم
کہ یک مژگان کشودن می‌کند صد رنگ حیرانش

ادا فہم چراغان خموشم کس نشد ورنہ
ضمیر داشت چون طاؤس چشمکہای رنگینی

ظاہر ہے شاعر کی فطرت میں جو رنگینی ہے اس کے مقابلے میں دونوں جہانوں کی رنگینیاں ہیچ ہیں اور اس خوبی نے جو مستی عطا کی ہے اس کا تھوڑا سا اظہار بھی ہر دو عالم کے جام ہائے شراب کو گردش میں لا سکتا ہے۔ مگر وضعدار شاعر حیا کی بنا پر اس قسم کے مظاہرے سے پہلو تہی کرتا ہے:

حیا رعنائی طاؤس از وضعم نمی‌خواہد
وگرنہ با دو عالم رنگ یک پرواز می‌کردم

بس کہ چون طاؤس پیچیدہ است مستی در سرم
جام‌ها در گردش آید گر بخود جنبد پرم

بارہ ماسبق سے پتا چلتا ہے کہ بیدل کی فطرت کی رنگینی اور شگفتگی حیرت افزا ہے ۔ وہ خود کہتے ہیں :

درین گلشن بہار حیرتم آئینہ دارد
اگر طائر شوم طاؤسم وگر نخل بادامم

طاؤس ان کی رنگینی فطرت کی علامت ہے ۔ اپنے آپ کو اس طرح چمن حسن و رنگ میں گم پا کر وہ حیرت زدہ ہو جاتے ہیں ۔ حیرت سوال کو جنم دیتی ہے اور وہ بار بار استفسار کرتے ہیں! وہ کون ہے جس کے رنگ بہار نے انہیں شوخی پرواز عطا کی ۔ یہ جو ان کے پر ہیں مو سے آغوش فردوس وا ہو چکی ہے ان کا طاؤس خیال کس کے خرام ناز کو دیکھ رہا ہے :

شوخیِ پرواز من رنگ بہار ناز کیست
چون پرِ طاؤس خود را در چمن گم کردہ ام

چنین محو خیال کیست طاؤس خیال من
کہ وا کردہ است فردوس از بن ہر مویم آغوشی

طاؤسِ خیال کی ترکیب جہاں نظارہ پرور ہے وہاں بیدل کے تخیلِ رنگین کی بھی عکاسی کرتی ہے ۔ بیدل کا یہ استفسار مختلف دل چسپ، پر لطف اور معنی خیز پیرایہ ہائے بیان کے ساتھ جاری رہتا ہے ۔ کبھی وہ پوچھتے ہیں! ہمارے طاؤس رنگ نے کس کی نگاہوں سے مے کشی کی کہ اس کی پرواز بھی مست مست جلوؤں سے قدح نوش ہے ۔ کبھی کہتے ہیں کس کے باغ آرزو کی گل چینی ان کی گرد داماں کو بھی پرطاؤس بنا رہی ہے اور کبھی عالم بے تابی میں کہہ اٹھتے ہیں :

ندانم گل فروش باغ نیرنگ کیم بیدل
ہزار آئینہ دارد در پرِ طاؤس تمثالم

یہ ابہام، یہ استفسار بھی ان کی فطرت رنگین کا مجسم سوال ہی کر اس رنگینی کا راز معلوم کرنا بڑا لطف انگیز ہے ۔ کیوں کہ اس طرح ان کی رنگینیِ طبع زیادہ رعنائی کے ساتھ نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے ۔

شاعر جو بات اب تک رمز و ایما سے کہہ رہا تھا آخر اسے خود واضح کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اے میرے محبوب! یہ سب کچھ تیرے حسنِ رنگین

کی معجزہ نمائی ہے۔ نگاہ تیرے رنگِ حسن کو دیکھتی ہے تو سامنے جیل طاؤس بہ صد ناز و ادا محوِ پرواز ہو جاتا ہے:

گر دہد رنگ تماشای تو پرواز نگاہ
جیل طاؤس کوان ریخت ز پرواز نگاہ

شاعر جب اس طرح محبوب سے محوِ تکلم ہوتا ہے تو جذبے سے جدید انداز اختیار کرکے اس حقیقت کو بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ کہتا ہے میرے تفکر پر تیرے حسن کی نیرنگی کا غلبہ ہے۔ تیری یاد رنگینیوں اور چمن پردازیوں کا سرمایہ بن چکی ہے اور تیرے خیال نے میرے عضو عضو کو پرِ طاؤس کی طرح رنگین بنا ڈالا ہے:

بس کہ بیرنگش قدح چیدہ است در اندیشہ ام
می کند طاؤس فریاد از شکستِ شیشہ ام

پرِ طاؤس دارد محملِ پرواز مشتاقان
بیادت پر کجا رقم بہ سامان چمن رفتم

—

عضو عضوم چمن آرای پرِ طاؤس است
بہ خیال تو ہزار آئنہ آغوش خودم

شاعر حسنِ محبوب کو دیکھ کر عالمِ حیرت میں کھو جاتا ہے، لیکن اس کی حیرت بھی سرتا پا گل فروش ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں موجِ پرِ طاؤس مژگانی کرتی ہے اور عالم بہشت بریں بن جاتا ہے:

نمی دانم ز گلزارش چہ گل چیدہ است حیرانی
بہ چشمم می کند موجِ پرِ طاؤس مژگانی

ہزار آئنہ طاؤس می پرم بہ خیالت
بہشت کرد جہان را چمن تراشیِ حیرت

حیرت دمیدہ ام گل داغم بہانہ ایست
طاؤس جلوہ زار تو آئینہ خانہ است

شاعر کی فطرت رنگیں اور محبوب کے حسن رنگیں کے متعلق اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس نے احساس جمال کے متعلق ایک بنیادی حقیقت کی توضیح کر دی ہے ! علمائے تنقید اس مسئلے پر بار بار بحث کیا کرتے ہیں کہ یہ احساس داخلی حیثیت رکھتا ہے یا خارجی - بیدل کے خیال کے مطابق اس میں داخلی عناصر بھی شامل ہوتے ہیں اور خارجی بھی - شاعر کی اپنی فطرت حسن آفریں ہوتی ہے اور اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ خارجی عناصر بھی اس کی جمال پروری کا موجب بنتے ہیں - بیدل کا ایک شعر ہے :

بیدل اثری بردۂ از یاد حرامش
طاؤس بروں آ کہ خیال تو چمن شد

'یاد حرام' کی ترکیب خارجی اثرات کی اہمیت بتا رہی ہے اور دوسرے مصرع میں ضمیر مخاطب کا دوبار استعمال اس حقیقت کو الم نشرح کر رہا ہے کہ تخلیق حسن میں داخلی عناصر کا بھی بے حد دخل ہوتا ہے - خود لفظ 'یاد' بھی شاعر کے حافظے اور تخیل کو اہم قرار دے رہا ہے - دوسرے الفاظ میں خارجی عوامل اور داخلی عناصر کے باہمی تعامل سے تخلیق حسن ہوتی ہے - خیال رہے کہ جمالیاتی شعور کے متعلق بیدل کا یہ نظریہ سترھویں صدی عیسوی کے اواخر میں تھا جب کہ مغربی علوم کی بھنک بھی اہل مشرق کے کانوں میں نہیں پڑی تھی -

حسن محبوب کے متعلق ان تصورات کے ہوتے ہوئے شاعر ان کے توسط سے عالم کی ایک ایک چیز کا ذکر کرتا ہے - شاعر نے محبوب کے دست نگاریں کو دیکھا - طبیعت پر عجیب حسن آفریں کیفیت طاری ہوئی اور شاعر کہنے لگا ، تو اگر مکھی جیسی ناقص شے کو اڑائے تو وہ بھی طاؤس بن جائے :

کیفیت آن دست نگارین اگر این است
طاؤس کند گل مگسی را کہ پرانی

محبوب کی رفتار اس قدر جمال پرور ہے کہ اس کے پاؤں سے اڑنے والی گرد بھی پر طاؤس بن جاتی ہے اور جس گلستان کو محبوب کے نقش پا ایسے نقش بدیع کی رنگینی نصیب ہوتی ہے وہاں بال طاؤس سجادت کی بجا پر حلقۂ در بن

جاتا ہے :

ہر کجا کہ می گذری گرد پر طاؤس است
نقش پایت چہ قدر بوقلموں می گزرد

بہ چمنی رنگہا راں نقش پا گل می توان چیدن
برفتارت پر طاؤس رو بر خاک می مالد

در گلستانی کہ رنگِ نقشِ پایت ریختند
بالِ طاؤس از خجالت حلقہ ساز در شود

ظاہر ہے جس صحرا سے محبوب کا محملِ ناز گذرے گا وہاں کی خاک بھی طاؤس چمن پیرایہ بن کر اٹھے گی :

محملِ نازش ز صحرای کہ بال افشان گذشت
گرد اگر برخاست طاؤسِ چمن پیرایہ بود

طاؤسِ رنگین اور کثرت پر حسن محبوب کی برتری کا بار بار اظہار ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں محبوب کے نقاب اور پیراہن پر نگاہ ڈال لینا ضروری ہے :

بہ گلشنی کہ کشاید نقاب گردش رنگ
تعبیر از پر طاؤس رونما گیرد

در گلستانِ چمن پردازیٔ پیراہنت
بالِ طاؤسانِ رعنا رخت آتش کار بود

واضح رہے یہ مغل عہد کی شاعری ہے جب نقاب کا رواج تھا اور لطافتوں سے معمور باریک ململ کا پیراہن محبوب ہوا کرتا تھا۔ شاعر کہتا ہے میرا محبوب حسن آئینے میں جھانکتا ہے، وہ بھی مرقع حسن بن جاتا ہے :

دامِ جوہر نسخۂ طاؤس دارد در بغل
این قدر رنگی کہ شد یا رب شکارِ آئینہ

اور بہار جیسے اپنی حسن آفرینی پر ناز ہوا کرتا ہے، وہ بھی گلزارِ محبوب

کی سیر کے لیے نکلتی ہے وہ عجیب انداز سے پر سور کر یعنی موراں داس اپنی کمر پر لیے ہوئے :

سیر گلزار کہ یا رب در نظر دارد بہار
از پر طاؤس دامن بر کمر دارد بہار

مندرجہ بالا اشعار پڑھ کر ہمارے اپنے عہد کے نامور مصور عبدالرحمان چغتائی کے شاہکار نگاہوں کے سامنے پھر جاتے ہیں ، جن میں مغل عہد کی حسن آفرینی موجود ہوتی ہے ۔

حسن مجازی کی نسبت بیدل حسن مطلق کے زیادہ دل دادہ ہیں ۔ ان کے عین میں ساقی ازل نے اس طرح بزم آرائی کی ہوتی ہے کہ اس کے مقابلے میں یہ عالم اور اس کی نیرنگیاں بالکل ہیچ ہیں ، اس لیے پر طاؤس کو وہ در خور اعتناء نہیں سمجھتے :

در تخیل ساقی این بزم ساغر چیدہ است
تا بکی بینم پر طاؤس و مستی ہا کنم

پر طاؤس کی رنگینی اور دل کشی تسلیم ۔ لیکن حسن مطلق ایسی عجیب چیز ہے کہ اس کی مینای بے رنگ کو ڈھانکنے کے لیے اسے یعنی پر طاؤس کو پنبہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے ۔ یہاں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حسن مطلق اس قدر بدیع الجمال ہے کہ سارے عالم کی رنگینیاں اس کی پردہ داری میں مصروف ہیں :

دریں باغم بحدیں جام تکلیف جنوں دارد
پر طاؤس یعنی پنبہ مینائی بیرنگش

اس لیے وہ کہتے ہیں کہ طاؤس مست کی طرح اپنی فصرت کی تمام رنگینیوں کو پوری طرح آراستہ اور پیراستہ کرکے وہ ایک جلوہ کو دیکھنے میں محو ہیں اور اپنے دیکھنے والوں سے کہتے ہیں میرے دم حسین پر نگاہ ڈال کر خاموش ہو جاؤ ۔ نیرنگ صیاد کے متعلق کچھ نہ پوچھو ، اس کے جلوے کی نیرنگی بیان سے باہر ہے :

ہم چو طاؤسم بجدین رنگ محو جلوہ ہای
نقش دامم دیدی از نیرنگ صیادم مپرس

حسن مطلق کی نیرنگی سے محرم ہونا کسی کے مقدر میں نہیں ۔ ازل سے ہر ذرہ بہ صد چشم تماشا اس کی بیرنگی کو دیکھنے کا آرزو مند ہے ۔ زمانہ ان ہی

کر اور سوز سنور کر آتا ہے تا کہ اس حسن بے مثال کی بزم خلوت میں باریابی حاصل کرے ، مگر اس وقت تک محروسی کے بغیر اسے کچھ حاصل نہیں ہوا :

دل ہر ذرہ بصد چشم تماشا جوشید

دہر طاؤس شد و محرم نیرنگ نشد

اس محرومی کے باوجود کون سی چیز ہے جس کے دل میں جلوۂ حسن ازل کو دیکھنے کی تمنا موجود نہیں ۔ چمن دہر کا ایک ایک غنچہ آنکھ بن کر اسے دیکھنے کے لیے بے تاب ہے ۔ خود چمن ہر وقت منتظر ہے کہ کب اسے حسن و لطافت کے پیکر ازلی کی طرف سے استقبال کی اجازت ملتی ہے اور وہ سرتاپا آئینہ بن کر اس کے سامنے حاضر ہوتا ہے :

ز استقبال نازت گر چمن را رخصتی باشد

بہ صد طاؤس بندد نخل و یک آئینہ وار آید

دولت وصال اور رخصت استقبال حاصل ہو یا نہ ہو ، صرف اس کے خیال میں وہ نیرنگی پائی جاتی ہے کہ ہر ذرہ طاؤس مست بن چکا ہے :

یک ذرہ ندیدم کہ بطاؤس نمالد

نیرنگ خیالت بہ ہزار آئنہ پرداد

یاد رہے کہ حسن مطلق یا اقدار عالیہ سے محبت عاشقانہ شاعری کا اعلیٰ ترین مقام ہے اس لیے شاعر جب اس کا ذکر کرتا ہے تو اس کا فن بھی نقطۂ کمال پر پہنچ جاتا ہے ۔ حسن و جمال کے پیکر بے نظیر سے جذبۂ عشق و محبت نے سوز و ساز اور درد و داغ کا جو عطیہ عنایت فرمایا ہے وہ بھی رنگینیوں سے معمور ہے ۔ محبوب کے جلوے کی بہار دیکھنے کا سودا دل میں سمایا تھا ۔ عمر دراز اسی آرزو میں رونے گزر گئی ۔ حسین تصورات نے دل و دماغ کو اس قدر حسن پرور اور حسن آفریں بنا ڈالا کہ مژگاں پر جو اشک بھی نمودار ہوا ، وہ سرتاپا بہار تھا ۔ اور اس کو پونچھنے کے لیے جو دامن استعمال کیا گیا وہ بھی پر طاؤس بن گیا ۔ خوش قسمتی سے محبوب خراماں خراماں سامنے سے گزرا ، اس کی گرد رفتار حسن آفریں تھی ، فرط مسرت کے باعث آنکھوں سے جو آنسو نکلے وہ انعکاس رنگین کی بنا پر طاؤس نظر آنے لگے :

بہ سودای بہار جلوہ ات عمریست گریانم
پر طاؤس دامانی کہ نم چیند ز مژگانم

گرد رفتارت پری افشاند در چشم ترم
دہر شد طاؤس خیز از گریہٴ رنگین من

غرور حسن کی بنا پر محبوب نے اپنے چاہنے والے کا خون بہا دیا ، مگر خون عاشق نے محبوب کی تمکنت کو رنگینیوں سے لبریز کر دیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ پر طاؤس کی وجہ سے چتر کوہ شفق نما ہو جایا کرتا ہے۔ تیغ محبوب نے بھی محبوب کے گلشن حسن سے آب و تاب حاصل کی ہے ، اس لیے بسمل کے خون کا جو قطرہ خاک پر گرا اس سے آواز طاؤس برآمد ہوئی اور خاک شہید سے شفق کی رنگینیاں نمودار ہوگئیں۔ سبحان اللہ! تیغ محبوب کی گل افشانی کا کیا کہنا۔ خون بسمل کے قطرے طاؤس بن کر فرش کو چمن بنا دیتے ہیں :

خون ما مغتنم گرد سر تمکین گیر
چتر کوہ از پر طاؤس شفق می باشد

تدانم تیغ قاتل از چہ گلشن دادہ اند آبش
چکیدنہای خونم ہست بی آواز طاؤسی

تیغت چہ فسون داشت کہ چو بیضہٴ طاؤس
گل می کند از خاک شہید تو شفق ہا

ہر جا دم تیغ تو گل افشان خیالیست
فرش است چو طاؤس چمن در پر بسمل

القصہ حالات عاشق کے دل میں جو داغ ہیں وہ طاؤس سے کم چمن پوش نہیں ، اس لیے عشق کے دل داغ داغ میں وہ رنگینی ہے ، جو گلزار کو بھی حاصل نہیں ، یہ تو بہشت دیگر ہے :

دل داغ آشیانی از قفس پرورده ام بیدل
بریرِ بال دارم سیر طاؤس چمن پوشی

داغِ دل رنگینیٔ دارد که در گلزار نیست
گر نۂ طاؤس باری رحمتِ آتش کار باش

داغِ سودای گرفتاری بہشتی دیگر است
عالمی در بال طاؤسم بذوق دام سوخت

جذبۂ محبت کے سوزِ رنگین نے عاشق کو شعلۂ جوالہ اور بال طاؤس بنا دیا ہے ۔ گویا تمنائی رنگین اور شوقِ حسین نے اس کی قلب ماہیت کر دی اور وہ طاؤس بن گیا ۔ جب جذبۂ عشق کی یہ تاثیر ہو تو اس حسین اور جمیل محبوب کے حضور رسائی کی حسرت سے شوق دل کیوں بے تاب نہ ہو :

ندانم شعلۂ جوالہ ام یا بال طاؤسم
محبت در قفس دارد بچندین رنگ زنارم

سیرِ گلزار تمنای تو طاؤسم کرد
غوطہ در رنگ زدم تا بہ پریدن رفتم

در گلشنی کہ شوقش بر صفحہ ام زد آتش
فردوس در قفس داشت طاؤس پر کشودن

سیرِ بالِ پرِ طاؤس مکرر گردید
صفحہ آتش زدہ ام فصل تماشای من است

شوقِ دل حسرتِ گلہای حضوری دارد
ہمچو طاؤس چرا آئینہ دفتر نکند

بہاریں عاشق بڑے جذبات انگیز پیرائے میں کہتا ہے کہ اسے عصٔ

لیلیٰ و مجنوں سے کچھ سروکار نہیں - اسے صرف اپنا دلِ داغ آشیاں اور گریۂ رنگین عزیز ہے - اسے اپنے باطنی جذب و شوق سے اس قدر لگاؤ پیدا ہو چکا ہے کہ اب یہی اس کے لیے موردِ توجہ ہے :

مجنون و سازِ بیبلانِ لیلیٰ و نازِ گلستان
من با دلِ داغ آشیان طاؤسِ نالان در بغل

مندرجہ بالا آخری شعر بیدل کی دروں بینی کی طرف اشارہ کر رہا ہے - ان کے مسلۂ افکار کا یہ وہ پہلو ہے جو بنیادی اہمیت رکھتا ہے - ان کے سینے میں لطیف جذبات و کیفیات کا وفور تھا اور ان کے تخیل نے ان کے تانے بانے سے ان کے باطن میں ایک سدا بہار گلشن بنا دیا تھا ، جس کی رنگینی و رعنائی کو بیان کرنے کے لیے وہ لفظ طاؤس رمزی علامت کے طور پر استعمال کرتے تھے - یہ حسن و جمال در اصل اس کامل امتزاج کا نتیجہ تھا جو ان کے باطن میں ادب و شعر ، فلسفہ و حکمت اور اخلاق و تصوف کے نہایت ہی پاکیزہ عناصر کی وجہ سے رونما ہوا تھا - واضح تر الفاظ میں یہ ان کی حقیقی شخصیت تھی ، جس کی تعمیر انھوں نے جان جوکھوں سے اپنی ذات میں ڈوب کر کی تھی - جس انسان کی شخصیت ہر اس شے سے نشو و نما پاتی رہی ہو جس پر انسانی فکر اور روح کو ناز ہو ، اس سے زیادہ خوش قسمت کون ہو سکتا ہے - صوفی ہونے کی حیثیت سے بیدل صاحبِ حال تھے ، اس لیے محض علمی طور پر وہ اپنی شخصیت سے آشنا نہیں تھے ، بلکہ ان کی باطنی نگاہ نے اسے بالمشاہدہ دیکھا تھا - اس لیے اس کے بےنظیر حسن و جمال پر وہ صرف فدا ہی نہیں تھے بلکہ اس پر نازاں بھی تھے - بنابریں جب انھوں نے رموز و علامات کے ذریعے اپنی شخصیت کو بیان کرنا چاہا تو طاؤسِ مست سے بہتر انھیں اور کوئی لفظ دکھائی نہ دیا - متعدد اشعار میں بڑے فخر و ادعا سے طاؤسِ من اور طاؤسِ ما کے الفاظ استعمال کرکے انھوں نے اپنی ذاتی انا کا ذکر کیا ہے اور اس طرح اس کی بہشت پروری کی طرف بلیغ اشارے کیے ہیں :

طاؤس من از باغ حضور کہ خبر یافت
کز رنگ من آتش پر و بال برآورد

طاؤس من بہار کمین چہ مژدہ است
عمریست بال می زنم و چشم می پرد

طاؤس من احرام تماشای کہ دارد
در گشت سراپای من از آئینہ چیدن

طاؤس ما بہار چراغان حیرت است
آئینہ خانہٴ بہ تماشا رسانده ام

طاؤس ما اگر نہ پر افشان نازِ اوست
رنگِ پریدۂ کہ چمن کرد بال را

طاؤس ما خجالتِ اظہار می‌کشد
زین حلقہ ھا کہ بر در نیرنگ می زنند

مستی طاؤس من با صد قدح مخمور ماند
ظلمت یا بر نمی دارد چراغان ارم

حیرت از طاؤس ما پر می زنند
وحشتی را نرگستان کرده ایم

یہاں پہلے چھ اشعار میں طاؤس من اور طاؤس ما کی ابتدا میں نشست اس امر کا بدیہی ثبوت ہے کہ دوسرے محسوسات اور مدرکات کی نسبت اپنی حقیقی شخصیت کا وجدان بیدل کے دل میں اولین مقام رکھتا تھا۔

جیسا کہ پارۂ ماسبق سے واضح ہے ، بیدل کی ذات میں اخلاق و اقدار کا ایک نہایت خوب صورت توازن رونما ہوا تھا۔ یہ ان ایام کی بات ہے جب وہ ارتقاے ذات کی تمام منازل طے کر چکے تھے۔ ان کی فطرت میں یہ کرشمہ گیارھویں صدی ہجری کے آخری چند برسوں میں ظہور پزیر ہوا ، اس لیے انسانوں

کو پرکھنے کے لیے ان کا معیار بے حد بلند تھا اور سیرت و کردار کے اعتبار سے اپنے عہد کے صرف چند انسان ان کے معیار پر پورے اترے۔ ان میں سے ایک خوش لصیب السان نواب شکر اللہ خان بھی تھے۔ ان کی صفات حسنہ کا ذکر بیدل مثنوی ''طور معرفت'' کے اختتام پر یوں کرتے ہیں :

سعادت گوہر گنجینۂ او
سیادت صورت آئینۂ او

مروت رنگ گلزار صفاتش
لتوت جوہر شمشیر ذاتش

کلش عرض صفا را دستگاہی
نگاہش فرق ہمت را کلاہی

ادب وضعی کہ عضو پیکر اوست
حیا آبی کہ وقف گوہر اوست

یہ اس بے نیاز مرد فقیر کی زبان سے تعریف و توصیف ہے جو اپنے عہد کے جلیل القدر مغل شہنشاہوں کو بھی در خور اعتنا نہیں سمجھتا تھا، اس لیے یہ مدحیہ اشعار اس بات کا زبردست ثبوت ہیں کہ نواب شکر اللہ خان کی فطرت میں سیرت کی اعلیٰ خوبیاں پائی جاتی تھیں۔ انھی خوبیوں کے گہرے احساس کا نتیجہ تھا کہ جب ۱۱۰۸ھ میں نواب صاحب موصوف فوت ہوئے تو بیدل نے قطعۂ تاریخ وفات میں سب سے پہلے انھیں کا ذکر ان الفاظ میں کیا :

فریاد کان جمال کرم در جہان نماند
طاؤس جلوہ ریز درین آشیان نماند

قابل توجہ امر یہ ہے کہ اس شعر میں بھی باطنی خوبیوں کے لیے طاؤس کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے، یعنی بیدل کے خیال کے مطابق باطن آراستہ طاؤس مجسم ہوتا ہے۔ اس شعر میں لفظ کرم کی حیثیت جمالیاتی بھی ہے۔ قرآن مجید میں لفظ کریم جو کرم سے مشتق ہے، معصوم و جمیل اور حسین[1] کے معنوں میں آیا

۱۔ حضرت یوسف کا ذکر کرتے ہوئے : ''ان ھذا الا ملک کریم'' یہ تو کوئی معصوم و جمیل فرشتہ ہے۔

نیز سورۂ لقمان میں : ''فانبتنا فیھا من کل زوج کریم'' ۔ پھر اس میں ہم نے ہر قسم کی حسین چیزوں سے جوڑے پیدا کیے۔

ہے۔ اس لیے حال ، کرم ، طاؤس ، جلوہ ، تمام الفاظ یہاں حالیاتی ہیں اور ان کو سامنے رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی حقیقی شخصیت میں اقدار و اخلاق کی کامل ہم آہنگی بیدل کے نزدیک سر تا پا جمال ہوا کرتی ہے۔ ذات انسانی میں حقیقت کا یہ وہ نقطۂ عروج ہے جس پر پہنچ کر کیٹس (Keats) نے حسن و صداقت کو مترادف قرار دیا تھا۔

ضمناً یہ کہنا خالی از دلچسپی نہیں ہوگا کہ بیدل حقیقی شخصیت ، باطنی آرائش اور وجودِ معنوی کے لیے غنچہ و گل ، بہار و گلزار اور فردوس و بہشت کے استعارے بھی استعمال کرتے ہیں اور اس سلسلے میں تلمیحِ یوسف[۳] کو بھی بڑی خوبی سے کام میں لاتے ہیں۔ مثلاً جب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حسن کے اعتبار سے تو خود غنچۂ رنگیں سے کم نہیں ، ذرا درِ دل وا کرنے کی ضرورت ہے ، تو اس وقت زبان سے یہ حسین و جمیل شعر نکلتا ہے :

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن در آ
تو ز غنچہ کم ندمیدہ‌ای درِ دل کشا بچمن در آ

اسی طرح جب یہ کہنا مقصود ہوتا ہے کہ مانا اپنی غیر اصلی اور منفی شخصیت بھی عزیز دکھائی دیتی ہے ، لیکن اصلی اور حقیقی شخصیت کی رعنائی کا کیا کہنا۔ اس نے نقلی شخصیت کے خاتمے سے کوئی نقصان نہیں ہوگا بلکہ بالکل وہی صورت رونما ہوگی جس طرح وداعِ غنچہ کے بعد پھول بے حد زیادہ رنگینی اور جاذبیت کے ساتھ جلوہ آرا ہوتا ہے ، تو پھر یہ پیارا شعر زبانِ قلم پر وارد ہوتا ہے :

ہمہ حسرت است شوقِ طرب مکین ز وداع غنچہ گل آفرین
تو اگر ز خود روی این چنین بتو از تو خوب تری رسد

شعرا دل سے بھی اپنے تخیل اور اپنی ذات کا اندرونی عالم مراد لیتے ہیں۔ چناں چہ ذیل کے شعر میں بیدل اپنے دل یعنی اپنی حقیقت کو گلزار سے بھی حسین تر کہتے ہیں :

غافل از سیرِ گداز دل نباید زیستن
ہست در خون گشتنت رنگی کہ در گلزار نیست

مندرجہ ذیل شعر میں کہتے ہیں کہ اپنی ذات میں ہی بہار ہے ، گلزار ہے اور بہشت موجود ہے ، دور جانے کی ضرورت نہیں :

نشاط ایجا ، بہار اینجا ، بہشت ایںجا ، نگار ایںجا
تو کز خود غافلی صرف عدم کن دور بینی را

اور دیل کے شعر میں کہتے ہیں ، ہمارے سینوں میں آج بھی در ہائے فردوس وا ہو سکتے تھے ، مگر افسوس ہے اپنی بے دماغی کی وجہ سے ہم منتظر فردا رہے :

درہای فردوس وا بود امروز
از بےدماغی گفتیم فردا

جہاں تک تلمیحِ یوسفؑ کا تعلق ہے اس کی موزونیت ظاہر ہے ۔ حضرت یوسفؑ حسنِ ظاہری کے علاوہ کمالاتِ باطنی سے بھی آراستہ و پیراستہ تھے ۔ بنابریں حسنِ باطنی اور وجودِ معنوی کے لیے تلمیحِ یوسفؑ بےحد مناسبت رکھتی ہے ۔ مندرجہ ذیل شعر میں دیکھیں ، تلمیح ، تضاد اور مراعاۃ النظیر کا کیا عجیب طلسم ہے :

نور جان در ظلمت آباد بدن گم کردہ ام
آہ ازان یوسفؑ کہ من در پیرہن گم کردہام

اسی قسم کا ایک اور خوب صورت شعر ہے :

جان پاکی تا کی افسردن بہ کلفت گاہِ جسم
یوسفت در چاہ مرد و بر نمی آری ہنوز

معلوم ہوتا ہے کہ جب کبھی اپنے معاصرین کو بیدل حسنِ باطن کی طرف متوجہ کرنا چاہتے تھے اور خطاب میں درد و تاثیر پیدا کرنا مقصود ہوتا تھا تو حضرتِ یوسفؑ کے حسنِ ظاہر و باطن اور ان کی ابتلا کا نقشہ بڑے عجیب اسلوب سے کھینچ دیا کرتے تھے ۔

دیل کے اشعار شاہد ہیں :

گر باین رنگ است بیدل رونقِ بازارِ دہر
تا قیامت یوسفِؑ ما بر نمی آید ز چاہ

کم ز یوسفؑ نیستی ای قدردانِ عافیت
چاہ و زندان مغتنم گیر از صفِ اخوان برآ

مغتنم گیرید دامانِ دلِ آگاہ را
محرمانِ تبریز یوسف[۴] دیدہ اند ایں چاہ را

اس بارے کے تمام اشعار اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ بیدل کے لیے حسین ترین چیز ان کا باطنی انا یا انائے حقیقی تھا ، اس لیے والہانہ انداز میں کبھی اسے طاؤس ، کبھی غنچہ ، کبھی گلِ شگفتہ ، کبھی بہارِ بےخزاں ، کبھی بہشت و فردوس اور کبھی ماہِ کنعانی کہنے میں وہ حق بجانب ہیں ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر تشبیہ و تلمیح بیدل کی انائے کامل کی کوئی نہ کوئی مخصوص خوبی آشکار کرتی ہے لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حسن کا اصل سرچشمہ جذبۂ محبت ہوتا ہے ۔ روحانی مسرت اور قلبی آسودگی اپنی محبوب شے کے مشاہدے اور ذکر سے حاصل ہوتی ہے اور ہر رنگینی اس کی ذات میں جمع ہو جاتی ہے ۔

انائے حقیقی کے سلسلے میں طاؤس کے استعارے پر ایک دفعہ پھر غور کر لینا ضروری ہے ۔ انائے حقیقی کی بیداری انسانی زندگی کا معمولی واقعہ نہیں ۔ نفلی انا کے تہ در تہ پردوں کا اصلی شخصیت سے دور ہو جانا حیاتِ انسانی کا اتنا خوش آئند ، اتنا عظیم اور اس قدر حیرت انگیز واقعہ ہے کہ کوئی اور بڑے سے بڑا واقعہ اس کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتا ۔ انسان کے مسرت اور تعجب کے جذبات کی انتہا نہیں رہ جاتی ۔ وہ ایک ایسا منظر دیکھتا ہے اور اس منظر کا مشاہدہ اثباتِ ذات کا ایسا احساس طبیعت میں پیدا کرتا ہے کہ پھر زمین و آسمان ہیچ نظر آنے لگتے ہیں ۔ انسان احساسِ ذات کے خمار سے اس طرح مست ہو جاتا ہے کہ پھر چاہتا ہے اس مستی کا اظہار کرے ۔ چوں کہ بیدل کو اپنے حقیقی انا کا بھرپور تجربہ ہوا اس لیے اس کے اظہار کی بے تاب کی تڑپ ان کے دل میں موجود تھی ۔ اس لحاظ سے بھی لفظ طاؤس کی موزونیت دیکھیں :

تا کنم از پر بن مو رنگ ہستی آشکار
جام می خواہم دربن می ماند یک طاؤس وار

اس شعر میں طاؤس احساسِ ہستی کا مظہر ہے اور حضرتِ بیدل نے ذات کے اس مثبت احساس اور وجدان کا ذکر کیا ہے جس پر اسلامی تصوف کو عام طور پر ناز ہے ۔

زمانۂ حال کے مغربی مفکرین ہستی کے اس وجدان کو وجودیت کا نام دیتے ہیں ۔ تصوف اسلامی کے لیے یہ نئی چیز نہیں ۔ اس سلسلے میں بیدل کے افکار[1] کا مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ انہیں وجودی مفکرین بوبر (Buber) آؤسپنسکی (Ouspensky) سارتر (Sartre) جیسپر (Jasper) وغیرہ کے مقابلے میں ہر طرح فکری اور زمانی تقدم حاصل ہے ۔ من و تو کے عنوان سے اپنی ایک نظم میں بیدل اپنے وجود کی حقانیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :

یکی ویر تر از کون و مکان شو
جہان بگذار و خود در خود جہان شو

ایک شعر میں کہتے ہیں کہ انسان کی اپنی ذات حاصل کن فکاں ہے ۔ دنیا و عقبیٰ بے معنی چیزیں ہیں :

چہ دنیا چہ عقبیٰ خیال است بیدل
تو باش این و آن گر نباشد نباشد

یہ ہنگامۂ کائنات محض وجود انسانی کی وجہ سے فضاؤں میں نمودار ہؤا :

صبح این ہنگامہ ای از سیر خود غافل مباش
یک نفس پیدائیت از عالمی دارد نشان

'سیر خود' بیدل کا سب سے بڑا درس ہے ۔ مثنوی طلسم حیرت میں ایک جگہ کہتے ہیں :

ہمین نقش توئی گر برتراشی
تو باشی و تو باشی و تو باشی

تکرار الفاظ سے سارتر کی طرح کس جوش سے احساس ذات کا اظہار ہو رہا

۱- اس ضمن میں کرنل خواجہ عبدالرشید کے مقالہ "علم النفسیات کا ایک انادی پہلو" کا مطالعہ کریں ۔ ان کا مقالہ رسالہ 'برہان' دہلی میں مئی ۱۹۶۱ع کے پرچے میں چھپا تھا ۔ اس میں انھوں نے بیدل کے وجودی افکار کی طرف بوضاحت اشارہ کیا ہے اور بیدل کی 'من و تو' والی نظم بھی درج فرمائی ہے ۔ اس مقالے میں بوبر کی تصنیف "I & Thou" یعنی 'من و تو' کا بھی ذکر موجود ہے ۔ بوبر کا ذکر علامہ اقبال نے بھی اپنی تصنیف 'فلسفۂ الٰہیات کی تشکیل جدید' میں کیا ہے ۔

ہے ۔ اسی پرجوش انداز سے وہ خودی کو بیدار کرنے کی دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

توئی مطلوبِ خود در طلب دریاب

اور اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں :

کدام رمز و چہ اسرار خویش را دریاب
کہ ہر چہ ہست نہان غیرِ آشکارِ تو نیست

یہ امر کہ اپنی یافت میں وہ کامیاب ہوئے تھے ، اس شعر سے واضح ہے :

بجہانِ جلوہ رسیدہ ام ، ز ہزار پردہ دمیدہ ام
ثمرِ نہالِ حقیقتم چمنِ بہارِ حدائقم

اس شعر کے اسلوب اور اس کی حقائق پروری کا کون جواب دے سکتا ہے ۔ علامہ اقبال کی طرح جسپر[1] انسان کے بے پناہ امکانات کا قائل ہے اور انسانی ارادے کی آزادی پر زور دیتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کوئی اتمام یافتہ شے نہیں جس کا پشت در پشت اعادہ ہوتا رہتا ہے ۔ بلکہ وہ ایک ایسی ہستی ہے جو اپنی ایگو Ego کی خود صورت گر ہے ۔ بیدل نے ان سب سے پہلے یہی کہا تھا :

مشو بر خویش داغِ تہمتِ غیر
کہ خود سیری و ہم خود صاحبِ سیر

طبیعت جوشِ تکراری ندارد
بجز تجدیدِ خود کاری ندارد

بیدل کے ان اشعار میں وہ تمام مطالب بڑی خوبی سے بیان کیے گئے ہیں جن کا ذکر جسپر کے حوالے سے ہوا ہے اور اگر یہ پتا چل جائے کہ جسپر نے بیدل کا مطالعہ کیا تھا تو میں کہوں گا اس نے بیدل سے استفادہ کیا ۔ الغرض یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ بیدل وجودیت کے ائمہ میں سے ہیں ۔ ان کا فلسفہ' حیات سر تا پا وجودیت ہے اور اس موضوع سے متعلق ان کے کلام میں بڑا قابل قدر اور بے حد بصیرت افروز مواد موجود ہے ۔ طاؤس کے التزام سے بیدل نے ان

۱۔ دیکھیں : ضمیر علی بدایونی کا مقالہ : 'اقبال وجودیوں کے درمیان' ۔ مطبوعہ ماہ نو ، بابت اپریل ۱۹۶۱ع ۔

مطالب کی طرف ان اشعار میں بھی اشارے کیے ہیں :

تماشا فرش راہ تست از آزادگی مگذر
کشاد بال چون طاؤس دارد نرگستانی

ہزار آئینہ حیرت در قفس کردست طاؤست
جہانی چشم بکشاید نو گر یک بال بکشائی

ہزار آئینہ چون طاؤس می خواہد تماشائیت
بقدر شوخی رنگی کہ داری چشم حیران شو

بہار ہستی اندار پر طاؤس می خواہد
بیک چشم کشودن سیرچندین چشم حیران کن

فسردن تابکی ای بی خبر گردی پر افشان کن
تو ہم داری بزیر بال طاؤسانہ نیرنگی

شوق طاؤس است بیدل بیضہ می باید شکست
صد در فردوست از یک عقدہ وا خواہد شدن

'بیضہ شکستن' سے مراد نقلی شخصیت کے پردوں کا دور کرنا ہے ، جس کا ذکر ارباب تصوف 'تزکیۂ نفس اور نفیِ ذات کی اصطلاحات کے ذریعے کیا کرتے ہیں ۔ 'بیضہ شکستن' کا محاورہ بیدل اور معنوں میں بھی استعمال کرتے ہیں ۔ بیضہ سے مراد وہ عدم بھی لیتے ہیں ۔ جس طرح کہ بیضہ کے اندر جو کچھ موجود ہے ہمیں بالکل معلوم نہیں ، اسی طرح عدم کے متعلق بھی ہماری معلومات بالکل ہیچ ہیں ۔ بیدل کہتے ہیں کہ جس طرح بیضہ ٹوٹنے سے طاؤس رعنا باہر نکلتا ہے اسی طرح کتمِ عدم سے جو شے باہر آتی ہے ، بے حد حسین و جمیل ہوتی ہے اور اس کے بے اندازہ خوش آئند امکانات ہوتے ہیں ۔ ہم جانتے ہیں اس دنیا کی ہر نیرنگی کتمِ عدم سے منصۂ شہود پر آئی ہے ۔ اس بنا پر بیدل عدم کو بے پناہ امکانات کا مخزن اور سرچشمہ خیال کرتے ہیں ۔ یاسیت پسند مفکرین کی طرح وہ مستقبل سے

مایوس میں بلکہ اس سے بڑی رنگین اور دل فریب توقعات وابستہ کرتے ہیں اور پُر امید ہیں کہ ہمیشہ اس کے پردوں میں سے نئی حیات افروز اور نظر پرور تخلیقات ظاہر ہوتی رہیں گی ۔ حکیم طالسطائی کہتا ہے کہ ہر ننھے منے بچے کی ولادت ہمیں خداوند تعالیٰ کے وجود کا یقین دلاتی ہے ۔ بداعت اور حسن تخلیق کے ان افکار کے سلسلے میں بیدل حکیم موصوف کے پیش رو ہیں :

عدم بان بے نشانی رنگ گلشنی داشت کز ہوایش
چو بال طاؤس ہر چہ دیدم ز بیضہ رست است گل بداماں

وہ کہتے ہیں کہ زندگی کو قید نہ سمجھو ، بلکہ یہ تو ایک عجیب و غریب عالم ہے ۔ اس کے عجائبات یک سر نگاہ تحسین سے دیکھنے کے قابل ہیں :

ای عدم آواز قید زندگی ہم عالمیست
بیضہ گر بشکست چون طاؤس رنگین کن قفس

فرماتے ہیں ، عدم سے اگر یہاں آئے ہو تو گھبراؤ نہیں ۔ ان رنگینیوں کو تو دیکھو جو تمہارے گرد و پیش موجود ہیں ۔ ایسی خوب‌صورت دنیا میں آئے ہو تو خوشی مناتی چاہیے تھی :

بگوشم از شبستان عدم آواز می‌آید
کہ چون طاؤس اگر از بیضہ وارستی چراغان کن

شبستان عدم میں دھرا ہی کیا تھا ، وہ تو قید محض تھی ۔ اب ایک حسین و جمیل دنیا میں آزادی کا سانس لے رہے ہیں ۔ بنابریں بیدل اس عالم کے حسن و جمال کا ذکر بڑے جوش سے کرتے ہیں :

درین صحرا کہ یک سر بال طاؤس است اجزایش
غباری گر بود بالد بہاں نیرنگ می‌جوشد

بیدل کے ان خیالات سے پتا چلتا ہے کہ ہندوستان میں رہتے ہوئے بھی انھوں نے ویدانت کا اثر قبول نہیں کیا تھا ۔ ہندو فلاسفہ اس عالم کو بے حقیقت سمجھتے ہیں لیکن بیدل اسے مادی اور معنوی لحاظ سے قدرت کا ایک ایسا عظیم کارنامہ تصور کرتے ہیں جو سرور ابام سے حسن خیر اور حسن پرور بنتا چلا جاتا ہے ۔ اسی طرح اگرچہ بیدل نے افلاطون کے افکار کا بنظر غائر مطالعہ کیا تھا لیکن وہ عالم امکان کی بجائے عالم اعیان کو اصل حقیقت نہیں سمجھتے تھے ۔

لفظ طاؤس کے واسطے سے بیدل نے اور مطالب بھی بیان کیے ہیں مگر وہ

بنیادی اہمیت نہیں رکھتے۔ بنابریں ہم انہیں چنداں در خور اعتنا نہیں سمجھتے۔ سطور بالا میں ہم نے دیکھا ہے کہ بیدل کو طاؤس کیوں پسند تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سارے بیان میں ہم نے ان کے جمالیاتی ذوق کا مطالعہ کیا ہے لیکن جس بات نے ہمیں سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ ہے کہ اپنے عہد کے تازہ گو شعرا کی طرح بیدل نے محض رنگین خیالی اور رنگین بیانی کو اپنا مطمع نظر نہ سمجھا بلکہ جس طرح ان کے ہم عصر معماروں نے ناتراشیدہ سنگ مرمر کے بطن سے تاج محل ایسا لازوال شاہکار نکال کر نگاہوں کے سامنے کھڑا کیا، اسی طرح انہوں نے بھی اپنی فطرت کی گہرائیوں میں ڈوب کر حسن و صداقت کا وہ گوہر آب‌دار نکالا جس نے فکر انسانی کی گراں مایگی میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ اطالوی ماہر جمالیات کروچے نے ذہن کے فقط سرور آمیز مشاہدۂ حسن ہی اپنی توجہات مرکوز کی تھیں۔ جمالیات میں اس طرح لاریب سرور انگیزی اور آسودگی احساس کو امتیازی درجہ حاصل ہو جاتا ہے مگر یہ نغمہ ہائے طاؤس و رباب کی اس طرب انگیزی کی طرح ہلاکت آفرین ہے جس کے اثرات بد بیدل نے اپنی زندگی کے اواخر میں دیکھ لیے تھے۔ بیدل حسن کے ساتھ خیر کو بھی لازمی سمجھتے تھے تاکہ ادب عالیہ کے ذریعے ذہن انسانی حیات آفریں انداز میں ڈھل جائے اور نوع انسانی اپنا سفر ارتقا جاری رکھ سکے۔ ان کا طاؤس اسی لیے ایک بیدار دل، ایک پاکیزہ باطن اور نہایت ہی حسین اور ہم آہنگ حقیقی شخصیت کی علامت ہے اور اسی لیے اس استعارے کی رنگینی سے کام لے کر انہوں نے بعض مسائل مبہمہ کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ بنابریں ہم کہہ سکتے ہیں کہ طاؤس بیدل تخت طاؤس سے بدرجہا زیادہ قیمتی ہے۔ تخت طاؤس صرف ایک بار اپنی رنگینی دکھا کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا مگر طاؤس بیدل کے حسن و جمال سے ہم اس وقت تک لطف اندوز ہوتے رہیں گے جب تک ادب زندہ ہے۔

(ادب لطیف، اپریل ۱۹۶۲ء)
نگار پاکستان، اگست ۱۹۶۲ء
بحوالہ" ادب لطیف)

(۷)

بیدل اور حُباب—ایک مطالعہ

یک غنچه به صد رنگ گل افشان حباب است

یکتائی او این قدرم ده دله دارد — بیدل

میرزا بیدل بڑے پُر گو شاعر تھے اور 'حباب' سے بڑی وابستگی رکھتے تھے اس لیے ان کے کلام میں لفظ 'حباب' سیکڑوں مقامات پر وارد ہوا ہے۔ کہیں تشبیہ کے طور پر موجود ہے، کہیں استعارہ بن کر نمودار ہوا ہے اور کہیں علامت بن کر ان کے تصورات کی نمائندگی کرتا ہے۔ کہیں اس کی کوئی حیثیت نمایاں ہے اور کہیں یہ کسی اور صورت میں جلوہ گر ہوا ہے۔ اپنے عہد کے تازہ گو شعرا کی طرح بیدل نے اس سے معنی آفرینی کا کام بھی لیا ہے اور اپنے مربوط مکتب خیال کی تشریح اور توضیح کے لیے بھی اسے استعمال کیا ہے۔ اس طرح 'حباب' عام معانی بھی بیان کرتا ہے اور حکمت و تصوف کے مطالب مبہم کی بھی وضاحت کرتا ہے۔ مسائل وجود، حقیقۃ الحقائق، کائنات، انسان، ان تمام موضوعات کے متعلق اس ایک لفظ کی بدولت ہمیں بیش بہا معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ بیدل نے اپنی فکر دقیقہ رس سے حباب کو اسرار و معارف کا گنجینہ بنا دیا ہے، اس لیے ہم اس دفتر رموز اور صحیفۂ اسرار کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتے ہیں۔

بیدل کے ایک شاگرد آنند رام مخلص لکھتے ہیں کہ انھیں تصوف میں بڑا غلو تھا اور وہ اسے تمام علوم سے برتر اور افضل سمجھتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں ان کا قلب احوالِ تصوف سے لبریز تھا وہاں ان کا دماغ افکارِ تصوف سے مالا مال تھا۔ صرف یہی نہیں کہ ائمۂ تصوف کے خیالات اور اولیائے کرام کے ملفوظات کا انھوں نے گہرے غور و فکر سے مطالعہ کیا تھا اور وہ ابن العربی،

غزالیؒ ، رومیؒ ، جامی ، شبلیؒ ، جنیدؒ ، اور بایزید بسطامیؒ وغیرہ بزرگوں کے افکار و خیالات سے پوری طرح آگاہ تھے ، بلکہ کسی نہ کسی صورت میں انھوں نے افلاطون اور ارسطو کی تصنیفات کا مطالعہ بھی دقت نظر سے کیا ہو تھا ۔ علاوہ بریں وہ ہندوؤں کے فلسفے سے بھی اچھی طرح آشنا تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں بیدل کا جذب کامل طبائع میں ہیجان پیدا کرتا ہے ، وہاں ان کے فکر کی پختگی حیرت زدہ کر دیتی ہے ۔ ان کے ہاں حباب خزینۂ اسرار اسی لیے بن گیا ہے ۔

بیدل کا حباب سے شغف کس طرح پیدا ہوا اور اس شغف نے مراحلِ ارتقا کس طرح طے کیے ؟ ان سوالات کا جواب دینا چنداں آسان نہیں ۔ البتہ ان کی بعض نظموں اور مثنویوں کے سال ہائے تصنیف ہمیں معلوم ہیں ـــــ اس طرح ہمیں معلوم ہو سکتا ہے کہ کس زمانے میں بیدل نے حباب کے متعلق واضح اور متعین نظریات قائم کیے ۔ اپنی مثنوی 'محیط اعظم' انھوں نے سن ۱۰۷۸ھ میں لکھی ۔ ان کی مثنوی 'طلسم حیرت' کا سال تصنیف ۱۰۸۰ھ ہے اور امیر خسرو کے جواب میں انھوں نے صنعت تمثیل کا استعمال کرتے ہوئے 'قصیدۂ سواد اعظم' ۱۰۸۲ھ میں لکھا ۔ ان کی تاریخ پیدائش ۱۰۵۴ھ ہے ؛ یعنی ان تین تصانیف کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہو سکتا ہے کہ اپنی عمر کے چوبیس سے اٹھائیس سالوں کے درمیان حباب ان کے لیے کیا معنوی حیثیت رکھتا تھا ۔ اس طرح حباب کے سلسلے میں ان کے خیالات کا ارتقا کسی نہ کسی حد تک ہمیں معلوم ہو جائے گا ۔

مطبعِ صفدری بمبئی کے کلیات بیدل میں سے مثنوی 'محیط اعظم' کی ورق گردانی سے پتا چلتا ہے کہ اس میں لفظ 'حباب' بارہ مقامات پر وارد ہوا ہے ۔ ان تمام مقامات کو سامنے رکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ بیدل 'حباب' کی گول ہیئت ، اس کی درخشندگی اور اس کے نازک اور حقیر وجود سے بڑے متاثر ہیں اور اس کی انھی صفات کو سامنے رکھ کر اپنے مطالب بیان کرتے چلے جاتے ہیں ۔ ایک جگہ مثنوی میں بہاریہ لکھتے ہوئے حباب کو پھول سے تشبیہ دی ہے اور اس کا جمالیاتی پہلو اجاگر کیا ہے ۔ کہتے ہیں :

خیابان گلزار شد جوی آب
کہ ہر موج شاخ گل است از حباب

اور ایک اور مقام پر ظہوری ترشیزی کے تتبع میں قسم کھاتے ہوئے

حباب کو آئینۂ وہم کہہ کر معنی آفرینی کرتے ہیں :

بشاطۂ عیش یعنی شراب
بہ آئینۂ وہم یعنی حباب

لیکن ان تمام مقامات پر کہیں بھی یہ گماں نہیں گزرتا کہ حباب بیدل کے لیے علامت کی حیثیت اختیار کر چکا ہے ۔ البتہ وحدت وجود کے بعض اہم مسائل[1] بیان کرتے ہوئے لفظ حباب کو بڑی خوبی کے ساتھ استعمال کیا ہے ۔ نقطۂ نگاہ کاملاً مابعدالطبیعیاتی ہے ۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ تصوف اور حکمت کے مطالعے اور صوفیائے کرام کی علمی مجلسوں سے استفادے کی بنا پر عہد شباب میں بیدل کا ذہن مابعدالطبیعیاتی مسائل سے معمور تھا ۔ بے چند و چون ، بے شبہ و نمون حق تعالیٰ کی ذات محض کا ذکر کرتے ہوئے ، یعنی اس احدیت کا بیان کرتے ہوئے جو قید اطلاق اور قید تنزیہ سے بھی مقدس و منزہ ہے ، فرماتے ہیں :

نہ ابروی موجش اشارہ فروش
نہ چشم حبابش تحیر بدوش

یہاں حباب سے مراد ذات کا اپنا اجمالی علم ہے جس کا تعلق مرتبۂ وحدت سے ہے ۔ آگے بڑھ کر بیدل جب یہ بیان کر رہے ہوتے ہیں کہ ذات کے لحاظ سے نہیں[2] بلکہ وجود کے اعتبار سے ہر چیز کی اصل ایک ہے ، تو عام صوفی مشرب شعرا کی طرح بحر اور حباب کا استعارہ استعمال کرتے ہیں :

ز یک بحر شد حلقہ زن بے حجاب
حباب و کف و گوہر و موج و آب

یہاں 'حباب و کف و گوہر و موج و آب' سے مقصود جملہ مراتب کونیہ اور مرتبۂ جامع یعنی حضرت انسان ہیں ۔ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ کسی قسم کے تغیر یا

۱۔ ان مسائل کے لیے دیکھیں میر ولی الدین کی کتاب : 'قرآن اور تصوف' صفحہ ۱۰۶ ، ۱۰۷ ۔

۲۔ ذات کے لحاظ سے متنائی اور مختلف ہونے کا فیصلہ بیدل نے مندرجہ ذیل شعر میں نہایت ہی واضح الفاظ میں کر دیا ہے :

چہ ممکن است رود داغ بندگی ز جبین
زمین فلک نشود و آدمی خدا نشود

تبدل یا تحول کے بغیر ذات مطلق اپنی جگہ پر قائم رہ کر صور مختلفہ میں ظہور پذیر ہوئی۔ یہ صوفیائے کرام کے نظریہ' تنزلات کا ذکر تھا جس کی تشریح کی یہاں گنجائش نہیں[1]۔

مقصد' تنزلات کا ذکر صوفیائے کرام اشعاع نور کے ذریعے بھی کرتے ہیں، اور اس نقطۂ نگاہ سے مثنوی 'محیط اعظم' کا وہ مقام بڑا دل چسپ ہے جہاں بیدل ذات حق کے انوار سے مختلف اشیاء کے استفادے اور استفاضے کی حقیقت اور نوعیت بیان کرتے ہیں اور بحر و حباب کا استعارہ جدید معنویت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ اشعار کی روانی اور جذبے کی گرمی دیدنی ہیں۔ فرماتے ہیں:

نماید چو خورشید در خانۂ او
ز شمعی فزون نیست انوار او
و لیکن بصحراست صاحب جلال
بود لازم ظرف نقص و کمال
بود فرق از ذرّہ تا آفتاب
کجا ساغر بحر و جام حباب

کہتے ہیں کہ سورج کی روشنی جب گھروں پر پڑتی ہے تو اتنی زیادہ چمک دمک نہیں دکھاتی۔ مکانات کے اندر تو صرف اس طرح معلوم ہوتا ہے جیسے ایک معمول سے چراغ کی وجہ سے کچھ اجالا سا ہو گیا لیکن کھلے میدانوں میں اسی سورج کی روشنی وہ چکاچوند پیدا کرتی ہے کہ دیکھا نہیں جاتا۔ تمام وسعتیں روشنی سے معمور ہو جاتی ہیں۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ میدانوں اور صحراؤں کا ظرف بڑا کشادہ ہوتا ہے اور اس کے مطابق کمال درجے کی روشنی وہاں موجود ہو جاتی ہے۔ لیکن مکانوں کا ظرف مختصر اور معمولی ہوتا ہے اس لیے معمولی سی روشنی حاصل کر سکتا ہے۔ استعداد اور اہلیت کے نقص کی وجہ سے حاصل کردہ نور کی مقدار بے حد کم ہو جاتی ہے۔ ایک ذرہ آخر آفتاب کے کس قدر انوار جذب کر سکے گا۔ حباب کے ننھے سے جام میں آخر پانی کے صرف ایک قطرے سے زیادہ اور کیا سما سکتا ہے۔ لیکن ساغر بحر اس قدر کشادہ اور

۱- اس غرض کے لیے ڈاکٹر میر ولی الدین کی تصنیف 'قرآن اور تصوف' کا مطالعہ کیا جائے۔

وسیع ہوتا ہے کہ عظیم ذخیرۂ آب بھی اس میں آسانی سے سما جاتا ہے

یہ لفظی معانی تھے لیکن استعارے کے ذریعے جن حقائق کو بیان کیا گیا ہے ان کی مناسب تشریح ضروری ہے ۔ آفتاب سے مراد ذات بحت ہے ۔ صحرا لامکان کی ناپیدا کنار وسعتوں کے لیے استعارہ ہے ۔ خانہ و ذرہ و حباب و کائنات کے مختلف مظاہر کے لیے استعارے ہیں ، جو لامکاں کی ابد کنار پہنائیوں میں حقیر وجودوں کی طرح موجود ہیں ۔ صوفیائے کرام نور کو عین ذات تسلیم کرتے ہیں ۔ ''اللہ نورالسمٰوات والارض'' کی آیات قرآنی صوفیائے کرام کے اس عقیدے کی تائید کرتی ہیں ۔ اب بیدل کہتے ہیں کہ ذات الٰہی کے انوار پنی پوری آب و تاب اور پوری درخشندگی اور کمال درجے کے اشراق کے ساتھ صرف لامکاں میں موجود ہیں ۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ افلاک اور موجودات نے ان انوار سے کسب فیض کیا ، لیکن اپنی تمام وسعتوں کے باوجود چوں کہ یہ تمام وجود لامکاں کے مقابلے میں بالکل حقیر ہیں اس لیے انھوں نے اس قدر کم نور حاصل کیا ہے کہ اسے اندھیرا کہنا یا کثافت سے تعبیر کرنا بجا ہے ۔ عالم فی الواقعہ وجود حق کے نور سے پیدا ہوا لیکن کائنات کی تمام اشیا نے صرف اپنی اپنی اہلیت کے مطابق نورِ اول سے استفادہ کیا ، مستشرقین کا خیال ہے کہ صوفیائے کرام نے یہ عقیدہ اسکندریہ کے فلاطینوس[1] سے اخذ کیا ہے ، جو کہتا ہے کہ ہستیِ مطلق نورِ مطلق ہے ۔ اس نور کا اشعاع ازلی ہے ۔ اس نور میں اپنے مرکز سے ہٹتے ہوئے درجہ بدرجہ تنزل ہوتا ہے ۔ ان تنزلات میں جو چیز مرکزِ نور سے اقرب ہے وہ نسبتاً افضل ہے اور جو چیز نور سے جتنی دور ہے وہ حقیقتِ ازلی سے اسی قدر مہجور ہے ۔ لیکن یہاں ہمارا مقصود اس نظریے پر بحث کرنا نہیں تھا ۔ ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ اپنی مثنوی 'محیط اعظم' میں بیدل نے حباب کے ذریعے کون سے حقائق بیان کیے ۔

اپنی دوسری مثنوی 'طلسم حیرت' میں بیدل بدستور حباب کی گول ہیئت سے متاثر دکھائی دیتے ہیں اور اس کی صفائی اور لطافت کے زیر نظر محبوب کے اعضاء کی خوبی اور دل کشی کا ذکر کرتے ہوئے معاً اس کی طرف متوجہ

۱۔ دیکھیے : حکمت رومی ، از خلیفہ عبدالحکیم ، صفحہ ۲۰۹ ۔ یہاں مناسب احتیاط کے ساتھ الفاظ بھی خلیفہ صاحب مرحوم کے استعمال کیے گئے ہیں ۔

ہو جاتے ہیں ۔ مثلاً شکم کی صفا خیزی کا ذکر کرتے ہوئے نقطہ حباب لاتے ہیں :

ز طوفان جوشِ موجِ صفا خیز
چو گوہر ساحلش از قعر لبریز
حبابش چشمِ حیرت آشنایان
کف از خود رفتن بے دست و پایان

اس کے بعد ناف کو حباب کہتے ہیں :

حبابی داشت از جوش شکر خواب
بچشم بستہ سیر عالم آب

یعنی ملائم اور نفیس شکم پر ناف اس طرح موجود تھی جیسے سطحِ آب پر خواب آلودہ نگاہوں والا حباب ہو ۔ اور لب :

ہجوم آرزوہا موج آبش
نشان بوسہ حسرت حبابش

ان اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ بیدل نے محبوب کا سراپا قلم بند کرتے ہوئے حباب کے طبعی حسن سے خوب کام لیا اور حباب کے معانی میں وسعت پیدا کردی ۔ لیکن اس مثنوی میں دل کے متعلق جو لاجواب مختصر سا قطعہ ہے اور جو حسنِ بیان و ندرتِ تشبیہ و استعارہ کی خوبی اور جوشِ جذبات کے لحاظ سے شعر کا معجزۂ فن کہلانے کا حق دار ہے ، حباب کی مدور پشت کے باعث اور بھی ریدہ معنی خیز بن گیا ہے :

چہ مضمون ها کہ لفظ دل ندارد
چہ لیلی ها کہ این محمل ندارد

ازین یک مشت گل غافل مباشید
ازین یک صفحہ دل غافل مباشید

بہ مشقِ امتیاز وا رسیدن
توان صد گلشن از یک غنچہ چیدن

حبابی باهمہ کم فرصتیہا
بچشم بستہ دارد غور دریا

شراری باوجود لیستی ساز
بروی خویش چشمی می کند باز

نفس تا راست گردد مہلتی است
مژہ تا برہم آید فرصتی ہست

بآن مہلت غنیمت وقف ذوق است
باین فرصت تماشا مفت شوق است

قطعہ' بدا میں دل کا ذکر کرتے ہوئے بیدل نے مدور حباب کی دو صفات بیان کی ہیں : ایک کم فرصتی اور دوسرے چشم بستہ غور دریا کرنا ۔ اس مثنوی میں شاعر کے دل میں حباب کی ان دو صفات کا زبردست احساس پایا جاتا ہے ۔ اسی لیے کم فرصتی کے سلسلے میں ایک جگہ 'دم سرد' کا ذکر ہے ، ایک جگہ 'غباری در نفس' کہہ کر 'آہی در نفس' سے تعبیر کرتے ہیں اور پھر جب اس حقیر وجود اور اس قدر مختصر مہلت حیات کے باوجود اسے ظاہری آنکھیں بند کر کے پوری طرح چشم تحیّر بن کر حقیقت دریا پر بڑی عمیق نگاہوں سے ایک صوفی کی مانند غور کرتے دیکھتے ہیں تو انہیں حباب اور صوفی سے ، حباب اور اپنے آپ سے ، بلکہ انہیں حباب اور تشنہ' حقیقت انسان سے بڑی مماثلت نظر آتی ہے ۔ انسان بھی تو حباب کی طرح بالکل بے مایہ ہے مگر جس طرح حباب اپنی ہیچ مقداری کے باوجود حقیقت دریا معلوم کرنے کے لیے ہر وقت آنکھ بند کر کے غور کرتا رہتا ہے ، انسان بھی حقیقت الحقائق کی کنہ معلوم کرنے کے لیے ہر آن محو فکر ہے ۔

اس تمام مماثلت و مطابقت کی بنا پر بیدل کے شعور میں ایک عجیب احساس جاگزیں ہو جاتا ہے ۔ حباب انہیں ان کی اپنی نمایندگی کرتا نظر آتا ہے اور انجام کار ان کے ذہن میں علامت بن کر ابھرتا ہے ۔ ظاہر ہے حباب کے سلسلے میں ہم بیدل کو مثنوی 'طلسم حیرت' میں ایک انقلابی موڑ پر دیکھتے ہیں اور اس نقطہ' نگاہ سے یہ مثنوی بے حد اہمیت رکھتی ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۲۶ سال کی عمر میں جب بیدل نے یہ مثنوی لکھی ، حباب ان کے لیے علامت کی حیثیت اختیار کر چکا تھا ۔ علامت کے طور پر حباب اس مثنوی کے مندرجہ ذیل اشعار میں موجود ہے :

بہ طوفان گاہ آشوب حوادث
نمی دانیم مارا چیست باعث

حبابم و صفائی سینہ نیست
نفس گرمی کشیم آئینہ نیست

یہاں حوادث عالم کے پر آشوب طوفان کے مقابلے میں حباب کی طرح انسان کی بے مقداری کا ذکر کیا ہے ، لیکن بیدل افسوس کرتے ہیں کہ اس لحاظ سے تو مماثلت حاصل ہے ، حباب کی طرح صفائیِ سینہ حاصل نہیں ۔ آگے چل کر کہتے ہیں :

حبابم رازی از عالم نہفتہ
نگاہی دارم و آنہم نہفتہ

یہاں اپنے آپ کو حباب کہتے ہیں اور اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ وہ ایک سربستہ راز ہیں ۔ اسی طرح مثنوی کے اختتام پر انسان کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں :

گدا طبعی وگرنہ شاہی از تست
وداعِ غفلتی آگاہی از تست
حبابت این قدر فرصت شمار است
وگرنہ بحر یک آغوش وار است

مندرجہ بالا آخری تین اشعار ایک عظیم حقیقت کی طرف انگشت نمائی کر رہے ہیں اور وہ یہ ہے کہ انسان اگرچہ بے حقیقی کے اعتبار سے حباب سے مماثلت رکھتا ہے لیکن پھر بھی ایک بہت بڑے راز کا حامل ہے اور اگر اپنی حقیقت سے آشنا ہو جائے تو وہ صاف طور پر دیکھ لے کہ موجودات کا اصل حکمراں وہ خود ہے ۔ حباب کو انسان کے لیے علامت قرار دینے کے باوجود اثبات ذات کا شدید احساس بیدل کا طرۂ امتیاز ہے ۔ اس طرح نظر آتا ہے کہ انسان کی بے مقداری اور اس کے ساتھ گراں مائیگی کے متعلق خیالات شروع ہی سے بیدل کے ذہن میں ایک حقیقت کے دو پہلوؤں کی حیثیت سے موجود تھے جیسا کہ مندرجہ ذیل مصرع سے ظاہر ہے ۔ اثبات ذات مثنوی 'طلسم حیرت' کا بنیادی خیال ہے ۔ انسان کو مخاطب کرکے بیدل کہتے ہیں :

تو باشی و تو باشی و تو باشی

اس مصرع نے اس بات کی تائید کر دی ہے کہ اس مثنوی میں لفظ حباب علامت کی حیثیت اختیار کرنے کے علاوہ اثبات کا آئینہ دار بھی بن چکا ہے ۔

جیسا کہ اشعار بالا سے ظاہر ہے ، حباب آن واحد میں آغوش بحر میں پہنچ کر موجودات کا حاکم بن جاتا ہے اور اس کی ہستی نئی عظمت اور مہابت[1] حاصل کر لیتی ہے -

'محیط اعظم' اور 'طلسم حیرت' میں حباب کے معنی جو جو پہلو اختیار کر چکے ہیں ان پر ہم نے غور کر لیا ہے - اب ہم 'قصیدۂ سواد اعظم' کو موضوع مطالعہ بناتے ہیں ، جو بیدل نے انھی زیر تبصرہ ایام میں لکھا - لفظ 'سواد اعظم' سے قصیدے کی تاریخ تصنیف ۱۰۸۲ھ برآمد ہوتی ہے - یہ قصیدہ بیدل کے خیالات میں ایک اور اہم انقلاب کا پتا دیتا ہے - جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا جا چکا ہے ، ابتدا میں بیدل کا دماغ متصوفانہ مابعدالطبیعیات کے مسائل سے معمور تھا - انھوں نے ۱۰۷۵ھ تک اپنی زندگی کے ابتدائی اکیس سال بہار اور اڑیسہ میں بڑے باکمال صوفیوں کی صحبت میں گزارے تھے - چوں کہ وہ علاقے شاہجہان آباد سے بہت دور تھے ، اور مغل دارالخلافہ کی برائیاں ادھر سرایت نہیں کرسکی تھیں ، اس لیے بیدل جب تک ان اطراف میں رہے ، انھوں نے شعر و شاعری کے علاوہ صرف علم تصوف کے علمی اور فکری پہلوؤں کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے رکھا اور مغل امرا اور باقی حکم ران طبقے کی اخلاق گراوٹ اور بے مغزی سے وہ آشنا نہ ہو سکے - وہ ۱۰۷۵ھ میں دہلی اور اکبرآباد کی طرف آئے - ۱۰۸۰ھ تک انھوں نے اپنی مذکورہ بالا دونوں مثنویاں لکھ لیں لیکن اس عرصے میں وہ پوری طرح ان بیماریوں سے باخبر نہیں ہوئے تھے جو مغل معاشرے کی تباہی اور بربادی کے سامان فراہم کر رہی تھیں - اس لیے ان کی یہ دونوں مثنویاں کلیتہً مسائل تصوف کو بیان کرتی تھیں - زندگی کے وسیع تر مطالعے کا پتا ان سے نہیں چلتا - ان مثنویوں میں ایک آدھ جگہ عدل کے فقدان کا ذکر ضرور موجود ہے ، مگر عام قاری اسے نظر انداز کر دیتا ہے ، لیکن معلوم ہوتا ہے بیدل نے ۱۰۸۲ھ تک اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ امور سلطنت میں تمام خرابیوں کی اصل وجہ یہ ہے کہ حکم ران طبقہ بے مغز ہے - ان کا دماغ حباب کی طرح بالکل خالی ہے ، اس لیے قصیدۂ 'سواد اعظم' میں کہتے ہیں ۔

۱- یہ موضوع تشنہ رہ گیا ہے - اس غرض کے لیے بیدل کے نظریۂ حیات پر مفصل بحث کی ضرورت ہے ، جس کا یہ موقع نہیں -

اعتبارات بزرگان جہاں ہیچ است و پوچ
چوں حباب این جا سر بے مغز صاحب افسر است

وہ اس شعر کے ذریعے اس حقیقت کو واشگاف طور پر بیان کر دینا چاہتے ہیں کہ ان حاکم لوگوں کی شان و شوکت بالکل ہیچ و پوچ ہے ۔ جس طرح حباب ہر لحاظ سے خالی ہونے کے باوجود سطح آب پر تاج جیسے نظر آتا ہے اسی طرح ہر بے مغز شخص یہاں صاحب افسر بن جاتا ہے ۔ یہاں سے اشعار کے ذریعے اپنے عہد کی تنقید کا رشتہ لفظ 'حباب' سے قائم کر دیتے ہیں اور ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ اس لفظ کو بہ تدریج زیادہ معنی خیز بناتے چلے جا رہے ہیں ۔ حباب والا ایک اور شعر بھی اس قصیدے میں موجود ہے ، مگر چوں کہ وہ شاعر کے خیالات میں کسی خاص بنیادی تغیر کی آئینہ داری نہیں کرتا اسے نظر انداز کیا جاتا ہے ۔

مذکرہ بالا تین تصنیفات نے واضح کر دیا ہے کہ ۲۸ سال کی عمر تک حباب کے سلسلے میں بیدل کے خیالات کون سا منہاج اختیار کر چکے تھے ۔ اس کے بعد انھوں نے دو اور مثنویاں تصنیف کیں ۔ 'طور معرفت' ۱۰۸۹ھ میں لکھی گئی اور 'عرفان' کا سال تصنیف ۱۱۲۴ھ ہے ۔ یعنی علی الترتیب ان کی عمر کے پینتالیسویں اور سترویں سالوں میں ، لہذا یہ دونوں شاعر کے ایام پختگی کے خیالات ظاہر کرتی ہیں ۔ اس لیے حباب کے سلسلے میں ان مثنویوں کے اشعار کا مطالعہ ان کی غزلیات کے اشعار کے ساتھ کرنا موزوں ہوگا ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تمام مثنویاں بیدل کے خیالات کی خوب توضیح کرتی ہیں اور فنی لحاظ سے ان کا درجہ بہت بلند ہے ۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اپنے موضوع ، خوش فصاحت ، گرم گرم جذبات ، حسن بیان ، معنی آفرینی اور رنگینیٔ خیال کے اعتبار سے ان کی مثنوی 'طور معرفت' تمام فارسی ادب میں بے نظیر ہے ۔ لیکن بیدل اپنے پورے کمال پر اپنی غزلیات میں نظر آتے ہیں اور وہ حقیقت میں ایک غزل گو شاعر ہیں ۔ انھوں نے قصائد و قطعات ، مثنویات و مخمسات ، ترکیب بند اور ترجیع بند اور رباعیات ان تمام اصناف شعر میں خوب زور قلم دکھایا اور اساتذۂ قدیم کی صف میں شامل ہو گئے ۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ ہمارے عہد میں تمام شعرا اپنا زور سخن غزل میں دکھا رہے ہیں ۔ میری معنی آفرینی کا کمال بھی غزل میں دیکھا جائے ۔ غنی کشمیری ، صائب اصفہانی ، ناصرعلی سرہندی ، بیدل کے معاصر

تھے اور یہ تمام غزل گو شعرا ہیں ۔ اس عہد کے تذکرے شاہد ہیں کہ دوسرے اور تیسرے درجے کے شعرا کا بھی یہی حال ہے ۔ وجہ غالباً یہ نظر آتی ہے کہ اورنگ زیب کے تدین نے قصیدہ گوئی کے لیے کوئی میدان نہیں چھوڑا تھا ، اس لیے بیدل کا عہد ، دورِ غزل ہے وہ ایک مقطع میں کہتے ہیں :

بیدل گہر نظم کسی راست کہ امروز
در بحر غزل زورق اندیشہ دواند

یہی وجہ ہے کہ ان کا بحرِ غزل اس طرح پھیلتا چلا گیا کہ انجام کار ناپیدا کنار ہو گیا ۔ اسی لیے محمد افضل سرخوش ایک ہم عصر معاصر ، بیدل کو بحرِ بے ساحل کہتے ہیں ۔ ان کے دیوانِ غزلیات کی مجموعی تعدادِ اشعار صحیح طور پر کسی کو معلوم نہیں ۔ ہاں ، ہند و پاک ، کابل اور وسط ایشیا اور یورپ اور برطانیہ میں موجود تصنیفاتِ بیدل کے تمام قلمی نسخے کسی طرح فراہم ہو سکیں تو ممکن ہے ہمیں ان کے اشعار کی مجموعی تعداد معلوم ہو جائے ۔ بہرحال ہم کسی نہ کسی حد تک حباب کے سلسلے میں بیدل کے خیالات کا ارتقا معلوم کر چکے ہیں ۔ اب ہم زیادہ تر ان کی غزلیات سے استفادہ کرکے اس دفتر نامی یعنی حباب کا مطالعہ کریں گے ۔ لیکن چوں کہ مثنوی 'طور معرفت' میں ہمارے موضوع سے متعلق بڑا قیمتی مواد موجود ہے اور اس بات کا مستحق ہے کہ اس پر علیحدہ غور کیا جائے ، ہم تھوڑی دیر کے لیے اس طرف متوجہ ہوتے ہیں ۔

مثنوی 'طور معرفت' کوہ بیراٹ واقع وسط ہند کی منظر کشی کرتی ہے ۔ برسات کا موسم تھا ، آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں ، بادل لگاتار برس رہے تھے ، چاروں طرف پانی ہی پانی تھا ۔ وفور آب ، حسین مناظر اور کوہستانی فضا سے بیدل بڑے متاثر ہوئے ، وہاں سیر و تفریح کے سلسلے میں جانے کا اتفاق ہوا تھا ۔ ان مناظر کو انھوں نے صرف دو روز میں بارہ سو اشعار پر مشتمل ایک مثنوی کی صورت میں بیان کیا ۔ خوب دل کھول کر معنی آفرینی کی اور صرف لفظ حباب کی معنویت میں بھی معتدبہ اضافہ کیا ۔ کوئی بارہ مقامات پر اس کا ذکر موجود ہے ، تحقیق کے دوران میں حبابات بہ تدریج زیادہ سے زیادہ پرجوش ہوتے چلے گئے ہیں ۔ ابتدا میں ہر چیز کا ذکر مقابلةً اجمال اور سادگی سے کیا ہے ۔ اسی لیے شروع میں حباب کے ساتھ تعلق رکھنے والا بھی صرف ایک

شعر کہا ۔ اس کے بعد ایک اور بڑا حقائق پرور شعر لکھا ، پھر موقع آیا تو دو شعر کہے ، پھر چار ۔ اب جذبۂ تحقیق میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو چکی تھی ۔ ایک شعر پر اکتفا نہ ہو سکتا تھا ۔ حتیٰ کہ وہ نوبت آ گئی جب وضع حباب کے متعلق اکیس شعر کا ایک قطعہ کہہ ڈالا ۔ چونکہ مطالب اور معانی کے لحاظ سے وہ قطعہ ایک خاص موضوع سے تعلق رکھتا ہے ، ہمارا مقصد صرف اس پر غور کرنا ہے ۔ مگر پہلے ہم ایک طائرانہ نگاہ اس بات پر ڈال لینا چاہتے ہیں کہ اس مثنوی میں حباب کو سامنے رکھ کر بیدل نے کس طرح معنی آفرینی کی ہے ۔

بیراٹ میں جوش باراں تھا ، موسمی ہوائیں چل رہی تھیں ۔ حباب کے ذریعے یوں منظر کشی کرتے ہیں :

دریں منزل کہ جز آب و ہوا نیست
کسی با آتش و خاک آشنا نیست
زمین و آسمانش یک حباب است
کہ ہرسو می خرامی باد و آبست

آگے چل کر کہتے ہیں کہ بیراٹ میں ان دنوں خاک نایاب ہے ، ہجر کی راتوں میں عاشق زار سر پر خاک کیسے ڈالے ۔ تیمم کرنا مطلوب ہو تو کیسے کیا جائے ۔ غبار تو مطلب نایاب کی طرح معلوم ہے اور اگر شہید عشق زندگی کو خیر باد کہہ دے تو اسے دفن کہاں کیا جائے :

شہیدی گر وداع زندگانی
شود آمادۂ خاک آشیانی
مہیا ساز تابوت از حبابش
بامید زمین بردہ بہ آبش

کہتے ہیں اس کا تابوت حباب سے بنایا جائے اور اس طرح زمین کی امید میں اسے سطح آب پر چھوڑ دیا جائے ۔ اس کے بعد کہتے ہیں عام رطوبت کی وجہ سے نقش پا بھی حباب بن چکا ہے ۔

دریں وادی کہ طوفانش اوج دارد
نہ تنہا جادہ حکم موج دارد

که این جا تا نشان پا حبابیست
برنگ چشم عاشق پر ز آبیست

یہاں تشبیہ کا لطف دیکھیں ۔ چند ایک مزید اشعار کے بعد کہتے ہیں کہ ابر باراں کی تاثیر بڑی معجز نما ہے ۔ چشم آہو بھی اس سے بیابان میں حباب بن جاتی ہے :

وگر سوی بیابان آورد رو
بجوشاند حباب از چشم آہو

اور ان بادلوں سے گرنے والے تمام بے شمار قطرے حباب بن کر ابھرتے ہیں :

دمی کاین قطرہا بر خاک ریزد
بہ سامان حباب از آب خیزد

ان تمام وجوہات کی بنا پر وادیٔ ہیراٹ میں جہاں بھی نگاہ پڑتی ہے حباب ہی حباب دکھائی دیتے ہیں ۔ لیکن یہ حباب معمولی شے نہیں ، ان میں سے ہر ایک جان پرور ہے ۔ یہ ہیراٹ کی آب و ہوا کی تاثیر ہے کہ ہر بلبلے سے عمر خضر نشو و نما پاتی ہے :

چنان جان پرور افتاد است آبش
که عمر خضر بالد از حبابش

چھوٹے چھوٹے وجودوں کے عظیم ممکنات کے متعلق معلوم ہوتا ہے ۔ بیدل کا اعتقاد اس نظریے پر مبنی ہے کہ انسان دیکھنے میں تو عالم اصغر ہے مگر حقیقت میں عالم اکبر ہے ۔ انہوں نے اس سے پہلے مثنوی 'محیط اعظم' میں محیط اور نم کے استعارے سے کام لیتے ہوئے انسان کے متعلق کہا تھا :

بہ معنی محیط و بصورت نمی

مختصر وجودوں کے متعلق اس اعتقاد کا اظہار بیدل کے متعدد اشعار سے ہوتا ہے ۔ جب کبھی وہ غور کرنے لگتے ہیں تو مناسب موقع پر اس اعتقاد میں بھی جنبش پیدا ہو جاتی ہے ، جو پھر کسی نہ کسی تشبیہ یا استعارے کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ یہاں بھی ابر و باراں کا ذکر کرتے ہوئے حباب کو عمر خضر کا ضامن بتایا ہے اور ساتھ ہی کہا ہے کہ جوش باراں نے تو ہر قطرے میں جان ڈال دی ہے اور یہاں کی ہر کف خاک اپنی آغوش میں ایک عالم لیے ہوئے ہے :

یقینم شد کہ در ہر قطرہ جاایست
نہان در ہر کف خاکی جہاایست

فرماتے ہیں معجب انگیز بات تو یہ ہے کہ اس پہاڑ کے سنگ ریزے بھی مینا کی طرح نازک ہیں اور جان رکھتے ہیں - یہ ہماری طبع درشت ہے جو حباب کو بھی سنگ پشت سمجھتی ہے :

سبک‌تر ران درین کہسار محمل
مبادا شیشہ را بشکنی دل
ز بس آئینہ‌ات طبع درشت است
حبابی را کہ بینی سنگ پشت است
تو جسم اندیش و اینجا غیر جان نیست
ہمہ میناست سنگی درمیان نیست

لطافتِ مزاج ، اسرار کی جن نزاکتوں تک رسائی حاصل کر سکتی ہے ، اُن کا بیان ان اشعار میں کمال نظر آتا ہے :

حباب کے ذریعے معنی آفرینی کا عالم ہم نے اس مثنوی میں دیکھ لیا۔ اب ہم وضعِ حباب کے متعلق مطولہ بالا قطعہ درج کرتے ہیں :

زہی وضعِ حبابِ بے سروپا
کہ حیرانی ز تقریر اوست پیدا

نفس در دامنِ دل پا شکستہ
نگہ با شرم عقدِ دیدہ بستہ

دل و ضبطِ نفس داماں و بالش
نگاہ و چشم تر روی و فقایش

اگر چشم است بر غیرش نظر نیست
وگر پا از خودش بیرون سفر نیست

چو ساغر پادشاہ عالم آب
کلاہ آرای ناز از وضع آداب

حیا چون چشم حسن آمیزش
خموشی ہمچو لب نقش نگینش

چو او نتوان صفای سینه دادن
نفس را صیقل آئینه دادن

نهفته از نفس آن سربسر چشم
پری در شیشه چون نظاره در چشم

نفس در آتش دزدیده زان رنگ
که رشکش سوخت آتش در دل سنگ

چراغش در کمین پاس ناموس
نفس دزدیده تر از وضع فانوس

سبکروحی وقار امتیازش
تهی از خود شدن سامان نازش

چنان بر آب دارد سیر تمکین
که گوئی بیضهٔ مرغابی است این

بهر آب از سبکساری روان است
تهی چون گشت کشتی بادبان است

بآن رنگش نزاکت نقش بسته است
که گر چشمی بهم مالد شکسته است

نگه از نازکی نگشوده مژگان
قدم از عاجزی نشکسته دامان

زمین گیری طلسم اشک آبی
مقیم گوشهٔ حیرت نگاهی

هوا صهبا ایاغی دل شکسته
نفس روغن چراغی شعله جسته

به فانوسش نفس می سوزد و بس
خیالی عشق می افروزد و بس

چو صبحش در نفس غیر از نفس نیست
ولی تا پر زند ساز نفس نیست

معمای چنین عالم ندارد
که تا پشکافت نامی هم ندارد

طلسم حیرتی گل کردہ از آب
جہان رنگ رنگ در جوش است درباب

ذرا توجہ سے دیکھا جائے تو صاف نظر آ جاتا ہے کہ بظاہر تو یہاں عام حباب کا ذکر کیا گیا ہے لیکن فی الحقیقت حباب کو علامت قرار دے کر بیدل صوفیِ باصفا کی صفات عالیہ بیان کر رہے ہیں ۔ اس کی وضع سے حیرت پیدا ہے جو ایک شیفتۂ ذات الٰہی صوفی کی صفت ہوا کرتی ہے ۔ پاسِ انفاس اس کا شعار ہے ۔ نگاہ شرم و حیا کی پابند ہے اور صرف الٰہی ذات کی حقیقت کا مشاہدہ کرتی رہتی ہے ۔ وضعِ آداب اختیار کر لینے کے باعث حباب خود صاحب ناز بن چکا ہے ۔ لب خاموش ہیں ، سینہ تمام آلائشوں سے پاک ہے ۔ صوفی کی طرح پاس ناموس فقر اس کا دستور ہے ۔ خود بینی اور خود پرستی کے تمام تقاضوں سے اپنے وجود کو بالکل تہی کر لیا ہے اور اس لیے بڑی سبک روحی اور بڑی سبک ساری اور بڑی تمکنت سے سطحِ آب پر رواں ہے ۔ ان صفات نے ان کی طبیعت میں حد درجہ کی نزاکت پیدا کر دی ہے ۔ علاوہ بریں فطرت میں سوز ہے اور بڑے عجز و نیاز سے اپنے محبوب کے خیال کی شمع روشن کر رکھی ہے ۔ سینے سے ہر وقت گرم گرم آہیں اٹھتی ہیں ۔ سرمایۂ حیات ایک نفس سے زیادہ نہیں مگر اپنی غیر معمولی صفات کی بنا پر ایک معمہ ہے ، طلسم حیرت ہے ۔

ظاہر ہے حباب چوں کہ صوفی کی پاکیزہ فطرت کا مکمل طور پر آئینہ دار ہے اس لیے بیدل کی نگاہوں میں معنویت سے لبریز علامت کی حیثیت اختیار کر گیا ۔ مندرجہ بالا قطعہ کے اواخر میں وہ پھر اسے بطور علامت اختیار کرتے ہیں :

مپرسید از تماشای حبابم
کہ من هم گر بخود اندیشم آبم

شبی کز گریہ طوفان کارم بود
حباب آئینۂ دلدارم بود

نفس در پردۂ دل آدمی ریخت
نگاہ از چشم حیران نالہ می ریخت

کہ ای غافل تو خود هم چشم مائی
ز وضع بے دلی بیدل چرائی

طرب با کی گرت اشک و آہست
سر بی مو درین عالم کلاہست

ان اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ حباب کس حد تک بیدل کے لیے آئینۂ دل داری تھا ۔ نیز ان اشعار سے بدستور سابق مترشح ہوتا ہے کہ حباب کو علامت قرار دینے کے باوجود اثبات ذات کا یقین کامل بیدل کے دل میں موجود تھا ۔

اس مقالے کا مقصد تصوف کی حمایت کرنا نہیں ۔ ہم کلام بیدل میں حباب کی فنی اور معنوی حیثیت کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ۔ لیکن چوں کہ حباب بیدل متصوفانہ تصورات اور خیالات کا نمائندہ ہے ، ہم ان افکار اور آراء کے متعلق قارئین کرام کو مثبت انداز فکر اختیار کرنے کی ترغیب دینے کے لیے تصوف کے ایک پہلو کا مجملاً ذکر کرتے ہیں جو نظروں سے ہمیشہ اوجھل رہا ہے ۔ اور وہ یہ ہے کہ اقدار اسلامی کی مشعل ہمیشہ تصوف نے روشن کی ۔ مطلق العنان بادشاہ اکثر و بیشتر جہاں گیری اور نفس پرستی کے درپے رہے ۔ علماء اور حکماء نے زیادہ تر نشر اسلام اور اس کے فکری پہلوؤں کو مورد توجہ سمجھا ۔ یہ صوفیائے کرام ہی تھے جنھوں نے اسلامی تعلیمات کی روح کو بڑی بلند نظری اور بے نفسی کے ساتھ اپنایا اور بڑے خلوص دل سے فقر بھی کو اپنا شعار زندگی قرار دیا ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شبلیؒ ، جنیدؒ ، غزالیؒ ، رومیؒ اور اس مبارک گروہ کے باقی تمام پاک نفس افراد اقدار اسلامی کے صحیح معنوں میں علم بردار بن گئے اور ان بزرگوں کا وجود اسلام کی صداقت اور حقانیت کا مجسم ثبوت بن کر نظر آتا رہا ۔

اس تصریح کے زیر نظر تصوف اپنی اصلی اور خالص صورت میں آج بھی اتنا ہی ضروری نظر آتا ہے جتنا کہ پہلے تھا ۔ نوع انسانی کے تمام امراض کا علاج زندگی کے متعلق صرف اس نظریے کے عملی طور پر اختیار کرنے سے ہو سکتا ہے جس پر صوفی بزرگ زور دیتے رہے ہیں ۔ خلائے آسمانی بے شک سمٹتا چلا جائے اور انسان ایک ستارے سے دوسرے[۱] تک پہونچتا رہے لیکن جب تک صورت حالات

۱۔ ایک ستارے سے دوسرے ستارے تک پرواز کرنا بھی بالکل محدود رہے گا ۔
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

یہ ہے کہ ہم ہر نئے ستارے کو اپنے دشمن کے خلاف ایک نیا محاذ بنانے کی سعی کرتے رہیں گے ، کس طرح ممکن ہے کہ یہ کائنات گہوارۂ امن و راحت بن سکے ۔ خود غرضی اور گھٹیا درجے کی حدبابیت جب تک موجود ہے سائنس کی محیرالعقول معجز نمائیوں کے متناسب بلکہ ان سے بھی زیادہ اخلاقی لحاظ سے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی ضرورت ہے ۔ صوفیائے کرام نے اسی لیے "از خود تہی شدن" اور تولید معنوی کی تعبیر دی ہے ۔ "وجودک ذنب" اسی لیے کہا گیا ہے اور یہ زندگی سے فرار ہرگز نہیں بلکہ زندگی کی حقیقی اور دائمی اقدار زندہ اور قائم رکھنے کے لیے ایک انتہا درجے کی مشت اور جرأت مندانہ کوشش ہے ۔ اعلیٰ اقدار

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

فلکیات کے ماہر خود تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کا چاند یا مریخ تک پہنچنا تو تصور میں آ سکتا ہے ۔ چاند زمین سے ۲۳۹۰۰۰ میل دور ہے اور خلائے آسمانی میں ہمارا قریب ترین ہمسایہ ہے ، جہاں آواز کی نسبت دس گنا رفتار سے پرواز کرکے ایک دن میں پہنچنا ممکن ہو سکتا ہے ۔ اور مریخ زمین سے ۰۰۰، ۰۰۰، ۳۵ میل سے ۰۰۰، ۰۰۰، ۶۳ میل کے درمیان دور رہتا ہے ، اور چاند کے علاوہ باقی اجرام فلکی کی نسبت زمین کے قریب‌تر ہے ۔ مندرجہ بالا رفتار پر پرواز کرکے وہاں چھ ماہ میں پہنچا جا سکتا ہے ۔ لیکن باقی تمام ستاروں اور سیاروں پر آواز کی بہ نسبت سو گنا رفتار سے پرواز کرکے دس ہزار سال میں بھی پہنچنا ممکن نہیں ۔ وہ زمین سے اس قدر دور ہیں !!!

روشنی کی رفتار ۰۰۰، ۱۸۶ میل فی سیکنڈ ہے ۔ بعض ستاروں کی روشنی اس حیرت انگیز رفتار سے سفر کرتی ہوئی زمین تک لاکھوں سالوں میں پہنچتی ہے ۔ طبیعیات کے ماہر روشنی کی رفتار سے انسان کا پرواز کرنا ناممکن بتاتے ہیں لیکن بفرض محال پرواز کی یہ رفتار ممکن بھی ہو جائے ، پھر بھی آسمانی بحر اخضر کے ان جزیروں میں پہنچنے کے لیے ابدی عمر بھتم سفر درکار ہے ، یعنی انسان کبھی بھی ستاروں کو پھاند کر فضائے لامکان میں نہیں جا سکتا ۔ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں علمائے اسلام ہمیشہ یہی کہتے چلے آئے ہیں ۔ اس مسئلے پر علمائے طبیعیات ان سے پوری طرح متفق ہیں ۔

کی مشعل کو فروزاں رکھا اور اس کے انوار سے اپنے وجود معنوی کے تمام اجزائے ترکیبی کو مستنیر کرتا کبھی فرار عن الحیات نہیں کہلا سکتا ۔ تذکرے شاہد ہیں ، صوفیائے کرام نے رہبانیت سے ہمیشہ کنارہ کشی اختیار کی ، لیکن تمام ارباب فن کی طرح اپنے مقاصد عالیہ کے حصول کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے انھوں نے کبھی بھی دریغ نہیں کیا ۔

ان ضمنی مگر ضروری تصریحات کے بعد اب ہم بیدل کی غزلیات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ۔ حباب بیدل ان کی غزلیات میں اس طمطراق سے موجود ہے اور اس نے اس آن بان سے اپنے ارد گرد معانی کا ایک عظیم ہجوم جمع کر لیا ہے کہ کیا کہنا ۔ چوں کہ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ پر مکمل ہوتا ہے اور ایک خیال اپنی تمام پہنائیوں کے باوجود تنگنائے شعر میں سما جاتا ہے ، علاوہ بریں بیدل کے ہاں خیالات کا ویسے بھی وفور ہے اور جب تک وہ اپنی شخصیت کو اپنے شعر میں منتقل نہیں کر لیتے مطمئن نہیں ہوتے ، اس لیے ان کی غزلیات میں ایسے اشعار کی بہتات ہے جو معانی اور مطالب سے لبریز ہیں ۔ فی الواقعہ وہ ان بلند پایہ شعرا میں سے ہیں جنھوں نے ابنائے جنس کو اعلی خیالات کا ایک ایسا ذخیرہ عطا کیا ہے جس میں باقاعدہ ربط و ضبط موجود ہے اور جس کی وجہ سے تہذیب و شائستگی کی سطح بلند سے بلند تر ہو گئی ہے ۔ اگر فکر بیدل کا تجزیہ اور احصا کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ انھوں نے حقائق کے تمام پہلوؤں کو لیا اور ذات محض سے لے کر ذرۂ ناچیز ، اور اعلی روحانی کمالات سے لے کر معمولی پیشہ ورانہ مشاغل تک ہر ایک پر بڑی بلند نظری سے بحث کی ۔ اسی بنا پر وسط ایشیا میں جہاں بیدل بے حد مقبول ہیں ، ان کے خیالات نے اشتراکی انقلاب میں بھی مثبت کردار انجام دیا ۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کا حباب اگر فوق السماء اپنی تابانی دکھاتا ہے تو تحت الثریٰ بھی جلوہ گر ہے ۔

بیدل کہتے ہیں کہ تمام مظاہر کی اصل ایک ہے ، ایک ہی وجود ہے جس کی وجہ سے دنیا میں سب کچھ موجود ہو گیا ۔ عدم محض میں یہ قابلیت کہاں کہ اس میں سے ایسی حسین و جمیل اور اتنی عظیم و جسیم کائنات پیدا ہو جائے ۔ یہ ساری ایک ہی وجود کی جلوہ گری ہے ۔ قطرہ ، موج اور حباب کو بحر سے جدا نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ تمام اشیا قائم بالذات نہیں ۔ اپنی ذات کے لحاظ سے ہیچ اور ناکارہ ہیں ۔ معمولی سی جنبش ان کا خاتمہ کر سکتی ہے ، مگر وجود

کے لحاظ سے انھیں بحر کے ساتھ عینیت حاصل ہے :

یکسر قطرہ و موج و حباب اگر ارسی
وجود ہیچ یکے از عین بحر نیست جدا

سرمایۂ حباب بغیر از محیط نیست
آب تو آب ما و ہوایت ہوای ما

ہر حباب و موج نتوان چید دام اعتبار
ہرچہ می‌آید دریں دریا فراہم رفتہ است

یہ تمام اشیاء کیسے وجود میں آ گئیں ؟ ذخیرۂ آب چشمۂ ازل میں موجود تھا ۔ وہاں سے جب رواں ہوا تو راستے کے نشیب و فراز کی وجہ سے موج و حباب و کف اس کی سطح پر نمودار ہو گئے :

آب ہر گہ ز چشمہ گشت رواں
کرد موج و حباب و کف ساماں

یہ 'مثنوی عرفاں' کا شعر ہے اور حیات وجودی کا ذکر کرتے ہوئے بیدل نے کہا ہے ۔ اس سے پہلے مثنوی 'محیط اعظم' کے وہ اشعار درج کیے جا چکے ہیں جن میں اشعاع نور کو تخلیق عالم کا سبب ظاہر کیا گیا تھا۔ جیسا کہ اس موقع پر بیان ہوا ہے ، تخلیق کی اس توجیہ کا مطلب یہ ہے کہ ایسے ازلی اور ابدی مرکز سے نور کے پھیلنے کے باعث درجہ بدرجہ تنزلات ہوتے چلے گئے ۔ بیدل نے یہاں صرف استعارہ تبدیل کیا ہے ورنہ حقیقت وہی ہے جو مثنوی 'محیط اعظم' میں بیان ہوئی تھی ۔

ہمارا موضوع مطالعہ صرف حباب ہے ، ہم ادھر ادھر صرف نظر نہیں کریں گے اور کوشش کریں گے کہ بڑے مربوط انداز میں بیدل کے افکار کو پیش کریں ، مگر چوں کہ حباب کو سامنے رکھ کر انھوں نے تمام جزئیات ترتیب نہیں دی تھیں اس لیے ممکن ہے بعض کڑیاں نظرانداز ہو جائیں ، تاہم بنیادی طور پر ان کے نظام فکر میں فرق نہیں آنے دیا جائے گا ۔ تخلیق کائنات کے مسئلے کو جاری رکھتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ 'صدائے کن' آج بلند نہیں ہوئی ۔ تخلیق کا سلسلہ کسی قریبی زمانے میں شروع نہیں ہوا بلکہ ازلی ہے ۔ خدا قدیم ، اس کی

صفات قدیم ، اس لیے تخلیق ازل سے ہو رہی ہے :

همریست که گرم است درین قلزم نیرنگ
از موج و حباب انجمن دور تسلسل

اس قلزم نیرنگ میں انجمن موج و حباب کا دور تسلسل ازل سے جاری ہے۔ حقیقتاً حقائق شروع سے اپنی نیرنگیاں دکھاتی رہی ہے اور دکھاتی چلی جائے گی۔ چوں کہ اشیاء اپنی ذات کے اعتبار سے حادث ہیں ، انھیں قدیم نہیں کہا جا سکتا۔ ذات خداوندی "الآن کما کان" موجود ہے۔ کسی قسم کا تغیر و تبدل اس میں رونما نہیں ہو سکتا مگر وہ خواہش نمود رکھتی ہے۔ اس لیے حادث اشیاء منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن چوں کہ مقصود اپنی نمود ہے اس لیے اس کی شان جلالی ان حادث اشیاء کو کچھ وقت گزرنے کے بعد باری باری ختم کر دیتی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا جلال وجود ان کے نیست ہونے سے ہی قائم رہتا ہے۔ اس لیے یہ امر محتاج تشریح نہیں کہ اس کی عظمت کے مقابلے میں گردوں بھی ہیچ ہے :

غرور ہستی او را تقاضای ماست دلیل
خم کلاہ محیط است در شکست حباب

نقد گردوں نیست غیر از اعتبارات خیال
چوں حباب این کاسۂ وہم از ہوا بالیدہ است

جس طرح حباب کی بالیدگی کا سبب صرف "ہوا" ہوا کرتی ہے۔ گردوں کا کاسۂ وہم بھی خیال کی پیداوار ہے۔ ذات الٰہی کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا جس نے گردوں کی صورت اختیار کر لی۔ یہاں افلاطون کے اعیان ثابتہ کی طرف اشارہ ہے۔ جب آسمان ایسے عظیم وجود کی یہ حیثیت ہے تو کم تر درجے کی اشیاء کا ذکر ہی فضول ہے۔ اسی لیے جو چیز بھی پیدا ہوتی ہے ذات الٰہی کے سامنے سرتاپا ادب و احترام بن کر آتی ہے۔ ادب گاہ محیط میں سے حباب باہر نکلتا ہے تو اسی لیے نفس گرفتہ ہوتا ہے :

ز احتیاط ادب گاہ این محیط مپرس
نفس گرفتہ برون آمدہ است حباب

بحر ہی سے موج و حباب پیدا ہوئے ۔ ''کل شیٔ یرجع الیٰ اصلہٗ'' کے مطابق انجام‌کار پھر حباب بحر میں پہنچ جائیں گے :

کجا داشت اشارت کہ سرکشی تا چند
بجنب بحر رجوع آورند موج و حباب

اناللہ و انا الیہ راجعون اسی لیے کہا گیا ہے ۔ مولانا رومی بھی فرماتے ہیں : ع
منزل ما کبریا است

اسلام نے توحید خداوندی پر زور دیا تھا ۔ دنیا کے لوگ شرک اور حلول کے مفسدے کا شکار ہو چکے تھے ، اس لیے اسلام نے بڑے جوش و انہاک سے خالص توحید کی تعلیم دی اور صرف ذات الٰہی کے معبود ہونے کا اعلان کیا ۔ چوں‌کہ اسلام عمل کو فکر پر ترجیح دیتا ہے اس لیے پیغمبر اسلام صلعم نے توحید کے فکری پہلو کی چنداں توضیح نہ فرمائی ۔ صرف حسب ضرورت عمل معنی‌خیز اشارے فرما دیے ، لیکن جب مسلمان اپنے مرکز سے باہر نکلے اور دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیل گئے تو انھیں دوسرے مذاہب کے علماء اور مفکرین سے واسطہ پڑا ۔ مسلمان اپنے عقیدۂ توحید کی تبلیغ اور اشاعت چاہتے تھے ، لیکن نئے حالات میں انھیں اس کی از سر نو تشکیل اور تدوین کی ضرورت محسوس ہوئی ۔ وہ علمی اور فکری لحاظ سے اپنے عقیدے کو غالب دیکھنا چاہتے تھے ، اس لیے آیات و احادیث سے استفادہ کرکے انھوں نے توحید کے بارے میں اُن تمام حیالات پر دل کھول کر بحث کی جو انھیں دوسری اقوام کے ہاں رائج ملے ، اور جہاں کہیں انھیں اسلام کے بنیادی تصوراتِ توحید سے ٹکراتی ہوئی کوئی چیز نظر نہ آئی ، انھوں نے ان آراء و افکار کو اپنا گم شدہ ورثہ سمجھ کر اخذ کر لیا ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم غزالی ، رومی اور بیدل کے ہاں دوسری اقوام کے فلسفہ و حکمت کے اثرات دیکھتے ہیں ۔ چناں چہ یہاں ہم نے دیکھا ہے کہ کس طرح بیدل نے بحر اور حباب کے استعارے سے کام لے کر توحید اور تخلیق کے بعض مسائل کو چھیڑا ہے اور کس طرح یونانی اور نوفلاطونی تصورات کو بھی استعمال کیا ہے ۔

بیدل نے کہا ہے کہ تمام کائنات اپنے وجود کے لیے ذات باری تعالیٰ کے قائم بالذات وجود کی مرہون منت ہے ۔ اور یہ انسان بھی جو بحر موجودات میں ایک حباب بن کر نمودار ہوا ہے ، اپنی متاع وجود کے لیے اسی ذات کا زیر بار احسان ہے ، ورنہ اس کی ابتدا بھی عدم اور انتہا بھی عدم ۔ اب جس ذات نے اسے

نیست سے ہست کیا ، اعلیٰ درجے کا ترقی یافتہ وجود عطا کیا اور کائنات کی تمام مخلوقات کو اس کی خدمت پر مامور کیا ، اس کا وہ فطری طور پر دل و جان سے والہ و شیدا ہے ۔ انسان کی اس بے پناہ شیفتگی کو دیکھ کر بیدل حیرت زدہ ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں :

کیفیت ہوای کہ دارد سر حباب
مارا ز ہوش برد می ساغر حباب

یہاں استعارہ علامت کے طور پر موجود ہے ۔ انسان کے لیے علامت بننے کے علاوہ حباب بیدل کے لیے عشق و محبت کا مظہر بھی بن جاتا ہے ، اس لیے کہتے ہیں کہ جام شراب سے اُٹھنے والا حباب ، حباب نہیں بلکہ عاشق وارفتہ کی چشم مشتاق ہے ، جو اے ساقی ازل ! تیرے حسن عالم آرا کو دیکھنے کے لیے وا ہوئی ہے :

ز نادانی حباب بادہ می‌نامند بے دردان
بدیدار تو چشم حیرتی کز جام می خیزد

حباب کی یہ حیثیت بیدل کی نگاہوں کے سامنے بار بار آتی ہے ۔ دو مزید شعر ملاحظہ ہوں :

امروز سواد خط آن لعل کہ دارد
عینک ز حباب است بچشم قدح مل
کیفیت لعل تو ز بس نشہ گداز است
در چشم حباب آئینہ دارد قدح مل

یہ حباب کے ذریعے آرزوے دیدار کا اظہار تھا ۔ کلام بیدل میں محبوب ازل سے عشق کے متعلق بے شمار اشعار موجود ہیں ۔ ہم صرف ایک اور نقل کرتے ہیں ، اگرچہ اس میں حباب موجود نہیں :

بلبل بہ نالہ حرف چمن را مفسّر است
یا رب زبان نکہت گل ترجمان کیست

یہاں شعریت کا لطف بیان سے باہر ہے ۔ دوسرا مصرع ختم ہوتا ہے تو سامعہ عشق و محبت کی ایک لطیف چاشنی سے سرشار ہو چکا ہوتا ہے ۔

بیدل کے ہاں عشق تکوینی حقیقت کے طور پر بھی نظر آتا ہے ۔ مگر یہاں اس موضوع کو زیر بحث لانے کا موقع نہیں ۔ ہم بہ دستور حباب کے متعلق

غور و فکر جاری رکھیں گے ۔ حباب اپنے سر میں ہوائے عشق رکھتا ہے ۔ اس ساغر میں جو شراب موجود ہے وہ ہوش ربا ہے ۔ اس کے دل میں ساقیِ ازل کے حسن جاں پرور کے دیدار کی بے تاب کن آرزو ہے ، اس لیے اس نے چشم حیرت کھول رکھی ہے اور عینک لگا کر چار سو نگراں ہے کہ کوئی ہے کہ جس کے لب ہائے رنگین کے گرد سواد خط اس قدر جاذب نظر ہو جس قدر کہ اس کے محبوب کا ہے ، لیکن اسے ایسا کوئی حسین دکھائی نہیں دیتا ۔ حسن ظاہر ، حسن باطن کیا ہے جو بے مثل انداز کے ساتھ محبوب ازل کے ہاں موجود نہیں ۔ لیکن اس تمام سوز عشق اور اس تمام درد و شوق کے باوجود عاشق تاب نظارہ نہیں لا سکتا ۔ انوارِ حسن کا اس قدر وفور ہے کہ سہی سی آنکھ کے پاس یارائے دیدار کہاں ۔ انوارِ حسن چاروں طرف محیط ہیں ۔ حباب واقعی اپنی آنکھ میں شوخی پیدا کرکے ان انوار کا احاطہ کرنا چاہتا ہے ، لیکن اس کی یہ سعیِ زبوں بھی نقاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے :

تو ای حباب چه یابی خبر ز حسن محیط
که چشم شوخ تو رنگ نقاب می ریزد

یہ لا ادریت کی صدائے دردناک ہے ۔ ایک اور شعر میں جو حباب کے بغیر ہے ، کہتے ہیں کہ حقیقۃ الحقائق ماورائے ادراک ہے :

با که باید گفت بیدل ماجرای آرزو
آنچه دل خواه منست از عالم ادراک نیست

لیکن جیسا کہ ظاہر ہے یہ ایک ملحد اور زندیق کی لا ادریت نہیں ۔ ایک عاشق جانباز کی لا ادریت ہے ، جو چشم حیرت آفریں سے مشاہدہ کرتے کرتے سیر نہیں ہوتا بلکہ حقیقت منتظرہ کی ہر تجلی جہاں اس کے لیے روح پرور ثابت ہوتی ہے وہاں اس کے دل میں شوق و آرزو کو بھی دہ چند کر دیتی ہے ۔ اس کی اصل ''ما عرفناک حق معرفتک'' ہے اور صدیق اکبر ایسے مومن کامل کے اس فقرے :

''العجز عن درک الادراک ادراک''

جو عجز کو نہایت ادراک کہتا ہے ، بے اپنا نسبی تعلق رکھتی ہے ، اسی لیے بیدل اپنے عقل و شعور کو بھی غفلت سے تعبیر کرتے ہیں اور بہ صد تاسف کہتے ہیں کہ یہ حباب آئینہ دل رکھنے کے باوجود بیدل ہے :

چیدہ ام بر خویش از غفلت بساط آگہی
این حباب آئینۂ دل دارد اما بیدل است

اور اسی حقیقت کے احساس کی بنا پر وہ وصال محبوب کے لیے طلب و جستجو کو بھی لاحاصل سمجھتے ہیں۔

من کیم تا در طلب چون موج برہنم کمر
یک نفس جای کہ دارم چون حبابم برلب است

توحید کے بعد بیدل کے ہاں سب سے زیادہ جاذب نظر شے انسان ہے اور انسان کی حقیقت اور کائنات میں اس کے مقام کے متعلق انہوں نے اس قدر اشعار کہے ہیں کہ ان کی حکمت پرور خیال آرائیوں کی بنا پر ایک مبسوط اور بے حد بصیرت افروز مقالہ قلم بند کیا جا سکتا ہے۔ حباب ان کے ہاں انسان کے لیے علامت کا کام دیتا ہے، اس لیے انسان کے متعلق بیدل کے تمام بنیادی افکار حباب کے ذریعے معلوم کیے جا سکتے ہیں، اور چوں کہ حباب بیدل کے افکار و تصورات کا نمایندہ ہے، اس کی تمام حیثیتیں بھی ضمناً یکے بعد دیگرے نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہیں۔ اس کا نازک وجود، لطیف لباس، اس کا ایک سانس کا محتاج ہونا، دریا اور اس کا تعلق، اس کی مدوّر ہیئت، اس کی مختلف چیزوں مثلاً آنکھ، تکمہ وغیرہ سے مشابہت اور پھر ایک عظیم وجود سے تعلق رکھنے کی بنا پر اس کے عظیم امکانات، یہ تمام باتیں ایک ایک کر کے مختلف پیرایہ ہائے بیان اور مختلف لفظی اور معنوی رعایات سے شاعر نے پیش کر دی ہیں اور جس طرح شعر زیب عنوان سے ظاہر ہوتا ہے انسان کے موضوع کے سلسلے میں حباب واقعی بہ صد رنگ گل افشاں ہے۔

انسان پر غور کرنے کے لیے ہم دو طریقے اختیار کر سکتے ہیں: ایک حقیقت مطلق کے سامنے اس کی حیثیت پر نظر دوڑانا ہے اور دوسرا کائنات کی نسبت سے اس کے مقام اور منصب پر فکر کرنا ہے۔ ویدانت نے اول الذکر طریقے پر زور دیا۔ چناں چہ اس کے نقطۂ نگاہ سے انسان لاشئے محض ہے اور فریب نظر سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ بیدل نے اس انداز فکر کو بھی اپنایا۔ ممکن ہے ان کے خیالات پر ویدانت کا بھی اثر ہوا ہو، کیوں کہ ہندو سادھوؤں کی شخصیت سے وہ بڑے متاثر نظر آتے ہیں اور کرشن مہاراج کی جنم بھومی یعنی متھرا کی محبت پرور فضا اور روایات سے انھیں بڑا لگاؤ ہے۔ علاوہ بریں

قصہ "مہا بھارت" انھیں تمام کا تمام ازبر تھا - لیکن ان کے خیالات زیادہ تر مسلمان صوفیوں کے فلسفہ" تنزلات سے اثر پذیر ہوئے جس کی رو سے صرف ایک وجود ظاہر اور باطن میں موجود ہے اور باقی جو کچھ ہے بے اصل ہے اور صرف عدم کی انفعالی صفت کا ظہور ہے - لہٰذا عیسیٰ عدم کا نعرہ بیدل اس زور کا لگاتے ہیں کہ اچھے بھلے صاحب فکر انسان ان کے متعلق مغالطے میں مبتلا ہو جاتے ہیں - اس کے ساتھ ہی صوفیائے کرام جب پستیوں سے بلندیوں کی طرف نگاہ لے جاتے ہیں تو انھیں انسان کا مقام اتنا بلند نظر آتا ہے کہ کوئی مفکر کہاں تک رسائی حاصل کرے گا - یہی وجہ ہے کہ ہمارے عارف کامل یعنی بیدل بھی عظمت انسان کے مسئلے میں یہ کہتے سنائی دیتے ہیں ع : حق ازو آشکار و او از حق

رمز : کوست فہمد کرشمہ" انسان

اب ہم مذکرہ بالا دونوں طریقے اختیار کر کے حباب بیدل کا مشاہدہ کرتے ہیں - لیکن خیال ہے کہ بنیادی طور پر یہ اسلامی انداز فکر سے متباین نہیں کیوں کہ اسلام کا مقصد وحید اثبات توحید اور اعلام مقام انسان تھا اور اس طریق فکر کا بھی انجام کار یہی حاصل ہے -

حقیقت حقہ کائنات اور ماورائے کائنات کی غیر محدود اور ناپیدا کنار فضائی میں اپنی ذات اور صفات کے ساتھ موجود ہے - اس کی شان مطلقیت جملہ مظاہر سے بے نیاز ہے - قرآن مجید اس کے متعلق کہتا ہے کہ "لیس کمثلہ شیئی" - صوفیائے کرام اس جاری اور ساری وجود کو بحر کہتے چلے آئے ہیں اور مظاہر کو موج و کف و حباب سے تعبیر کرتے رہے ہیں - جس طرح سطح آب پر یہ ساری چیزیں ظاہر ہوتی اور مٹتی رہتی ہیں اور دریائے بے پایاں بدستور موجود رہتا ہے ، اسی طرح خلائے لامتناہی کی فضاؤں میں اشیاء ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں اور کچھ مدت کے بعد پھر معدوم ہو جاتی ہیں - مظاہر کی حالت یہ ہے مگر ذات باری تعالیٰ ہر زوال اور ہر نقص سے پاک رہ کر "کل یوم ھو فی شان" کی صورت میں موجود رہتی ہے - صوفیائے کرام نے سمجھانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا ورنہ جو نسبت موج و حباب کو بحر سے ہے وہ مظاہر کو وجود باری تعالیٰ سے ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی - اس کی شان صمدیت ان تمام سے بے نیاز ہے - ان کا وجود اس کے جلال میں اضافہ نہیں کر سکتا اور ان کا معدوم ہونا اس کی جلالت شان

میں فرق پیدا نہیں کرتا ۔

بیدل بھی السان کے متعلق جب اس نقطۂ نگاہ سے غور کرتے ہیں تو اسے بالکل بے حقیقت پاتے ہیں ۔ جب حقیقی وجود محیط کا ہے ، حباب جس قدر منفعل ہو ، کم ہے :

ہر منفعل دمید حبابم درین محیط
جیم سری نداشت کہ باید برون کشید

ز بس کہ می برم افسوس ازین محیط ندامت
حباب آبلہ دارد چو موج سودن دستم

اس بحر میں دراصل حباب اور موج کا وجود ہی کوئی نہیں اور اس حقیقت کا اعلان بے تکلف کر دینا چاہیے :

بے تکلف نہ حبابیست درین بحر نہ موج
نقش بے حاصل ہست کہ زائل ہستند

اس ہمہ گیر محیط کے ہوتے ہوئے حباب و موج کیوں خودنمائی کریں ۔ اگر ان کا وجود ہے بھی تو وہ نہیں جو سمجھ لیا گیا ہے :

درین محیط حیا کن ز خود نمائی ہا
حباب و موج بہان نیستند اگر ہستند

حباب جب اس قدر بے حقیقت ہے تو اس شوخی اور طراری سے اسے سمندر کی سطح پر نمودار نہیں ہونا چاہیے :

حبابت ساغر و با بحر طوفان پیش می آئی
حذر کز یک نفس تنگی برون از خویش می آئی

اگر ایسے شوخ اور طرار حباب بہ تعداد کثیر سطح آب پر نمودار ہو جائیں تو شوکت دریا میں کیا اضافہ ہو جائے گا :

جوش حباب انجمن شوکت دریا نشود
ما ہمہ صیقل زدہ ایم آئینۂ بے جگری

سمجھ میں نہیں آتا کہ جب حباب کی یہ حیثیت تھی تو اسے ایجاد کیوں کیا گیا ۔ کاش کوئی دانش مند اس مشکل کو حل کرتا :

بحر ز ایجاد حباب آئینہ دار وہم کیست
بیدل ما مشکلی درپیش دارد ، حل کنید

اب انسان کو سمجھنے کی کوشش شروع ہوئی ہے ، لیکن یہ کوشش بے سود ہے ، کچھ حقیقت ہو تو سمجھ میں آئے :

نقد حباب بیدل از چنگ آگہی رہت
شد بوئہ گدازم چشمی کہ باز کردم

حباب سراسر کسوتِ عبرت ہے - بندِ قبا کھولا تو اندر کچھ نہ تھا :

زین کسوتِ عبرت کہ معمای حباب است
آخر اکشودیم بہ حر بند قبا ہیچ

انسان کی اصل عدم اور نیستی ہے - اس کی وضع قطع ہی اسے مائل بہ فنا دکھاتی ہے :

چون حباب از نیستی چشمی بہم آوردہ ایم
در خرابی خانہ ما سایہ دیوار داشت

کسی خیال چہ ہستی کند ز وضع حباب
شکافتہ است بنام عدم معایم

ز باغ تہمت عنقا گل بسر زدہ ایم
ہستی از عدم دیگر آمدہ است حباب

جب اصل انسان عدم اور نیستی ہے تو لاف ہستی کے کیا معنی ؟

یہ زندگی شبہ ہستی ہے ، تہمت ہستی ہے - کھوکھلے حباب کی طرف سے لاف ہستی بالکل فضول ہے - ذرا دم مارے گا تو فنا ہو جائے گا :

زندگی شبہ ہستی است کہ مانند حباب
ہر کہ ہست آئنہ پیش نفس می گیرد

در حرابات ظہورم نام ہستی تہمت
چون حباب جرم مینا بی نفس بالیدہ ام

ہیچ می آئی برون از لاف ہستی دم مزن
نیست بے عرض حباب ز قطرہ خندیدن در آب

زہست خویش مزن دم کہ در محیط ادب
حباب را نفس سرد خویش جلاد است

ای حباب بی‌خبر از لاف ہستی دم مزن
صرفہ کم دارد نفس را آن کہ آتش برسر است

حرابات ظہور میں نامِ ہستی کا تہمت ہونا اُس وقت بخوبی سمجھ میں آ جاتا ہے جب انسان اس بات پر غور کر لے کہ ہماری زمین مرکز افلاک نہیں۔ ایک ننھا سا کرہ ہے جو فضائے آسمانی کے لا تعداد اجرام کے درمیان ایک کونے میں موجود ہے۔ اجرام فلکی فی الحقیقت ریگِ صحرا سے بھی تعداد میں زیادہ ہیں اور اکثر و بیشتر اجرام ضخامت میں زمین سے بدرجہا بڑے ہیں۔ اب اگر ریت کے ایک باریک سے ذرے پر ایک خورد بینی وجود موجود ہو اور کوئی صاحب کہہ دے کہ اس کو پست کہنا ہستی پر تہمت ہے تو کون سی قابل اعتراض بات ہوگی۔ یہ تو صرف ایک مثال تھی۔ کائنات کے مظاہر عظیمہ کے مقابلے میں تو انسان اس سے بھی زیادہ حقیر ہے۔ کوپرنیکس (۱۵۴۳ع — ۱۴۷۳ع) نے جب سے زمین کی بجائے سورج کو مرکزی حیثیت عطا کی ہے، انسان جو کرۂ ارض کا باشندہ ہے، مفکرین کے نزدیک اپنی تکوینی حیثیت کھو بیٹھا ہے۔ ظاہر ہے یہاں ایک صوفی بھی آخر وہی بات کہہ رہا ہے جو ایک ماہر ریاضیات نے کہی تھی۔

بحر و حباب کے استعارے کو جاری رکھتے ہوئے بیدل نے انسان کو ایک اور لحاظ سے بھی بےحقیقت کہا ہے؟ کہتے ہیں کسی طرح ذرہ سی ہوا ایک بوند پانی میں داخل ہو گئی ور حباب بن گیا۔ یعنی حباب کا دار و مدار صرف ہوا پر ہے۔ اب جس چیز کا لباسِ ہستی ایک تارِ نفس پر مشتمل ہو اسے غرور کہاں راست آتا ہے۔ وہ لاف زنی کرے تو کیوں کرے۔ حباب کی طرح انسان بھی بالکل ہیچ پوچ سے لبریز ہے۔ اب آپ کی مرضی، اپنی اس حقیقت سے آشنا ہو کر آپ نوحہ خوانی کریں یا ترنم ریزی:

از ہوا برخاست بیدل خانۂ وہمِ حباب
در لباسِ ہستیِ ما جز نفس یک تار نیست

یک تامل وار ہم کم نیست سامان حباب
وای بر مغرور وسعی کز نفس خواہد دوام

نفس متاعی ندارد در چہ لاف زند
بغریبی مشکر لاغر آمدہ است حباب

لبریز گردہ اند بہ ہیچم حباب وار
بادست وقف ساغر اگر شیشہ بشکنم

ہوای بیش نتوان یافت از ساز حباب این جا
تو خواہی نوحہ کن خواہی ترنم دل ہمین دارد

نیم نفس کے لیے ہوا ہمارا تکمۂ گریبان بنی اور ہم موجود ہو گئے - ہماری جنس کی جب اس قدر کساد بازاری ہے تو ہم اپنے وجود کو قیمتی کیوں تصور کر لیں - سچی بات تو یہ ہے کہ ہم اس قدر نحیف اور کمزور ہیں کہ بار نفس کی وجہ سے آبلہ بدوش ہو چکے ہیں - جب یہ حالت ہو تو کوئی اور حسرت دل میں کیسے پیدا ہو :

حباب کسوتم از دست گاہ عجز مپرس
ہواست نیم نفس تکمۂ گریبانم

جنس ما باین کسادی قیمتی فہمیدہ است
چون حباب این کاسۂ وہم از ہوا بالیدہ است

بعرض جوہر طاقت درین محیط خموشم
کہ من ز بار نفس چون حباب آبلہ دوشم

چہ خیالست کشم حسرت دیگر چو حباب
من کہ از بار نفس آبلۂ دوش خودم

زیادہ غور و فکر کی ضرورت ہی نہیں ۔ خود حباب کی وضع قطع اس کی حقیقت بیان کر رہی ہے ۔ اسی لیے حباب اپنے آپ کو دیکھ کر حیران ہے :

پوشیدہ نیست صورت بنیاد زندگی
آئینہ بستہ اند بر بام و در حباب

چہ سازد گر بہ حیرانی نہ پردازد حباب من
زبس عریانم از خود کسوت آئینہ می پوشم

انسانی زندگی میں انفعالی صفات بھی بے حد ضروری ہیں ۔ وہ منکر جو جامعیت کا قائل ہے اور تمام حیات عمرانی کا مؤسس ہے ، انفعالی صفات کو کبھی نظرانداز نہیں کرتا ۔ بیدل کے فلسفۂ حیات میں اسی لیے فقر و فنا ، تسلیم و رضا عجز و انکسار اور ادب و تواضع کا اپنا خاص مقام ہے ۔ انھی استعاروں کے ذریعے بیدل نے ایک اور اہم اور پیچیدہ مسئلے کو بھی چھیڑا ہے اور وہ ہے مسئلۂ زمان ۔ سطور بالا سے ظاہر ہے کہ حقیقتِ مطلق کے سامنے موجودات ہیچ ہیں ۔ یعنی مکاں بالکل بے حقیقت ہے ، جو تمام کا تمام سمٹ کر فضائے لا متناہی میں ایک حقیر نقطے کی حیثیت اختیار کرتا دکھائی دیتا ہے ۔ ہمارے زمان کی بھی یہی حالت ہے ۔ اقبال کی زبان میں :

زماں ہے نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ

ہم نے چوں کہ صرف حباب کو مرکزِ خیال بنایا ہوا ہے ، ہم پوری وضاحت کے ساتھ بیدل کے نظریۂ زمان پر بحث نہیں کر سکتے ۔ تاہم حباب بھی اس قدر تو بتاتا ہے کہ بیدل مادی وجودوں کے زمان کو بالکل بے اصل اور ہیچ سمجھتے تھے ۔ مادی وجودوں کا زمان گردشِ افلاک کی پیداوار ہے جو خود مخلوق ہیں ، اس لیے مخلوق کی مخلوق کیا حقیقت رکھ سکتی ہے ۔ بیدل کے سامنے الوہی زمان کا تصور تھا ۔ جو ایک ایسی آن کی صورت میں موجود ہے جس کا آغاز ہے ، نہ انجام ۔ ازل اور ابد جس میں کہیں دکھائی ہی نہیں دیتے ، اس لیے انسانی سال و ماہ پر غور کرنا بیدل بالکل بےمعنی سمجھتے تھے :

وہم تا کی شمرد سال و مہ فرصت کار
شیشۂ ساعتِ موہوم حبابست این جا

ان کے نزدیک انسانی سال و ماہ ساعت موہوم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں سانس ختم ہوا تو ہمارے شہور[1] و سنین بھی ختم ہو گئے :

نفس شمار زمانیم تا نفس نزدن
همین شهور حباب و همین سنین حباب

یہ وقت کا عام تجربہ تھا ۔ ہر ایک کو معلوم ہے کہ دنیا میں انسان کو بہت کم فرصت ملی ہے بلکہ جو ملی ہے وہ بھی نہ ملنے کے برابر ہے :

به فرصتی که نداری امید مهلت چیست
درون بیضه برون پر بر آمده است حباب

عمر انسانی محض فریب نظر ہے ۔ جب اس کا وجود ہی کوئی نہیں ، اس کو محفوظ رکھنے کے لیے متردد ہونے کی کیا ضرورت ہے :

کو فرصتی که فکر سلامت کند کسی
آه از سواد کشتی بی‌لنگر حباب

یہ ایک لحاظ سے کم فرصتی کی شکایت بھی تھی ۔ کہتے ہیں نظارے عام تھے لیکن دیکھنے کی مہلت کم ملی ۔ اس احساس کے ذریعے زندگی یا اشک تر ان کے پہلو میں تڑپ لیتی دکھائی دیتی ہے :

حباب از حیرت کم فرصتی های زمان بیدل
نگاهی جانب دریا به پشت چشم تر دارد

اس لیے ذات مطلق کے سامنے زمان و مکان کی معدومیت کے باوجود زندگی بیدل کو عزیز نظر آتی ہے :

طرب پیام چه شوق الله قاصدان عدم
که جام بر کف و گل بر سر آمده است حباب

اس جدید احساس کی بنا پر ان کے دل میں حسرت نمود پیدا ہوتی ہے :

قانع بجام وهم از بزم نیستی کاش
قسمت کنند بر ما از یک حباب نیمی

اور انہیں کائنات کا وجود بھی حقیقی نظر آنے لگتا ہے :

۱- مہینے ۔

اگر بوادیِ امکان غبار پی آیست
ھجوم آبلہ ات از کجا دماند حباب

یہاں وہ اس موڑ پر پہنچ جاتے ہیں جہاں سے عظمت انسان کے روح پرور منظر ان کی نگاہوں کے سامنے آ کر انھیں 'پر آرزو بنا دیتے ہیں :

بہارِ آرزو در دل گلِ امید در دامن
بہر رنگی کہ می آیم چمن پرداز می آیم

اور حباب کی بے حقیقی میں ڈوب کر وہ اس طرح برآمد ہوتے ہیں کہ انسان کے بغیر انھیں کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا ۔

جہاں تک مفکرین کا تعلق ہے سب سے پہلے سوفسطائیوں نے انسان کو معزز اور محترم قرار دیا ۔ انھوں نے کہا کہ انسان مرکز کائنات ہے ۔ ان سے پہلے انسان کو عام اجزائے عالم میں سے ایک جزو شمار کیا جاتا تھا اور جہاں تک ادیان کا تعلق ہے ، سب سے پہلے زبور نے اس بات کا اعلان کیا کہ کرۂ ارض انسان کا ورثہ ہے ۔ ویدانت نے انسان کو فریب ادراک قرار دیا اور عیسائیت نے کہا کہ آدم کے گناہ کی وجہ سے انسان پیدائشی طور پر گناہ آلودہ ہے اور یہ ایسی آلودگی ہے جو کسی صورت میں دور نہیں ہو سکتی ۔ لیکن اسلام نے ''ولقد کرمنا بنی آدم'' کہہ کر نوع انسانی کو عزت و تکریم عطا کی اور تخلیق آدم کا قصہ بیان کرتے ہوئے قرآن کریم میں ''اسجدوا لآدم'' کا فرمان فرشتوں کے نام یاد دلا کر واضح کر دیا کہ نصب العینی انسان کے سامنے فرشتے بھی کم تر درجہ رکھتے ہیں ۔ نیز قرآن مجید نے اس آیۂ کریمہ کے ذریعے کہ ''سخر لکم ما فی السمٰوات والارض'' اس حقیقت کو الم نشرح کر دیا کہ زمین و آسمان تمام انسان کے لیے مسخر کر دیے گئے ہیں ۔ قرآن کریم نے غیر مبہم الفاظ میں یہ بھی کہا کہ انسان کو دنیا میں بہترین صلاحیتوں کے ساتھ بھیجا گیا ہے ۔ ''لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم'' اس ضمن میں سب سے بڑی دلیل ہے ۔ انسانی عزت و تکریم کے متعلق اور بھی آیات اور متعدد احادیث ہیں ، اس لیے اسلام ہی وہ مبارک مذہب ہے جس نے کائنات میں انسان کے بلند مقام کی توضیح و تصدیق کی ۔

چوں کہ صوفیائے کرام کی زندگی کا تار و پود قرآن اور حدیث کی تعلیمات سے تیار ہوا تھا ، اس لیے انسان کے متعلق غور کرتے ہوئے انھوں نے بنیادی حیثیت ہمیشہ قرآن اور حدیث کو دی ۔ چناں چہ بیدل بھی جب اپنی مثنوی

'محیط اعظم' کی تمہید لکھنا شروع کرتے ہیں تو کہتے ہیں :

''حمد ثناء آفرینی کہ میخانۂ حقیقت انسانی را از نشاء 'ولقد کرمنا بنی آدم' علوی معاشرہ بخشیدہ و پیمانۂ شہود جسمانی را بہ نسیم ''و نفخت فیہ من روحی'' لبریز صہبای ہستی گردانید۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ بنیادی طور پر انسان کے متعلق بیدل کے نظریات کا خمیر بھی اسلامی تعلیمات سے تیار ہوا تھا لیکن یہاں اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ انسانی تعظیم و تکریم کے متعلق بیدل کے احساسات اور خیالات کو ان کے عملی اور نظری تصوف سے بھی تقویت پہنچی اسی لیے انسان کے متعلق ان کے نظریات دوآتشہ نہیں بلکہ سہ آتشہ ہو کر نکلے ہیں۔ ہمارا موضوع مطالعہ بدستور صاحب بیدل ہے اور ہم اسی پر اپنی توجہات مرکوز کرکے انسانی عظمت کے متعلق ان کے خیالات کا جائزہ لیتے ہیں۔

عظیم مظاہر قدرت کے مقابلے میں انسان جب اپنے آپ کو دیکھتا ہے تو اپنا مختصر سا جسم اسے بے حد کوتاہ نظر آتا ہے، حتیٰ کہ سطح ارضی پر اس کے ساتھ رہنے والے دوسرے جانوروں میں سے بعض مثلاً اژدہا، ہاتھی، شیر وغیرہ اسے اپنے مقابلے میں جسمانی لحاظ سے بہ درجہا طاقتور نظر آتے ہیں اور ان کو دیکھ کر اس کے دل میں احساس کمتری پیدا ہوتا ہے۔ لیکن بیدل کہتے ہیں اپنے کمزور اور نازک وجود کو دیکھ کر گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسی وجود میں ایسی محیرالعقول صلاحیتیں پائی جاتی ہیں کہ ان سے کام لے کر انسان تمام مظاہر قدرت کو مسخر کر سکتا ہے، بلکہ اگر وہ اپنی ان صلاحیتوں کی تربیت کرے تو ان مظاہر کا مسخر کرنا اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا، یعنی ان کے بے انتہا کمالات کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ۔ اسی بنا پر وہ بہ صد افتخار فرماتے ہیں :

ہرچند چون حبابم بی دست گاہ قدرت
تسخیر عالم آب برگیست از کلاہم

یہ ردیف میم کا شعر ہے جس میں میمِ متکلم کے ذریعے شاعر کی 'انا' کو اپنے اظہار کے لیے بڑے مواقع ملتے ہیں۔ اسی لیے اس شعر کا دوسرا مصرع بڑا 'پُر زور' ہے اور اثبات ہستی کا پورے جوش و خروش کے ساتھ اظہار کر رہا ہے۔

عالم اور آدم کے اسی تعلق پر حاں آرائی کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ جسمانی لحاظ سے انسان کا کمزور ہونا تسلیم لیکن موجودات عالم میں سے کوئی بھی اس کا ہم پلہ نہیں ۔ کائنات نے ہزاروں کروٹیں لے کر اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ہزاروں جتنوں کے بعد انسان کو پیدا کیا ، یہی انسان فعل تخلیق کا اصلی ثمر ہے :

که دارد طاقت ہم چشمی طرف حباب می
محیط از خود تہی گردید تا بیدل بروں آمد

اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ بیدل نے یہ خیال سوفسطائیوں سے مستعار لیا ہے ۔ ممکن ہے کہ افلاطون اور ارسطو کے مطالعے کا یہ ثمرہ ہو ۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ حکماء سوفسطائیوں کے جانشیں تھے ۔ بہرحال یہ خیال بیدل کے ضمیر میں بڑی پختگی اختیار کر چکا ہے ۔ ایک رباعی میں فرماتے ہیں :

صد قطرہ و موج محو طوفاں گردد
کز دریا گوہری نمایاں گردد
فطرت عمری کند تگ و تاز ہوس
تا نقش ادیب ہند و انساں گردد

بیدل کا یہ بھی خیال ہے کہ جب تمام عالم بڑی شفقت اور محبت کے ساتھ تخلیق اور تربیت آدم کے لیے بیتاب ہے ، اگر اس میں کسی طرح آدم کا وجود نہ رہے تو قدرت کا یہ تمام کارخانہ معطل ہو کر خود بخود معدوم ہو جائے گا :

بے وجود ما ہمیں ہستی عدم خواہد شدن
تا درین آئینہ[1] پیدا ایم عالم عالم است

اسی ضمن میں حباب کے بجائے اس شعر کی طرح ایک اور شعر بھی پڑھ لیں ؛ ردیف میم کا ہے اور شاعر کا "انا" پورے جوش و خروش سے کارفرما ہے :

شور دو جہان آئینہ دار نفس ما است
نے لشکر ، نہ طوفاں ، نہ قیامت ، چہ بلائیم

ظاہر ہے بیدل کائنات میں انسان کو مرکزی حیثیت دے رہے ہیں ۔ ان کے

۱۔ بیدل کے ہاں صرف حباب ہی علامت نہیں بلکہ آئینہ بھی ہے اور ان کے علاوہ اور بھی کئی الفاظ کی یہی حیثیت ہے ۔

خیالات کے مطابق تمام کائنات انسان کے گرد گھوم رہی ہے ۔ لیکن کوپرنیکس کے زمانۂ حال کے پیرو کار ایک مغربی مفکر برٹرینڈرسل کا خیال بیدل کے بالکل خلاف ہے ۔ رسل کائنات کو ایک ایسی متحرک مشین تسلیم کرتے ہیں جس کے قوانین ابدی ہیں اور جن میں انسانی اقدار کے لیے کوئی گنجائش نہیں ۔ انسان اگر ختم بھی ہو جائے تو پھر بھی کارخانۂ عالم کی حرکت پورے زور و شور سے بدستور جاری رہے گی ۔ ادنیٰ تامل سے واضح ہو جاتا ہے کہ رسل کا تفکر خالصۃً ریاضیاتی ہے اور فکر بیدل کو اس لیے برتری حاصل ہے کہ اس میں کشف و وجدان بھی پوری طرح کارفرما ہیں ۔ اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ خود رسل کی زندگی میں آج کل ان کے ہم مشرب ریاضیات اور طبیعیات کے ماہرین خلائے آسمانی میں دور دور تک رسائی حاصل کرکے اور چاند پر کمند ڈال کر انسان کے عجز مطلق کے مقابلے میں اختیار مطلق کا پرچار کر رہے ہیں ، یعنی کائنات میں انسان کی اہمیت اور عظمت کے قائل ہو رہے ہیں ۔

آدم اور عالم کے سلسلے میں بیدل ایک قدم آگے بھی بڑھتے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ انسان معنوی لحاظ سے اپنے اندر اس قدر وسعتیں رکھتا ہے کہ اس کا اس مختصر سے عالم میں سمانا ممکن نہیں ۔ اس لیے انسان کے لیے یہ فضائیں ایک قفس کی حیثیت رکھتی ہیں جس میں پرندے کی طرح پر سکیڑ کر بیٹھنا پڑتا ہے ۔ اس کا غنچے کی صورت اختیار کرکے بیٹھے رہنا مکان کی تنگی کی وجہ سے ہے ۔ اگر اس غنچے کو پوری طرح کھلنے کا موقع مل جاتا تو اس کا حسن و جمال دیدنی ہوتا :

بہ فشار تنگی این قفس چو حباب غنچہ نشستہ ام
پر صبح می کشم از بغل ہمہ گر نفس بہ ہوا رسد

اور ایک اور شعر میں کہتے ہیں بالیدگی کا وہ عالم ہے کہ نُہ انجمن افلاک میں سما نہیں سکتا :

نالہ ام اما نمی گنجم درین نُہ انجمن
یارب این مقدار دریا و چہ کس بالیدہ ام

اس لیے کہتے ہیں کہ جب میں نے اپنے لیے اس دنیا کو تنگ پایا تو دامن افشاں ہو کر لامکاں میں پہنچ گیا :

عرصہ آزادی از جوش غبارم تنگ بود
برسر خود دامنی افشاندم و صحرا شدم

بیدل یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ عزت و تکریم اور بالیدگی کے یہ انعامات تمام نوع انسانی کے لیے عام ہیں ۔ اگر کوئی فرد محروم ہے تو اس کے اپنے نصیب ۔ اس نے بحر کرم میں حباب کی طرح خود اپنے ساغر کو نگوں کر دیا ۔

مکن ز خوان کرم شکوه گر نصیبت نیست
کہ در محیط نگوں ساغر آمده است حباب

انسان کی اس تعظیم و تکریم کا سبب بتاتے ہوئے بیدل کہتے ہیں :

آئینہ عالم بقایم همہ
نیرنگ جہان کبریایم همہ
گو موج و چہ گرداب ، چہ دریا ، چہ حباب
هر جانم جلوهٔ ایست مایم همہ

ان کا عقیدہ ہے کہ انسان عالم بقا کا آئینہ ہے ۔ ذات مطلق نے اپنا مشاہدہ کرنے کے لیے اسی آئینے کو منتخب کیا ، لہٰذا انسان جہان کبریا کا بہت بڑا اعجاز ہے ، ذات احد کی کبریائی انسان ہی سے ظاہر ہوتی ہے ۔ یعنی انسان کی تخلیق کا مقصد صرف خود نمائی تھا ، اس لیے یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ مقصود تخلیق فقط انسان تھا ۔ باقی جو کچھ موجود ہے ضمنی حیثیت رکھتا ہے ۔ زمین و آسمان ، چاند ستارے ، شجر و حجر ہر چیز سے صرف انسان کی عظمت ظاہر ہوتی ہے ۔ دوسرے الفاظ میں یہ سارے انسان کے اپنے جلوے ہیں ۔ تخلیق کی اسی نوعیت کو سامنے رکھ کر وہ کہتے ہیں :

ہر چند ہستی۔ من بی مغزی حباب است
دریا سری ندارد جز در تہ کلاهم

دریا یعنی کائنات کا وجود ہی نہ ہوتا اگر اس پر انسان کا سایۂ شفقت نہ پڑتا ۔ انسان کے مقصد تخلیق اور کائنات میں اس کی حیثیت کے زیر نظر وہ کہتے ہیں کہ ہستی انسان تو انمول چیز ہے ۔ اس کا غبار ہستی بھی اس قدر قیمتی ہے کہ بے مایہ اشیاء کو حسن اور رنگینی عطا کر دیتا ہے :

اگر بہ دریا سایہ اندازد غبار ہستیم
از نفس چون فلس ماہی رنگ می بندد حباب

بیدل اسی لیے اسرارِ انسانی کے مطالعے کی دعوت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان کو دیکھو گے تو محبوبِ ازل کے جلوے نگاہوں کے سامنے آ جائیں گے۔ محبوبِ ازل کو انسان نے زیرِ بغل لیا ہوا ہے۔ اپنے غیر متناہی جلوؤں کے باوجود وہ قلبِ انسانی میں سمایا ہوا ہے، یعنی بحر حبیبِ حباب میں موجود ہے:

حباب این محیطم سعت دیدن باست اسرارم
پری زیر بغل می کردم از مینای عسوسی

تا بہ رنگش وارسی از نقش ما غافل مباش
بحر در جیبِ حباب این جا نفس دزدیده است

محبوبِ ازل کے اس قرب کو سامنے رکھ کر بیدل کہتے ہیں کہ ہماری شوخ نگاہوں نے ادھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا اور مہجوری پیدا ہو گئی، ورنہ یہاں تو وصال ہی وصال تھا۔ ہمارا ذہن مقاصد کی گویا گوئی میں اپنے حقیقی مقصد کو نظرانداز کر دیتا ہے، حالانکہ اس کا حصول بے حد سہل تھا:

بیدل ز شوخ چشمی خود در محیطِ وصل
داریم چون حباب ز سر تا بپا نقاب

عظمتِ انسان کے سلسلے میں بیدل کے خیالات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم اس مقام پر پہنچ چکے ہیں جو بے حد نازک ہے۔ جہاں فکر کے پر جلتے ہیں، جہاں تصور اظہارِ عجز کرتا ہے اور حس کے متعلق دم زنی کرنا تختۂ دار پر آویزاں کراتا ہے۔ یعنی اس مقام پر پہنچ کر سالک کو دوئی کا تصور ہی نہیں آتا۔ عبد اور معبود، عاشق اور معشوق، بندے اور خدا میں بالکل وحدت ہوتی ہے:

تماشای دو رنگی بر نمی دارد حباب من
نظر تا بر تو وا کردم ز چشم خویش بیرونم

اور بندہ نشۂ وحدت سے اس طرح سرشار ہوتا ہے کہ اسے اور کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ دراصل فلسفۂ تنزلات کی رو سے وجود کے لحاظ سے خالق اور مخلوق میں کوئی فرق نہیں۔ ذات کے لحاظ سے ایک باقی دوسرا فانی، ایک قدیم دوسرا حادث، ایک واجب الوجود دوسرا ممکن الوجود، ایک قائم بالذات دوسرا ادنیٰ سی بات کے لیے محتاجِ غیر۔ اب ذرا راز تخلیق بھی سنیے! جب ذاتِ بحت کو ظہور منظور ہوا تو مخلوقات پہلے صورِ علمی کی صورت میں ارادۂ الٰہی میں نمودار ہوئیں۔

پھر چوں کہ عدم محض سے کوئی چیز پیدا نہیں ہو سکتی ۔ حق معنوی کی تجلی یا تمثیل سے صور علمی اپنے اقتضائے ذاتی کے مطابق صفت وجود سے بہرہ یاب ہوئیں ۔ حق و خلق کی اسی رمز کے متعلق بیدل کہتے ہیں :

ہر گاہ کہ غنچہ گشت شگفت حباب
رمز حق و خلق ہیچ نہ نہفت حباب
لیکن نہ شنید موج سرگشتۂ ما
آن حرف کہ پوست کندہ گفت حباب

ہماری بے شعوری ہمیں حقیقت سے آشنا نہیں ہونے دیتی ، ورنہ خالق اور مخلوق میں وجود کے اعتبار سے عینیت پائی جاتی ہے ۔ حباب کا پوست اتر جائے تو وہ بحر ہی ہوتا ہے ۔ ہم بھی اپنا ظاہری وجود ترک کر دیں تو حق سے وحدت از خود آشکارا ہو جائے گی :

غیر دریا چیست افسون مایۂ ناز حباب
می دوم پیراہم بر خود ز بس بالیدہ ام

اس وحدت کے زیر نظر معنوی لحاظ سے انسان حقیقت بے رنگ ہے ۔ یہ تو صورت اظہار ہے ، جس نے اسے کثافتوں سے ملوث کر دیا ۔

معنیم اجزای بیرنگ است بیدل چون حباب
این کلہا شوخی اظہار دارد خامہ ام

بہرین آئینۂ ہستی عجیب و غریب نزاکت رکھتا ہے ۔ آپ ذرا نگاہ ڈالیں گے تو اس کا یہ وجود آنکھوں کے سامنے تحلیل ہو کر معدوم ہو جائے گا اور پھر یہ اپنی آب و تاب لامکاں میں دکھانے لگے گا :

نزاکتیست در آئینہ خانۂ ہستی
کہ چون حباب ہوای نظر نمی تابد

اس لیے یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ حقیقت بے رنگ خود اپنی آنکھوں سے اپنے آپ کو مظاہر کی صورت میں دیکھ رہی ہے :

چون حباب آن‌دم کہ سیر آہنگ این دریا شدم
در گشاد پردۂ چشم از سر خود واشدم

اسی بنا پر سالک سر تا پا حیرت بن کر نگران ہے کہ ان مظاہر کے

ذریعے کون سی حقیقت پنہاں ، عریاں ہو رہی ہے :

چون حباب از پیکر حیرت سرشت ما مپرس
نقش ما یک پردہ عریان است پنہاں زیر پوست

تکریم انسانی کے سلسلے میں یہ نقطہ عروج تھا ۔ اب ہم مختصر الفاظ میں انسان کے اس معنوی حاسے کا ذکر کرتے ہیں جسے اصطلاح عام میں دل کہا جاتا ہے ۔ اس سے مراد وہ باطنی حاسہ ادارک ہے جسے محسوسات اور معقولات پر برتری حاصل ہوتی ہے اور جو حقائق کا ادراک بدرجہ اولی کرتا ہے ۔ صوفیائے کرام ، شعرا ، حکمٰا ، تمام اس کی اہمیت کے قائل ہیں ۔ برگساں اسے عقل برتر کا نام دیتا ہے اس لیے کہ عقل کے ذریعے حقیقت کا ادراک تحلیل اور تدلیل کے طویل مراحل طے کرنے کے بعد ہوتا ہے ۔ لیکن دل یا قلب حقیقت تک اپنی باطنی آنکھ کے ذریعے آناً فاناً رسائی حاصل کر لیتا ہے ۔ اپنے باطن کو ہر قسم کی کثافتوں سے پاک کرکے صوفیائے کرام ایک جام جہاں نما کے مالک بن جاتے ہیں جس میں حقائق اشیا برابر منعکس ہوتے رہتے ہیں ۔ یہی کشف اور وجدان ہے ۔ انبیاء چوں کہ نہایت ہی ذکی الحس اور لطیف مزاج ہوتے ہیں ، ان کے قلب میں دقیق سے دقیق اور بعید سے بعید حقائق کا انعکاس بڑی وضاحت سے ہوتا رہتا ہے ۔ اس درجے پر پہنچ کر یہ حاسہ ادراک وحی اور الہام کہلاتا ہے ۔ اب چوں کہ حدیث کنز[1] کے مطابق تخلیق کا مقصد عرفان الٰہی ہے اور قلب ہی وہ آلہ لطیف ہے جس کے ذریعے عرفان حاصل ہوتا ہے ، ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمام ہنگامہ عالم اسی قلب یا عام الفاظ میں صرف قطرہ دل کے لیے بپا کیا گیا ۔ بیدل کہتے ہیں :

مدعا دل بود اگر نیرنگ امکان ریختند
بہر این یک قطرہ خون صد رنگ طوفان ریختند

اس رئیس الاعضا کے لیے بھی بیدل حباب کا اپنا محبوب استعارہ استعمال کرتے ہیں ۔ حباب اپنی لطافت ، نظافت اور درخشندگی کی بنا پر جام جہاں نما نظر آتا ہے ۔ بنابریں اسے قلب صوفی سے تشبیہ دینا بےحد موزوں ہے اور اسی بنا پر یہ اس کے لیے استعارہ اور علامت کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے ۔ بیدل

۱۔ کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق ۔

کہتے ہیں ۔ چوں کہ قلب لطیف لطیف اسرار کا مہبط ہے اس لیے اس کی کارگاہ میں سر تا پا ادب بن کر رہنا چاہیے اور سانس لیتے ہوئے بھی بڑی احتیاط برتنی چاہیے ، مبادا کوئی سر لطیف و نازک بھاری کسی معمولی سی جنبش سے رک کر دل پر اترنے نہ پائے اور دل کا تمام کارخانہ بکھر جائے ۔

در کارگاہ دل ہمہ ادب باش و دم مزن
پر نازک است صنعت میناگر حباب

دل کی دنیا عجیب معجز نما ہے ۔ اس کی سیر کے ارادے سے اگر آپ ذرا سربگریباں ہوں تو حقیقت حقہ کی تجلیات سامنے دکھائی دیں گی ۔ آپ اپنے کو آغوش یار میں پائیں گے :

ز سیر عالم دل غافلیم ورنہ حباب
سری اگر بگریبان فرو برد دریاست

یہ در اصل عظمت انسانی کی کرشمہ سازی ہے کہ پیکر انسانی کے ذرے ذرے سے تعمیر دل ہوتی ہے :

موج برہم خوردہ دارد عرض سامان حباب
می توان تعمیر دل کرد از شکست پیکرم

آپ نے دیکھا ایک طرف انسان کی عظمت و جلال کا یہ عالم ہے اور دوسری طرف بیدل عدم پر بڑا زور دیتے ہیں ۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے اس تضاد پر غور کر لیا جائے ۔ بیدل کے ہاں عدم کی حقیقت کا ایک پہلو سطور بالا میں ظاہر کیا جا چکا ہے ، اب ایک اور پہلو کا ذکر کیا جاتا ہے ۔ اور اس کے مطالعے سے پتا چلے گا کہ عدم کا یہ تصور منفی نہیں ، بلکہ مثبت حیثیت رکھتا ہے اور اس سے انسان کی بے مائیگی کی بجائے عظمت ظاہر ہوتی ہے ۔ یہ تصور رومی کے ہاں بھی موجود ہے ۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم حکمت رومی میں ارتقائے انسانی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :

"انسان کو فرشتگی سے بھی گزر کر اور اوپر کے درجات میں جانا ہے ۔ یہاں تک کی منزلیں تو کچھ وہم و گمان میں آتی ہیں لیکن اس سے اوپر کی منزلیں قیاس و گمان سے برتر ہیں ۔ آگے کی منزلوں میں وجود کے موجودہ اندازوں میں سے کچھ بھی نہ اجسام ہیں اور نہ زمان و مکان ۔ اس لیے (رومی کے ہاں) ان

کے لیے عدم کی مطلاح استعمال کی گئی ہے ۔ لیکن یہ عدم عدم مطلق نہیں ، بلکہ ہستی کا ایک ناقابل بیان سرچشمہ ہے ۔ محسوسات اور معقولات کی سرحد میں ادراک مکانی اور زمانی سانچوں میں ڈھلتا رہتا ہے ۔ مکان ابعاد ثلاثہ میں اور زمان ماضی ، حال اور مستقبل میں تقسیم پذیر ہوتا ہے ، ادنیٰ درجے میں کثرت ظاہر اور وحدت پنہاں رہتی ہے ، لیکن روحانی ترقی میں چار سے تین اور تین سے دو اور دو سے آخر میں ایک رہ جاتا ہے ۔ اس سرمدی کیفیت میں دوش و فردا ، امروز بن جاتے ہیں ۔''

خلیفہ صاحب مرحوم کی عدم کے متعلق ان تصریحات کے بعد آپ بیدل کے ان اشعار پر غور فرمائیں ۔ یہ اشعار مثنوی عرفان میں روحانی ترقی کے سلسلے میں فنا و بقا پر بحث کرتے ہوئے کہے گئے ہیں :

بس عدم چیست ہستیِ جاوید
دو جہان ذرۂ ازاں خورشید

نور مرآت اول و انجام
لشاہ ذوالجلال والاکرام

دامن از گرد این و آن برزن
ہمہ در دامن عدم بشکن

تا عدم نیستی علم داری
ہستی از تست اگر عدم داری

ان معانی کے مطابق عدم ہستی کا ایک ایسا اثبات ہے جس کے بعد فنا نہیں ، یعنی بقا ہی بقا ہے ۔ اب جو اصحاب بیدل کی عدم دوستی پر طعنہ زن ہوتے ہیں وہ ذرا غور فرمالیں ۔

اس ضمنی وضاحت کے بعد ہم پھر حباب کا تذکرہ چھیڑتے ہیں ۔ یہاں سے ایک نیا موضوع شروع ہوتا ہے : کمالِ اختیار و کبریائی کے باوجود بیدل تسلیم پیشہ بنتے ہیں :

با ہمہ سامانِ قدرت شخصِ تسلیم اعتبار
با کمالِ کبریائی پیکرِ بیدل لقب

اس لیے کہ یہ قدرت و کبریائی انسان کا ذاتی وصف نہیں ۔ عطیۂ الٰہی ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے اپنے وجود میں متعدد اوصاف پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے ۔ اگر اپنی عظمت کا احساس دل میں عُجب و غرور پیدا کر دے تو ترقی کے امکانات محدود ہی نہیں ختم ہو جاتے ہیں ۔ بلکہ جس مقام پر پہنچنے کے بعد دل میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے ، انسان اس سے بھی بےحد نیچے جا گرتا ہے ۔ انسان کی نگاہ حقیقت بیں نہیں رہتی ۔ انسان باقی حقائق کی اہمیت سے بالکل غافل ہو جاتا ہے اور اس طرح غرور و استکبار اس کی عقل و شعور پر دبیز پردے ڈال دیتے ہیں ۔ اس لیے منازل ترقی پر گامزن رہنے کے لیے عجز و انکسار اور تسلیم و رضا ضروری ہیں ۔ روحانی ترقی جس میں ایک لحظے کی غفلت منزل سے صد سالہ مسافت پر دور پھینک دیتی ہے ، ان انفعالی صفات کو اور بھی ضروری قرار دیتی ہے ۔ انسانی عزت و تکریم کے بیان کے بعد بیدل کا ان صفات کی طرف اشارہ کرنا ظاہر کرتا ہے کہ اب ارتقاے ذات کا موضوع شروع ہو گیا ۔ وہ موضوع جس کے لیے علم تصوف وضع ہوا اور جس کی خاطر اصفیاء کا پاکیزہ فطرت گروہ عام دنیاوی دھندوں سے ہمیشہ کنارہ کشی اختیار کرتا رہا ۔

بیدل کہتے ہیں کہ ایک عالم دنیاوی مال و دولت کے لیے سرگرداں و پریشان ہے ۔ تنہا میری ذات ہے جو صرف اعلیٰ اقدار انسانی کی پرستار ہے ۔ کہتے ہیں اسباب عالم سے مجھے اس قدر استغناء ہے کہ اب تو تن کی عریانی میرا لباس بن چکی ہے ۔ پھر ان اسباب کا ذکر ہی فضول ہے کیوں کہ اب تو بارِ نفس تک اپنے کمزور کندھوں پر اٹھانا دشواری کا موجب بن چکا ہے :

غیر من زیں قلزمِ گوہر حبابی گل نکرد
عالمی صاحبِ دل است اما کسی بیدل نشد

کہ دارد فکرِ بی سامانیٔ وضعِ حبابِ من
بہ رنگی گشتہ ام عریاں کہ گوئی پیرہن دارم

بہ این ہستی ز اسبابِ دگر تہمت مکش بیدل
نفس کم نیست آن باری کہ بردوشِ حباب افتد

لیکن یہ کمالِ ترک نہ تھا ۔ جب تک دل میں اپنی ذات یا غیراللہ

کے متعلق احساسات و جذبات اور خیالات ہیں ۔ انسان اس وقت تک پستیوں میں موجود ہے ۔ جستی مدرکات کا غلام ہے ۔ اس کا ادراک الٰہی رنگ میں نہیں رنگا گیا ۔ اس کا معنوی وجود ایک خاص نقطے پر مرتکز نہیں ہوا ، وہ نقطہ جو بعد میں پھیل کر مکان و لامکان پر محیط ہو جاتا ہے ۔ اسی لیے بیدل اپنے قلب کو پوری طرح غیراللہ سے¹ تہی کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہستی مطلق سے پُر ہو جائے ۔ انھیں کسی اور دولت کی ضرورت نہیں ۔ وہ اپنے پیمانے کو صہبائے محبت سے پُر کرکے سرشار ہو جانا چاہتے ہیں ، انھیں کسی اور صہبا کی ضرورت نہیں ۔ وہ تو پیراہن وجود بھی اتار دینا چاہتے ہیں کیوں کہ یہ محسوس ہوتا رہے تو غیراللہ کا احساس پھر بھی باقی رہ جاتا ہے ۔ ترک کا یہ درجہ ہو تو انسان اپنے حقیقی کمالات سے از خود آشنا ہو جاتا ہے اور اس کی ذات کمالات الٰہی کا آئینہ بن جاتی ہے :

ہرکہ از خود شد تہی از ہستیٔ مطلق پُر است
از حباب من سراغ گوہر نایاب گیر

الفتی دگر نمی شمرد کہنہٴ حباب
بیدل من از تہی شدن خویشتن پُرم

ز صہبائے دگر برخود نمی بالد حباب من
تہی گردیدن از خود دارد این مقدار سرشارم

ز پیراہن برون آ تا بہ بینی دست گل خود
حباب آئینہٴ دریاست از تشریف عریانی

جب انسان اپنی ذات سے تہی ہو جاتا ہے تو اس قدر وسعت پذیر ہو جاتا ہے کہ جامہٴ وجود اس کے لیے تنگ ہو جاتا ہے ۔ اسی لیے حباب کی طرح وہ

۱۔ جدید فلسفیوں کی زبان میں اس کا یہ مطلب ہے کہ انسان اپنی غیرحقیقی شخصیت سے نجات حاصل کرنے کے بعد حقیقی شخصیت تک پہنچ سکتا ہے ، اور حقیقی شخصیت ہی ہستیٔ مطلق سے معمور ہوتی ہے ۔

جلد اس سے مستغنی ہو جانا چاہتے ہیں - ایسے آپ کی طرف ایک نگاہ بھی نہیں ڈالنا چاہتے ، مبادا وہ معمولی سی غفلت سے تباہی اور بربادی سے ہم کنار ہو جائیں - یہ پردۂ وجود دور ہو جائے تو بحر حقیقت عریاں ہو جائے گا :

حباب نیم نفس با نفس نمی سازد
ز خود تہی شدگاں بر خود این قدر تنگ اند

چو گوہر قطرہ ام تاکی بہ آب افتد کہ برخیزد
زبانی کاش در پای حباب افتد کہ برخیزد

درین محیط مقیم تغافلم چو حباب
مباد چشم کشودن تہی کند جایم

چون حبابم پردۂ ہستی فریبی بیش نیست
بحر عریانست اگر بیرون کنی پیراہنم

جہاں اپنے وجود کا احساس بھی ارتقا کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے وہاں گفتگو یقیناً ذہن اور خیال میں انتشار پیدا کرتی ہے اور دل کو ان انوار حقیقت سے محروم کر دیتی ہے جن سے اسے منور کرنا منظور اور مطلوب ہوتا ہے - اسی لیے صوفیائے کرام گفتگو سے پرہیز کرتے ہیں - اس سے نہاں خانۂ دل تاریک ہوتا ہے اور وہ بڑی کوشش سے خاموشی اور ضبط نفس اختیار کرتے ہیں کیوں کہ اس طرح نور القلب قائم رہتا ہے اور باطن زیادہ پُر نور ہو جاتا ہے -

روشن گر جمعیت دل جہد خموشی است
نتوان چو حباب آئنہ بی ضبط نفس ریخت

چون حباب آئینۂ ما از خموشی روشن است
لب بہم بستن چراغ عافیت را روغن است

نتوان بہ ضبط نفس معنی دل انشا کرد
حباب شیشہ نہفتہ است در شکستن موج

لیکن اس خاموشی کا یہ مطلب نہیں کہ روح حقیقت مطلقہ سے مخاطبت ختم کر دیتی ہے ۔ یہ مخاطبت نہ ہو تو روح کی بالیدگی ناممکن ہے ۔ دل پُر آرزو میں سے بڑی پُر سوز آہیں نکلتی ہیں ۔ صدائیں اٹھتی ہیں ، بڑی درد آمیز ، جن سے عرش معلی پر تہلکہ رونما ہو جاتا ہے ۔ ایسے مخلص صادق کے دل سے اٹھنے والی کوئی آواز ایسی نہیں ہوتی جس کے جواب میں عرش پر سے لبیک لبیک نہ کہا جائے ۔ اس طرح مقابلۃً خاموش مگر نہایت ہی گرم گرم اور روح پرور مکالمہ جاری رہتا ہے ۔ اسے آپ مناجات کہہ لیں یا دعا ، صوفیائے کرام اسے روح تصوف سے تعبیر کرتے ہیں ۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ خدا کو محبوب رکھنے والے با صفا لوگ ترک کے بعد مناجات پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں ۔ روحانی تجربات کی اقسام بیان کرتے ہوئے ولیم جیمز کہتے ہیں کہ دل سے نکلنے والی مناجات اور روح سے بلند ہونے والی دعاؤں کے ذریعے وہ روحانی توانائی بیدار ہو کر اپنی پوری قوت سے وجود انسانی میں کارفرما ہو جاتی ہے ، جو ویسے بالکل محو خواب رہتی ہے ۔ بیدل بھی سوز و ساز اور دعا و مناجات کی بنیادی اہمیت کے قائل ہیں اور حباب کا استعارہ استعمال کرکے کچھ شے کی آرزو بڑے درد و سوز اور بڑی نیازمندی کے ساتھ محبوب ازل کی درگاہ میں عرض کرتے ہیں :

ہر قطرہ زین محیط بہ موج گہر رسید
ما جامہ می کشیم ہنوز ازبر حباب

درین دریا کہ ہر یک قطرہ صد دامن گہر دارد
حباب ما بہ دل پیچیدہ آہ بے اثر دارد

فریاد کہ نقشی ننمائید حبابم
تا دم زدم این آئینہ از تاب نفس ریخت

انہیں اپنی آہ بے اثر کا درد ہے ۔ دوسروں کو گوہر مقصود ہاتھ میں لیے دیکھتے ہیں ، ان کے دل میں رشک پیدا ہوتا ہے ۔ ان کی روح کی گہرائیوں سے فریاد فریاد کی آوازیں اٹھتی ہیں ۔ وہ اپنی آرزو و جستجو کو دہ چند کر دیتے ہیں :

دریای جستجو را بی پا و سر حبابم
صحرای آرزو را بی پا و سر گیاہم

آرزوئیں مانا کہ اس طرح تکمیل پذیر نہیں ہوتیں جس طرح ان کا خیال ہے لیکن اپنے خلوص کی بنا پر انہیں یقین ہے کہ ان کے شیشۂ دل میں شکست پیدا ہوئی تو اس کی آواز ملاء اعلیٰ میں پہنچے گی :

چون حبابم شیشۂ دل ہر کجا خواہد شکست
آنسوی ”ہ“ عصی امکاں صدا خواہد شکست

انہیں پتا ہے کہ ان کا گریہ تنہا ان کا گریہ نہیں بلکہ چشم حباب سے اشک بحر جاری ہیں :

بگریہ متکر تر داستان عشق مباش
کہ اشک بحر ز چشم حباب می ریزد

اس لیے وہ کہتے ہیں ہمارا تیر آہ معمولی چیز نہیں :

ز بیدلاں مشو ایمن کہ تیر آہ حباب
یک نفس گذرد از ہزار جوشن موج

فضول احتیاط سد راہ بن گئی ہے ورنہ سوز و گداز کی یہ دولت ان کی ذات ایک نہایت ہی ارتقاء یافتہ وجود کی صورت اختیار کر لیتی :

تنگ ظرف احتیاطم ورنہ مانند حباب
بحر می بالد ز آغوش گداز ہستیم

اس لیے وہ احتیاط اور ضبطِ گریہ ترک کرنا چاہتے ہیں ۔ انہیں یقین ہے کہ ان کی یہ جنوں پروری اس حقیر سے حباب کو لباس بحر میں جلوہ گر کر دے گی :

ز پیراہن بروں آ بی شکوہی ایست عریانی
جنوں کن تا حبابی را لباس بحر پوشانی

آخر وہ کب تک لبِ خاموش سے حریفِ رازِ عشق بنے رہیں اور اس جذبے کو کیوں نہ آشکارا کر دیں جو سمندر کی پہنائیاں اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے ۔ توانائی کے ایسے عظیم ذخیرے کو چھپائے رکھنا کیسے اور کب تک ممکن ہے ۔

از لبِ خاموش نتواں شد حریف رازِ عشق
چند دارد ایں حبابِ بوج عیاں زیر پوست

اشعار بالا سے ظاہر ہے کہ ’بر سوز مناجات کی وجہ سے سینے میں عظیم روحانی قوت تربیت پاتی ہے ۔ یہ وہ شے ہے جو خشک اعتقادات کے ذریعے اپنے نہیں

سکتی ۔ اعتقاد جذبے کی آمیزش کے بغیر بے اثر اور بے جان ہے ۔ ان اشعار میں بیدل اسی لیے جذبے کی تربیت پر زور دیتے ہیں ۔

یہ گریہ و مساملت ، یہ ترکیۂ باطن اور یہ درد و سوز مبتدیوں کا کام تھا ۔ منتہی محویت اور استغراق کی صفت سے متصف ہوتے ہیں ۔ محبوب کے جلوؤں کے مشاہدے میں محویت کا وہ عالم ہوتا ہے کہ اپنی ذات کہیں دکھائی نہیں دیتی :

غریق بحر ز فکر حباب مستغنی است
رسیدہ ایم جای کہ بیدل آنجا نیست

اور اس استغنا کے نتیجے کے طور پر زر و مال کے تمام ہنگامے موج سراب نظر آتے ہیں ۔ جو انسان محیط میں غواصی کر رہا ہو سراب اسے کیوں فریب دے ۔ وہ تو عرفان اور وصال کی حقیقی دولت سے سرشار ہے :

بیدل بہ قلزمیکہ تو غواص قطرتی
گوہر گرہ برشتۂ موج سراب داشت

ایسا انسان تو جلوۂ الٰہی کے عین مرکز تک پہنچ چکا ہے ۔ دل دریا میں غوطہ زن ہے ۔ حباب اگر سطح آب پر رہتے ہوئے سیلِ امواج کے لیے وقف ہو چکا ہے تو ہو ۔ مرد عارف عین دلِ دریا میں موجود ہونے کی وجہ سے آب گوہر حاصل کر چکا ہے :

سیلِ امواج وقف خانہ بردوش حباب
لنگری چون آب گوہر در دل دریا زدند

ارتقا کی انتہا پر پہنچنے کے بعد حیرت و استعجاب اس مرد کامل کا شعار ہوتا ہے ۔ کیوں کہ وفور جلوہ کی بنا پر وہ حیران ہے کہ کدھر دیکھے کدھر نہ دیکھے :

نمی دانم چہ خواہد کرد حیرت با حباب من
کہ دریا عرض طوفان دارد و من یک دل تنگم

اس مقام پر عارف معمولی سی گردش چشم سے وصال الٰہی کی دولت سے محظوظ ہونے لگتا ہے ، یعنی نیم نفس میں حباب بحر سے ہم آغوش ہو جاتا ہے :

عارف بجلای رسد از گردش چشمی
در نیم نفس بحر ہم آغوش حباب است

اس وقت حباب کے دل میں جذبۂ خود نمائی پیدا ہوتا ہے اور وہ کہیں سماتا نظر نہیں آتا :

در محیط از خود نمائیہای نمی گنجد حباب
گر نفس بر خود ببالد گوشۂ دل تنگ نیست

یہاں آخری شعر میں حباب عارف کے لیے علامت کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے پہلے شعر میں عارف کے لیے استعارے کا کام دے رہا ہے ۔ بحر سے ہم آغوش ہونے کے بعد حباب کا جذبۂ خود نمائی ایک اور اہم مسئلے کی طرف اشارہ کر رہا ہے ، یعنی وصال کے بعد یا فانی فی اللہ ہونے کے بعد عارف فنا نہیں ہوتا بلکہ اسے بقا حاصل ہوتی ہے ۔ لوہا ہم رنگ آتش ہونے کے بعد اپنا وجود کھو نہیں دیتا بلکہ اس میں ایک ایسا انقلاب پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کی ماہیت کلیۃً اور ہو جاتی ہے جو بدرجہا اعلیٰ اور ارفع ہوتی ہے ۔ اور پھر عارف اپنی اس ارفع اور اعلیٰ ماہیت کے ساتھ ایک علیحدہ اور مستقل انا کے طور پر موجود رہتا ہے :

در حقیقت بیدل ما صاحب گنج بقا است
گر بصورت در رہ فقر و فنا افتادہ است

عرفا کا باقی باللہ کی اصطلاح سے یہی مطلب ہوا کرتا ہے اور مقام بقا پر فائز ہونے کے بعد ارتقائے ذات ختم نہیں ہو جاتا ، ابدی طور پر جاری رہتا ہے :

یک نفس ساکن داماں حبابیم امروز
ورنہ چون آب روان است بہان پیشۂ ما

آب رواں کی تشبیہ حرکت دوام کی طرف اشارہ کر رہی ہے ۔ ارتقائے ذات اسفل سے اعلیٰ کی طرف حرکت کیے بغیر نا ممکن ہے اور جس طرح علمی لحاظ سے نئے خیالات سابقہ خیالات کی تائید و تصدیق اور اصطلاح و تکمیل کرتے رہتے ہیں ، اسی طرح ذات انسانی کی معنویت بھی لحظہ بہ لحظہ معمور تر اور مکمل تر ہوتی چلی جاتی ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے ۔ یہی لحظہ بہ لحظہ بالیدگی منزلِ تکمیل کی طرف لے جاتی ہے جہاں انسان کبھی نہیں پہنچتا ۔ معنوی لحاظ سے اس طرح ترقی کرنے والا اگر مکان یعنی مادی عالم میں نہ سما سکے تو جائے حیرت نہیں :

نمی گنجم بعالم بس کہ از خود گشتہ ام فانی
حبابم را لباس بحر تنگ آمد بہ عریانی

ارتقا کے اس مقام پر بیدل کو دیکھ کر ہمیں ان کی وہ دعا یاد آتی ہے ، جو عہد شباب میں انھوں نے مانگی تھی ' ۲۳ سال کی عمر میں 'محیط اعظم' لکھتے ہوئے انھوں نے درگاہ الٰہی میں التجا کی تھی :

کنم گرم ہنگامۂ ساز خویش
نگنجم بہ پیراہن راز خویش

اور دو سال بعد مثنوی 'طلسم حیرت' لکھتے ہوئے انھوں نے پھر اسی آرزو کا ان الفاظ میں اعادہ کیا تھا :

شوم رازی کہ در گفتن نہ گنجم
زنم جوشی کہ من در من نگنجم

اب ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی دعائیں مستجاب ہو چکی ہیں ۔ عرفان کی منازل ارتقاء طے کرنے کے بعد وہ اپنی ذات تو جائے خود محمل امکاں میں نہیں سما سکے ۔ اس لیے وہ فرط مسرت سے اثبات ہستی کا اعلان ان الفاظ میں کرتے ہیں :

نہ بری گماں فسردگی بہ غبار بی سر و پائیم
کہ بہ چرخ می فگند نفس چو سحر زمیں ہوائیم
بہ جہاں جلوہ رسیدہ ام ز برار پردہ دمیدہ ام
ثمر نہال حقیقتم چمن بہار خدائیم

بارۂ ماسبق میں حرکت کا ذکر آیا تھا ۔ ذہنی اور روحانی ارتقاء باطن کی حرکت پذیری کے بغیر نا ممکن ہے ۔ بیدلؔ شدت سے اس حقیقت کے قائل ہیں :

پی عشق دل راہ جائی نتواں برد
یکسر جرس قافلۂ موج حبابست

جرس حباب صدائے الرحیل بلند کرتی ہے اور قافلۂ موج رواں ہو جاتا ہے ۔ یعنی انسان کا معنوی ارتقا جذبات و خیالات اور تصورات میں مسلسل حرکت کے بغیر ناممکن ہے ۔ چوں کہ بیدل ابدی ارتقا کے قائل ہیں اس لیے وہ حرکت میں بھی دوام چاہتے ہیں ۔ محولہ بالا شعر جس میں حرکت پر بھی حاوی ہے ۔ موج کی تشبیہ نے خاصی وضاحت کر دی ہے ۔ بیدل کا فلسفۂ حیات اقبال کی طرح

"ہستم اگر میروم نروم نیستم" کی حقیقت کو بنیادی حیثیت دیتا ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ آرزوے ارتقا چوں کہ ہر لحظہ آگے بڑھنے کو کہتی ہے، اس لیے ایک وقت جو مقام منزل بن کر چمکتا دکھائی دیتا ہے، کسی اور لمحے محض سنگ میل کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ آگے بڑھتے ہوئے افق نگاہ وسیع تر ہو جاتا ہے اس لیے نگاہیں ایک اور درخشاں منزل پر مرکوز ہو جاتی ہیں اور حوصلہ بڑھاتی ہیں۔ اس طرح راہ آگے بڑھتی چلی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ منزل بھی آگے سے آگے نظر آتی ہے لہذا ارتقاء پسند انسان مستقل طور پر آگے سے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ حرکت غیر مختتم، یہ سفر مسلسل، یہ جستجوے دوام زندگی کے ہر پہلو میں ضروری ہے۔ مادی زندگی ہو یا روحانی، یہی کہتے ہیں صاحب نظر اس حرکت کو ختم نہیں ہونے دیتے۔ یہی راز حیات ہے:

در طلب کوش و مده دامن امید ز دست
منزل و جادہ ہر دو در سفر است

اس فلسفۂ حیات کی تعلیم دینے کے بعد مزید جزئیات بھی نگاہوں کے سامنے لاتے ہیں۔ غور کیجیے:

انفعالی کاش بر چیند بساط اختیار
آه ازین تدبیر پوچ آنکه با تقدیر جنگ

اس شعر میں بڑی متانت اور حقیقت کے شدید احساس کے ساتھ وہ ہمیں متنبہ کرتے ہیں کہ زندگی بچوں کا کھیل نہیں بلکہ انتہائی احساس ذمہ داری اور پوری پوری مستعدی سے جملہ فرائض انجام دینے کا نام ہے۔ اسی لیے اس شعر میں وہ پوچ پوچ تدابیر اختیار کرنے پر سخت معترض ہوتے ہیں۔ کم ہمت لوگوں کی طرح تقدیر کو کوسنے والوں کی تنقید کرتے ہیں اور زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اختیار سے تعلق رکھنے والی تمام مردانہ صفات کو بروے کار لانے کی پر زور انداز میں تبلیغ کرتے ہیں۔ ہمت، اولوالعزمی، مشکل پسندی، خطر دوستی، بالغ نظری، خوش تدبیری وغیرہ صفات عالیہ بیدل کو بے حد پسند ہیں اور یہ صفات ان کے فلسفۂ حرکت میں فولادی عزم رکھنے والی روح پھونک دیتی ہیں۔ لطف یہ ہے کہ یہ تمام مثبت صفات حباب کے ذریعے بیان کی گئی ہیں، جو بظاہر مسلّم منفعلانہ رجحانات کا حامل ہے۔

بلند ہمتی کی ترغیب اور پست ہمتی سے نفرت دلاتے ہوئے کہتے ہیں :

مباش ہمچو گہر مردہ ریگ این دریا
نظر بلند کن و ہمت حباب طلب

گوہر اور حباب کی تشبیہ پر غور کریں ۔ بیدل کے خیال کے مطابق خواص پست ہمت اور مردہ فطرت ہیں ، اس لیے وہ کہتے ہیں ، ایسے خواص کی نسبت اولوالعزم عوام ہزار درجہ بہتر ہیں ۔ بنابریں پست ہمتی اور زبونی فطرت کو ترک کرنے کی ترغیب دیتے ہیں اور مشکل پسندی اختیار کرنے کو کہتے ہیں :

سحر است بیدل این ہمہ معنی کشیدنت
مدان گرفتہ بسر از پیکر حباب

خطرات سے بچنے کے لیے دعا مانگنے کی بجائے وہ الٹا خطرات کو دعوت دیتے ہیں ، کیوں کہ ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنے سے انسان ہر مصیبت سے محفوظ رہتا ہے :

ای حباب از سادگی دست دعا بالا مکن
در محیط عشق جز موج خطر محراب نیست

موج خطر ہی حباب کے لیے محفوظ محراب ہے ، محیط عشق کا یہی دستور ہے حباب جس قدر خطر پسند ہوگا اس کے احترام میں اسی قدر اضافہ ہوگا ۔ خطرات کی بھٹی میں پڑنے سے انسان کے جوہر کھلتے ہیں اور اس کی قدر و منزلت زیادہ ہوتی ہے :

ز تیغ یار سر ما بلند شد بیدل
بہ موج خیمہ ناز حباب می بالند

چوں کہ ارتقاے ذات اور ارتفاع مقام مشکل پسندی اور ترک عافیت سے وابستہ ہیں ، اس لیے عافیت کا خیال تک دل میں نہیں لانا چاہیے :

چون پیکر حبابم ز آفت سرشتہ اند
از مغز عافیت سر بی بای من تہیست

عزلت اور زمیں گیری کی صفات بالکل ناپسندیدہ ہیں ، سفر موجب خطر سہی لیکن حصول ظفر اس کے بغیر ممکن نہیں ۔ ہر قدم پر دل میں جو طپش پیدا ہوتی ہے

اس پر تمام آرام و آسائش قربان کیے جا سکتے ہیں :

ناتواں آزاد بودن دامن عزلت مگیر
موج را در ہر تپش بر وضع گوہر خندہ است

سفر کے نشیب و فراز کے متعلق معلومات کا موجود نہ ہونا سوہان روح کا باعث تو ہوتا ہے مگر سیاحت پرست انسان پھر بھی پا در رکاب رہتے ہیں :

چوں حبابم داغ دارد حیرت تکلیف شوق
دیدہ محروم نگاہ و سیر دریا کردنی ست

دوسرے مصرع میں لفظ 'کردنی' بڑا معنی خیز ہے اور شاعر کی روح اسی لفظ میں سمٹ آئی ہے ۔ شاعر بہرحال اپنا سفر جاری رکھنا چاہتا ہے ۔ وہ مصائب سفر سے بے نیاز ہے کیوں کہ یہ تو لزوم کا درجہ رکھتی ہیں :

راہ رو از رنج سفر چارہ ندارد بیدل
موج دائم ز حباب آبلہ پا دارد

باہمت انسان مشکلات کو دیکھ کر متبسم ہوتا ہے ۔ شکست اس کے لیے حوصلہ فرسا نہیں ہوتی ۔ اس کا کام ان کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا اور ان کے باوجود آگے بڑھنا ہے :

تو ہر شکست کہ خواہی حوالۂ ما کن
حباب و موج سراپا خمیدن دوشند

باہمت انسان کی سب سے بڑی آرزو بے باک جولانی ہے ۔ کنج قفس میں اس کے لیے بیٹھنا سخت دوبھر ہے :

بحر جولانگہ بیباکی و من ہمچو حباب
در شکنج قفس از وضع ادب کوش شدم

مخاطب بیدل محض عام انسانوں اور مستقبل کی نسلوں سے نہ تھا ۔ ان کا مخاطب زیادہ تر اپنے گرد و پیش کا مغل معاشرہ تھا ۔ ان کا دل واقعی محبت الٰہی سے سرشار تھا اور بڑی والہانہ لے کے ساتھ انھوں نے موحدانہ اشعار کہے ۔ شعر و شاعری ان کی روح کی غذا تھی اور شعر کہہ کر وہ لطف حیات حاصل کیا کرتے تھے ۔ یہ اپنی جگہ جس معاشرے کے وہ فرد تھے ، اس کے طور طریقوں کو جب انھوں نے دیکھا تو شاعری ان کے لیے محض بالیدگی روح اور لطف حیات کا

موجب نہ رہ گئی بلکہ اصلاح احوال کے لیے ان کے دل میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور اپنے ہم عصروں کو مخاطب کرکے انھوں نے ہر اس مرض کی نشان دہی کی جو مغل سوسائٹی کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہی تھی ۔

یہ حقیقت ہے کہ وفور دولت و مال اور اقتدار مطلق کی وجہ سے مغل اُمرا عیش پرست اور مطلق العنان بن چکے تھے ۔ نشہ ٔ دولت کے باعث جوہر انسانیت کی حفاظت کا خیال کسی کے دل میں نہ تھا ۔ امرا کی دیکھا دیکھی متوسط طبقے کے لوگوں نے بھی انھی کے انداز اختیار کر لیے تھے ۔ لوگ نام کے تو مسلمان تھے مگر عملاً ہر اس فعل کے مرتکب ہوا کرتے جس سے اسلام روکتا ہے ۔ مذہب کے ساتھ قلبی وابستگی ختم ہو چکی تھی اور سب کچھ تھا مگر ایک جذبہ ٔ ایمان کہیں بھی دکھائی نہیں دیتا تھا ۔ بیدل کا ایک مقطع ہے :

بیدل امروز در مسلمانان
ہمہ چیز است لیک ایمان نیست

اورنگ زیب عالم گیر نے قانون کے زور سے اصلاح کی کوشش کی مگر خود محتسب ہوس پرست اور بدکار تھے ۔ کیمبرج کی تاریخ ہند کے مصنف رقم طراز ہیں کہ حسن اخلاق کو اورنگ زیب رواج پذیر دیکھنا چاہتے تھے ، ان کی رعایا کے جمیع افراد کے دلوں میں ان کی مخالفت کا جذبہ پایا جاتا تھا ۔ جب اورنگ زیب دکن کے الدوہ ناک معارکے میں مصروف ہوئے تو شمالی ہند میں عثمانی سلطنت کی بے مغزی اور بد اعمالی کی وجہ سے حالات بد سے بدتر ہو گئے ۔ کوئی ایسا کام انجام نہیں پاتا تھا جو کسی لحاظ سے مفید مطلب ہو یا بہبودی مملکت اور رفاہ عامہ کا باعث بن سکتا ہو ۔

یہ حالات بیدل کے لیے سخت روح فرسا تھے ۔ انھوں نے عالی ہمتی سے معاشی اور معاشرتی اصلاح کے لیے شعر گوئی سے کام لیا ۔ چنانچہ حکیم الامت کی حیثیت سے انھوں نے 'حباب' کے محبوب اور مرغوب استعارے کو استعمال کیا ۔ ایسے کھوکھلے سماج کے لیے حباب کا استعارہ جس قدر موزوں ہے اس کا اندازہ ہر شخص لگا سکتا ہے ۔ ظاہر ہے حباب سے ان کی دل بستگی کا ایک سبب ان کا سماج ہی تھا ۔ جوں جوں وہ اپنے ہم عصروں کو غلط روی ، زر پرستی اور

حصول جاہ و اقبال پر مصر دیکھتے تھے تو ان کے دل میں یہ عزم قوی تر ہوتا جاتا کہ ان کی بے مائیگی اور بے حقیقتی ان پر واضح کی جائے :

جہاں بہ شہرت اقبال ہوچ می بالد
تو ہم بگنبد گردوں رسان پیام حباب

پیام حباب یعنی انسانی بے مائیگی کا ایک پہلو تو وہ تھا جس کا ذکر حقیقت مطلق کے بالمقابل کیا جا چکا ہے اور ایک پہلو یہ ہے جسے انحطاط پذیر اور زوال آمادہ محل معاشرے کی نسبت سے زیر نظر رکھنا چاہیے ۔

بیدل کی زندگی میں شاہ جہاں تا اورنگ زیب کے علاوہ شاہ عالم ، بہادر شاہ ، جہاں دار شاہ ، فرخ سیر ، رفیع الدولہ ، رفیع الدرجات اور محمد شاہ رنگیلا یکے بعد دیگرے تخت طاؤس کے مالک بنے ۔ تاج و تخت کے لیے متعدد لڑائیاں لڑی گئیں ، درجنوں شہزادے خون میں لت پت ہوئے ۔ کامیاب ہونے والے شہزادے تاج پہن کر ہمیشہ مغرور اور متکبر ہو جایا کرتے تھے ۔ وارثان تاج و تخت کی ان مغلہ حرکات کو دیکھ کر سخت متحیر تھے ۔ ایک شعر میں کہتے ہیں ۔ جب تمام انسان اولاد آدم ہیں ، کوئی کسی سے کسی طرح متفاوت نہیں ۔ صاحب اورنگ اپنے دماغ میں حباب کی طرح غرور و تکبر کی ہوا کیوں پھونک لیتے ہیں اور کیوں اپنے آپ کو دوسروں سے افضل اور برتر سمجھتے ہیں :

در حباب و موج این دریا تفاوت بیش نیست
اندکی باد است در سر صاحب اورنگ را

وہ ان شہزادوں کو حقائق پر گہری نگاہ ڈالنے کو کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ غور سے دیکھا جائے تو دنیا میں ثروت و غنا ہے نہ سامان غرور ۔ اس لیے تاج حاصل کرنے کے لیے تمام جد و جہد اور سرگرمی فضول اور بے معنی ہے :

جہان نہ برگ غنا دارد و نہ ساز غرور
عرق فروش سر و افسر آمدہ است حباب

کہتے ہیں ہوس تاج و نگیں اس لحاظ سے بھی بے کار ہے کہ ایک لمحے میں سلیمان کے ہاتھ سے خاتم اتر جاتی ہے :

گرہ باد بود دولت ہستی چو حباب
تا سلیمان نفسی عرصہ دہد خاتم نیست

کئی بادشاہوں کے ہاتھ سے بیدل آن واحد میں عدم اترتے دیکھ چکے تھے ۔ سلطانی کے اس انجام کو دیکھ کر وہ نام و نگین کو بالکل بے حقیقت سمجھتے تھے :

نقش زدیم بہ شہرت عدم بروں آمد
دگر چہ نقش ترا شد نگین بنام حباب

~

پیام داشت بہ هستا خط جبین حباب
کہ گرد نام نشستہ است بر نگین حباب

بیدل نے نگین کو اپنی آنکھوں سے اس قدر بے حقیقت دیکھا تھا کہ حباب اور نگین میں انہیں کوئی فرق نظر نہ آیا۔ یہ محض خیال آرائی اور معنی آفرینی نہیں بلکہ اپنے مشاہدے کا ذکر ہے ۔ نام و نگین اور تاج و تخت کے کھیل میں سب سے بڑا عیب بیدل کو یہ نظر آیا کہ غریب عوام کا خون چوس کر تاج دار لوگ رنگ رلیاں مناتے ہیں ۔ عاجز کشی ان کا ذریعۂ معاش ہوتا ہے ۔ دہان مور سے یہ لوگ برات رزق پاتے ہیں :

معاش حہ بے عاجز کشی صورت نمی بندد
برات رزق شاہاں بر دہان مور می باشد

جاگیرداری نظام کے ایام عروج میں غریب اور بے کس لوگوں سے یہ جذبۂ ہمدردی بیدل کو ایک انسان کے لحاظ سے کس قدر بلند دکھاتا ہے ۔ ہمیں اس قسم کے خیالات کے لیے مارکس اورلینن کا مرہون منت ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ سترھویں صدی عیسوی میں ایک درد دل رکھنے والے صوفی نے ان خیالات کا ایک گراں قدر ذخیرہ ہمیں عطا کر دیا تھا ۔

حباب کے استعارے سے اپنے عہد کے امرا پر بیدل نے خوب تنقید کی ہے ۔ کہتے ہیں یہ لوگ اہمیت نہیں رکھتے ، امور مملکت کو کس طرح انجام دیں ؛ بالکل بےمغز ہیں ، اور تنک مزاج اتنے ہیں کہ معمولی سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور معمولی سی مشکل پیش آئی ہے تو بری طرح نا کام ہوتے ہیں :

بہ یک نفس سر بی مغز می خورد بر سنگ
جدا ز چشم کلاہ حباب می باشد

باد پیمای سبک مغزیست ہر کس چون حباب
ساغر خود را نگون در مجلس دریا کند

یہ ان کی سبک دماغی کا نتیجہ ہے کہ صاحب بصیرت لوگوں کے پند و نصائح سے مستفیض نہیں ہوتے ۔ تعداد میں یہ لوگ مور و ملخ سے زیادہ ہیں ۔ ان سبک مزاج اور تنک فطرت امرا کا ایک بے پناہ ہجوم ہر طرف دکھائی دیتا ہے :

ہر سو ہجوم روی تنک گرد می کند
این عرصہ را کہ کرد پر از لشکر حباب

یہ لوگ لشکر حباب ہیں ، معمولی سی آزمائش سے ختم ہو جانے والے ۔ اس کے باوجود ان لوگوں کے غرور اور تکبر کی انتہا نہیں ۔ یہ غرور ان کے لیے یقیناً ایک روز مصیبت اور پریشانی کا موجب بنے گا :

نصیبی از عاقبت ندارد حباب جز غرور بودن
حذر کہ باد دماغت آمر برخ نفخ شکم نگیرد

–

مینای حبابی ز دم گرم بیندیش
بر طاق بلندیست تماشای غرورت

اس غرور کا انجام شکست اور تباہی ہے :

غرور طاقت ما با شکست نزدیک است
دمی کہ قطرہ بپالد حباب می گردد

–

باد کبر از سر بدر کن ورنہ مانند حباب
عاقبت این بادۂ سنگ کاسۂ سر می شود

یہ غرور اور تکبر ثابت کرتا ہے کہ ان لوگوں کو ابدی زندگی حاصل کر لینے کا گمان ہے ۔ افسوس یہ لوگ موت سے غافل ہیں :

ای ز تیغ مرگ غافل بر نفس چندین مناز
نیست جز نقش حباب آن سر کہ موحش گردن است

ہر ایک کا انجام فنا ہے :

چو حباب غیر لباس تو چہ توقع و چہ ہراس تو
نہ تو ماند و نہ قیاس تو چو شکند جامہ ز پیکرت

اس یقینی انجام کے باوجود لوگوں کے بے بنیاد قیاسات نے انہیں خوش فہم بنا دیا ہے - ہم نے تو قدر و منزلت اور جاہ و مرتبہ کو اندر سے خوب جھانک کر دیکھا ، ہمیں تو کچھ نظر نہیں آیا :

ہزار جا گرہ اعتبار شق کردیم
بہ چشم ما ہمہ دم گوہر آمدہ است حباب

ایسی ہیچ اور پوچ چیز کے لیے دوڑ دھوپ کرنا فی الواقعہ ننگ ہمت ہے - انسان بذات خود بے حد مکرم ہے - تاج پہننے سے اس کے شرف میں اضافہ نہیں ہوتا - انسان ایسی مکرم و محترم ذات کو تاج پہنانا بالکل اسی طرح ہے جس طرح دریا کو حباب کا تاج پہنا دیا جائے :

اقبال ہیچ و پوچ جہان ننگ ہمت است
دریا چہ سر کشی کند از افسر حباب

یہ لوگ کس قدر احمق ہیں ، شاہی دربار میں پہنے جانے والی دستار کے لیے بے تاب ہو رہے ہیں - اس دستار میں کیا رکھا ہے :

بے دلان را پوزہ لہ فریبد غم دستار پوچ
چون حباب این قوم سر را ہم ز سر وا کردہ اند

عزت و تکریم کی کشت زار عرق انفعال سے سرسبز ہوتی ہے - کاش یہ لوگ انفعال کے اس مقام پر پہنچ جاتے :

سحاب مزرعۂ اعتبار منفعلی است
تو ہم نمی ز عرق ریز بر زمین حباب

منصب پرست لوگ نا اہل ، سبک مغز ، مغرور اور متکبر ہونے کے علاوہ زردوست بھی تھے - حکیم اور مصلح کی حیثیت سے بیدل اس مرض کی طرف بھی متوجہ ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ انسان ایسے بلند فطرت وجود زر و مال ایسی حقیر چیز کے لیے کیوں مارا مارا پھرے - کیش گوہر اختیار کرنے کی بجائے دین حباب کا پابند ہونا بہتر ہے - انجام بینی کا تقاضا یہی ہے :

دماغ کسب و کارم نشد کفیل وفا
جہان بہ کیش گہر ساخت من بدین حباب

اگر حقیقت انجام دو نظر داری
ز ہر کجا گہرت می رسد حباب طلب

زر و مال تو ایک فریب ہے ، دیکھنے میں چمک دار اور مرعوب و مطبوع مگر حقیقت میں بالکل بے کار :

فریب منصب گو پر غرور کہ ہمچو حباب
ہزار کیسہ دریں بحر بیکراں خالیست

لا تعداد لوگوں نے اس کا فریب کھایا مگر انجام کار ان کے ہاتھ خالی رہے اور جن لوگوں کو کچھ مل گیا وہ جوہر انسانیت سے ہاتھ دھو بیٹھے ۔ گدھا پن ، بے حسیتی اور بد تہذیبی ان کا شعار بن گیا ۔ وہ ایسی آزمایش میں پڑے کہ سب کچھ کھو بیٹھے ۔

بے زری معنی جوہر انسانی نیست
آدم آنست کہ مال و حشمش خر نکند

اس لیے ضروری ہے کہ انسان حرص و ہوا ترک کر دے ، شرم و حیا اختیار کرے ۔ درباری دستار کا والہ و شیدا نہ ہو ۔ زندگی کی جو فرصت ملی ہے اسے غنیمت سمجھے ۔ اپنے حقیقی جوہر کی تربیت کرے ۔ یہ عظیم کام ہے اور اس حقیقت کو ضرور مدنظر رکھے کہ وہ علم سے منصۂ شہود پر آیا اور پھر جلد معدوم ہونے والا ہے ۔

بیاد رفتہ ذوق فضولی ایم ہمہ
سر ہوا طلبیہا حباب دستار است

رمقیست فرصت مغتنم بہ ہوس فسون امل مدہ
چو حباب سعی کمی مدان کہ نفس بہ پیکر خم کشی

بہ ہوا مکش چو سحر علم بہ حیا فسون ہوس مدم
عدمی علم عدمی علم و علم چہ عرصہ بری عبث

محل معاشرے کی تصویر اشعار بالا کے مطالعے سے چشم تصور میں موجود ہو جاتی ہے لیکن بیدل ایسے فنکار ہیں جو وفور جزئیات کے قائل ہیں ۔ جب تک وہ

ایک ایک چیز کو علیحدہ علیحدہ مناسب مقامات پر لا دکھا دیں ، مطمئن نہیں ہوتے ۔ اس لیے کلام بیدل کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو ہم ان کے عہد کے متعلق اس قدر وثوق کے ساتھ اور ایسی گراں قدر معلومات حاصل کر سکتے ہیں جو ہمیں کسی اور تذکرہ یا تصنیف سے نہیں مل سکتیں ۔ ایک غزل میں وہ ہیجڑوں، مخنثوں ، پشمینہ فروش زاہدوں ، خودنما ارباب زر ، علت المشائخ میں مبتلا امرا کا ذکر بڑی نفرت اور حقارت سے کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہم تو ابنائے زمان میں آدمیت اور وضع ہموار دیکھنا چاہتے تھے مگر افسوس وہ نایاب ہے :

وضع ہمواری ز ابنائے زمان مطلوب ماست
آدمیت گر نباشد ہر کہ خواہد خر شود

اسی طرح ایک اور غزل میں اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ علم و حکمت کا مقصود اب صرف روٹی کمانا ہے ۔ آدمیت اور انسانیت تو اب مطمح نظر ہی نہیں :

این زمان عرض کمالت فکر آب و نان بس است
آدمیت داشتی درکار گندم کردہ ای

اسی طرح مادیت کے غلبے اور وجود انسانی میں حیوانیت کے استیلا کا ذکر ان پُر سوز الفاظ میں کرتے ہیں :

نور جان در ظلمت آباد بدن گم کردہ ام
آہ ازین یوسف[۴] کہ من در پیرہن گم کردہ ام

کلام بیدل میں اسی قسم کے سینکڑوں اشعار موجود ہیں اور ان کو سامنے رکھ کر مغل معاشرے کی صحیح کیفیت پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی جا سکتی ہے مگر چوں کہ اس وقت ہم صرف حباب بیدل کے طالب علم ہیں ، اس طرف اب متوجہ ہونا ممکن نہیں ۔

جہاں تک بیدل کے بنیادی افکار و تصورات کا تعلق ہے حباب کے ذریعے وہ تمام کے تمام بیان ہو چکے ہیں ۔ بیدل کا سارا تخیل انھی افکار اور تصورات کے گرد گھومتا ہے ۔ حباب کے متعلق بیدل کے اور اشعار بھی ہیں ۔ مثلاً رباعیات بیدل میں ، جو تعداد میں چار ہزار کے قریب ہیں ، حباب سے تعلق رکھنے والے کئی اشعار موجود ہیں ۔ علاوہ بریں دیوان غزلیات کی بعض ردیفیں ایسی ہیں جن سے اس قسم

کے اشعار کا انتخاب نہیں کیا گیا۔ نیز بیدل کا کوئی دیوان غزلیات بھی مکمل نہیں۔ ان کے اشعار قلمی اور مطبوعہ دیوانوں میں بکھرے پڑے ہیں، اس لیے عین ممکن ہے کہ جن ردیفوں میں سے اشعار حباب لیے گئے ہیں ان میں اس التزام والے اور شعر بھی موجود ہوں۔ مثنوی عرفان کے اس نوعیت کے بعض اشعار بھی اس مقالے میں شامل نہیں کیے گئے لہٰذا تمام ماخذ و منابع کو کھنگالا جائے تو ممکن ہے کہ ہم بیدل کے حباب والے اور بھی بہت سے اشعار اکٹھے کر لیں۔ اس کام کو انجام دیا جا سکتا تھا مگر مقالہ اور بھی زیادہ طویل ہو جاتا۔ تاہم اس انتخاب سے بھی ہمیں بخوبی پتا لگ چکا ہے کہ لفظ حباب نے بیدل کے خیالات کو بیان کرنے میں کیا کردار انجام دیا ہے۔ اب ہم مختصر طور پر اس لفظ کی علامتی حیثیت کا ذکر کرتے ہیں۔

صوفی شعرا شروع ہی سے بحر اور حباب کا استعارہ استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ یعنی بیدل سے پہلے حباب کے سلسلے میں ایک خاص رجحان پایا جاتا تھا، لیکن انھوں نے اپنی قوت اجتہاد سے کام لے کر اس رجحان کی تکمیل کی۔ حباب کا استعمال کثرت سے کیا، اس کے معانی میں تنوع پیدا کیا اور اسے معنویت سے لبریز کر دیا۔ انھوں نے حباب کے ذریعے مابعدالطبیعیاتی، متصوفانہ، اخلاقی، تمدنی اور معاشی مسائل بیان کیے۔ ان کا عہد جن مسائل سے دو چار تھا ان پر انھوں نے دل کھول کر بحث کی اور اس طرح انھوں نے حباب کے ذریعے اپنے معاشرے کی خوب عکاسی کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ابنائے زمان تک وہ جو پیغام پہنچانا چاہتے تھے حباب کو ذریعۂ ابلاغ بنا کر انھوں نے بڑی کامیابی سے پہنچایا۔ حباب ان کے کلام میں نصب العینی انسان کی حیثیت سے بھی موجود ہے اور اخلاق باختہ اور ازکار رفتہ انسان کی حیثیت سے بھی۔ حباب کی صورت میں انسان فعل تخلیق کا ثمر اعلیٰ بھی نظر آتا ہے اور بے حقیقت حادثہ مخلوق بھی۔ الغرض باکمال شاعر نے حباب کو ہمہ گیر اور ہمہ رس معنویت کا حامل بنا دیا ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کی نقاب کشائی حباب کے ذریعے نہیں ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لفظ حباب بیدل کے کلام میں ایک ایسی اکائی کی حیثیت اختیار کر گیا ہے جس میں بے حد جامعیت ہے، اور علامت کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ وہ منتشر مطالب کو ایک معنی خیز لفظ میں جمع کر دے تاکہ ان کے متعلق غور و فکر کرنا اور ان سے نتائج اخذ کرنا آسان ہو جائے۔

رموز و علائم شاعر کی روح میں سے ابھرتے ہیں ، اس کی شخصیت ان کی آبیاری کرتی اور شاعر کا عہد اپنی مخصوص فضا میں انھیں پھلنے پھولنے کا موقع دیتا ہے۔ عہد کی مخصوص فضا انھیں راس نہ آئے تو پھر ان کا پنپنا ناممکن ہوجاتا ہے ۔ اس لحاظ سے رموز و علائم شاعر کے عہد کی پیداوار ہوتے ہیں اور اس عہد کو اگر پس منظر کے طور پر سامنے نہ رکھا جائے تو ان کی معنویت سے پوری طرح واقفیت حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے ۔ اس پس منظر کے بغیر ہم ان سے جو نتائج اخذ کریں گے وہ سرتاپا غلط ہوں گے ۔ رموز و علائم کی مستقل حیثیت کوئی نہیں ہوتی ، اضافی ہوتی ہے۔ جب ہم اس بات کو سامنے رکھیں گے کہ بیدل کا معاشرہ اندر سے بالکل کھوکھلا ہو چکا تھا ، ہم آسانی سے حباب پر ان کے اصرار کی لم سے آگاہ ہو سکتے ہیں ۔ ان کا معاشرہ اپنے متعلق غلط گمان میں مبتلا ہو چکا تھا ۔ بیدل کے سامنے سب سے بڑی مہم یہ تھی کہ اس گمانِ باطل کو دور کرکے اپنے ہم عصروں کو حقیقی اقدار سے آشنا کریں ۔ وفور دولت و اقتدار نے مغل لوگوں کے دل و دماغ میں ہوا بھر دی تھی ۔ اس ہوا کو خارج کیے بغیر انھیں صالح انسان بنانا ناممکن تھا ۔ ان کے جسموں میں بسیار خوری کی وجہ سے وفور خون تھا اور جب تک فصد نہ لی جاتی ، وہ زندہ لاشے بنے رہتے اور زندگی کی ان مہمات کو انجام دینے کے اہل نہ ہو سکتے جن کو حل کرنے کے لیے دل و دماغ کی اعلیٰ صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اس طریق کار سے ایک بالغ نظر حکیم کی حیثیت سے بیدل اپنی قوم کو انحطاط اور زوال سے بچانا چاہتے تھے جس کی طرف بدبختی سے وہ بگٹٹ دوڑی چلی جا رہی تھی ۔ اس پس منظر کے ہوتے ہوئے حبابِ بیدل ہماری حیاتِ ملی کے ایک خاص مقام کی نشان دہی کر رہا ہے اور علامت کی حیثیت سے ہمیں اپنی اہمیت کا معترف بناتا ہے ۔

اپنے مطالب کی توضیح کے لیے ہم اقبال کی علامتوں 'لالہ' اور 'شاہین' کو لیتے ہیں ۔ اقبال کے سامنے جو قوم موجود تھی وہ وفور خون کے مرض میں مبتلا نہیں تھی ، بلکہ اس کا خون اس قدر بہہ چکا تھا کہ فقدانِ خون کے باعث دم توڑ رہی تھی۔ اس کا علاج یہ تھا کہ اس کے وجود میں کسی نہ کسی طرح از سر نو تازہ خون داخل کیا جائے تاکہ یہ موت سے بچ جائے اور اقوام عالم کے دوش بدوش پھر سے کھڑی ہو سکے ۔ اس لیے اقبال نے اپنے کلام میں

لالہ اور شاہین کی علامتیں استعمال کیں ۔ اقبال ان کے ذریعے ملت اسلامیہ کے وجود میں خون بھی داخل کرتے ہیں اور خون کو گرم رکھنے کے اسباب بھی بہم پہنچاتے ہیں لیکن بیدل کی زندگی کے ستر سال شاہ جہاں ، اورنگ زیب اور شاہ عالم کے زمانوں میں گزرے ، جب کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی فاتحانہ حیثیت ابھی قائم تھی ۔ ان کے اقتدار کے خلاف بغاوتیں ہو رہی تھیں مگر اقتدار بحال تھا اور عام خیال یہ تھا کہ اس قسم کی بغاوتیں وقتی اہمیت رکھتی ہیں اور بہتر قیادت سے فرو ہو سکتی ہیں ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی زندگی کے باقی نو سال میں بیدل نے جہاں دار شاہ اور فرخ سیر کا نسبتاً افسوس ناک زمانہ دیکھا لیکن پھر بھی اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کے ہاتھ رہا ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عمر بھر بیدل کے سامنے اقتدار سے مخمور معاشرہ رہا اور اس کی اصلاح کے لیے اس کی نوعیت مرض کے مطابق انھوں نے علاج تجویز کیا لیکن اقبال جب پیدا ہوئے تو ہندوستان میں مسلمان اقتدار اعلیٰ سے مکمل طور پر محروم ہو چکے تھے اور بیدل کی وفات (۱۷۲۰ء) سے لے کر اقبال کے سن ولادت (۱۸۷۳ء) تک نادر شاہ ایرانی ، احمد شاہ ابدالی ، مرہٹوں ، روہیلوں اور انگریزوں کے تابڑ توڑ منتقمانہ حملوں کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کی وہ درگت بنی تھی کہ الامان و الحفیظ ۔ اور پھر بیرون ہند اقبال نے اپنی آنکھوں سے ترکوں کی الم ناک رسوائی بھی دیکھی ۔ یعنی ان کے سامنے ایک زوال یافتہ مردہ ملت تھی اور انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اس کے احیا کے لیے ایسی تدابیر اختیار کیں جو تقاضائے وقت کے عین مطابق تھیں ۔ ان کے مخصوص رموز و علائم کی حقیقی لم یہی ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے عہد کے لحاظ سے جو اہمیت بیدل کی علامت 'حباب' کو حاصل تھی وہی اقبال کے 'لالہ' اور 'شاہین' کو حاصل ہوئی ۔ اپنے مقصد کے اعتبار سے دونوں شعرا کی علائم ہم جنس ہیں ۔ دونوں کے ہاں تسلسل خیال پایا جاتا ہے ۔ دونوں شاعر ان علامتوں کو استعمال کرنے کی وجہ سے برابر عظمت کے حامل ہیں ۔ کوئی کسی سے برتر نہیں ۔ اب ہم رموز و علائم کی اضافی حیثیت سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ حباب کی علامت اختیار کرکے بیدل نے وقت کے تقاضے کو پورا کیا ۔

جیسا کہ سطور بالا سے واضح ہے ، ہر علامت اپنے مخصوص ماحول کی پیداوار

ہونے کی بنا پر مخصوص اقدار اور مطالب کا مظہر ہوتی ہے ۔ اسی اختلاف معاشرہ کی بنا پر بیدل جن اقدار پر زور دیتے ہیں وہ بھی مختلف ہیں ۔ وہ اخلاق اور روحانی اقدار کو نظام حیات میں بنیادی اہمیت دیتے ہیں ۔ تزکیۂ نفس ، صفائے باطن اور پاکیزگی روح کو زیادہ اہم قرار دیتے ہیں اور اپنے ہم عصروں کے جذبۂ ایمان میں تڑپ اور سوز پیدا کرنا چاہتے ہیں ۔ مغل معاشرے میں در اصل انھی صفات کا سخت قحط محسوس ہو رہا تھا ۔ بیدل کے برخلاف اقبال کا زور زیادہ تر حیاتیاتی اوصاف پر ہے ۔ ان کے سپرد تن مردہ میں جان ڈالنا تھا ، اس لیے ان کا کلام زیادہ تر حسیاتی لحاظ سے حیات آفریں اور حیات پرور ہے ؛ لیکن جیسا کہ پیش تر ازیں اشارہ ہو چکا ہے ، اخلاق اور روحانی اقدار پر زور دیتے ہوئے بھی بیدل حرکت اور عمل کی تبلیغ کرتے ہیں ۔ زندگی کا حیاتیاتی پہلو ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ۔ ان کا ایک مشہور شعر ہے :

درین راہ شود پامال حوادث
چو نقش قدم ہر کہ خوابیدہ باشد

یہ شعر سر تا پا حرکت و عمل اور عالی ہمتی کا پیغام ہے اور ترکیب 'پامال حوادث' اس دوربین بیدل کو نگاہوں کے سامنے لا رہی ہے جو اپنے ہم عصروں کی غفلت شعاری کی وجہ سے سخت متفکر تھا اور جسے خطرہ تھا کہ اگر ان معنوں کے یہی لیل و نہار رہے تو حوادث عالم انھیں پامال کرکے رکھ دیں گے ۔ ساتھ ہی اس شعر میں لفظ خوابیدہ اس معنویت کو اجاگر کر رہا ہے ، جو اپنے مخصوص معاشرے کی وجہ سے بیدل کے لیے مابہ الامتیاز ہے ۔ حیاتیاتی تقاضوں سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی وہ ایک لمحے کے لیے اس معنویت سے جدا نہیں ہوتے ۔ ان کی زندگی کا مقصد وحید یہ تھا کہ ابنائے جنس کو غفلت شعاری سے باز رکھیں اور ان کی اخلاق اور روحانی حس کو بیدار کرکے انھیں تباہی اور بربادی سے بچالیں ، کیوں کہ اعلیٰ انسانی اقدار کو ترک کرکے کوئی معاشرہ تا دیر زندہ نہیں رہ سکتا ۔ بیدل کو جن حوادث کا ڈر تھا وہ ملت کو پامال کر چکے تو اقبال پیدا ہوئے ۔ اقبال ، رومی اور بیدل کے سوز و ساز کے وارث ہیں ۔ اخلاق اور روحانی اقدار انھیں بھی اتنی ہی عزیز ہیں جتنی ان بزرگوں کو تھیں ۔ ان کا 'مرد کامل' دانتے کے 'فوق البشر' سے انھی صفات کی وجہ سے مختلف ہے ۔ لیکن حوادث سے

پامال ملت کو ابھارنے کے لیے حیاتیاتی اوصاف زیادہ ضروری تھے - اسی لیے انھوں نے زیادہ زور انھی پر دیا اور اسی لیے لوگوں کو اقبال کے مرد کامل اور نطشے کے فوق البشر میں بڑی مشابہت نظر آتی ہے - اس موازنے اور مقابلے سے واضح ہو گیا ہے کہ رموز و علائم کی طرح نظریات زندگی بھی معاشرے کے مخصوص حالات کی وجہ سے نشو و نما پاتے ہیں اور انسانی زندگی کا جو پہلو ناقص اور ناسکمل نظر آتا ہے پیمبرانہ نگاہ رکھنے والا شاعر اصلاح کے لیے اپنے فکر کا مرکز بنیادی طور پر اسی کو بناتا ہے -

علامت حباب کے تاریخی پس منظر کو بیان کرنے کے بعد ان بنیادی افکار کا ذکر ختم ہو جاتا ہے جن کی وجہ سے اس علامت کو ادب فارسی میں مہتم بالشان حیثیت حاصل ہوئی - اختتام پر لفظ حباب کے سلسلے میں آیئے دو ایک مزید ادبی اور فنی محاسن پر غور کر لیں -

یہ تو ظاہر ہے کہ بیدل کے حباب والے تمام اشعار رعایت لفظی کا نادر نمونہ ہیں - ایک ہی لفظ ہے مگر ایسے ایسے نئے بصیرت افروز معانی کا جامہ' حوش رنگ پہنایا گیا ہے - عام طور پر یہ تمام معانی ایک مربوط نظام فکر سے تعلق رکھتے ہیں مگر بعض اوقات اس لفظ سے محض خیال آفرینی کا کام بھی لیا گیا ہے - تازہ گو شعرا کے ہاں اس صنعت گری کا بڑا رواج تھا اور بیدل بھی اپنے عہد سے متاثر ہوئے ہیں - اس قسم کے اشعار کا نمونہ ذیل میں درج ہے :

حباب سخت دلیرانہ می زند بر موج
دل گرفتہ ز شمشیر سر نمی تابد

ہمچو من از سر نگوں طالعی دارد حباب
کز خم دریای می در جام نتوانست کرد

دگر چہ چارہ بجز خامشی کہ ہمچو حباب
بر آب کہنہ' ما آہ سنگ می بارد

رعایت لفظی بیدل کا عام شعار ہے - حباب کے ساتھ ساتھ وہ لفظ پیراہن کے متعلق بھی اسی رعایت کا کھیل جاری رکھتے ہیں - اس قسم کے اشعار بیشتر ازیں

نقل کیے جا چکے ہیں لیکن اس وقت نقطۂ نگاہ مختلف تھا ۔ حباب کا پردۂ لطیف بیدل کے خیال میں عجیب و غریب معانی پیدا کرتا ہے ۔ کبھی وہ اسے پیراہن شمار کرتے ہیں اور کبھی لباس عریانی اور اس طرح صنعت مراعاۃالنظیر سے کام لیتے ہوئے وہ پوشش ، لباس ، جامہ ، تشریف ، پیراہن ، عریانی تمام الفاظ کو استعمال کرتے ہیں اور ایک عجیب لفظی اور معنوی طلسم پیدا کر دیتے ہیں ۔ بیدل رعایت معنوی سے بھی کام لیتے ہیں ۔ ایک ہی معنی ہوتا ہے ، اسے الفاظ کا نیا دیدہ زیب جامہ پہناتے ہیں ۔ حباب اور مذکورہ بالا الفاظ کا التزام جاری رہتا ہے ۔ اسی معنی کو از سر نو بیان کرتے ہوئے اس کے جدید پہلوؤں کی طرف بھی اشارے کرتے چلے جاتے ہیں ۔ یہ بیدل کی قادرالکلامی کا بہت بڑا ثبوت ہے ۔ مزید برآں صنعتوں کا یہ کھیل محض لطف طبع کے لیے نہیں بلکہ بنیادی مقصد اپنے فلسفۂ زندگی کی تشریح ہوتا ہے اور یہ صنعتیں ضمناً کلام میں حسن پیدا کر دیتی ہیں ۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ بیدل نے فن شعر کا مطالعہ کس اہتمام اور کس قدر بالغ نظری سے کیا ہوا تھا ۔ یہ محاسن کلام ذہن میں اس طرح رچے ہوئے تھے کہ اشعار میں از خود بلاتکلف وارد ہو جایا کرتے تھے ۔ اس سلسلے میں آپ مندرجہ ذیل اشعار کا مطالعہ کریں :

ز پیراہن برون آ بی شکوہی نیست عریانی
جنون کن تا حبابی را لباس بحر پوشانی

ز پیراہن برون آ تا بہ بینی دست گاہ خود
حباب آئینۂ دریاست از تشریف عریانی

درین دریا کہ عریانی است یکسر ساز امواجش
حباب ما بہ پیراہن رسید از چشم پوشیدن

لشد حباب حیالم غبار حسانی
حباب را تہہ پیراہن است عریانی

نمی گنجم به عالم بسکه از خود گشته ام دور
حبابم را لباس بحر تنگ آمد به عریانی

غیر دریا چیست افسون مایهٔ ناز حباب
می توان پیراہنم بر خود ز بس بالیده ام

حباب از پیرہن آئینه داری می کند روشن
بپوشش ساختم تا این قدر دیدند عریانم

من درین بحر نه کشتی نه کدوئی آرم
چون حباب از سر خود جامه فرو می آرم

اسی ضمن میں صنعت تمثیل کا نمونہ بھی ملاحظہ فرمائیں :

تا نفس ہست حباب می جولان ہوس
نیست آرام سری را که ہوا می پیچد

بنائیم را نم اشکی بباد می برد بیدل
به کشتی حبابم می کند یک قطره طوفانی

ادبی محاسن کے سلسلے میں حباب صد رنگ کے[1] ایک اور پہلو پر آپ پھر نگاہ ڈالیں ۔ شعر کے سوز و ساز میں تحریک نیرنگیِ حسن کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے ۔ نگاہیں حسن کی رنگینیوں سے اکتساب کیف و مستی نہ کریں تو کسی کا شعر بننا محال ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ تمام بڑے بڑے شعرا جہت ہی عظیم

۱۔ مثنوی 'عرفان' میں حباب ، میدان رزم میں بھی نظر آتا ہے ۔ جنگ کے موقع پر قتل و خون ریزی کا حال بیان کرتے ہوئے بیدل کہتے ہیں :

چون حباب از تلاطم سر ہا
داشت دریای خونم کدوی شنا

احساس حسن رکھتے چلے آئے ہیں ۔ بیدل کی صورت بھی یہی ہے ، ان کی اس حسن لطیف کا مطالعہ بالغ نظر نقادوں کے لیے نہایت ہی معنی خیز اور دلچسپ موضوع ہے ۔ بالخصوص جب بیدل حسن محبوب کا ذکر کرتے ہیں تو ایسی بھرپور فصاحت کا اظہار کرتے ہیں کہ مذاق سلیم ان کے قلم کا بے اختیار بوسہ لے لیتا ہے ۔ دیں میں اس قسم کے دو شعر پڑھیں اور صنعت تضاد کی نیرنگی کی داد دیں :

سرو قد تو مصرع موزوں چمن
زلف کج تو خط پریشاں آفتاب

خورشید مشرقی کہ بر آن سایہ افگند
فردوس منزلی کہ در آن جا گذر کنند

یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیات میں تغزل کی شان بھی نرالی ہے :

ہم چو شبنم در تمنای نثار تو گلی
داشتم اشکی نمی دانم کجا غلطیده است

اب لطف کی بات یہ ہے کہ بیدل کے حسن آفریں قلم نے حباب کو بھی حسن پرور بنا دیا اور تغزل کی گرمی اس میں بھی پیدا کر دی ۔ دو ایک شعر مقالے کے آغاز میں درج کیے جا چکے ہیں ، تین شعر یہاں ملاحظہ فرمائیں :

محیط تہمت آلود جفا شد از شکست من
حبابم گرد بر دریا فشاند از خانہ ویرانی

ز گرم جوشی لعلت بکسوت بت خال
حباب بر لب ساغر کباب می گردد

محیط ناز کافیا زوری دلہاست طوفانی
حبابش گردش چشم است و موج ایمای ابروی

اہل عالم حباب کو بے حقیقت سمجھتے ہیں تو سمجھتے رہیں ۔ بیدل نے اپنی سحر نگاری سے اسے ایک عظیم حقیقت بنا دیا ہے اور ایسے عجیب و غریب مطالب اور اتنے اہم حقائق و معارف اس کے ذریعے بیان کیے کہ انسان محو حیرت ہے ۔ خود کہتے ہیں :

خواہی نفس خیال کن و خواہ گرد وہم
چیزی نمودہ ایم در آئینۂ حباب

(مجلۂ انجمن عربی و فارسی دانش گاہ پنجاب
مئی ۱۹۶۳ء—فروری ۱۹۶۴ء)

---

(۸)

کلامِ بیدل میں لفظِ "آئینہ"

زیں عرضِ جوہریکہ در آئینہ دیدہ ایم
خط بر جریدہ ہای ہنر می کشیم ما

بیدل کے کلام میں لفظِ آئینہ بار بار استعمال ہوا ہے - ان کے کلام میں اس لفظ کی اس قدر تکرار ہے کہ اگر وہ اپنی جودتِ طبع سے ہر بار اس میں کوئی نئی خوبی پیدا نہ کر دیتے تو قاری کی طبیعت یقیناً اکتا جاتی اور یہی ایک لفظ ان کے "آئینہ" کمالات کے لیے کلفِ سیاہ بن کر رہ جاتا - لیکن اب صورت یہ ہے کہ اگرچہ لفظِ آئینہ پر مشتمل اشعار کی تعداد سینکڑوں سے گزر کر ہزاروں تک پہنچ گئی ہے مگر ہر نئے شعر میں بیدل کی بے نظیر تخلیقی صلاحیتیں نئے انداز سے جلوہ گر ہوتی ہیں - لفظِ آئینہ سے لگاؤ انھیں زندگی کی ابتدا میں ہی پیدا ہو گیا تھا - اگر ان کی تصانیف کو اس ترتیب سے زیرِ نظر رکھا جائے جس سے وہ معرضِ وجود میں آئی ہیں تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لفظ شروع ہی سے ان کے لیے مرکزِ توجہ بن گیا تھا - 'محیطِ اعظم' ان کی اولین مثنوی ہے جو انھوں نے ۲۴ سال کی عمر میں تصنیف کی - 'کلیاتِ صمدری' میں اس مثنوی کے کم و بیش دو ہزار شعر ہیں اور ان میں سے کم از کم ۱۲۵ شعر ایسے ہیں جن میں لفظِ آئینہ موجود ہے - ان کی تمام دوسری بہ مقابلتاً مختصر نظموں کی حالت بھی یہی ہے اور دیوانِ غزلیات میں تو متعدد غزلیات ایسی ہیں جن کی ردیف آئینہ ہے - اور بہت سی ایسی ہیں جن میں آئینہ ردیف کو ترتیب دیتا ہے - ویسے بھی ان کی بہ مشکل کوئی ایسی غزل ہوگی جس میں آئینہ کا لفظ ایک سے لے کر تین چار اشعار میں نہ پایا جاتا ہو -

لفظ آئینہ ادبیاتِ عالم میں زمانۂ قدیم سے موجود ہے - ہندی آریائی روایتوں

میں کسی نہ کسی صورت میں یہ سکندر اعظم کی آمد سے پہلے بھی نظر آتا ہے۔ لیکن جب سکندر اعظم نے ساحلِ بحر پر اسکندریہ کا شہر تعمیر کرایا اور وہاں مینار پر ایک آئینہ نصب کرایا جو فرنگی حملہ آوروں کی حرکات و سکنات کا پتا دیتا تھا تو اس لفظ نے ایک خاص روایت اور تلمیح کی صورت اختیار کر لی اور پہلوی اور فارسی علم و ادب میں شعرا اور اہل قلم اسے بار بار استعمال کرتے رہے۔ پہلوی زبان میں یہ "آئینک" کی صورت رکھتا تھا۔ فتح ایران کے بعد عربوں نے 'ک' کو 'ہ' پڑھا اور یہ اپنی موجودہ شکل میں جلوہ گر ہو گیا۔ آئینہ کا مادہ آئین ہے اور آئین کا معنوی معنی زیب و آرائش ہے۔ چوں کہ آئینہ سے زیب و آرائش کا کام لیا جاتا ہے اس لیے اسے آئینہ کہا گیا۔ اس کا مادہ آہن بروزن و معنی آہن بھی بتایا جاتا ہے۔ چوں کہ آہن کو صیقل کرکے آئینہ تیار کیا گیا تھا اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کا نام آہن سے مشتق کر کے آئینہ رکھا گیا[۱]۔

صاحبِ بہارِ عجم اور صاحبِ فرہنگِ اصطلاح آئینہ کی بہت سی صفات و تشریحات بیان کرتے ہیں۔ جناب سید عابد علی عابد نے کلمہ آئینہ کی تحقیق کرتے ہوئے ان میں سے چند ایک کا ذکر کیا ہے، مثلاً بے غبار، گوہر نگار، طوطی نما، روشن، پریشان نظر، سادہ، عریاں، پری خانہ، چشمہ حیوان اور خاموشی اور حیرگی کے باعث حیران۔ ان صفات اور تشبیہات پر غور کیا جائے تو ایک خاص بات نگاہوں کے سامنے آتی ہے۔ آئینہ دل سے ان تمام کا گہرا رابطہ ہے، اسی لیے بالخصوص صوفی مشرب شعرا کو اس لفظ سے بڑا لگاؤ رہا ہے۔ انھیں سراسر ایسے دل سے سروکار ہوتا ہے جو ہر قسم کے افکار و احساسات کی عکاسی آئینے کی طرح کرتا ہے۔ بیدل بھی صوفی مشرب تھے۔ تصوف سے ان کا قلبی اور باطنی تعلق عہد طفلی ہی میں قائم ہو گیا تھا۔ بعد کے مشاہدے اور مطالعے نے ان کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا کہ علم و عمل کی ہم آہنگی کا وہ نقطہ آخر جو کون و مکان کے تمام حقائق کو اپنی آغوش میں لے سکتا ہے، صرف فقر و تصوف ہے۔ اس لیے لفظ آئینہ سے ان کا تعلق روز بروز بڑھتا چلا گیا اور آہستہ آہستہ اس

۱- ان مطالب کے لیے آپ دیکھیں: "انتقاد" از سید عابد علی عابد، مقالہ 'کلمہ آئینہ کی تحقیق'۔ غیاث اللغات کا ابتدائی صفحہ بھی مفید رہے گا۔

لفظ میں وہ وسعت اور جامعیت پیدا ہو گئی کہ ایک روز وہ بے اختیار ہو کر کہہ اٹھے :

زین عرض جوہریکہ در آئینہ دیدہ ایم
خط بر جریدہ‌های ہنر می کشیم ما

یعنی ان کے خیال کے مطابق ارباب ہنر کی کوئی علمی اور معنوی عمیق لفظ آئینہ کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتی تھی ۔ معانی اور مطالب کی اسی وسعت کے زیر نظر یہ شعر اس مقالے میں زیب عنوان ہے ۔

چوں کہ بیدل نے رنگ رنگ کے احساسات و جذبات اور نوع نوع کے افکار و خیالات کو لفظ آئینہ کی وساطت سے بیان کیا ہے اس لیے ان کی فکر دقیقہ رس نے آئینہ کی نئی سے نئی صفات اور تشبیہات دریافت کیں اور اپنے تازہ اور جدید خیالات کو بیان کرنے کے لیے اس لفظ کے ذریعے نو بہ نو ترکیبات وضع کیں ۔ انھوں نے آئینہ کی متعدد مثبت صفات پر زور دیا ؛ مثلاً صفائی اور پاکیزگی ، صیقل پذیری ، آب و تاب اور نور آفرینی ، تمثال یا عکس قبول کرنے کی اہلیت ، رنگ بہ رنگ بہشت آفریں مناظر کو ایک پاکیزہ ماحول میں یک جا دکھانا اور دھندلی اشیا کو نتھری نتھری صفا میں واضح طور پر نگاہوں کے سامنے لانا ، یعنی ان کی حقیقت کو الم نشرح کرنا ۔ اسی طرح آئینہ کا مظہر کمال اور جوہر پرور ہونا ، اس کا زینت و آرائش کا ذریعہ بننا اور پھر حیرت کی گوناگوں کیفیتوں کی آئینہ داری کرنا ۔ علاوہ ازیں اس کی منفی صفات بھی کم اہم نہیں ۔ آئینہ میں صرف عکس کا نظر آنا اور منعکس ہونے والی شے کا اس سے ماورا رہنا اور پھر عکس کا آئینے سے کوئی حقیقی تعلق نہ ہونا ، اس کا نفس یا معمولی سے غبار سے مکدر ہو جانا ، اس کی حراش پذیری اور زنگ پذیری ، نزاکت وجود اور شکست آمادگی وغیرہ تمام منفی صفات سے بھی بیدل نے کئی مطالب پیدا کیے ہیں جن کا تعلق محض خیال آفرینی سے نہیں بلکہ بڑے بڑے بالشان علمی مسائل ہیں جو با کمال شاعر نے زبان شعر سے بیان کیے ہیں ۔

آئینہ کے سلسلے میں جن مسائل مہمہ کی طرف اشارہ ہوا ہے ان کا ذکر بعد میں آ رہا ہے ۔ یہاں اس سے ماخوذ ترکیبات کے متعلق کچھ کہہ دینا مناسب ہے ۔ الفاظ وہ جامہ ہیں جو افکار و خیالات زیب تن کرکے صورت مجاز میں نمودار ہوا کرتے ہیں ۔ یہ جامہ پہننے سے پہلے معانی اپنی تجریدی صورت میں ہمارے ادراک کے سامنے اس طرح آتے ہیں جس طرح بجلی کوندتی

ہے ۔ یہی ایک چمک سی آن بھر کے لیے وسعت آباد ذہن میں نمودار ہوتی ہے ۔ اعلیٰ سے اعلیٰ اور پاکیزہ سے پاکیزہ خیالات بعض اوقات خاص لمحات میں عام لوگوں کے دلوں میں بھی پیدا ہوتے ہیں لیکن نہ تو وہ ان کی اہمیت سے آگاہ ہوتے ہیں اور نہ ہی انھیں الفاظ کا موزوں جامہ پہنا کر محفوظ کر سکتے ہیں ۔ صحیح القدر ادیب یا شاعر انھیں موزوں ترین الفاظ کے ذریعے محفوظ کر لیتے ہیں اور پھر یہ خیالات نوعِ انسانی کا بہترین سرمایہ بن جاتے ہیں ۔ چوں کہ خیالات اور معانی الفاظ کا مناسب ترین لباس زیبِ تن کرتے ہیں اس لیے معانی اور الفاظ میں کوئی تفاوت نہیں رہ جاتا ۔ 'حسن نقاب تو اوڑھتا ہے مگر اس کے انوار ایسے دل کش انداز سے چھن چھن کر باہر آتے ہیں کہ نقاب صرف افزائشِ حسن کا موجب نہیں بنتا بلکہ عین حسن ہی جاتا ہے ۔ بیدل کہتے ہیں :

تفاوت در نقاب و حسن جز نامی نمی باشد
خوشا آئینۂ صافی کہ لیلیٰ دید محمل را

یعنی دیکھنے والے محملِ الفاظ سے لیلائے معانی کے حسنِ روز افزوں کا تماشا کرتے ہیں ۔

عالی فطرت شعرا کا ذہن بےحد معنی آفریں ہوتا ہے ۔ تخلیقی تجربے کے وقت اُن کے احساسات اور جذبات بڑھتے ہوئے طوفان کی طرح لحظہ بہ لحظہ پھیلتے جاتے ہیں ۔ اُن کے خیالات میں بڑی تیزی سے بالیدگی ہوتی ہے اور جیسے جیسے شاعر پر یہ وسعت پرور کیفیت طاری ہوتی ہے الفاظ ساتھ دینے کے لیے اپنے دامن کو وسیع تر کرنا شروع کر دیتے ہیں ۔ گویا وفورِ گل اُن کے دامن کو دراز تر کر دیتا ہے ۔ معانی اور مطالب کی بالیدگی سے اس طرح زبان میں بھی وسعت پیدا ہوتی ہے ۔ نئے نئے الفاظ پیدا ہوتے ہیں ۔ اظہار و بیان کے جدید تقاضے نئی سے نئی موزوں تراکیب کو جنم دیتے ہیں ۔ زبان اس طرح پھیل کر معانی کی جولاں گہ بن جاتی ہے ۔ بیدل اس حقیقت کو بڑی خوبی سے یوں بیان کرتے ہیں :

جولانگہ اسرارِ معانی است عبارت
چندانکہ پری ناز کند شیشہ بناند

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ زبان کی وسعت پذیری وفورِ خیالات کا پورا پورا

سانپ دیتی ہے ۔ بالخصوص اذہان نابغہ کو تو بعض اوقات ایسے ایسے نادر، اس قدر تازہ اور انیے پہلو دار خیالات سوجھتے ہیں کہ ان کو ادا کرنے سے زبان کے موزوں سے موزوں پیمانے بھی عاجز آ جاتے ہیں ۔ اور پھر شعرا کو تو وزن، قافیہ اور ردیف کی دقتیں بھی در پیش ہوتی ہیں، اس لیے ہر خیال اور ہر جذبہ الفاظ میں نہیں سما سکتا ۔ الفاظ کا جامہ اس قدر تنگ ہوتا ہے کہ وجود معانی اس سے باہر نکل نکل پڑتا ہے ۔ معانی بے پردہ رہ جاتے ہیں ۔ شاعر کو درد ہوتا ہے کہ اس کی نوا ساز الفاظ میں سما کر پوری طرح مترنم نہ ہو سکی ۔ بیدل لفظ آئینہ کے التزام سے فرماتے ہیں :

بے پردگیِ معنی آئینہ لفظ است
فریاد کہ در ساز نگنجید نوایم

ظاہر ہے خیالات آگے آگے رہتے ہیں اور پیرایہ ہائے بیان پیچھے پیچھے ۔ اس طرح زبان ہر آن اور ہر لحظہ ترقی پذیر رہتی ہے ۔

بیدل کو بھی اظہار و ابلاغ کی مذکورہ بالا ضروریات عمر بھر پیش آتی رہیں ۔ انھوں نے زندگی کے آخری لمحات تک تخلیق کا کام پوری آن بان کے ساتھ جاری رکھا ۔ اس لیے ان کی وجہ سے زبان کو جو بالیدگی حاصل ہوئی ہے اس کا صحیح معنوں میں احساس بہت کم افراد کو ہوا ہے ۔ وہ اپنے معاصر تازہ گو شعرا کی طرح بے کار اظہار صنعت اور بے سود حسن عبارت کے قائل نہیں تھے ۔ معانی کا ایک طوفان تھا جسے انھوں نے الفاظ کے تنگ پیمانے میں بند کرنے کی نہایت کامیاب کوشش کی ۔ اگرچہ وہ اپنی اس کوشش سے مطمئن نہ ہوئے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی اس عرق ریزی اور تلاش الفاظ کی وجہ سے جدید تراکیب کا ایک ذخیرۂ عظیم جمع ہو گیا ۔ نقید نگار اسلوب بیان میں ابلاغ کے اس تصور کو مغرب کا تحفہ سمجھتے ہیں لیکن آج سے اڑھائی سو سال پہلے بیدل اس تصور سے پوری طرح آشنا تھے ۔ کہتے ہیں :

عرض مطلب دیگر و اظہار صنعت دیگر است
بیدل از آئینہ نتوان ساخت وضع جام را

یہی وجہ ہے کہ اپنی محبوب ترین علامت یعنی کلمہ "آئینہ" کے سلسلے میں بھی انھوں نے بیسیوں نئی تراکیب وضع کی ہیں ۔ ذیل میں چند ایک کی نیرنگی ملاحظہ فرمائیں

چشمۂ آئینہ ، کسوتِ آئینہ ، صورتِ آئینہ ، عرصۂ آئینہ ، ملکِ آئینہ ، سرابِ آئینہ ، جوہرِ آئینہ ، صفحۂ آئینہ ، خانۂ آئینہ ، رخِ آئینہ ، سراپائے آئینہ ، بہارِ آئینہ ، کنارِ آئینہ ، چشمِ آئینہ ، جمالِ آئینہ ، تمنائے آئینہ ، خلوتِ آئینہ ۔

آئینہ رو ، آئینہ زار ، آئینہ تماشا ، آئینہ تمثال ، آئینہ بارگاہ ، آئینہ ہوس ، آئینہ جوش ، آئینہ ساں ، آئینہ مشرب ۔

آئینۂ وحدت ، آئینۂ اسرار ، آئینۂ مہتاب ، آئینۂ موہوم ، آئینۂ لطف ، آئینۂ نار ، آئینۂ جاں ، آئینۂ حسن ، آئینہ پوش ، آئینۂ تحقیق ۔

ان ترکیبات کا تعلق تشبیہ و استعارہ سے بھی ہے اور کنایہ اور مجازِ مرسل کا حسن بھی یہاں نظر افروزی کرتا ہے ۔ علاوہ بریں بیدل کے عہد میں اظہارِ کثرت کے لیے عجیب و غریب ترکیبات وضع ہو رہی تھیں ۔ مثلاً خود بیدل کہتے ہیں :

بیدل از مشتِ غبارِ حسرت آلودم مپرس
یک بیابان خار خارم یک نیستان نالہ ام

اسی بنا پر ایک اسی قسم کی حسین و حسیں ترکیب ان کے ہاں آئینہ کے سلسلے میں بھی موجود ہے :

صافیِ دل بے نیازم دارد از عرضِ کمال
حیرتے گشتم رہ صد آئینہ جوہر زدم

یک بیابان خار خار ، یک نیستاں نالہ ، صد آئینہ جوہر کی حسن آفریں تراکیب کو پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ اگر بیدل نے عبارت آرائی سے کام لیا ہے تو وہ بھی دراصل معنی پروری اور معنی آفرینی ہے ۔ اسی لیے ان کا یہ دعویٰ بالکل درست ہے :

حاصلِ معنیست با حسنِ عبارت ساختن
کعبہ جویاں رو بہ خاکِ پائے بت آوردہ اند

کجاست مشتریِ لفظ و معنیِ بیدل
پری متاعم و دکانِ شیشہ گر دارم

سطورِ بالا سے ظاہر ہے کہ بیدل کی جدید تراکیب معانی کی پیداوار ہیں لیکن آئینہ کے سلسلے میں ان کی نیرنگی ایک خاص حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے ۔ اور اگرچہ اسی سلسلے میں تصریحاتِ بالا خاصی روشنی ڈال رہی ہیں ، تاہم اس کے

متعلق چند لمحات کے لیے مزید غور کر لینا ضروری نظر آتا ہے تاکہ یہ خیالات ایک مربوط سلسلۂ فکر میں منضبط ہو جائیں۔ ایک ذکی الحس اور دقیقہ رس انسان جب کسی چیز کو دیکھتا ہے تو اس کی کوئی خاص صفت عجیب معنوی اہمیت کے ساتھ اس کے ذہن میں قرار پکڑ لیتی ہے۔ یہی وہ صفت اس چیز سے علیحدہ ہوکر ایک تجریدی خیال کے طور پر اس کے ذہن میں موجود ہوجاتی ہے۔ یہ تجریدی خیال ایک نقطۂ خیال کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور جس طرح مقناطیس فولاد کے ذرات کو ریت کے ڈھیر میں سے اپنے اردگرد جمع کرتا چلا جاتا ہے، اسی طرح اس نقطۂ حادثہ کے اردگرد مشاہدات سے حاصل کردہ ہم جنس خیالات کی ایک بہت بڑی تعداد جمع ہو جاتی ہے۔ یہ تعداد محض گنتی کے اعتبار سے زیادہ نہیں ہوتی بلکہ چوں کہ یہ خیالات ہم جنس ہوتے ہیں، ایک دوسرے سے پیوست ہوکر مذکورہ بالا نقطۂ حادثہ کی نشو و نما کا موجب بنتے ہیں۔ اور یہ بالکل اسی طرح ہوتا ہے جس طرح ہر نیا لقمہ اپنی غذائیت بدن میں تحلیل کر کرنے کے بعد بدن کو تازہ قوت اور توانائی عطا کرتا ہے۔ اس بنیادی تجریدی خیال کی قوت اور توانائی میں اس طرح برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے، حتیٰ کہ یہ پھیل کر آفاق گیر ہو جاتا ہے اور اس کے افکار کا سلسلۂ دوار تمام حقائق کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ یہ سلسلۂ افکار عمر بھر ذہن اور خیال میں تموج پیدا کرتا رہتا ہے اور سے انسان کی شخصیت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ مربوط افکار کا یہ تانا بانا در اصل انسان کا معنوی وجود ہی ہوتا ہے اور زندگی اس کے بغیر متصور ہی نہیں ہو سکتی۔

مرور ایام سے آئینہ کی صفات بھی اسی طرح بیدل کے جامع معنوی وجود کے مترادف بن گئیں۔ بنیادی طور پر آئینہ کا کام کسی چیز کو واضح طور پر نگاہوں کے سامنے لا کھڑا کرنا ہے۔ یعنی اس طرح ظاہر کر دینا کہ وہ من و عن آنکھوں کے سامنے موجود ہو جائے۔ توضیح اور اظہار کی یہ بنیادی خوبی بیدل کے ذہن میں کسی عجیب انفعالی کیفیت کے ساتھ ایک تجریدی خیال کی صورت اختیار کر گئی اور ہولے ہولے یہ خیال ایک توانا سلسلۂ افکار میں تبدیل ہو گیا۔ تخلیقی تجربے کے وقت شاعر کی پوری شخصیت میں تہیّج رونما ہوا کرتا ہے۔ اس لیے لازماً ایسے مواقع پر بیدل کے اس سلسلۂ افکار میں بھی ایک ہل چل نمودار ہو جایا کرتی تھی۔ اور آئینہ سے تعلق رکھنے والے تمام خیالات جو ویسے

وجودِ معنوی میں محوِ خواب رہتے تھے ، یک لخت بیدار ہو جایا کرتے تھے ۔ اب ایک ایسے تخلیقی تجربے کے وقت شاعر کی چشمِ تصور کے سامنے مختلف مظاہر آ رہے ہیں ۔ اور اگر اُن کی دو جہتوں کا کوئی نہ کوئی پہلو توضیح اور اظہار کے اُس معیار سے کسی نہ کسی حد تک مشابہت رکھتا ہے جو آئینے سے تعلق رکھنے والے افکار کو حاصل ہے تو شاعر کے قوی تاثر کی بنا پر یہ مشابہت تشبیہات اور استعارات کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ چوں کہ تجربہ تخلیقی بالکل تازہ ہوتا ہے اور ایک تازہ لمحے میں خاص خاص حقائق شاعر کی شخصیت کے آئینے کے سامنے جلوہ گر ہو رہے ہوتے ہیں ، اس کا ذہن وقتی تاثر کی بنا پر مشابہت اور مناسبتِ افکار کے نئے نئے پہلو دیکھتا ہے اور ان پہلوؤں کو زبانِ قلم سے بیان کرنے کے لیے نئے الفاظ کی ضرورت محسوس کرتا ہے ، جو شاعر الفاظ کے نئے رابطے قائم کر کے وضع کرتا ہے ۔ اگرچہ فکری مشابہت کے کئی پہلو پوری طرح اس کی گرفت میں نہیں آتے مگر بسا اوقات وہ نہایت معنی خیز اور نادر تراکیب تلاش کر لیتا ہے ۔ اس طرح بے شمار جدید ترکیبات وضع ہو جاتی ہیں اور تجربہٴ تخلیقی کی تازگی اور جدت کی وجہ سے بدرجہٴ اتم تازہ اور جدید ہوتی ہیں ۔ بیدل کے ہاں آئینے سے تعلق رکھنے والی معنی خیز اور حسن پرور انوکھی ترکیبات کی حقیقی وجہ یہی ہے ۔

ہر شاعر کی نگاہ بنیادی طور پر حسن پرور اور معنی آفریں ہوتی ہے ۔ حسن جس رنگ میں نظر آئے ، انسان کا دل بے اختیار اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے اور نئے نئے معانی اُسے جہاں بھی دکھائی دیں ، اُس کا فطری تجسس اُسے وہاں کشاں کشاں لے جاتا ہے ۔ اور شاعر چوں کہ عام انسانوں کی نسبت بدرجہا زیادہ ذکی الحس ہوتا ہے اس لیے اس کی طبیعت میں ان دونوں صفات کا ایک نرالا ہی عالم ہوتا ہے ۔ وہ گویا انسان کی حسن پروری اور معنی نوازی کا مظہرِ کامل ہوتا ہے ۔ اس کے سلسلہٴ افکار میں یہ دونوں صفات زندگی اور حرارت پیدا کرنے کا موجب بنتی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ آئینہ کے سلسلے میں بیدل کے فکر و احساس نے حسن اور معنی کی ایک نئی دنیا نگاہوں کے سامنے جلوہ گر کر دی ہے ۔ جیسا کہ اس سے پہلے کہا جا چکا ہے ، ہم اس ضمن میں بیدل کے مطالبِ مبہم کا مطالعہ کرنے والے ہیں لیکن موجودہ ادبی اور لسانی مباحث کی مناسبت کے زیرِ نظر پہلے ہم اس کی حسن آفرینی کا نظارہ دیکھتے ہیں ۔

بیدل کے نظریہٴ اسلوب و جمال کے سلسلے میں حیرت انگیز امر یہ ہے کہ

وہ مشرق کے تمام معاییر تنقید کے بھی بڑے ماہر ہیں اور ان کے کلام میں وہ تمام خوبیاں اپنے کمال پر نظر آتی ہیں جو یکے بعد دیگرے اساتذۂ قدیم کے ہاں شروع سے موجود رہی ہیں۔ ساتھ ہی چونکہ بیدل کی زبان کے داخلی اسرار کو بیدل بہ وجوہ احسن سمجھتے ہیں اس لیے مغرب کے ائمۂ تنقید جو کچھ کہتے ہیں اُس کا تذکرہ بھی وہ اس عمدگی سے کرتے ہیں کہ انسان پڑھ کر محوِ حیرت ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مغرب کے علمائے تنقید کا جو اندازِ فکر ہے، وہ ہمارے لیے کوئی نئی چیز نہیں، بشرطیکہ ہماری نگاہ کے سامنے وہ تمام آرا موجود ہوں جو ہمارے شعرائے قدیم نے اپنے اسلوب اور نظریۂ خیال کے متعلق اپنے کلام میں بیان کر دی ہیں۔

حسنِ خیال کی کیا حقیقت ہے اور اس میں داخلیت کا عنصر زیادہ ہوتا ہے یا خارجیت کا؟ دوسرے الفاظ میں تخلیقِ خیال کی حیثیت معروضی ہے یا موضوعی؟ اس مسئلے پر مغرب میں خوب بصیرت افروز مباحثے ہوتے رہے ہیں۔ بیکن (Bacon) (۱۵۶۱ء-۱۶۲۶ء) نے بڑی معنی خیز بات کہی تھی کہ تخلیقِ خیال قدرت اور انسان دونوں کی مرہونِ منت ہے۔ حسین اور رنگین مناظر جب شاعر کی فطرت میں پنہاں حسنِ خیال سے آب و تاب حاصل کرتے ہیں تو تخلیق کا وہ کمال نگاہوں کے سامنے آتا ہے جسے ہم معجزۂ فن سے تعبیر کرتے ہیں۔ مغرب میں آج بھی علمائے تنقید احساسِ خیال میں خارجی عناصر کے متعلق وہی کچھ کہہ رہے ہیں جو بیکن[1] (Bacon) نے کہا تھا۔ اب قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ مشرق کے عظیم شاعر بھی میرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی نے بھی اس اہم مسئلے کے متعلق سترھویں صدی عیسوی کے ربع آخر کے لگ بھگ یہی کچھ کہا۔ فرماتے ہیں:

بیدل اثری بردہ از یادِ خرامش
طاؤس بروں آ کہ خیالِ تو چمن شد

بلکہ ذاتی طور پر میرا تو یہ بھی خیال ہے کہ اگر اس شعر کے تمام الفاظ پر پوری طرح غور کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ بیدل نے ان مطالب کی طرف بھی اشارے کر دیے ہیں، جو اس مسئلے میں مغرب کے تنقید نگار بیکن (Bacon)

۱- پروفیسر محمد شریف (تخلیقِ حسن)، صفحہ ۸۹۔

کے بعد کہتے رہے ہیں ۔ شعر میں محبوب کے حسن پرور حرام کا ذکر ظاہر کرتا ہے کہ فنی لحاظ سے تخلیق حسن میں صنف لطیف کی رعنائیوں کا بڑا دخل ہے اور یہ فرائڈ (Freud) کے نظریہ تخلیقِ حسن کی تائید ہے ۔ پھر کئی تنقید نگار اس بات پر متفق ہیں کہ حسین اور دل کش مناظر کو دیکھتے ہی عملِ تخلیق شروع نہیں ہو جاتا ، بلکہ وہ منظر عملِ بصارت کے ذریعے ہمارے حافظے میں پہنچ کر محفوظ ہو جاتا ہے اور پھر کسی اثر انگیز لمحے اس کی "یاد" شاعر کے باطن میں ایک عجیب تہیج پیدا کر دیتی ہے ۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ تصور اس مکمل منظر کو نگاہوں کے سامنے لا کھڑا کرے بلکہ بعض اوقات کی کیفیتوں میں اس منظر کی کوئی ایک ادا طبیعت میں ہلچل ڈالنے کے لیے کافی ہوتی ہے ۔ کسی حسین سجے خارجی حسن کی کوئی حسین ادا یاد آئی اور شاعر کے اس وسعت پرور نقطہ جذبہ میں تحریک پیدا ہو گئی جس کے ارد گرد حسین یادوں کے بے شمار تصورات جمع ہیں ۔ اسی طرح دو ہی انگیخت سے شاعر کے تمام تصورات میں انتہائی رنگین کی کیفیت پیدا ہو گئی ، تخیل کو بال و پر لگ گئے اور شاعر کا ہمہ حلقہ خیال چمن آفریں اور چمن پرور بن گیا ۔ لیکن شعر صرف اسی بات پر قائم نہیں کہ حسین یادوں نے اس کے خیال کو چمن پرور بنا دیا ۔ اس شعر میں ضمیر مخاطب کا بار بار استعمال اس بات پر زور دے رہا ہے کہ ایسے لمحات میں شاعر کی اپنی شخصیت بھی اپنی پوری رنگینی اور رعنائی کے ساتھ جلوہ آرا ہوتی ہے ، کیوں کہ اس کے بغیر تخلیق حسن ناممکن ہے ۔ یہ تو ممکن ہے کہ نقالی ہو جائے مگر معجزۂ فن کا امکان شاعر کی اپنی فطرت کی رنگ آمیزی کے بغیر ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا ۔ "بروں آ" کی ترکیب عملِ تخلیق میں اس حرکی عنصر کی طرف اشارہ کر رہی ہے جسے اہلِ مغرب محسوسات حرکی (Motor Sensa ions) سے تعبیر کرتے ہیں ۔ اس تمام بیان سے ظاہر ہے کہ تخلیق حسن میں شاعر کی اپنی معنویت بہت زیادہ دخیل ہوتی ہے ۔ ہیگل (Hegel)[1] بھی یہی کہتا ہے ۔ یہاں مغرب کے حکما کا تذکرہ کر کے بیدل کی عظمت کو ظاہر کرنا مقصود نہیں ۔ بیدل ان باتوں سے بے نیاز ہیں ۔ ان کی عظمت ان سہاروں پر قائم نہیں ۔ مطلوب صرف

۱۔ اس موضوع پر پروفیسر محمد شریف کے محولہ بالا انگریزی رسالے کا بالاستیعاب مطالعہ ضروری ہے ۔

یہ ظاہر کرتا ہے کہ بیدل کا جمالیاتی شعور بڑا جامع ہے اور اسی سے آئینہ کی علامت کے سلسلے میں انھوں نے اس کا بڑا شان دار مظاہرہ کیا ہے۔

آئینہ میں مظہر جمال بننے کے بے پناہ امکانات مضمر ہیں ۔ اس کی آب و تاب ، اس کی ہموار سطح اور اس کے اندر منعکس ہونے والی اشیا میں بیرونی مناظر کی نسبت کئی گنا زیادہ دل کشی اور جاذبیت کا پیدا ہو جانا اور پھر اس کی صورت جو حیرت و استعجاب اور وحشت کے جذبات کی تجسیم ہے ، یہ تمام امور ایسے ہیں جن سے ایک شاعر کا ذہن خلاق حسن کے شہکار پیدا کر سکتا ہے ۔ آئینہ کی یہ تمام صفات بیدل کے ذہن میں موجود تھیں ۔ آن کے تخیل نے ان جمال پرور صفات کو لے کر وہ جولانی دکھائی ہے جو شاذ و نادر دید و شنید میں آئی ہو گی ۔ بے شک وہ حکیم ہیں اور تصوف سے بھی انھیں بے انتہا دل چسپی ہے ، لیکن ان کا شاعرانہ ذہن ان تمام افکار کو جب ادراک کی وحدت[1] میں پروتا ہے تو اعلیٰ درجے کی شاعری جنم لیتی ہے اور اُس کا ایک نمایاں پہلو حسن آفرینی بھی ہوتا ہے ۔ حسن عبارت کی طرف ان کا پر زور میلان بنیادی طور پر ان کی حس جمال کا مرہون منت ہے ۔ انھوں نے نظم اور نثر دونوں میں ایسے جواہر پارے چھوڑے ہیں جو جمالیاتی نقطۂ نگاہ سے بے حد اہم ہیں ۔ اُن کی تصنیف 'چہار عنصر' میں نثر پر مشتمل بہاریہ ، 'محیط اعظم' میں بہاریہ اشعار ، 'تمام کی تمام مثنوی 'طور معرفت' ، ان کی غزلیات کے بے شمار اشعار اور پھر بہت سے قطعات ایسے ہیں جو خاصتاً جمالیاتی حیثیت سے بڑے گراں قدر ہیں ۔ ان تمام امور کو سامنے رکھ کر بیدل کی حس جمال پر ایک بڑا معنی خیز رسالہ (یعنی Thesis) قلم بند کیا جا سکتا ہے مگر اس وقت ہمارا موضوع مطالعہ صرف آئینہ ہے ۔

آئینہ کے سلسلے میں سادہ ترین صفت اس کی صفائی اور آب و تاب ہے ۔ بیدل اس کو لے کر خوب سطر کشی کرتے ہیں ۔ مثنوی 'محیط اعظم' میں بہاریہ کے یہ دو شعر ملاحظہ فرمائیں :

۱ آئینہ پردازیٔ نوبہار — تجلی است از باغ دہر آشکار
چمن و خار از بس طراوت بمست — چو آئینہ دیوار جوہر نما ست

یہ اُس آب و تاب ، درخشندگی اور طراوت کا بیان تھا جو آمد بہار پر چہروں

۱- ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ کا نظریہ : متحدہ ادراک ۔

طرف چشمک زنی شروع کر دیتی ہے لیکن آئینہ کی چمک دمک اپنے کمال پر اسی وقت نظر آتی ہے جب بیدل شرابِ معرفت کے اثرات بیان کرتے ہیں ۔ اب چونکہ کلام میں ان کی محبوب کا نعکاس بھی ہو رہا ہے اس لیے آئینہ کی چمک دمک میں بھی بے حد فروغ پایا جاتا ہے ۔ فرماتے ہیں :

گر آئینہ رو ناہد از ساغرش　　　زند موجِ تارِ نظر جوہرش
ارو جبہہ' جام خورشید تاب　　　وزو شیشہ' آئینہ آفتاب

معرفت بیدل کی روح ہے ، اسی لیے انعکاسِ نور کے لحاظ سے آخری شعر میں لفظ آئینہ کمالِ اشراق کا مظہر ہے ۔ بیدل اگر محض تدریجی مناظر کی نقاشی کرتے تو ممکن ہے آئینہ اس طرح چشمہ' نور نہ بنتا ۔ اسی مثنوی محیط اعظم میں اس طرح کا ایک شعر صراحی کے متعلق بھی ہے :

ز صافی چو آئینہ' بے غبار　　　توان دید رازِ دلش آشکار

اب ہم اس ضمن میں مثنویِ 'طورِ معرفت' کو لیتے ہیں ۔ اس میں حباب کی نقاشی اس طرح کی گئی ہے :

چو او تنوان صفائی سینہ دادن　　　نفس را صیقلِ آئینہ دادن

اس شعر میں حباب صوفی کے لیے بطور علامت موجود ہے ، اسی لیے احساس میں خاصی گرمی پیدا ہو گئی ہے ۔ اس مثنوی میں کوہستان بیراٹ میں بارش کا ذکر کرتے ہوئے چمکتے ہوئے بادلوں میں سے گرنے والے بے شمار آبدار قطروں کی منظرکشی بیدل اس طرح کرتے ہیں :

بہ تعمیرِ دلِ مستان روانہ
شکستِ یک جہان آئینہ خانہ

ذرا ملاحظہ فرمائیے ، محولہ بالا اعداد ِ ادراک نے اس شعر کو کس قدر قیامت آفریں بنا دیا ہے ۔

یہ نور کا تذکرہ تھا ، اس میں رنگ کی آمیزش نہیں تھی ۔ معلوم ہوتا ہے بیدل کو سبز رنگ سے اتنی زیادہ دل چسپی نہیں ۔ چارپہ 'محیط اعظم' میں آئینہ کی رعایت سے سبز رنگ سے متعلق یہ شعر ملتا ہے :

غبارِ تبسماست در سینہ سبز
چو طوطیست جوہر در آئینہ سبز

یہ مصرعے کی ہمہ گیری کا تذکرہ تھا ، یہاں طوطی اور آئینہ کی رعایت سے لطف پیدا کیا گیا ہے اور معنی آفرینی کی گئی ہے ۔ اسی قسم کا ایک شعر مثنوی 'طورِ معرفت' میں بھی ہے ۔

ز اطرافِ سبز جو سبزہ در جوش
کشودہ طوطی از آئینہ آغوش

ان دونوں شعروں میں دیکھیں ، کیسا لطیف اور طربیہ استعارہ موجود ہے ۔ بیدل کے کلام میں اس قسم کے استعارے بڑی کثرت سے ملتے ہیں ۔ حسن آفرینی کا یہ عالم بہت کم شعرا کے ہاں ہوگا ۔

میر کی بہ نسبت بیدل کو گلابی رنگ بڑا مرعوب ہے ۔ وہ بڑے مسحور ہوکر اس رنگ کا ذکر کرتے ہیں ۔ اس رنگ کی ساحرانہ کیفیت انعکاس کی وجہ سے دو چند ہو جاتی ہے ۔ گلاب کا پھول اور اس کا آئینے میں عکس اسی بنا پر ان کے لیے بے حد جاذبِ نظر اور دل کش ہے ۔ ایک جگہ ساقی سے شرابِ معرفت کا مطالبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر عطا ہو جائے تو میں مجسم جوش و مستی اور رنگینی و رعنائی بن جاؤں :

بہ جوشم چو اندیشہ از رازِ گل
شوم چون دلِ آئینہ پرمِ گل

ایک اور مقام پر جام میں شراب کا ذکر کرتے ہوئے ایک لطیف اور طربیہ تشبیہ سے یوں حسن پروری کرتے ہیں :

جمالِ سخن راست آئینہ دان
چو گل ساغرِ رنگ را آشیان

اسی طرح مثنوی 'طورِ معرفت' میں یک جگہ گلستاں کا منظر کھینچتے ہوئے اس طرح رنگ آمیزی کی ہے :

نشیمن ها همه آئینہ تعمیر
ز عکسِ لالہ و گل صبحِ کشمیر

دیکھیے ، تخلیقِ حسن کے لحاظ سے ایک سے ایک شعر بڑھ چڑھ کر آ رہا ہے ۔ یہ شعر چشمِ تصور کے سامنے آئینہ سے تعمیر شدہ ایسے نشیمن موجود کر دیتا ہے جو عکسِ لالہ و گل کی وجہ سے صبحِ کشمیر کا منظر پیش کرتے ہیں ۔ صبح کبھی آئینہ پرور نہیں ہوتی مگر کشمیر کی تلمیح نے اسے کس قدر رنگین اور درخشاں

بنا ڈالا ہے اور اس کی وجہ سے سارا شعر کس قدر دل سوز اور دل آویز بن گیا ہے ۔

بیدل کی گلابی رنگ سے مسحوریت اپنے کمال پر نظر آتی ہے ، جب اس کا تعلق روئے محبوب سے تشبیہ یا استعارے کی صورت میں قائم ہو جاتا ہے ۔ ان کی ایک جمالیاتی غزل کا مصرع ہے .

زروئت آئینہ صفحۂ گل ز گیسوت شانہ موجِ سنبل

کس قدر والہانہ انداز ہے ! اسی طرح ایک مطلع ہے :

ای تماشایت چمن پرورِ چشمِ آئینہ
بی تو خس می پرورد جوہرِ چشمِ آئینہ

یہاں آئینہ میں روئے محبوب کی بہار دیدنی ہے ۔ روئے محبوب پر اگر قطراتِ عرق ہوں اور عکس آئینے میں پڑ رہا ہو تو بیدل کہہ اٹھتے ہیں :

کرد طوفانہا بہشت و کوثر اندر آئینہ

محبوب کی چشمِ مخمور بھی آئینے میں جلوہ گر ہو کر عجیب انداز سے حسن پروری کرتی ہے :

بچشمِ آئینہ تا جلوہ گر شد چشمِ مخمورت
ز مستی چون مژہ بر یک دگر افتاد جوہرہا

محبوب کا حسن، رنگینی و رعنا آئینے میں منعکس ہو کر اس قدر شدید جمالیاتی[1] تاثر پیدا کرتا ہے کہ بیدل کے تصورات اس سے لبریز ہیں اور اسے ہم

۱۔ لفظ آئینہ کے بغیر بیدل کے اس جمالیاتی تاثر کا اندازہ لگانا ہو تو ان کے مندرجہ ذیل اشعار کا مطالعہ کریں :

زہے بہ شوخیِ بہارِ رنگت شکستہ رنگِ غرورِ امکان
دو نرگست قبلہ گاہِ مستی دو ابروت سجدہ گاہِ مستان
سخن ز لعلِ تو گوہر آرا نگہ ز چشمِ تو بادہ پیما
صبا ز زلفِ تو رشتہ برپا چمن ز روی تو گل بدامان
بغمزہ سحری ، بناز جادو ، بہ طرہ افسون ، بہ قد قیامت
بخط بنفشہ ، بزلف سنبل ، بہ چشم نرگس ، برخ گلستان
چمن بعرضِ بہارِ نازت در آتشِ رنگ گل فروشی
سحر ز گل کردن عرق‌ہا بعالمِ آبِ شبستان

ان کی ہر تخلیق میں نمایاں طور پر دیکھ سکتے ہیں ۔ 'محیط اعظم' میں وصف مے خانہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں :

بساطش چو آئینہ' روی' حور
ز موج صفا جام لبریز نور

جام میں شراب دیکھ کر کہتے ہیں :

ز آئینہ اش موج می آشکار
چو خواب پریشان چشم نگار

اسی طرح ایک جگہ ساقی کو قسم کھا کر خلوص اور شدت آرزو کا اس طرح یقین دلاتے ہیں :

بصبحی کہ آئینہ' روی تست
بشامی کہ درچین گیسوی' تست

صبح اور شام کے تضاد ، صباحت چہرۂ دلدار اور لب ہائے لعلیں کی طرح شام پرور افق کے کناروں پر شفق کی رنگینی نے کئی رنگوں کی آمیزش سے کیسی طلسماتی تصویر کھینچی ہے ۔ اور حس جذبے سے شعر سرشار ہے اُسے بھی ساتھ شامل کر لیا جائے تو ادراک کتنا تہ در تہ نظر آتا ہے ۔

لیکن ذاتی طور پر میرا خیال ہے ، رنگ و نور کے باہمی پیچ در پیچ امتزاج کے باعث بیدلؔ کے احساس جمال کا جو عالم ان کی مثنوی 'طور معرفت' میں ہے وہ اور کہیں نہیں ۔ اس مثنوی کو لکھتے ہوئے جذبات کی وہ فراوانی تھی کہ بمشکل کہیں اور دکھائی دے گی اور خیالات میں وہ آمد تھی کہ آدمی دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے ۔ بارہ سو اشعار کا یہ شہکار صرف دو روز میں تیار ہو گیا ۔ برسات کے وقت بادلوں کی منظر کشی کرتے ہوئے تاثر میں گہرائی پیدا کرنے کی غرض سے بطور استفہام کہتے ہیں :

چہ ابری؟ آئینہ' ناز گل و مل
بہار صد شبستان زلف و کاکل

دوسرے مصرع میں اظہار کثرت کے لیے معنی پرور اور حسن آفریں ترکیب دیکھیں ۔ لیکن قوس قزح کا حسن رنگین و لطیف بیان کرنے کے لیے بیدلؔ کے قلم سے اس مثنوی میں جو شعر نکلا ہے ، وہ اپنی نظیر آپ ہے ۔ آئینہ کی

حقیقی اور جس لطیف کے حسن کی نیرنگیاں اس شعر میں ایسے معراج پر دکھائی دیتی ہیں ، اور شعر میں اس قدر بےساختہ پن ہے کہ بیان میں ہو سکتا ۔ اب قوسِ قزح کو نگاہوں کے سامنے رکھ کر یہ شعر سنیے :

کہ وا کرد ست بر آئینہ آغوش
کہ عکسش کرد عالم را چمن پوش

حسن پروری کے معاملہ نگاہ سے مثنوی طورِ معرفت ایک قدم اور آگے بڑھاتی ہے ۔ شعر و شاعری کے حق میں اپنے شہرۂ آفاق مقالے میں شیلے کہتے[1] ہیں :

"شاعری دنیا کے پوشیدہ حسن پر سے نقاب اٹھاتی ہے اور مانوس چیزوں کو اس انداز سے پیش کرتی ہے ، گویا ہم ان سے واقف نہ تھے ۔"

بیدل نے بھی مثنوی 'طورِ معرفت' میں حسنِ پوشیدہ کو بےنقاب کیا ہے اور اس کے تخیل نے بعض عام اور مانوس اشیاء میں وہ پری زاد پنہاں دیکھے ہیں جو آج تک کسی کی نگاہوں کے سامنے نہیں آئے ۔ کوہ بیراٹ کے سنگ و خشت کا آب و رنگ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں :

ز آب و رنگِ هر سنگ و خشتی
نقابی چهرهٔ زارِ بهشتی
دلِ هر ذره اش تخمِ بهاری
کجا سنگ و چه خشت آئینه زاری

به چشمت هر کجا خشت و سدلیست
زیارت گاهِ عشق و حالیست
به دل تا کی توان رنگِ هوس کاشت
که اسکندر غریب آئینه داشت
حقیقت تا سرِ اظهار دارد
ازین آئینه ها بسیار دارد

۱- Defence of Poetry از شیلے ۔

بیدل :

نہں ہر خاک صد گلشن در آغوش
کف ہر خاک صد آئینہ بر دوش
بہ کوشش از صدای طبع خارا
شرر چون جوہر از آئینہ پیدا

علاوہ ازیں پروفیسر محمد شریف[1] اس بات کا ذکر کرتے ہوئے کہ ما بعد الطبیعی حسن معروضی ہے نہ موضوعی کیونکہ وہ ہمارے ادراک سے ماوری ہے ، ایک عجیب نقطہ بیان کرتے ہیں : وہ کہتے ہیں کہ ہمارے حادث ہونے کے باوجود ہمارے ذہن میں ایک غیر محدود ، قائم بالذات ، اپنی ذات میں ہم آہنگ اور کامل کلیت کے وجود کا دھندلا سا تصور ضرور پایا جاتا ہے ۔ یہ وجود منفرد اور یکتا ہونے کے باوجود تمام افراد پر حاوی ہے ۔ ایسی ہمہ گیر حقیقت ہے جو تمام حقائق کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے اور ایسی قدر ہے جو تمام اقدار کی تکمیل کے لیے ان کی جامع ہے ۔ یہ وہ وجود مطلق ہے جو اپنی ذات کے لحاظ سے علم کامل ، خیر کامل اور حسن کامل ہے ۔ پروفیسر موصوف نے منطقی اور استدلالی انداز سے حس حسن کامل کے دھندلے سے تصور کا ذکر کیا ہے ، بیدل بڑے شاعرانہ انداز سے اس کے متعلق کہتے ہیں ۔

بیدل آن گوہر نایاب سراغ
بہ محیطیست کہ پرسیدن نیست
عکس افتادہ در آئینہ ہوش
گل توان گفت ولی چیدن نیست

حسن مطلق کے متعلق کس قدر صرب[2] افرا اور کتنا لطیف استعارہ ہے ۔

مذکورہ بالا سے ظاہر ہے کہ بیدل کا احساس جمال ، تحسین حسن فطرت سے گزر کر تحسین حسن مطلق تک پہنچ گیا ہے لیکن اب آگے بڑھنے سے پہلے ڈاکٹر یوسف حسین خان کی تصنیف 'اردو غزل' میں سے ایک معنی خیز اقتباس[3]

۱۔ پروفیسر محمد شریف : Beauty صفحہ ۸۴ – ۸۵ ۔
۲۔ نیاز فتح پوری : بہ حوالہ مجلہ 'استقلال' ۔
۳۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان : ''اردو غزل'' بہ حوالہ 'شعر اقبال' از سید عابد علی عابد ، ص ۶۰۵ ۔

پڑھ لینا ضروری ہے:

> "وہ نقطہ جس سے رنگ و بو کے محرکات کی تخلیق ہوتی ہے، غزل میں خاص تاثیر پیدا کر لیتے ہیں۔ غزل گو شاعر پر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے نشے کی سی کیفیت طاری رہتی ہے ...... بعض وقت رنگ و بو جذباتی زندگی کا استعارہ بن جاتے ہیں۔ ان دونوں کے ذریعے تحت الشعور کی یادیں برانگیختہ ہوتی ہیں جو تخیل کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ رنگ بھی زندگی کی تازگی اور لطافت کا معنوی رمز ہے۔ چمن اور بو کے رموز اور استعاروں سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ بہار جو زندگی کی بارآوری اور شادابی سے عبارت ہے، مظاہرِ رنگ کے سوا کچھ نہیں۔"

ڈاکٹر صاحب موصوف نے کلمۂ رنگ اور اس کے متعلقات کی حس دوزی اور ایمائی کیفیتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، بیدل کے اشعار بالا میں یہ تمام موجود ہیں۔ اُن کے اشعار کو پڑھ کر انسان کا تصور باغ و بہار بن جاتا ہے اور طبیعت میں سرور و کیف موج زن ہو جاتے ہیں۔ سبز و سرخ رنگ اور تخیل کے ذریعے ان کا آئینۂ دل میں انعکاس شاعر کی روح کو ایک عجیب و غریب حسن پرور فضا میں پہنچا دیتا ہے، جہاں لطافت اور رنگینی، تازگی اور رعنائی اور مسرت اور انبساط کا دور دورہ ہے۔ جمال اور جذبے کی یہ پر اسرار کیفیت شاعر کا بیش قیمتی اور روح پرور سرمایہ ہے جسے وہ کھلے دل سے اپنے ہم جنسوں کے درمیان تقسیم کرتا ہے اور اسی طرح ان کی زندگی کو مسرتوں سے لبریز کر دیتا ہے۔

مفرد رنگوں کو چھوڑ کر بیدل کے ہاں مرکب رنگوں کے سلسلے میں قوس قزح کا ذکر خاص معنی خیز ہے۔ مگر اس لحاظ سے انہیں طاؤس بے حد عزیز ہے، کیوں کہ اس میں بہت سے خوب صورت رنگوں کا نہایت ہی حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ مثنوی 'طور معرفت' میں ایک منظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ز طاؤسانِ رعنا گاہِ پرواز
بہشتی در ہوا بود آشیان ساز

طاؤسان رعنا کی وجہ سے ہوا میں فردوس بریں کا آشیانہ ہمیں دیکھیں۔ اسی رنگ پروری کی وجہ سے طاؤس بیدل کی فطرتِ رنگی کے لیے علامت کی حیثیت

اختیار کر چکا ہے ۔ اُن کے احساس جمال کے سلسلے میں اس شعر کو پیشتر ازیں نقل کیا جا چکا ہے :

بیدل اثری بردهٔ از یادِ خرامش
طاؤس برون آ کہ خیال تو چمن شد

خرامِ طاؤس کس قدر وجد آفریں اور کیف پرور ہوتا ہے ۔ اس شعر میں اس کی طرف اشارہ کس قدر نظارہ پرور اور معنی خیز ہے اور کس خوب صورتی سے شاعر کے باطنِ رنگین کی عکاسی کرتا ہے ۔ اسی شعر سے ملتا جلتا ایک اور شعر ہے :

عضوِ عضوم چمن آرائی پرِ طاؤس است
بہ خیالِ تو ہزار آئینہ آغوشِ خودم

حسنِ بدر بے تمیں کو چمنستان بنا دیا ۔ شاعر کا عضو عضو پرِ طاؤس کی طرح چمن آرا ہوگیا ۔ گویا شاعر کی آغوش میں ہزاروں آئینے تھے جو انعکاسِ رنگین کی وجہ سے اپنی اپنی جگہ پر رنگوں کا مرقعِ عظیم بن گئے ۔ ایسے تخیل کی اس بے نظیر حسن آفرینی کے زیرنظر وہ کہتے ہیں :

بہ فکرِ تازہ گویان گر خیالم پرتو اندازد
پرِ طاؤس گردد جدولِ اوراقِ دیوان ها

اُن کے معاصر تازہ گو شعرا کو اپنی رنگیں بیانی پر ناز تھا مگر بیدل کہتے ہیں ، ان کے حسن آفریں تخیل کے مقابلے میں ان کی تخلیقی صلاحیتیں بالکل ہیچ ہیں ۔ اس شعر سے ظاہر ہے کہ شاعر کو اپنی فطرت کی طاؤس پروری پر ناز تھا ۔ طاؤس ان کے لیے علامت کی حیثیت رکھتا ہے ، یعنی اس کا وجودِ رنگیں شاعر کے باطنِ رنگیں کا مظہر ہے ۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اشعار زیرنظر رکھے جائیں :

دل چو اندیشہ طاؤسِ بہارِ دیگر است
در چہ رنگ افتادہ است آئینۂ گل بازِ من

—

طاؤسِ ما بہارِ چراغانِ حیرت است
آئینہ خانہ ای بہ تماشا رساندہ ایم

—

طاؤسِ من احرامِ تماشای کہ دارد
دل گشت سراپای من از آئینہ چیدن

ندانم گل فروش باغ نیرنگ کیم بیدل
هزار آئینہ دارد در پر طاؤس تمثالم

دام جوہر نسخہ طاؤس دارد در بغل
این قدر رنگی کہ شد یا رب شکار آئینہ

ان اشعار میں آئینہ اور طاؤس دونوں یکے بعد دیگرے شاعر کے لیے بہ طور علامت موجود ہیں۔

اعلیٰ درجے کے شعرا تجربہ تخلیق کے وقت مجسم ادراک بن جایا کرتے ہیں۔ اُن کا وجود مادی تحلیل ہو کر سراپا ادراک بن جاتا ہے اور ان کے جملہ حواس مشترک ہو کر ایک نئی وحدت احساس کو جنم دیتے ہیں۔ پھر سماعت بصارت کا کام کرتی ہے اور بصارت سماعت کا۔ اصطلاح میں اسے حلول حواس[1] کہتے ہیں۔ نگاہ سمیع ہو کر نغمہائے شیریں سنتی ہے۔ سامعہ بصیر بن جاتا ہے اور رنگ و نور کی لہریں اس تک اس طرح پہنچتی ہیں جیسے کہ دل ربا تانیں ہیں۔ یہ لطافت احساس کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جن شعرا کی حس ذائقہ زیادہ لطیف ہوتی ہے وہ رنگ و نور کی لہروں اور دل ربا تانوں کو ذائقہ سے محسوس کرتے ہیں۔ عرفی کے ان اشعار میں بھی پُر لطف حلول حواس موجود ہے :

نگفت و می بشنودم هر آنچه گفتن داشت
کہ در بیان نگہش کرد بر زبان تقدیم
لبش چو نوبت حویش از نگاہ باز گرفت
فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم

ان اشعار میں سامعہ، باصرہ اور ذائقہ کی اس طرح وحدت پائی جاتی ہے کہ ایک کا دوسرے سے امتیاز ناممکن ہے۔ بیدل کے ہاں بھی یہ وحدت حواس پائی جاتی ہے اور چوں کہ عظمت عہد طفلی اور آغاز شباب میں ہی اپنا مظاہرہ شروع کر دیتی ہے، بیدل نے جب چوبیس سال کی عمر میں مثنوی 'محیط اعظم' لکھی تو اس وحدت لطیف کا اظہار شروع ہو گیا تھا۔ دف کی صفت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں :

۱۔ عابد علی عابد : 'شعر اقبال'، ...

ز آئینۂ پیکرش در نظر
نشد غیر حسن صدا جلوہ گر

چو آئینۂ جام بزم شہود
ز موج صدا نقش جوہر نمود

ان اشعار میں بصارت اور سماعت کا اشتراک موجود ہے۔ بیدل کے ہاں ان حواس کا اشتراک بعد میں بھی قائم رہا۔ مثلاً یہ شعر:

در نہان خانۂ دل مژدۂ دیداری ہست
می کشد گوش من از آئینۂ آواز نگاہ

اسی ردیف میں مندرجہ ذیل دو اشعار بھی اسی نوعیت کے ہیں:

تا بہ شوخی نکشد زمزمۂ ساز نگاہ
مردمک شد ز ازل سرمۂ آواز نگاہ
راز مخموری چشم نہان نتوان داشت
صد زبان در مژہ دارد لب غماز نگاہ

اگرچہ ان اشعار میں معنی آفرینی بھی موجود ہے مگر بنیادی طور پر اسی وحدت حواس کی کارفرمائی ہے جو حدیث تحقیق کی تطہیر کاملہ کے موقع پر رونما ہوتی ہے۔ ان اشعار میں آئینہ جو بصیرت تھا، گویا ہوگیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار بھی اسی قسم کے ہیں:

دل چیست کہ بی روی تو از درد بپیدن
چون آب از آئینہ توان نالہ شنیدن

حیرت آہنگم کہ می فہمد زبان راز من
گوش بر آئینہ شو تا بشنوی آواز من

قاصد پیام ما نفس واپسین ماست
گر بحرفی ز آئینہ چیزی شنیدہ رو

این انجمن هنوز ز آئینه غافل است
حرفِ زبانِ شمعم و روشن نگفته ام

ہم نے بیدل کی باطنی رنگینیوں کا ملاحظہ کیا ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ صنفِ نازک کے پیکر جمیل نے ان کے تخیل کو کس قدر رنگینی اور رعنائی عطا کی۔ ہم نے یہ بھی مشاہدہ کیا ہے کہ حسنِ ازل کے وہ کس حد تک دل دادہ ہیں اور کیسے لطیف استعارات کی صورت میں اپنی اس دل‌دادگی کا ذکر کرتے ہیں۔ ہم اس عشق و محبت اور درد و سوز سے بھی واقف ہوچکے ہیں جو بیدل کے لیے وجہِ بےتابی تھا۔ اُن کے نظریۂ تخلیقِ حسن سے بھی ہم بڑی اچھی طرح آشنا ہو چکے ہیں۔ اُن کے اندازِ بیان میں احساسات اور جذبات جس طرح شگفتگی اور حسن پیدا کر دیا کرتے تھے اُس کا بھی ہمیں بہ خوبی علم ہے۔ ہم یہ بھی جان چکے ہیں کہ ایک اعلیٰ درجے کے شاعر کی حیثیت سے ان کے حواس میں جذبۂ تخلیق کے وقت کیسا لطیف اشتراک پیدا ہو جاتا تھا۔ اب ہمیں ان باتوں پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ اُن کی غزل میں جذبہ اور خیال، ادراک اور بیان بڑی پاکیزگی اور خوبی کے ساتھ یک جا موجود ہیں۔ لفظ آئینہ کی رعایت نے اپنے مخصوص تلازمات کی وجہ سے غزل کی ان خوبیوں کو صد رنگ بنا ڈالا۔ اس رعایت سے بیدل کے حسنِ تغزل کا جائزہ لینے کے لیے آپ ذیل کے اشعار کا مطالعہ کریں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ان اشعار میں لفظ آئینہ جن نئے معانی پر محیط ہے ان کی مثال دنیا کے باقی شعرا کے ہاں بہت کم نظر آئے گی:

آتش پرستِ شعلۂ اندیشہ ات جگر
آئینہ دارِ داغِ ہوای تو سینہ ها

نیست برق جان گدازی چون تغافل‌های ناز
بیش ازین آتش مزن در خانۂ آئینہ ها

پس دیدہ کہ شد خاک و بشد محرمِ دیدار
آئینۂ ما نیز عبارت‌ست ازان ها

صد سنگ شد آئینه و صد قطره گهر بست
افسوس همان خانهٔ خرابست دلِ ما

یار در آغوش و نامِ او نمی دانم که چیست
سادگی حیرتم است چون آئینه بر نسیانِ ما

بدل نقشی نمی بندد که با وحشت نه پیوندد
نمی دانم کدامین بی‌وفا آئینه چید این جا

جوشِ خرامِ آئینه دارِ بهارِ اوست
نظاره کن ز چاکِ کتانِ ماهتاب را

تعبیر ناسها دارم هزار آئینه دربارم
خیال آهنگِ دیدارِ چندین بار می‌آیم

در دلِ هر ذرهٔ طوفانِ دیدار است و بس
جوهرِ آئینه دارم تا غبارِ او شدم

به اللحد تا کنم از حسرتِ دیدار ایمائی
بحیرت می روم آئینه بر پیغام می بندم

مشتِ خاکم لیک در عرضِ بهارِ رنگ و بو
عالمی آئینه می پردازد از سیمای من

حسن و هزار نسخهٔ نیرنگ در بغل
ما و دلی و یک ورق انشای آئینه

تا قیامت جوہر و آئینہ می‌جوشد بہم
از غبارم پاک نتوان کرد دامان شما

ادبی اور فنی محاسن کے اس بیان کو ہم بیدل کے شاگرد اور سوانح نگار بندرا بن داس خوش گو کے مندرجہ ذیل اقتباس پر ختم کرتے ہیں ۔

"او (بیدل) درین فن از اُستادانیست کہ صاحبِ طرزِ خاص شدہ‌اند و از زمانی کہ سخن آغاز شد این طرزِ مخصوص دستِ کسی نیفتادہ ۔ اکثر بی انصافہای زمانہ از روی حسد حرفی چند نامزا در حق جنابِ کرامت مآب وی می سازند کہ میرزا بیدل غلط گوئی مقرر است و حال آنکہ خود بہ غلطہایش نرسیدہ اند ۔ ناہنجارہای کہ زو ظہور پیوستہ چہ رستہ و این محض جہل و بغض است کہ مخمر آن فریق است ۔ و ہر چہ حضرتِ گلشن[1] می فرمود کہ میرزا بیدل پایہ ای دارد کہ این غلطہایش را بعد صد دو صد سال اہلِ لغت و فرہنگہا بطریقِ سند خواہند آورد ۔ وما فرض کردیم کہ ترکیب سازی و لفظ تراشی کہ نامش[2] غلط گذاشتہ اند در تمام اشعارش پانصد یا ہزار بیت خواہد بود جوابِ بقیہ شعر ہایش کہ ہم برعم مدعیان صحیح و درست باشد کہ می تواند داد ۔"

دریں وادی چساں آرام باشد کاروان‌ہا را
کہ ہم دوش است با ریگِ رواں سنگ نشاں‌ہا را (بیدل)

(قلم‌کار ، ادارہ مصنفین پاکستان کی خصوصی پیش کش)

۱۔ شیخ سعداللہ گلشن ، فارسی اور اردو کے مشہور شاعر ہیں جنھیں تاریخِ ادبِ اردو کبھی فراموش نہیں کر سکتی ۔

۲۔ لوگوں نے بیدل کے محاورۂ 'حرامِ کاشتن' کو غلط کہا ، مگر علامہ اقبال فرماتے ہیں : اسی ایک محاورے نے بیدل اور غالب کے درمیان بنیادی فرق واضح کر دیا ہے ۔ چوں کہ بیدل کا فلسفہ' حیات حرکی ہے ، اس کے ہاں یہ محاورہ موجود ہے ۔ غالب کا فلسفہ مائل بہ سکون ہے ، اس کے ہاں یہ بات نہیں ۔"

(۸)

بیدل کے ہاں لفظ آئینہ کا علمی پس منظر

ایں انجمن ہنوز ز "آئینہ" غافل است
حرفِ زبانِ شمعم و روشن نگفتہ ام

متصوفانہ ادب علامات سے معمور ہے اور ایک صوفی شاعر کی حیثیت سے مرزا بیدل نے اس سرمائے کی ثروت میں معتد بہ اضافہ کیا ہے۔ ان کا سرچشمۂ الہام عمیق تجربۂ روحانی ہے اور وہ حکمائے اسلام کے افکار سے ہی مستفیض ہوئے ہیں، اس لیے ایسے متصوفانہ اور مابعدالطبیعیاتی خیالات کے تنوع کا بھرپور احساس دلانے کے لیے ایک شاعر کے طور پر انھوں نے مختلف علامات اختیار کرکے ابلاغ کی بڑی گراں قدر راہیں نکالی ہیں۔ اگلے چند صفحات میں صرف اُن کی علامت 'آئینہ' کی علمی حیثیت کا تذکرہ کیا جائے گا۔ لیکن چوں کہ معنوی لحاظ سے اُن کی یہ علامت سب سے زیادہ وقیع ہے اور اُن کی تمام ادبی نگارشات اور اُن کے سارے متصوفانہ اور حکیمانہ خیالات پر پوری طرح محیط ہے، ہم اپنی توجہات اس کے صرف چند پہلوؤں تک محدود رکھیں گے، کیوں کہ بلا مبالغہ اس کے بالتفصیل تذکرے کے لیے ایک جامع تصنیف درکار ہے۔

مرسیہ اندلس کے معروف صوفی ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ (۱۱۶۵ء-۱۲۴۰ء) جنھوں نے مسلمانوں کے متصوفانہ افکار کو بے حد متاثر کیا ہے، ۱۲۲۹ء میں اپنی مشہور تصنیف 'فصوص الحکم' کو لکھنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ ایسے شاعرانہ تخیل کے لیے شہرت رکھتے ہیں، اس لیے اپنے تجریدی افکار کی توضیح کے لیے انھوں نے بعض تشبیہات اور علامات وضع کی ہیں۔ 'فصوص الحکم' میں خدا، کائنات اور انسان کا ذکر کرتے ہوئے اس کے پہلے دو ابواب فصِ آدم اور فصِ شیثیہ میں انھوں نے 'آئینہ' کی تشبیہ استعمال کی ہے۔ یہ لفظ اس تعلق

کا اظہار کرتا ہے ، جو خدا اور کائنات کے درمیان موجود ہے ۔ ابن العربی کہتے ہیں کہ جب خدا نے صفات کے لحاظ سے اپنے عین کا ملاحظہ کرنا چاہا تو کائنات کو پیدا کیا لیکن کائنات کی تخلیق ایک ایسے آئینے کی مانند عمل میں آئی جو جلا سے عاری ہو اور جس میں انعکاس کی اہلیت نہ ہو ، اس لیے خدا نے آدم یعنی انسانِ کامل پیدا کیا جو وجودِ جامع ہے ۔ بنابریں انسانِ کامل آئینۂ کائنات کی جلا ہے اور اپنی فطرت و نوعیت کے اعتبار سے وہ اس کی روح ہے ، یعنی اس جسم کی جان جو ظہورِ آدم سے پہلے کائنات کی صورت میں موجود تھا ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ زمان و مکان ، خدا ، انسان اور ایسی اہمیت رکھنے والے دیگر مسائل کے متعلق ابن عربی کے افکار و خیالات کو مربوط طور پر پیش کرنے کے لیے ابھی تک کوئی کامیاب کوشش عمل میں نہیں آئی ، تاہم یہ حقیقت ہے کہ اُن کے زمانے سے لے کر اس وقت تک مشرق اور مغرب میں برابر اہلِ علم اُن کی تصنیفات کا ذوق و شوق اور دماغ سوزی سے مطالعہ کرتے چلے آئے ہیں ۔ ابن العربی ۱۲۴۰ء میں فوت ہوئے ہیں ، ان کی وفات کے فوراً بعد مولانا جلال الدین رومی (وفات ۱۲۷۳ء) کے ایک معاصر اور ہم وطن مولانا صدرالدین قونیوی فصوص الحکم کا باقاعدہ درس دیا کرتے تھے ۔ ہمارے اپنے زمانے میں اس کتاب کے ایک ماہر ہو گزرے ہیں ، جن کا اسم گرامی پیر مہر علی شاہ گولڑوی (وفات ۱۹۳۵ء) تھا ۔ پیر صاحب موصوف بیسویں صدی عیسوی کے ایک اعلیٰ پایے کے ولی ہیں ۔ ظاہر ہے ابن العربی اکابر صوفیۂ اسلام میں شروع ہی سے بڑے مقبول چلے آئے ہیں ۔ بنابریں بہار و اڑیسہ کے اپنے معنوی استعدہ سے متاثر ہو کر عبدالقادر بیدل عظیم آبادی[1] نے بھی ان کا مطالعہ کیا ۔ خانِ آرزو ، آنند رام مخلص اور بندرابن داس خوش گو ، جو بیدل کے شاگرد اور ہم صحبت ہیں ، کہتے ہیں کہ بیدل نے کلام میں اُن مسائل کا بر رمز طریقے پر تذکرہ کیا کرتے تھے جن کا بیان ابن العربی نے علامات کے ذریعے فکر انگیز طور پر کیا ہے ۔ قدرتی طور پر اس شغف کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیدل کو عہد آئینہ سے ابن العربی کے خاص نظریے کے مطابق بڑا لگاؤ پیدا ہو گیا اور اس کے ذریعے

۱۔ شاہزادہ عظیم الشان کی وجہ سے پٹنہ کا نام عظیم آباد پڑا ۔ پٹنہ صوبۂ بہار کا صدر مقام ہے ۔

انھوں نے ابن العربی کے مخصوص افکار و خیالات کو بیان کیا ۔

کائنات کے متعلق ابن العربی کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ یہی وہ آئینہ ہے جس میں خدا اپنی صفات کا عینی مشاہدہ کرتا ہے اور بیدل کہتے ہیں :

ہر طرف نگری شوقِ محوِ خود بینی است
دکانِ آئینہ گرم است چار سوی ترا

لیکن ابن العربی کہتے ہیں تخلیقِ انسان سے پہلے کائنات آئینہ بے جلا تھی ۔ اس میں چمک دمک نام کو موجود نہ تھی ۔ جب اس میں انسان کامل نمودار ہوا تو اس آئینے نے اپنے مقصدِ تخلیق کو کما حقہ پورا کرنا شروع کر دیا ۔ دوسرے الفاظ میں اس مادۂ بے جان میں روح اور زندگی نمودار ہو گئی اور تجلیاتِ الٰہی کو دیکھنے والی آنکھ کھل گئی ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی طرح انسان کا خاتمہ ہو جائے تو یہ سارا سلسلہ معدوم ہو کر رہ جائے گا ، یہ نظریہ بیدل نے اس شعر میں بیان کیا ہے :

بی وجود ما ہمین ہستی عدم خواہد شدن
تا در این آئینہ پیدا ایم عالم عالم است

ابن العربی نے انسان کے متعلق یہ خیالات 'فصوص الحکم' کے باب اول یعنی فص آدم میں بیان کیے ہیں ۔ انھی ان افکار کو استعارہ اور علامت کی مدد سے وہ اگلے باب یعنی فص شیثیہ میں بھی بیان کرتے ہیں ، لیکن اس بار وہ اپنے ابتدائی نظریے کو زیادہ معنی خیز بنا دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ خدا انسان کو اپنا آئینہ قرار دے کر اپنے اسم کی تجلی اس میں دکھاتا ہے تو یہ آئینہ اس کے عین کے بغیر کچھ نہیں ہوتا ۔ اس بات کی توضیح وہ اس طرح کرتے ہیں کہ جو صورت آئینے میں منعکس ہوتی ہے وہ اپنے اصل سے مختلف نہیں ہوتی ۔ ظاہر ہے اب ابن العربی نے بہت بڑا قدم اٹھایا ہے ۔ یہاں ہم بیدل کا ایک شعر پیش کرتے ہیں جو اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ ان کے مزاجِ فکری کی تعمیر و تعمیر یقیناً ابن العربی کے خیالات سے ہوئی ہے ۔ فرماتے ہیں :

صورتِ آئینہ خورشید خورشید است و بس
بر نمی دارد خیالِ غیر طبعِ روشنم

بیدل کے اس شعر میں خیال زیادہ وضاحت سے بیان ہوا ہے جو اس بات کا ثبوت

ہے کہ صوفی کی حیثیت سے ان کے اپنے تجربۂ روحانی نے بھی اس کی تائید و تصدیق[1] کی تھی۔

یہ خیال کہ انسان ذات مطلق کا آئینہ ہے ، فصوص الحکم میں ارتقا کے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ابن العربی بڑی محنت اور توجہ کے ساتھ آئینہ کے نقائص ذاتی کی طرف بھی انگشت نمائی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کو اس قابل بنانے کے لیے کہ وہ اپنی ذات کا مشاہدہ کر سکے ، خدا انسان کا آئینہ بن جاتا ہے۔ لیکن اس آئینے میں انسان اپنے ذاتی عکس کے بغیر اور کچھ نہیں دیکھ سکتا ، کیوں کہ ہر انسان اپنی فطری استعداد کے مطابق تجلی حاصل کر سکتا ہے۔ بیدل یہاں بھی ابن العربی سے متحدالخیال ہیں :

خلقیست محو خود بہ تماشای آئینہ
من نیز دانم از پئ سیمای آئینہ

آئینہ ہمیشہ اپنی نوعیت کے مطابق اشیا کا عکس دکھاتا ہے۔ مضحکہ انگیز یا الٹا ترچھا عکس لازماً آئینے کی اپنی مختلف صورتوں کی وجہ سے ہوا کرتا ہے۔ اس لیے تجلیات الٰہی کے اختلافات وجود متجلی کے اپنے ذاتی نقائص کی وجہ سے ہوں گے۔ مزید برآں آئینہ تو صرف عکس دکھاتا ہے :

بغیر عکس ندانم دگر چہ خواهی دید
اگر در آئینہ بینی جمال یکتا را

لہٰذا بیدل کے خیال کے مطابق بھی جمال یکتا اپنے آئینے یعنی انسان کامل سے ہمیشہ وراء الوراء رہے گا۔ بنابریں بالآخر یہی کہنا درست ہے کہ حقیقت حقہ سے کامل محرمی کسی کے بس کی بات نہیں۔ ہر ایک اپنے ہی کمال عرفان کا آئینہ بنتا ہے :

آن کیست شود محرم اظہار و خطابی
آئینۂ خویشند عیان‌ها و بیان‌ها

۱۔ بیدل کے اڑیسہ کے خواب کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے ، جب طوفان انوار میں سے یہ آواز آئی تھی :

ما هم چو توئی دگر چہ گوئیم

دیکھیں سیرت بیدل (انگریزی) : صفحہ ۲۰۸۔

یہ خدا کی ماورئیت کا ذکر تھا جسے بیدل اور ابن العربی نے مماثل انداز میں بیان کیا ہے۔

یہ بات کہ اپنے مابعدالطبیعیاتی اور متصوفانہ خیالات کے اظہار و ابلاغ کی خاطر لفظِ آئینہ کے استعمال میں بیدل ابن العربی کے مرہونِ منت ہیں، اظہر من الشمس ہے۔ اس مرحلے پر ضمناً ہم فلسفے کے ایک نظریے کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جو مندرجہ بالا مطالب سے مطابقت اور مناسبت رکھتا ہے۔ مغربی فلسفی لیبنیز (Leibniz ١٦٤٦ عیسوی – ١٧١٦ عیسوی) جو بیدل (١٦٤٤ عیسوی تا ١٧٢٠ عیسوی) کا معاصر تھا، اپنے افکار کی تشریح کے لیے یہی تشبیہ اور استعارہ استعمال کرتا ہے۔ اس کے ''موناڈ'' (Monad) بھی آئینے ہیں جن میں کائنات منعکس ہوتی ہے اور ان کا انعکاس آئینے کی صفائی اور درخشندگی کے مطابق ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مختلف موناڈ، کائنات کو مختلف طریقوں سے ظاہر کرتے ہیں۔ علاوہ بریں حقیقی انفرادی انا جو ناقابل تقسیم وحدت ہوتی ہے، اس کی توضیح کے لیے لیبنیز (Leibniz) کہتے ہیں کہ ہر موناڈ (Monad) ایک روح ہوتی ہے جو مکان (space) میں پھیلی ہوئی نہیں ہوتی۔ ابن العربی (١١٦٥ عیسوی تا ١٢٤٠ عیسوی) اور بیدل کے خیالات بھی اسی نوعیت کے ہیں۔ ان کے آئینے بھی حقیقت مطلقہ کا عکس اپنی اصل کے مطابق دکھاتے ہیں۔ ساتھ ہی ان کی روحانی متاع ہی ان کا حقیقی انا ہوتی ہے۔ لیبنیز (Leibniz) کے تصورِ موناڈ (Monad) کے متعلق اپنی معمولی معلومات کے باوجود ہم یہاں ایک اور مماثلت کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔ دونوں مکاتیبِ فکر میں ادراک سے مراد حیاتیاتی قوت کا پورا عمل ہے جو نفس کے نقطۂ آخریں تک پہنچ جاتا ہے۔ اگرچہ عملِ ادراک میں شدت ضرور ہوتی ہے مگر جہاں تک مدرکات کا تعلق ہے، مختلف افراد کے معاملے میں یہ ادراک مختلف ہوتا ہے۔ یہ خشک عقلیت نہیں۔ یہ وجدان سے ہم جنس ہے جسے ہم برگساں (Bergson) کے ہاں زیادہ مربوط صورت میں دیکھتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ابن العربی، بیدل اور لیبنیز (Leibniz) کے تصورات کا تقابلی مطالعہ بڑا نتیجہ خیز ہے۔ ان کے تصورات میں اختلاف کی وجہ ان کی سیرت کا اختلاف ہے۔ ابن العربی اور بیدل دونوں خاص صوفی تھے اور روحانی زندگی کے بغیر انہیں اور کسی چیز سے سروکار نہ تھا۔ دہلی کے مغل شہنشاہوں اور ان کے

مغل امرا کی بھرپور اور پرزور استدعا کے باوجود بیدل کبھی بھی دربارِ شاہی میں نہ گئے ۔ وہ تمام بیدل کے غیرمعمولی کمالات کے دل و جان سے معترف تھے ، لیکن اس مردِ فقیر نے ہمیشہ خوش اخلاقی سے کام لے کر بے اعتنائی اور استغنا کا اظہار کیا ۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ بیدل نے قابلِ تعریف طریقے سے حکیمانہ انداز کو اپنایا ہوا تھا ، حسنِ اتفاق سے آج کل کے شہرۂ آفاق برطانوی فلسفی برٹرینڈرسل (Bertrand Russel) کے قول کے مطابق بے چارہ لیبنز (Leibniz) بالکل عاری تھا ۔ وہ تو زندگی بھر طبقۂ امرا کے مقاصدِ مخصوصہ کی حمایت میں مصروفِ عمل رہا ۔ یہ بنیادی نکتہ ان کے فلسفیانہ خیالات میں اختلاف کا موجب ہے ۔ ابن العربی کی طرح بیدل کے ہاں شروع سے لے کر آخر تک تجربۂ روحانی کی تڑپ محسوس ہوتی ہے مگر لیبنز کے ہاں ہر چیز کی بنیاد محض سطحی استدلال پر ہے ۔ اول الذکر کے خیالات لازماً حق سے زیادہ قریب ہیں کیوں کہ ان کا کشفِ حقیقت کا براہ راست مشاہدہ کرتا ہے ۔ مزید برآں لیبنز (Leibniz) کے خیال کے مطابق بےشک سب سے ارفع اور ترقی یافتہ ''موناڈ'' (Monad) خدا ہے ۔ لیکن جن بلندیوں تک بیدل کا انسانِ ربانی پہنچتا ہے ، انسانی سطح پر ان کی پرچھائیں بھی لیبنز (Leibniz) کے نظامِ فکر میں دکھائی نہیں دیتیں ۔

اس مرحلے پر اس امر کی تصریح بھی ضروری ہے کہ انسان اور کائنات کو حقیقتِ حقہ کا آئینہ تصور کرنے کا خیال حکمائے اسلام میں ابن سینا (۹۸۰ عیسوی تا ۱۰۳۷ عیسوی) کے وقت سے چلا آ رہا ہے ۔ علامہ اقبال (۱۸۷۳ عیسوی تا ۱۹۳۸ عیسوی) ایران میں مابعدالطبیعیات کا ارتقا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ابن سینا کے خیال کے مطابق حقیقتِ مطلقہ حسنِ ازل ہے جس کی فطرت میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ اپنا چہرہ آئینۂ کائنات میں منعکس دیکھے ۔ علامہ اقبال نسفی کی کتاب ''مقصدِ اقصیٰ'' کا حوالہ دیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ آئینے دو قسم کے ہیں ، ایک فطرتِ خارجی جو صرف عکس دکھاتی ہے ۔ دوسرا انسانی جو حقیقی ذات کا مشاہدہ کراتا ہے ۔ اس تصریح سے ہمیں مزید ثبوت ملتا ہے کہ مسلمان حکما اور اربابِ تصوف کے ہاں لفظِ آئینہ کا استعمال عرصۂ دراز سے چلا آ رہا تھا ۔ اور چوں کہ شاعرانہ تخیل کو بھی یہ لفظ بےحد پسند ہے ، اس لیے ایک صوفی شاعر اور مفکر کی حیثیت سے بیدل نے اپنے متصوفانہ اور حکیمانہ افکار کو بیان کرنے کے لیے اسے منتخب کر لیا اور پھر انھوں نے اسے اپنے کلام میں اس

کثرت سے استعمال کیا اور اس سے اس قدر متنوع معانی اور مطالب اخذ کیے کہ اب یہ لفظ ان کے تار و پود فکری کا جزو لاینفک بن چکا ہے۔

اس امر کی توضیح کی خاطر کہ بیدل کے خیال کے مطابق کائنات حسن ازل کا آئینہ ہے، بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ ذیل میں ان کی ایک رباعی درج کی جاتی ہے جو اس سلسلے میں تائید مزید کا کام دے گی اور اس کے بعد ہم انسان کے متعلق لفظ آئینہ کے استعمال پر ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ غور کریں گے کیوں کہ تمام موضوعات کی نسبت بیدل کو یہ موضوع زیادہ مرغوب ہے۔ تخلیق کائنات کے متعلق وہ کہتے ہیں:

ز یک آئینہ صد تمثال جوشید   ز یک پرواز چندین بال جوشید
ظہور اندیشی آن حسن جاوید   گرفت آئینۂ امکان بہ خورشید

انسان کے متعلق بنیادی طور پر بیدل کے دل میں یہ خیال ابھرتا ہے کہ ایک تیرہ و تار مشت خاک تھی، پامال ہونے والی اور بصیرت سے مکمل طور پر عاری۔ مقام حیرت ہے کہ اس حقیر اور ادنٰی شے کو ذات حق نے آئینہ کے طور پر کیسے منتخب کیا:

مشت خاک تیرہ را آئینہ کردن حیرت است
جلوہ ای کردی کہ ما ہم دیدۂ حیران شدیم

جیسا کہ پیش تر ازیں کہا جا چکا ہے اور اس شعر سے بھی ظاہر ہے کہ محض فکری طور پر بیدل نے انسان کو آئینۂ حق قرار نہیں دیا تھا بلکہ ایک عارف کامل کی حیثیت سے انھیں اس حقیقت کا ذاتی تجربہ حاصل تھا۔ نور مطلق نے انھیں اپنا آئینہ بنایا اور انھوں نے اپنے آپ کو ہمہ تن نور پایا:

شب کہ آئینۂ آن آئینہ رو گردیدم
جلوہ ای کرد کہ من ہم ہمہ او گردیدم

کامل اتحاد کے اس تجربے کے وقت ہمارے صوفیٔ کامل کو دوئی کا خیال تک نہ رہ گیا:

فکر دوئی چیست ما و توئی چیست
آئینہ ای نیست ما خود نمائیم

اتحاد کے اس تجربے کے وقت اثبات ذات کا جو احساس پیدا ہوتا ہے، اسے شاعر کی حیثیت سے بیدل نہایت ہی خوب صورت اور بڑے پر زور اشعار میں بیان کرتے

ہیں - جہاں اس قسم کی ایک سالم غزل کے صرف مطلع پر اکتفا کیا جاتا ہے :

در عالمِ حق شہرتِ باطل چہ فروشم
جنسم ہمہ لیلی ست بہ محمل چہ فروشم

مختلف غزلوں میں اتحاد کا پے در پے تذکرہ اس کے تواتر کی طرف اشارہ کرتا ہے اور غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ اس کے دوران میں ابھی 'انا' کا احساس غالب رہتا ہے - مندرجہ بالا چار اشعار کو پڑھیں - ردیف 'میم' کے ہیں - یہ ردیف انائے ذاتی کے شدید احساس کی خوب ترجمانی کرتی ہے - ان اشعار میں صیغہ متکلم کا بار بار استعمال کیا گیا ہے ، جو تجربہ روحانی کے وقت انائے ذاتی کے غلبے کا ثبوت ہے اور اس قسم کے بعض اشعار میں تو لفظ 'من' کا بڑا تکرار ہے - یعنی انائے ذاتی صرف غالب ہی نہیں رہتی بلکہ گویا یہی ہو جاتی ہے - ذیل میں اس نوعیت کے صرف دو شعر درج کیے جاتے ہیں :

قابل برق تجلی نیست ہر خاشاک 'من'
حسن ہر جا جلوہ پرداز است 'من' آئینہ ام
لفظِ 'من' بیدل نقابِ معنیٔ اظہارِ اوست
ہر کجا 'او' سر بر آرد 'من' گریبان می کشم

انانیت یا شعورِ ذات کے احساس کے ساتھ ساتھ کسی کے فضل و کرم ، دلی مسرت اور حتیٰ کہ فخر و استکبار کے احساسات بھی شامل ہوتے ہیں - الوہیت میں انجذاب کے وقت شعورِ نفسی غیر معمولی قسم کا ولولۂ روحانی پیدا کرتا ہے - یہ عامیانہ تجربہ نہیں ہوتا - اس لیے خدا کے آئینہ کی حیثیت سے براہ راست تجربہ رکھنے کی بنا پر اور شعورِ ذات کے احساس سے کامل طور پر سرشار ہونے کی وجہ سے ایک حیرت را جذبۂ خود نمائی کے ساتھ ہمارا بلند اختر صوفی شاعر کہتا ہے .

بیدل آئینۂ معشوق نما در برِ تست
این نیازیکہ تو داری نشود ناز چرا

نیاز آئینہ اسرار تدریست   شکستم کجکلاہی می نویسم

اشعار بالا میں وحدانِ ذات کا ذکر تھا - بیدل بار بار اس قسم کے اشعار زبان پر لاتے ہیں اور اپنی ہستی اور اپنے وجود کا اعلان کرتے ہیں - اس لحاظ سے فلسفۂ وجودیت کے وہ بہت بڑے علم بردار ہیں اور وجودی مفکرین جین پال

سارتر (Jane Paul Sartre — پیدائش ۱۹۰۵ عیسوی) اورکارل جیسپر (Carl Jasper — پیدائش ۱۸۸۳ء) کے پیش رو ہیں ۔ اگرچہ یہ بھی درست ہے کہ ہمارے اس صوفی شاعر کی وجودیت حقیقت ہمہ کے ان نقاط کو چھوتی ہے جن کا تصور بھی اول‌الذکر کے لیے ناممکن ہے ۔ اس لیے کہ وہ غریب ملحد ہے اور ان کا براہ راست تجربہ جیسپر کے لیے بھی بالکل محال تھا کیوں کہ اس بےچارے کی مذہبیت خالصۃً لفظی قسم کی ہے ۔

ڈاکٹر اقبال ایران میں ما بعدالطبیعیات کے ارتقا پر بحث کرتے ہوئے جب الجیلی (۱۳۶۵ تا ۱۳۰۸ء) کی تصنیف 'الانسان الکامل' کا تذکرہ کرتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ انسانِ کامل یعنی آن کی اپنی اصطلاح میں انسانِ ربی کی ذات میں وجود مطلق اپنی کھوئی ہوئی مطلقیت حاصل کر لیتا ہے یا ہیگل (Hegel) کے الفاظ میں انسانِ ربانی فلسفہ مطلق پر کامل عبور حاصل کر لیتا ہے ۔ روحی ارتقا کا یہ نقطۂ عروج ہے ۔ ہمارا صوفی شاعر جب اس معراج پر فائز ہوتا ہے تو اس وقت اس کی زبان سے ایسے اشعار نکلتے ہیں جن کی لم تک پہنچنا عام اذہان کے لیے دردِ سر سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا ۔ ذیل میں اس قسم کے تین اشعار درج کیے جاتے ہیں ۔ یہ ملحوظِ خاطر رہے کہ ان کی اصل وہی نظریہ ہے کہ انسان ذاتِ مطلق کا آئینہ ہے :

فطرتم رخت بروں شورِ وجوب و امکان
ایں دو تمثال در آئینۂ ''من'' بود مقیم
شعلہ بودم ''من'' و می سوخت نفس سمع مسیح
''می'' قدح می زدم و مستِ طلب بود کلیم
بیش از ایجاد بامید ظہورِ احمد
داشت نورِ احدم در کنفِ حلقۂ میم

ان اشعار میں انسانِ کامل کا زمان ازل الآزال اور ابدالآباد سے ہم کنار ہو چکا ہے ، یعنی انسانِ ربانی آلوہی زمان میں برابر کا شریک نظر آتا ہے ۔ یہ ایسے مسائل ہیں جہاں پہنچ کر ہمارے قلم پر فی‌الواقعہ کپکپی طاری ہو جاتی ہے کیوں کہ ہمارے لیے تو اس حقیقت کا ذہنی طور پر ادراک بھی سخت گراں ہے ۔

ان اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ انسانِ کامل کو انسانِ ربانی کی حیثیت سے اپنا وجدان حاصل ہو چکا ہے ۔ لیکن یہ روحانی تجربہ مستقل نہیں ہوتا ۔ جیسا کہ

سی محولہ بالا تصنیف میں علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ جب یہ تجربۂ روحانی ختم ہو جاتا ہے تو انسان انسان رہ جاتا ہے اور خدا خدا ۔ ابن العربیؒ نے فرمایا ہے :

الرب رب و ان تنزل والعبد عبد و ان ترقی

اور حضرت بیدل کہتے ہیں :

چہ ممکن است رود داغ بندگی ز جبین
زمین فلک شود و آدمی خدا نشود

ڈاکٹر اقبال فرماتے ہیں کہ اگر یہ روحانی تجربہ مستقل ہوتا تو ایک بہت بڑی اخلاقی قوت ضائع ہو جاتی اور معاشرہ درہم برہم ہو جاتا ۔

فطرت میں مقصدیت کا اظہار اول اول افلاطون نے کیا تھا ۔ یونانی حکما نے انسان اور اس کی تاریخ کو تکوینی حیثیت دی ۔ مسلمان مفکرین صرف یونانی افکار کو ایک جگہ سے لے کر دوسری جگہ تک پہنچانے والے نہیں تھے ، بلکہ بنیادی طور پر وہ اسلامی نظریات کے مفسر تھے ۔ ہماری الہامی کتاب قرآن کائنات اور انسان دونوں کو بامقصد قرار دیتی ہے :

وما خلقنا السمٰوت والارض وما بینھما لٰعبین ۴۴ : ۳۸	ہم نے آسمان ، زمین اور ان کے درمیان جو کچھ ہے ، کھیل کھیل میں نہیں پیدا کیا ۔
ما خلقنٰھما الا بالحق و لکن اکثرھم لا یعلمون ۴۴ : ۳۹	ہم نے انھیں محکم مقاصد کے لیے پیدا کیا لیکن ان میں سے اکثر بے خبر ہیں ۔
افحسبتم انما خلقنٰکم عبثاً و انکم الینا لا ترجعون ۲۳ : ۱۱۵	کیا تمھارا خیال ہے کہ ہم نے تمھیں عبث پیدا کیا اور تم لوٹ کر ہمارے پاس نہیں آؤ گے ؟

ان قرآنی تعلیمات کو بنیاد قرار دے کر مسلمان مفکرین نے اپنے فلسفۂ تعلیم کی عمارت کھڑی کی اور سماج پسند حیوان کی حیثیت سے انسان اور اس کی نیچرل تاریخ کا علم مدون کیا ۔ ان کے ساتھ صوفیائے اسلام بھی شامل ہو گئے ، جنھوں نے اپنے تجربۂ روحانی کی بنا پر اعلان کیا کہ تخلیق کے شاہ کار کی حیثیت سے انسان محافظِ کائنات ہے ۔ بقائے فطرت کے لیے انسان کا وجود اولین شرط ہے ، اور اگر

احسانِ کامل نہ ہوتا تو فطرت بھی مفقود ہوتی ۔ صوفیائے اسلام کے نزدیک انسان روحانی زندگی کا ارفع ترین مظہر ہے اس لیے ثمرِ تخلیق ہے ۔ اس کا آقا اور فرماں روا ہے اور کائنات کی تقدیر میں ہے کہ انسان اس کے متعلق گہرے غور و فکر سے کام لے اور اسے اپنی ابتدائی روحانی حیثیت کی طرف واپس لے جائے ۔

بیدل بھی ہے اس نظریے کی بنا پر کہ انسانِ ربانی آئینہ ٔ خدا ہے ، صوفیائے اسلام کے اس نقطہ ٔ نگاہ کی حمایت کرتا ہے ۔ اس کے خیال کے مطابق انسان اور اس کی تقدیر مرکزِ کائنات ہیں ۔ فرماتے ہیں :

شورِ دو جہان آئینہ دارِ نفسِ ما ست
نی لغتہ نہ طوفان نہ قیامت چہ بلائیم

بیدل ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ آئینہ ٔ خدا ہونے کی بنا پر وہ نور کا اتنا عظیم ذخیرہ اپنے وجود میں رکھتے ہیں کہ خلائے آسمانی کے بے شمار ستاروں میں اور کائنات کے ذرے ذرے میں بے شک تقسیم کر دیں ، پھر بھی اس کے حجم میں فرق نہیں آئے گا :

پیش ازالست در آئینہ ٔ من سایہ ٔ نور

کہ بہ ہر ذرّہ و خورشید نمودیم تقسیم

نہیں بلکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اپنے اس ذخیرۂ نور میں سے چاہیں تو وہ ایک اور کائنات تخلیق کر دیں اور یہ ذخیرہ جوں کا توں رہے ۔ اس سے پہلے بھی دونوں جہان آن ذراتِ نور سے پیدا ہوئے ہیں جو آئینہ ٔ انسان کے غبار کے طور پر نیچے گر پڑے تھے :

کونین غباریست کز آئینہ ٔ من ریخت گو عالمِ دیگر از خویش برآرم

انسان کے مقابلے میں کائنات کی حاجت مندی اور بے وقری اس سے بہتر الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی ۔ کائنات اپنے وجود کے لیے ہر لحاظ سے انسان کی مرہونِ منت ہے ۔

یہاں لفظِ "نور" ممکن ہے بیدل نے اس نظریے کی بنا پر استعمال کیا ہو جو شیخ شہاب الدین شیخ الاشراق مقتول نے پیش کیا تھا ۔ شیخِ اشراق بارھویں صدی عیسوی کے وسط میں پیدا ہوئے تھے اور ان کا نظریہ ہے کہ تمام موجودات کی انتہائی حقیقت نورِ قاہر ہے ، یعنی ابتدائی نورِ مطلق ۔ لیکن اس مقالہ نگار کا خیال

ہے کہ یہاں جس شعر میں لفظِ فقر آیا ہے وہ آئینے کی صفت کے طور پر موجود ہے۔ تاہم شیخِ اشراق کے اثرات کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ بیدل کے فلسفۂ تخلیق کی تفصیلات مختلف منابع[1] سے حاصل کی گئی ہیں۔

۱- صوفی کے لحاظ سے بھی بیدل کے خیالات ظاہر کرتے ہیں کہ وہ مختلف مآخذ و منابع کے مرہونِ منت ہیں۔ ہمیں یہاں ان تمام منابع کی نشان دہی کی ضرورت نہیں۔ لیکن چوں کہ ہمارا موضوع لفظِ آئینہ اور اس کے مضمرات ہیں، بیدل کے مندرجہ ذیل شعر میں یہ لفظ جس ماخذ کی طرف اشارہ کر رہا ہے ہم صرف اس کا ذکر کیے دیتے ہیں :

فقرِ ما آئینۂ سرِ ہو اللّٰہیست و بس
فیض این خاک از ہزار اکسیر نتوان یافتن

اس شعر میں مندرجہ ذیل قول کی طرف اشارہ ہے :

"اذا تم الفقر فھو اللّٰہ"

جس کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی شخص کی ذات میں عملِ تصوف تکمیل پذیر ہوتا ہے تو اللّٰہ کے بغیر باقی کچھ نہیں رہ جاتا۔ عبد کی فنا پذیر صفات ختم ہو چکی ہوتی ہیں اور اس کی ذات کا وہ جوہر برگ و بار لا رہا ہوتا ہے جو باقی رہنے والا ہے۔

اب بیدل کے والد کی غائبانہ بیعت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللّٰہ علیہ (۱۰۷۷ تا ۱۱۶۳ء) سے تھی اور اپنی زندگی کے ابتدائی سترہ سال میں بیدل سلسلۂ قادریہ کے اولیائے کرام سے بڑے متاثر ہوتے تھے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ اس زمانے میں بالخصوص سلسلۂ قادریہ میں یہ قول بے حد مقبول تھا۔ ان ایام میں اس برصغیر کے شمال مغربی کونے میں شورکوٹ کے قریب ضلع جھنگ کے ایک گاؤں کے اندر ایک مشہور قادری بزرگ حضرت سلطان باہو رحمۃ اللّٰہ علیہ (۱۶۲۹ تا ۱۶۹۱ء) موجود تھے۔ حضرت باہو اپنی تصنیفات نورالہدیٰ، شمس العارفین اور رسالۂ روحی میں بار بار اس قول کو نقل کرتے ہیں۔ بیدل خود بھی اپنی کتاب چہار عنصر میں اس کے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

وہ آلہ جو زندگی کی گہری حقیقتوں تک رسائی حاصل کرتا ہے، صوفیائے کرام کی اصطلاح میں قلب کہلاتا ہے ۔ اس سے ہمارے ذہن کی عقل پسندی مقصود نہیں، بلکہ اس سے مراد ایک ارفع قسم کا روحانی تجربہ ہے جس میں انسانی حقیقتِ حق کا براہِ راست مشاہدہ کرتا ہے ۔ اس روحانی عمل کے وقت زندگی کے گہرے چشمے متحرک ہو جاتے ہیں اور فطرت کے عمیق اسرار نگاہوں کے سامنے آتے ہیں ۔ باقی صوفیائے اسلام کی طرح ادراک کی اس قوت کو بیدل بھی قلب یا دل کہتے ہیں ۔ اب اس استعدادِ خاص کے لیے بھی بیدل آئینہ کی تشبیہ یا علامت استعمال کرتے ہیں :

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

ایک بزرگ قسیم ھوالشّہی کا ذکر کرتے ہوئے یہ قول درج کرتے ہیں ۔ اس بزرگ کے خطاب ہوالشّہی کی وجہ بھی یہی قول نظر آتا ہے ۔ اس بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ قول بیدل نے قادری بزرگوں سے سنا اور اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا ۔

مذکورہ بالا شعر میں ہمارے صوفی شاعر نے خدا سے کامل اتحاد کا ذکر کیا ہے ۔ حضرت سلطان باہو کے قول کے مطابق اس وقت خدا سالک کو ان الفاظ میں مخاطب کرتا ہے :

"تو عینِ ذاتِ ما ہستی و ما عینِ تو ہستیم در حقیقت
حقیقتِ ما ہستی و در معرفت یارِ ما ای"

ایسے بہت سے اشعار میں بیدل نے خدا سے اتحاد کا ذکر کیا ہے ۔ ان تمام کو یک جا کیا جائے تو نفسیاتِ اتحاد کا بخوبی علم ہو سکتا ہے ۔ آج کل اکثر اہلِ علم ہر مشرقی یا اسلامی بات کی تصدیق مغربی افکار اور آراء کے ذریعے کرنا چاہتے ہیں ۔ ان سے التماس ہے کہ اس غرض کے لیے وہ ولیم جیمز کی تصنیف "تجربۂ روحانی کی مختلف صورتیں" پڑھیں ۔ اس لحاظ سے بالخصوص آخری باب بڑا مفید ہے ۔ فاضل فلسفی نے خدا سے اتحاد کے مسئلے پر بڑی خوبصورتی سے بحث کی ہے ۔ نفسیاتِ مذہب سے آگاہی کے لیے اس کتاب کی اہمیت کلاسیکی نوعیت کی ہے ۔

ای رمزِ جلوہ فہمان غافل ز دل مباشید
کوری و زشت رویست آئینہ را ندیدن

وہ کہتے ہیں کہ آئینہ دل وحدت سرائے ہے اور اس میں ماسوا صرف عرض کی حیثیت رکھتا ہے :

خیالِ ما سوا عرض است در وحدت سرای دل
درونِ خویش دارد سینہ آئینہ بیرون را

نہایت ہی درخشاں بے شمار تجلیات آئینہ دل میں موجود ہیں :

ملاحِ قدرتِ نو و عکسِ تجلیات   زاید بہ بحرِ آئینہ دل سفینہ ھا

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تجربہ روحانی کے آلے کے طور پر دل علم کا عظیم ترین سرچشمہ ہے اور اس لیے بیدل ہر وقت اس میں جھانکتے رہتے ہیں :

از تماشا گاہِ دل ما را سرِ پرواز نیست
طوطیِ حیرانِ ما داند قفس آئینہ را

آئینہ حقائق کے طور پر بیدل کی قلب سے بحث غیر محدود ہے اس لیے انھوں نے اس کا ہزار ہا اشعار میں ذکر کیا ہے ۔ ان اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ بیدل حقیقتِ قلب سے پوری طرح آگاہ ہیں ۔ اس آگاہی کی بنا پر وہ ایک ایسی اہم بحث میں فیصلہ کن حصہ لیتے ہیں جس نے مشرق و مغرب کے اہل فکر کو ہمیشہ سرگرداں رکھا ہے ۔ یہ بحث قلب (Mind) اور مادے (Matter) کے باہمی تعلق پر مبنی ہے ۔ بیدل کہتے ہیں صرف 'قلب' کے لیے تمام 'مادہ' کی تخلیق عمل میں آئی :

مدعا دل بود اگر نیرنگِ امکان ریختند
بہر این یک قطرہ خون صد رنگ طوفان ریختند

بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ تمام موجودات ایک عطیہ قلب کے اندر موجود ہیں :

نقشِ نیرنگِ دو عالم رقمِ لوحِ دل است
همه از ساخت گر این آئینه بر ما بخشند

اس لیے وہ کہتے ہیں کہ شش جہت میں "قلب" کے بغیر اور کسی چیز کی کار فرمائی نہیں :

شش جهت بیدل همین یک دل قیاس می کند
خانهٔ آئینه ای من هم تماشا می کنم

کائنات کا وجود اگر نظر آتا ہے تو اس سے صرف یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ''قلب'' ذرا کم وسعت رکھتا تھا ورنہ ہر چیز اس میں اس طرح سما جاتی کہ یہ موجودات کہیں بھی دکھائی نہ دیتیں۔

دل اگر می داشت وسعت بے نشاں بود این چمن
رنگ، می بیروں نشست از بس کہ مینا تنگ بود

جس بحث کا بارہ مافوق میں ذکر کیا گیا ہے، فلسفے کی تاریخ میں اسے خیال پرستی کہتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ خیالات ہی خارجی عالم کی دنیا کا موجب ہیں۔ اگرچہ خیال پرستی کی اصطلاح کا اطلاق یونانی فلسفی پرمی نائیڈز (Perminades—۵۳۹ تا ۴۶۹ ق-م) کے فلسفے پر نہیں ہو سکتا کیوں کہ وہ بڑی سادگی سے احساس اور اس کے موضوع کو ایک ہی شے تصور کرتے ہیں۔ تاہم وہی پہلے فلسفی ہیں جنھوں نے کہا تھا کہ خیال اور وجود کامل طور پر ایک جیسے ہیں۔ افلاطون (۴۲۷ تا ۳۴۷ ق-م) کا دعویٰ تھا کہ حقیقت غیر مادی ہے، جو اپنے حقیقی وجود کی خیالات کی صورت میں متلاشی رہتی ہے۔ اُس کی تعلیم تھی کہ خیالات ہی اصل وجود ہیں، موجودات تو اپنے وجود کے لیے خیالات پر انحصار رکھتی ہیں۔ بشپ برکلے (Bishop Berkley—۱۶۸۵ تا ۱۷۵۳ع) جو ہمارے شاعر بیدل کا خورد سال معاصر تھا، کہتا ہے کہ وجود محض خیالات کا تانا بانا ہے۔ اُس نے جسمی وجود کے نظریے کو باطل قرار دیا اور ایک ایسی خیال پرستی کی تبلیغ کی جو وجود کو مجموعۂ خیالات سے ماورا کچھ بھی نہیں سمجھتی۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ کائنات ایک عظیم قلب کے اندر موجود ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیدل اور بشپ برکلے قلب اور مادے کے متعلق ایک ہی جیسے خیالات رکھتے ہیں۔ یہ روحانی خیال پرستی (Spiritual Idealism) ہے۔ بعد میں ہیگل (Hegel ۱۷۷۰ تا ۱۸۳۱عیسوی) نے بھی اپنی منطقیانہ خیال پرستی (Logical Idealism) کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ جو کچھ بھی اصلی یا حقیقی ہے وہ روح یا قلب کا مظہر ہے۔ اُن کے خیال کے مطابق موجودات روحِ مطلق کا موضوعی وجودِ خارجی ہیں۔ ان تمام مفکرین کے خیالات کا بیدل کے نظریات سے مقابلہ کریں۔ پتا چل جائے گا کہ مغرب میں جو حقیقت بڑے مراحل سے گزرنے کے بعد اہم تشریح ہوئی، بیدل کی نگاہِ حقیقت رس اس تک یک بارگی پہنچ گئی۔

یہ معلوم کرنے کے بعد کہ قلب (Mind) موجودات (Matter) کی اصل ہے، ہم بیدل کے اشعار سے اسی سعد 'آئینہ' کے درجے ایک اور مبہم باشان بحث سے بھی آشنا ہوتے ہیں۔ اس کا ذکر خواجہ عباداللہ اختر نے اپنی کتاب ''بیدل'' میں کیا ہے۔ ذات مطلق ناقابل تغیر و تبدل ہونے کے باوجود 'کل یوم ھو فی شان' کی آیہ قرآنی کے مطابق ہر لحظہ اور ہر آن اپنی صفات کا جلوہ نئے انداز دگر دکھاتی رہتی ہے، اس لیے ہر شے تغیر پذیر ہے۔ تخریب تعمیر کی صورت اختیار کرتی ہے اور موت حیات نو کی پیامبر ثابت ہوتی ہے۔ جدید طبیعیات نے واضح کر دیا ہے کہ مادے کی اصل توانائی ہے اور توانائی کی کمی بیشی کی وجہ سے مختلف مادی صورتیں ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ اس تعمیر مسلسل، حیات نو اور تبدل پذیری کی وجہ سے کائنات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ نظریہ مسلمانوں میں شروع ہی سے چلا آتا ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

فانظروا کیف بدء الخلق ثم اللہ ینشئ النشاۃ الآخرۃ - ۲۹ : ۱۹

دیکھو کہ خداوند تعالیٰ نے مخلوق کو کس طور پر اول بار پیدا کیا۔
وہ دگر بار بھی پھر پیدا کرے گا۔

و اذا شئنا بدلنا امثالھم تبدیلا - ۷۶ : ۲۸

اور جب ہم چاہیں گے ہم ان کی مانند بدل ڈالیں گے۔

افعیینا بالخلق الاول بل ھم فی لبس من خلق جدید - ۵۰ : ۱۵

کیا پہلی بار تخلیق سے ہم تھک گئے ہیں؟ یہ لوگ نئی تخلیق سے بے دلیل شبہ میں ہیں۔

یزید فی الخلق ما یشاء ۳۵ : ۱

وہ پیدائش میں جو چاہے زیادہ کر دیتا ہے۔

ابن العربیؒ نے تجدد امثال کی اصطلاح وضع کرکے ان حقائق کی طرف اشارہ کیا ہے۔ علامہ اقبال بھی 'تشکیل جدید الہیات اسلامیہ' میں اس مسئلہ کو زیر بحث لاتے ہیں۔ اب بیدل فرماتے ہیں:

تا دم زنی چو آئینہ گردانده است رنگ
این کارگاہ جلوہ چہ مقدار نازک است

دم زدن اور آئینہ کا تعلق ظاہر ہے ، سانس کی رطوبت آئینہ کی سطح پر فوری تغیرات رونما کر دیتی ہے ۔ جس تیزی سے یہ تغیرات سطحِ آئینہ پر رونما ہوتے ہیں ، اسی تیزی سے ''کارگاہِ جلوہ'' یعنی یہ کائنات بھی دگرگوں ہو جاتی ہے ۔ ایک منظر ابھی فرسودہ نہیں ہوا ہوتا کہ ایک اور تازہ تر اور زیادہ رنگین منظر نگاہوں کے سامنے موجود ہو جاتا ہے ۔ تجدیدِ کائنات اسی طرح بڑی تیز رفتاری اور انتہا درجے کی دل فریبی کے ساتھ جاری رہتی ہے ۔

ادراکِ حقائق کے لیے پیشتر ازیں دل کا ذکر ہو چکا ہے ۔ بیدل کہتے ہیں کہ امثال کا ہر تجدد اپنی رنگینی اور رعنائی کا جلوہ آئینۂ دل میں دکھاتا ہے ۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اس کارگاہِ تمثال میں صرف دل پر قناعت کر لیں اور کائنات کے تمام جدید مظاہر اس جام جہاں نما میں دیکھیں ۔

زین کارگاہِ تمثال با دل قناعت اولیست   از ہر گلی کہ خواہی آئینہ رنگ دارد

کون سا نقش ہے جو اس میں دکھائی نہیں دیتا :

دل صد رنگ نقش‌ها کہ نہ بست   بس کہ آئینہ است حیران است

ہزاروں جلوے ہیں جو بیک وقت دل میں نظر آتے ہیں اور انسان کو محوِ حیرت بنا ڈالتے ہیں :

دل بہ ہزار جلوہ ام چہرہ گشای حیرت است

جہاں جلووں کا یہ وفور ہو ، ادراک کی یہ کثرت ہو ، حقائق کا انبوہ لحظہ بہ لحظہ ترقی پذیر ہو ، وہاں ظرفِ دل بھی برابر وسعت پذیر رہتا ہے ؛ یعنی اضافۂ کائنات اور تجددِ امثال کے ساتھ ساتھ دامنِ دل بھی برابر پھیلتا چلا جاتا ہے ۔

دل پیش‌نظر گیر سر و برگِ تموکن   گر مائلِ نازی سوی این آئینہ رو کن

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ افلاطون کے خیال کے مطابق حیرت تمام علوم کی ماں ہے کیوں کہ اس سے اسرارِ قدرت معلوم کرنے کے لیے تجسس اور تحقیق کا مادہ پیدا ہوتا ہے ، لیکن علامہ موصوف فرماتے ہیں کہ بیدل حقیقہً حیرت پر ایک مختلف انداز سے غور کرتے ہیں ۔ بیدل کے نزدیک دینی نتائج سے قطع نظر حیرت کی اپنی قدر و قیمت بڑی گراں بہا ہے ۔ اس ضمن میں علامہ موصوف بیدل کا مندرجہ ذیل شعر قلم بند[1] فرماتے ہیں :

۱۔ علامہؒ موصوف کے انگریزی مس افکار پریشان ، صفحہ ۸۳ ۔

نزاکت ہا ست در آغوشِ مینا خانہ' حیرت
مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را

مضامینِ حیرت کا تعلق تجدد امثال سے ہے ۔ آئینے اور حیرت کا تعلق بھی ظاہر ہے ۔ آئینے کو ہمیشہ حیران باندھتے ہیں ۔ بیدل نے اس لفظ کی رعایت سے حیرت کے موضوع پر کثیر تعداد میں اشعار کہے ہیں ۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کے خیال کے مطابق بیدل کے نزدیک حیرت کی اس قدر کیوں قدر و قیمت ہے ۔

حضرتِ علامہ نے بیدل کا جو شعر نقل فرمایا ہے ، اس کا دوسرا مصرع حیرت کی اہمیت اور قدر و قیمت کو واضح کر رہا ہے ۔ نگاہیں ایسے مشاہدے سے دوچار ہوتی ہے جو صرف آغوشِ حیرت میں موجود ہوتا ہے ۔ اس کا تصور بھی اور کہیں ذہن میں نہیں آ سکتا اور اگر اسے دیکھتے وقت بے احتیاطی سے ذرا آنکھ جھپک جائے تو نظارہ بالکل درہم برہم ہو جاتا ہے ۔ یہ حسن ازل کا مشاہدہ ہے ۔ اس مشاہدے میں محویتِ تامہ بصارت افروز ثابت ہوتی ہے :

همچو آئینہ چشم عارف را ساز حیرت بصارتِ دگر است

اور یہ کہنا درست ہے کہ اس وقت وجود کا ہر ذرہ چشم' دیدار بن جاتا ہے :

دل ہر ذرہ ما چشم' دیدار تو بود چشم بستم و ہزار آئینہ نقصان کردیم

اس لیے آنکھ جھپکنا یا بند کرنا ہزار آئینہ نقصان کرنے کے مترادف ہوتا ہے ۔ حیرت جلووں کے طوفان میں پہنچا دیتی ہے ۔ اگرچہ ویسے تو یہ سعادت صرف نبوت کے حصے میں آتی ہے ، جلوۂ طور ایک موسیٰ کی نگاہ بے تاب ہی دیکھ سکتی ہے یا انوار ذات ایک ہی۔ امی[۱] لقب ہی سدرۃ المنتہیٰ سے آگے بڑھ کر دیکھ پاتے ہیں ۔ انبیا کی ذات میں ادراک اور مشاہدے کی لمی بے پناہ قوت کی بنا پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا گیا ہے کہ :

همہ[۱] دیدہ گشتہ چو نرگس تنش

بیدل بھی اپنے وجود کے ذرے ذرے کو چشم' دیدار کہتا ہے ، اس لیے اگر ایک عارف کامل بھی تابِ دیدار کی سعادت حاصل کر لیتا ہے تو اسے فیض نبوت

۱- صوفی اسی بنا پر حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانِ عین الوجود یعنی موجودات کی آنکھ کی پتلی قرار دیتے ہیں ۔

سمجھنا چاہیے ۔ یعنی عارف ہی نبوت کی ایک استعاری حیثیت سے بہرہ ور ہو گیا ۔

حیرتِ آئینہ ام مہر نبوت دارد کلبِ دیدارِ تو ہی شاہد اعجازِ نگاہ

انوارِ ذات کے مشاہدے کے وقت آئینۂ حیرت اپنے اندر نقشِ امکان کا معمولی سا عکس بھی نہیں پڑنے دیتا ۔

نقشِ امکان در بہارِ حیرتم رنگی نہ بست شستہ ام عمریست این دفتر بچشم آئینہ

بیدل کے ہاں حیرت کے تمام مضامین میں بنیادی طور پر یہی افکار مضمر نظر آتے ہیں اور انہی افکار عالیہ کے باعث یہ موضوع بے حد اہم بن گیا ہے ۔ یہاں اس بات کی طرف از سر نو اشارہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ یہ سرا بیان بیدل کے ذاتی تجربے کا آئینہ دار ہے :

سحر طرازیِ گلزارِ حیرت است امروز شکستہ رنگیِ آئینۂ تماشایم

حرفِ او می‌شنوم جلوۂ او می‌بینم پیش او آئینۂ چند از او می آرم

بیدل اپنے تجربۂ روحانی کی بنا پر کہتے ہیں کہ آدم یعنی انسانِ کامل مقامِ حیرت پر فائز ہو کر اور دل سے سروکار رکھ کر استغراق کی لذات حاصل کر لیتا ہے ۔ اس استغراق اور محویت کے عالم میں آدم یعنی عبداللہ حجب گم ہو جاتا ہے تو اللہ[۱] ہی رہتا ہے ، گویا بالآخر بندے اور خدا کا کامل اتحاد ہو جاتا ہے ۔ درمیان میں اور کوئی چیز باقی نہیں رہ جاتی :

آئینۂ تحقیق ز تمثال مبتراست حیرانِ حیایم بہ مقابل چہ فروشم

انسان اور خدا کی عینیت تامہ یا انسان اور خدا کے اتحاد کا تذکرہ اس مقالے میں کئی بار کیا جا چکا ہے ۔ علامہ اقبال بھی اپنی گراں قدر تصنیف ''تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ'' میں پروفیسر ہاکنگ (Professor Hocking) کا قول نقل کرتے[۲] ہیں اور فرماتے ہیں کہ حقیقتِ سرمدیہ تمام و کمال خصوصیت کے ساتھ ایک ولی کی روح پر چھا سکتی ہے ۔ سطور بالا میں اس بات کا اظہار بھی ہو چکا ہے کہ اس عینیت یا اتحاد کی حیثیت ایک تجربۂ روحانی سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی ۔ یہ کیفیت محض عارضی ہوتی ہے ، یہ علیحدہ بات ہے کہ عارضی ہونے کے باوجود

۱- قرآن اور تصوف : از میر ولی الدین ، صفحہ ۱۲۱ ، ۱۳۰ ۔

۲- تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ : ترجمہ نذیر نیازی ، صفحہ ۳۴ تا ۳۹ ۔

یہ دل میں عجیب و غریب قوت ، روح میں بے مثال توانائی ، طبیعت میں ابدی سکون و اطمینان اور مذہب کے متعلق افکار میں لازوال تیقن پیدا کر دیتی ہے ، جس کا ثبوت وہ تمام اشعار ہیں جو بیدل نے اس ضمن میں صیغہ متکلم استعمال کرکے کہے ہیں ۔ تاہم چوں کہ ہم لفظ آئینہ کے توسط سے تمام مطالب اور معانی کا احصا کر رہے ہیں اس لیے اس لفظ کو لے کر ہم ایک بار پھر بیدل کی اپنی زبانی سننا چاہتے ہیں کہ مستقل عینیت یا کامل اور دوامی اتحاد قطعاً ناممکن ہے ۔ ذات حق وراء الوراء رہتی ہے ۔

بیدل کہتے ہیں کہ آئینہ میں تمثال یعنی عکس کے بغیر اور کچھ نہیں ہوتا ۔ اصل شے اس سے دور رہتی ہے ۔

ای تراشیدہ نسبتِ مظہر　　دورِ عینیت ہمہ ہمہ حال
آئینہ گر ہمہ مصور شود　　نکشاید ز شخص جز تمثال

کہتے ہیں صوفیا نے انسان کو ذات حق کا مظہر کہا ، اس کا آئینہ قرار دیا ، اس کا عین بیان کیا ۔ لیکن اب عینیت کا دور ختم ہو چکا ہے ۔ تخلیق کائنات سے پہلے ذات حق میں موجود ہونے ہوئے عینیت تھی ۔ اب آئینہ اگر کاملاً سامنے بھی آ جائے ، اس میں عکس کے بغیر اور کچھ نہیں ہوگا ۔ اصل ذات اس سے باہر رہے گی ۔ علامہ اقبال کے مقولہ بالا الفاظ استعمال کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حقیقتِ سرمدیہ ، ولی کی روح پر کامل محسوسیت کے ساتھ چھا جانے کے باوجود وراء الوراء رہے گی ۔ بنابریں بیدل کہتے ہیں کہ جس ساعت سعید کو اہل تصوف ساعتِ وصال کہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اتحاد کامل نصیب ہو گیا ، وہ بھی دراصل خیال پرستی ہوتی ہے :

بہ رنگِ آئینہ گر شخص غیر عکس نہ بیند
بہ عینِ وصلِ من بی خبر خیال پرستم

اور ہونا بھی یہی چاہیے ؛ حقیقتِ تنزیہ صورتِ تشبیہ میں کس طرح جلوہ گر ہو سکتی ہے ۔

زاں جلوہ ہیچ نہ نمود آئینہ جز مثالی　　نقاش را محال است تصویر جاں کشیدن

ایک بار پہلے بھی سطور بالا میں فص شیثیہ کے ضروری مطالب کا ذکر کرتے ہوئے ذاتی استعداد کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ اہل خیال کی رسائی جہاں تک ہوگی جلوہ اسی نوعیت کا ہوگا ۔ تنزیہات ہوں یا حسیات ، ان کی ذاتِ حق

تک پہنچ نہیں۔ ہر شخص کی تحقیق صرف اس کے ذاتی افکار کا آئینہ ہوتی ہے ؛ یہ عجز ادراک کا اعتراف ہے۔

آں جا کہ بود جلوہ گہ حسن کجاست چون آئینہ جو لست یقین‌ها و گمان‌ها

آئینہ محدود شے ہے اور ذات حق غیر محدود۔ آئینہ کے پاس اتنی استعداد کہاں کہ غیر محدود کو اپنے ظرف میں جگہ دے :

صد گلستاں رنگ درباز است حسن اما چہ سود
خانۂ آئینۂ ما نیست جز یک گل زمین

چو سحر بہ عالم جلوہ اب خجلم ز تہمت اندکی
نفسی کہ داشتم آب شد ز حجاب آئینہ ہای تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آئینۂ حق بھی انجام کار حجاب ثابت ہوا۔ حقیقت مستور بدستور مستور ہی رہی۔

آئینہ کی نارسائی کا مزید ملاحظہ ہو ؛ حقیقت مطلقہ کا عکس اس میں کیسے پڑ سکتا ہے ، وہ ہستی تو ذات بے رنگ ہے۔ وہ تو اساسی نور ہے جو بالکل غیر مرئی ہے۔ رنگوں کی ظاہر کثرت میں موجود ہوتے ہوئے بھی اس کا آئینے میں منعکس ہونا ممکن نہیں ، کیوں کہ اس میں تو صرف رنگوں کا انعکاس ہو سکتا ہے۔

جہاں طوفاں رنگ و دل ہیں مشتاق بی رنگی
چہ سازد جلوہ با آئینۂ مشکل پسند ما

حسن بی رنگی کہ عیب صورت نیرنگ اوست
عرض تمثال کہ دارد باور اظہر آئینہ

دراں محفل کہ حسن از جلوۂ خود داشت اسما
من بی ہوش ہر آئینہ داری ناز می‌کردم

یہ اسلوب بیان بیدل کو نزہ گاہ تسمہ میں پہنچا دیتا ہے جہاں ذات الٰہی کی ماورائیت کے بعد اور کوئی معنی ذہن میں نہیں آتے۔

بیدل اسی طرح بڑے علمی انداز میں ان دقیق اور وقیع مطالب کا ذکر

کرتے ہیں۔ اس سے پہلے اشعار کا تذکرہ بھی ہو چکا ہے بڑی مہارت کے ساتھ کیا تھا۔ دوسرے لفظ میں مذہب اور روحانیت کے دو لفظوں کے درمیان بیدل کا تصور خدا گھومتا رہتا ہے۔ لیکن چوں کہ ان کے دل میں محبتِ الٰہی کا بے پناہ جذبہ ہے اور وہ دیدار الٰہی کے لیے ترستے ہیں اور اعلیٰ درجے کے شاعر بھی ہیں اس لیے شوق دیدار کا اظہار بار بار نہایت ہی خوب صورت اور وجد آفریں انداز میں کرتے ہیں۔ مثلاً :

بیدل آں گوہر نایاب سراغ   نہ عجیب کہ پوسیدہ نیست
عکس افتادہ در آئینۂ ہوش   گل بواں گشت وی چیدن نیست

آئینہ کا لفظ یہاں بھی موجود ہے اور آخری مصرع کے حسن کا تو جواب نہیں۔ بے شک انسان آنکھیں بند کر کے عالم تصور میں اس مصرع کا تکرار کرتا رہے اور طرب و سرور کے گل ہائے رنگا رنگ سے اپنے دامن دل کو معمور کرتا رہے۔

ابھی ابھی الوہیت کا ذکر ہو رہا تھا، اس کے ساتھ رسالت بھی بیدل کا اہم بانشان موضوع ہے اور ان کے نظام فکر میں اس موضوع کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ شعر کہتے ہوئے جب کبھی بیدل رسالت کا پُر جوش عقیدت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں تو اس میں ان کے نظام فکر کا یہ بنیادی نکتہ روح بن کر موجود ہوتا ہے۔ ہم اپنے اس خیال کی توضیح ان کی مندرجہ ذیل رباعی سے کرتے ہیں :

بیدل رقم جلی و خفی می خواہی
اسرار نبی و رمز ولی می خواہی
حق آئینہ است نور احمد دریاب
حق فہم اگر فہم علی می خواہی

اس رباعی میں حق کو نور مصطفیٰ کا آئینہ کہا گیا ہے اور ہدایت کی گئی ہے کہ حضرت علی کے متعلق آگاہی حاصل کرنے کے لیے حق فہمی اختیار کی جائے۔

رباعی ہذا میں فلسفۂ تنزلات کے دو نکات کا بیان ہے : ذات مطلق مرتبۂ تنزیہ میں نا معلوم و ناقابل علم ہے۔ نزول کا پہلا مرتبہ احدیت ہے۔ اس سے مراد حق تعالیٰ کی ذات محض ہے۔ یہ بے رنگی اور بے کیفی کا مرتبہ ہے۔ بیدل کہتے ہیں حضرت علی ذات مطلق کے اس مرتبۂ بے رنگی کا مظہر ہیں اور یہی رقم خفی یا رمز ولی ہے۔ اب رقم جلی یا اسرار نبی کا بیان شروع ہوتا ہے۔

بروں کا دوسرا مرتبہ وحدت ہے ۔ ارباب تصوف اسے تمام مخلوقات اور موجودات کا مادہ کہتے ہیں ۔ اس مرتبے میں سالک ذات حق کو اس طرح ملحوظ رکھتا ہے کہ اسے اپنی ذات کا اجمالی علم ہے اور اپنی تمام شیونات کا ادراک ہے ۔ یہ ادراک ازل سے ابد تک ساری خلق پر بطریق اجمال حاوی ہوتا ہے ۔ اسی لیے مرتبۂ وحدت کو مخلوقات کا مادہ کہتے ہیں ۔ احدیت کا مظہر حقیقی وحدت ہے ۔ مرتبۂ وحدت کو حقیقت محمدیہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے اور ہمارے نقطۂ نگاہ سے اسی نکتے کا سمجھنا از بس ضروری ہے ۔

جیسا کہ پیش تر ازیں کہا جا چکا ہے ، ابن العربی کے خیال کے مطابق مقصدِ تخلیق آئینۂ کائنات میں اسمائے مطلق کا ظہور ہے ۔ لیکن ابن العربی خود اس بات کے قائل ہیں کہ اسمائے مطلق کا ظہور باقی موجودات کے مقابلے میں ذات انسانی میں زیادہ ہے اور افراد انسانی میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس اسمائے مطلق کا مظہر اتم ہے ۔ یعنی ہنگامۂ تخلیق بپا ہونے کے وقت سے جو سلسلۂ ظہور شروع ہوا تھا ، وہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات انور میں تکمیل پذیر ہوا ۔ یہاں آ کر مرتبۂ وحدت یا مادۂ کائنات کا اظہار کامل ہوا ۔ مرتبۂ وحدت کو حقیقتِ محمدیہ[1] اسی لیے کہتے ہیں ۔ اس مصرع کے زیر نظر محولہ بالا رباعی کے اس مصرع :

خلق آئینہ است نور احمد دریاب

کا معنی واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ مرتبۂ وحدت کی جو حقیقت تھی اس کا کامل ظہور جناب رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات قدسی آیات میں ہوا ۔

رسالت کا یہی تصور بیدل کے فکر میں ہر جگہ جاری و ساری ہے ۔ مثلاً ان کی مثنوی 'طلسم حیرت' کے اس شعر کے حسن[2] کا ماخذ بھی یہی تصور ہے ۔

۱۔ حقیقت محمدیہ اور ذات محمدیہ میں خلق اور مخلوق کا فرق ہے ۔ دیکھیں : "قرآن اور تصوف" از میر ولی الدین صفحہ ۱۰۵ — ۱۱۰ ۔ خفی اور جلی کے حقائق کے زیر نظر اقبال کے اس شعر کو بھی سمجھیں :

اینکہ لشناسی خفی را از جلی هشیار باش
ای گرفتار ابوبکر و علی هشیار باش

۲۔ مولانا غلام رسول مہر رقم طراز ہیں کہ ایام طالب علمی میں انھوں نے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

صاحب سرور کونین کی نعت لکھتے ہوئے کہتے ہیں :

دو عالم چوں صدف درهم شکستم   کہ آمد گوہر ناسش بہ دستم

مرتبہ وحدت یا حقیقت محمدیہ کو نور محمدی بھی کہتے ہیں ۔ اسی نور کامل سے اشیا کی تخلیق ہوئی ہے ۔ اس توضیح کو سامنے رکھ کر بیدل کی مذکورہ بالا مثنوی کے اس شعر کو پڑھیں :

جہاں مرآت انوار جمالش   دل ہر ذرہ فانوس خیالش

ان کی اولیں مثنوی محیط اعظم کا یہ شعر بھی نور محمدی کی اسی حیثیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے :

ز آئینہ ذرہ تا آفتاب   ز نورِ تماشای او کامیاب

بادی النظر میں یہ اشعار صرف پرواز تخیل سے تعلق رکھتے ہیں لیکن بہ غور دیکھا جائے تو ان میں حقیقت محمدیہ کے متعلق ارباب تصوف کے افکار کا خلاصہ موجود ہے ۔ ہمارا دقیق النظر شاعر متصوفانہ مابعدالطبیعیات کو کسی وقت بھی نظرانداز نہیں کرتا ، اور لطف کی بات یہ ہے کہ آئینہ کا التزام ہر جگہ موجود ہے ، جو ہمارا موضوعِ مقالہ ہے ۔

اب تک ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس سے لاریب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ کلام بیدل میں لفظ آئینہ ایک عام تشبیہ یا استعارے کی حیثیت سے موجود نہیں ، بلکہ یہ ایک ایسا لفظ ہے جو شاعرانہ انداز میں تصوف اور مابعدالطبیعیات کے بڑے گہرے مطالب بیان کرتا ہے ۔ ہم بیدل کے ایسے مزید متعدد اشعار پیش کر سکتے ہیں جن میں وحدت و کثرت ، تشبیہ و تنزیہ ، وحدت وجود ، وحدت شہود ، عینیت ، ماورائیت ، تنزلات ستہ وغیرہ کے مسائل لفظِ آئینہ کی وساطت سے بیان کیے گئے ہیں ۔ یہ امر بھی بخوبی واضح کیا جا سکتا ہے کہ اپنی روایات کے مطابق بیدل نے اس لفظ کے ذریعے اپنے عہد کی برائیوں اور آنی اور وقتی مباحث کو بھی بڑی خوبی سے بیان کیا ہے ، اور دلیل دی ہے کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

مولانا روحی مرحوم سے نکات بیدل سبقاً پڑھنے شروع کیے لیکن مولانا روحی شروع ہی میں اس ایک شعر کے حسن میں اس طرح کھو گئے کہ آگے نہ پڑھ سکے اور سبق ہمیشہ کے لیے وہیں ختم ہو گیا ۔

جس طرح آئینے میں چمکتے ہوئے جواہر کا وجود اسے ناقص بنا ڈالتا ہے ، اس کے معاصر مغل امرا کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے درخشاں کمالات اور اعلیٰ دہانت کا بے جا مظاہرہ کرکے اپنے باطن کو تاریک نہ بنالیں :

دل روشن چہ لازم تیرہ از عرض ہنر کردن
ز جوہر خانۂ آئینہ را زیر و زبر کردن

لیکن یہ تمام مباحث اس مقالے کو بے حد طویل بنا ڈالتے - یہی کہہ دینا کافی ہے کہ بیدل نے اس قصے کے ذریعے عظیم اور وسیع خیالات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہمارے سامنے موجود کر دیا ہے اور فکر و ادراک کی بے شمار راہیں کھول دی ہیں -
(غیر مطبوعہ)

---

(۱۰)

کلام بیدل میں معنی خیز علامتیں

سترھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں شبہ قارۂ ہند میں عبدالقادر بیدل کا ظہور ایک غیر معمولی علمی اور فنی حیثیت کا پیش خیمہ ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملوں کو سات سو سال ہونے کو تھے اور ان صدیوں میں طول و عرض ہند میں اسلامی علوم کی اشاعت کے لیے بے شمار درس گاہیں قائم ہو گئی تھیں۔ نہ صرف یہ کہ مسلمانوں نے اس عرصے میں ان علمی روایات کو پختگی کا درجہ عطا کیا جو وہ سمرقند اور بخارا سے اپنے ساتھ لائے تھے بلکہ ہند کی مخصوص علمی روایات سے کام لے کر اپنے علوم و فنون کو تازہ توانائی بھی عطا کی۔ میرزا بیدل اپنی بے نظیر ذہنی صلاحیتوں کی بنا پر ان تمام علمی کمالات کے وارث بنے۔ زبان فارسی نے ہندوستان میں ایک خاص سبک و لہجہ اپنایا تھا۔ اگرچہ سنائیؒ، رومیؒ، سعدیؒ اور حافظؒ اس وقت بھی مسلمانوں کی عقیدت کا مرکز تھے مگر خود ہندوستان میں امیر خسرو، فیضی، عرفی، ظہوری اور دیگر باکمال شعرا نے جو ادبی ماحول پیدا کر دیا تھا، وہ بھی بے حد ذہن افروز اور بصیرت پرور تھا۔ اس لیے بیدل ایسے غیر معمولی طور پر ذہین اور طباع شاعر نے ان تمام ادبی اور فنی خوبیوں سے بڑے انہماک سے استفادہ کیا اور اپنے کلام کو عجب انداز سے بلاغت تمام بنایا۔

دقت نظر ہندوستان کی امتیازی خصوصیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے فارسی گو شعرا میں ہم اس خصوصیت کو عام جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ عرفی کو اس لحاظ سے تمام شعرا کا سرتاج تسلیم کیا جاتا ہے مگر ہند کے دوسرے فارسی گو شعرا کے ہاں بھی اس صفت کا اظہار بہت زیادہ ہوا ہے۔ بنابریں معنی آفرینی کے اعتبار سے ان شعرا کا مقام بہت بلند ہے۔ لیکن بیدل جو ان تمام باکمال شعرا کے بعد پیدا ہوئے اور ان تمام شان‌دار روایات سے مستفیض ہوئے، معنی پروری

اور معنی آفرینی کے لحاظ سے اس مقام پر فائز نظر آتے ہیں جہاں وہ حس نقطہ کو اپنی نوکِ قلم پر لاتے ہیں ، اُسے گنجینۂ معانی بنا دیتے ہیں ۔ علاوہ بریں وہ ایک عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے ، انہوں نے عمر بھر صرف ارتقائے ذات سے سروکار رکھا ۔ زندگی کے کسی اور سمت کی طرف وہ قطعاً مائل نہ ہوئے اور جذبات و احساسات کی وہ کیفیت رہی کہ وہ اپنے حال میں صرف مست ہی نہیں تھے بلکہ اپنی اس روش پر نازاں بھی تھے ۔ فرماتے ہیں :

بیدل مستِ شکوہ حالِ خویشم   شاہنشہ ملکِ بے زوالِ خویشم
از شوکت و جاہِ خسروانم مفریب   قربانِ خیالِ ذوالجلالِ خویشم

اس ضمن میں ایک اور رباعی بھی بڑی بصیرت افروز ہے ۔ کہتے ہیں :

تا رستہ ام از ہوس تبرا دارم   در خلوتِ معنی انجمن ہا دارم
در باغ و بہاری و کرم استغناست   شعری می گویم و تماشا دارم

عجز و پندار سے محو استغنا کی ایک عجیب کیفیت کے ساتھ وہ اپنے خیال میں محو رہا کرتے تھے اور کسی بڑے سے بڑے جلالت مآب شاہنشاہ کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے ، اس لیے اُن کے الفاظ اور معانی ایک خاص روح سے سرشار ہیں ، اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی علامتیں افکار پراگندہ کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک خاص مرکزیت کی حامل ہیں ۔ اور اس بنا پر اُن کے کلام نے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرونِ ہند بھی اپنے پرستار پیدا کیے ۔ ہم یہاں ان کی صرف دو علامتوں کا سرسری طور پر ذکر کرتے ہیں ۔

پہلی حباب کی علامت ہے ۔ حباب کے ساتھ شغف قدما کو بھی تھا لیکن بیدل کی نگاہوں میں سے جو محبوبیت حاصل ہوئی وہ عدیم المثال ہے ۔ ان کے سینکڑوں اشعار ہیں جن میں لفظ حباب بڑی آن بان کے ساتھ موجود ہے ۔ قابل قدر امر یہ ہے کہ ہر نئے شعر میں اس کا انداز نرالا ہے اور ہر بار یہ لفظ معانی کا نیا جامہ پہن کر نگاہوں کے سامنے آتا ہے ۔ اور یہ سب کچھ محض جمال آرائی کی بنا پر نہیں کیا گیا بلکہ حباب کے ذریعے بڑے بڑے عظیم حقائق بیان کیے گئے ہیں ۔ کہیں تو تصوف اور مابعدالطبیعیات کے اہم مسائل کو واضح کیا ہے ، کہیں اپنے معاشرے پر تنقید کی ہے ، کہیں انسان کو موضوع قرار دے کر اس کی عظمت اور کائنات میں اس کے مقام کی توضیح کی ہے اور کہیں ایک شاعر کی حیثیت سے منظر نگاری اور معنی آفرینی سے کام لیا ہے ۔ لطف کی بات یہ ہے

کہ ان تمام مصائب مطالب کو بیان کرتے ہوئے انہوں نے ہر بار اپنے جلبۂ فقر کی حرارت بھی تب شعر میں منتقل فرما دی ہے۔ اس قدر متنوع مطالب کا احصا صرف وہی شاعر کر سکتا تھا جس کی قوت مشاہدہ بڑی تیز ہو اور جو بڑی باریک بینی سے کام لے کر حباب کی تمام حیثیتوں کا جائزہ لے سکتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بیدل کے ہاں ہم جوں جوں حباب کا مطالعہ کرتے ہیں ، ہمیں ان کی دقت مشاہدہ اور تخیل کی خلاقی پر زیادہ سے زیادہ یقین ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان تمام امورات کے زیر نظر اگر انہیں اپنی علامت حباب پر ناز ہے تو بالکل بجا ہے۔ فرماتے ہیں :

حوامی نفس شمار کن و خواہ گرد وہم
چیزی نمودہایم در آئینۂ حباب

اپنے ایک اور شعر میں بیدل حباب کو 'عجوبۂ صد رنگ' کے نام سے بھی پکارتے ہیں اور اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے کلام میں حباب اسرار و معانی کا جس طرح خزینہ لاجواب بن چکا ہے اس سے وہ خود بہ خوبی آشنا ہیں۔

بہ غور دیکھا جائے تو حباب کی بہت سی صفات ایک صوفی کی صفات سے مشابہت رکھتی ہیں۔ اس کے نقش سے حیرانی ہویدا ہے ، صبر نفس کا پابند ہے ، نگاہ شرم آلود ہے ، چشم ہر وقت تر رہتی ہے ، غیر کی طرف نہیں دیکھتا ، سیر دل کا عامل ہے ، وضع آداب رکھتے ہوئے کلاہ آرائے ناز رہتا ہے ، خموشی اس کے لبوں پر طاری رہتی ہے ، صفائی سینہ جو حباب کو حاصل ہے وہ اور کسی کو کیا حاصل ہوگی۔ سبک سر اور سبک روح ہے ، بالکل تہی از خویش ہے ، اس کی عاجزی کا کیا کہنا ، نزاکت اور لطافت کا پیکر ، پاس ناموس کا بے حد پابند ، اس کی زندگی صرف نفس سوزاں سے وابستہ ہے۔ اس کی حقیقت کو کھولنا چاہو تو آن واحد میں ختم ہو جائے گا۔ اب یہ تمام صفات ایک صوفی کی ہیں اس لیے بیدل نے حباب کو صوفی کے لیے علامت قرار دے دیا اور اپنے اشعار میں اس کی وضع کو سامنے رکھ کر مختلف پیرایہ ہائے بیان سے صوفی کا ذکر کیا۔ قلب صوفی اپنی پاکیزگی اور درخشندگی کی بنا پر جام جہاں نما ہوتا ہے ، تمام اسرار کا مہبط بنتا ہے اور ذات الٰہی کے انوار و تجلیات اسی لطیف وجود میں مرتکز ہوتے ہیں۔ گویا اس کا رابطہ براہ راست ذات باری تعالیٰ سے قائم رہتا ہے۔ بیدل قلب صوفی کے لیے بھی حباب کا استعارہ استعمال کرتے ہیں اور اس سے کام لیتے ہوئے بڑے اہم معانی بیان کرتے ہیں۔

ز سیر عالم دل غافلیم ورنہ حباب
سری اگر بہ گریبان فرو برد دریاست

اور :

در کارگاہ دل بہ ادب باش و دم مزن
پُر نازک است صنعتِ میناگریِ حباب

تصوف کا مقصد حقیقی تکمیل ذات ہے ۔ جب صوفی اپنے آپ کو ذات کے لحاظ سے فانی کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنی ذات کے ان پست تر رجحانات کا خاتمہ کر دیا ، جو اسے زندگی کے پست مقاصد سے وابستہ رکھتے ہیں ۔ پست مقاصد کی حیثیت منفی ہوتی ہے اور ارفع مقاصد مثبت حیثیت رکھتے ہیں جو ارتقائے ذات اور اثبات ذات کا موجب بنتے ہیں ۔ ان سے جوہرِ انسانیت فروغ پذیر ہوتا ہے ۔ وہ جوہر جو پہلے ادنی درجے کے مقاصد کے غلبے کی وجہ سے کہیں طبیعت کے پردوں میں پنہاں رہتا ہے ، اعلی اقدار کے بروئے کار آنے سے نشو و نمود شروع کر دیتا ہے اور انسان کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے ۔ بظاہر تو انسان کے حواس خمسہ ویسے کے ویسے رہتے ہیں مگر اس کی شخصیت میں جو انقلاب پیدا ہو جاتا ہے وہ اس کی توانائی میں ہزار گنا اضافہ کر دیتا ہے ۔ اس کی روح میں اب اس قدر پہنائی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ کائنات کی فضاؤں میں سما نہیں سکتا ۔ بیدل تصوف کے ذریعے تکمیل ذات کے اسی درجۂ غنی پر پہنچے ہیں ۔ اس حقیقت کا ذکر وہ حباب کے استعارے سے کرتے ہیں :

نمی گنجم بہ عالم بس کہ از خود گشتہ ام خالی
حبابم را لباس بحر تنگ آمد بہ عریانی

اسی لیے وہ پائندگیِ ذات کے علم بردار ہیں :

در محیط از خود تہی‌ہا می‌گنجد حباب
گر نفس بر خود ببالد گوشۂ دل تنگ نیست

یہ پائندگی ایک مقام پر جا کر رک نہیں جاتی ۔ صوفی کہتے ہیں "منزل ما کبریاست" اور چونکہ ذات کبریا تمام حدود سے ماوراء ہے ، اس لیے صوفی کا ارتقا بھی بے انتہا ہے ۔ بیدل کہتے ہیں :

یک نفس ما گرہِ دامانِ حبابیم امروز
ورنہ چون آب روان است ہمان پیشۂ ما

غیر محدود رفتار حرکت دوام کو لازم قرار دیتی ہے۔ ایک موقع پر یک مقام جو منزل بن کر دعوت نظارہ دیتا ہے، ایک اور سمجھے محض سنگ میل بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ آگے سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے اور حرکت دائمی ہوتی رہتی ہے:

در طلب گاہ دل جو موج و حباب
منزل و جادہ ہر دو در سفر است

اس امر کو مدنظر رکھ کر بیدل کے تصوف کی تہذیب پر غور کریں، حباب کو عام طور پر فنا پذیری کی علامت سمجھا گیا ہے۔ یہ بیدل کی عظمت فکر کا ثبوت ہے کہ انہوں نے حباب کو بھی دوام بخشا اور حرکت دوام سے مالا مال کر دیا۔

بحرۂ عاشق میں منفی مقاصد کا ذکر کیا گیا ہے۔ منفی مقاصد منفی جذبات پیدا کرتے ہیں اور ان سے منفی قسم کی شخصیت نشوونما پاتی ہے۔ بعض اوقات انسان کی طبیعت کسی خاص منفی جذبے سے وابستگی پیدا کر لیتی ہے۔ اس طبعی وابستگی کی وجہ سے بہ معمولی سے ناخوشگوار واقعے کی بنا پر بھی بری طرح متہیج ہو جاتا ہے اور اس طرح منفیانہ نوعیت کی شخصیت اور بھی زیادہ پھلتی پھولتی اور استوار ہوتی رہتی ہے۔ اس شخصیت کا تعلق انسان کے ان صالح میلانات سے ذرہ برابر بھی نہیں ہوتا جو اس کی فطرت میں موجود ہوتے ہیں اور جو غیر اصلی شخصیت کے استیلا کی وجہ سے بالکل دبے رہتے ہیں۔ انسانوں کی غالب اکثریت غیر اصلی شخصیت کے اس خول میں ملفوف رہتی ہے اور اس طرح اپنی زندگی گزار دیتی ہے۔ ہمارے گرد و پیش لاتعداد انسان شخصیت کا یہی قابل نفرت خول زیب تن کیے بڑے مگن اور خندان و شادان پھرتے رہتے ہیں۔ انہیں اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں اپنی ذات پر کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ منفی مقاصد، منفی جذبات، اثبات ذات کے منافی احساسات انہیں بے حد پسندیدہ ہوتے ہیں، وہ انہیں متاع بے بہا سمجھتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہماری اصلی شخصیت ان کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہے، ان کا ترک لابدی ہے۔ بیدل کہتے ہیں:

غیر من زین قلزم گوہر حبابی گل نہ کرد
عالمی صاحب دل است اما کسی بیدل نشد

سری ذات کو ورطۂ ہلاکت میں ڈالنے والے اس قلزمِ شعار میں صرف حباب بننا موجبِ نجات ہے ۔ دل کو پست قسم کی مرغوبات سے وابستہ کرنا موجب ہلاکت ہے ۔ فلاح تو بیدلی میں ہے ۔ یہ بڑی کٹھن منزل ہے ۔ نوع انسانی کے لیے اس سے بڑی آزمائش اور کوئی نہیں ۔ لیکن اگر اس آزمائش کا سامنا مردانہ وار نہ کیا جائے تو انسان اس قیمتی جوہر کو کھو بیٹھتا ہے جو اس کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے ۔ بیدلی انسان کو اُن مثبت راہوں پر چلاتی ہے جو اثباتِ ذات کا موجب بنتی ہیں ۔ جس طرح حباب الدو سے بالکل ہی ہوتا ہے ، منفی مقاصد اور منفی جذبات کو بھی اپنی ذات میں سے اسی طرح خارج کر دیا جاتا ہے ۔ منفی مقاصد کی جگہ مثبت مقاصد لیتے ہیں ، ان کی آبیاری مثبت جذبات سے ہوتی ہے ۔ اثباتِ ذات اور ارتقائے انسانی کے لیے عظیم ترین مثبت مقصد یافت اور شہود حق ہے اور محبوب ترین مثبت جذبۂ محبت الٰہی ۔ انسان ان ارفع اور اعلیٰ مرغوبات کو لے کر اپنی ذات کو توجہ اور مشاہدے کا مرکز بناتا ہے ۔ منفی نوعیت کی ہر چیز کو اپنی ذات سے کانٹے کی طرح نکال کر باہر پھینکتا چلا جاتا ہے ، اس طرح منفی شخصیت دم توڑنے لگتی ہے ۔ مثبت یا اصلی شخصیت انگڑائیاں لے کر بیدار ہوتی ہے اور ہولے ہولے اُس کا دل ہستیِ مطلق سے معمور ہو جاتا ہے ۔ عرفانِ نفس کی تفسیر یہی ہے اور اسی سے عرفانِ الٰہی حاصل ہوتا ہے ۔ بیدل فرماتے ہیں :

ہر کہ از خود شد تہی از ہستیِ مطلق پُر است
از حبابِ من سراغِ گوہرِ نایاب گیر

معصوفانہ مابعدالطبیعیات اپنی توجہ خدا ، انسان ، رسالت ، حیات بعدالموت ، زمان و مکان اور ہتی متعلقہ مسائل پر مرکوز کر دیا کرتی ہے ۔ بیدل بھی ان تمام مسائل کو لے کر خوب دادِ تحقیق دیتے ہیں اور کسی نہ کسی انداز میں اپنے محبوب استعارے حباب کو بھی ضرور استعمال کرتے ہیں ۔ مثلاً زمان کا ذکر کرتے ہوئے حباب کم فرصتی کی علامت بن جاتا ہے ۔ مندرجہ ذیل دو اشعار پر غور کریں :

وہم تا کی شمرد سال و مہ فرصت کار
شیشۂ ساعتِ موہوم حباب است این جا

نفس شمار زمانیم تا نفس نزدن
همین شهود حباب و همین سنین حباب

لیکن بیدل مابعد طبیعیت کے اس مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں جو وحدت الوجود کا قائل ہے ـ ابن العربی ، فریدالدین عطار ، عراقی ، جامی ، تمام اساتذہ اسی مکتب فکر کے علم بردار گزرے ہیں ـ جب بیدل ان مطالب کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں تو حباب کا استعارہ از خود وارد ہو جاتا ہے ؛ مثلاً حق تعالیٰ کی ذات عشق کا بیان ہو رہا ہے اور مرتبہ وحدت پر ذات کے ایسے اجمالی علم کا ذکر مقصود ہے تو یہ شعر قلم سے نکلتا ہے :

نہ ابروی موجش اشارہ فروش ... نہ چشم حبابش تحیر بدوش

عام صوفی منش شعرا کی طرح بحر اور حباب کا استعارہ بھی استعمال کیا ہے اور ذات کے اعتبار سے نہیں بلکہ وجود کے لحاظ سے وحدت کا اظہار کیا ہے :

ز بسکہ بحر شد حلقہ زن بے حجاب
حباب و کف و گوہر و موج و آب

بہ کثرت قطرہ و موج و حباب اگر پرسی
وجود هیچ یک از عین بحر نیست جدا

بیدل کی تمام تصنیفات کو زیر نظر رکھا جائے تو اس طرح نظر آتا ہے کہ مابعدالطبیعیات کے سلسلے میں ان کی تمام تر موشگافیاں اس غرض کے لیے تھیں کہ انسان کی عظمت کو عالم آشکارا کریں اور کائنات میں اس کے مقام کو الم نشرح کریں ـ یہ موضوع انھیں بے حد مرغوب ہے ـ جہاں کہیں اسے چھیڑا ہے ان کا قلم فصاحت و بلاغت ، زور بیان اور معنی آفرینی کا سرچشمہ بن گیا ہے ـ اور ان کے اسی جوش طبع کا نتیجہ ہے کہ حباب ، جو عام طور پر بے حقیقتی کا مظہر ہے ، عظمت و کبریائی کا نشان بن جاتا ہے ـ کہتے ہیں کہ دیکھنے میں تو انسان حباب کی طرح بے حقیقت ہے مگر اپنے کمالات کے لحاظ سے بے نظیر ہے ـ تسخیر عالم تو اس کا ادنیٰ کرشمہ ہے :

ہر چند چون حبابم بے دست گہ قدرت
تسخیر عالم آب برگشت از کلاهم

انسان فعل تخلیق کا ثمر آخرین ہے ، تمام بحر تہی ہوا تو یہ حباب معرض شہود پر

جلوہ گر ہوا :

کی دارد طاقت هم چشمی ظرف حباب من
محیط از خود تهی گردید تا بیدل برون آمد

ان محدود وسعتوں نے انسان کو ہر سکیڑنے پر مجبور کر دیا ہے ورنہ اس کا پھیلاؤ تو غیرمحدود تھا :

به مشرب تنگی این قفس چو حباب غنچه نشسته ام
نه صبح می کشم از بغل نفس گر نفس به هوا رسد

مخلوق میں سے کوئی چیز انسان کی ہم پایہ نہیں ۔ ذات باری تعالیٰ کی کبریائی انسان ہی سے ظاہر ہوتی ہے :

هر چند هستی من بی مغزی حباب است
دریا سری ندارد جز در ته کلاهم

ان تمام مطالب کی تائید میں یہ رباعی بھی پڑھ لیں :

آئینۂ عالم بقائیم همه | نیرنگ جهان کبریائیم همه
چه موج و چه گرداب چه دریا چه حباب | هر جا نم جلوه ایست مائیم همه

اور اس شعر پر بھی غور کریں :

تا به رنگش وارسی از نقش ما غافل مباش
بحر در جیب حباب این جا نفس دزدیده است

جس حباب کی جیب میں خود بحر پنہاں ہو اس کی عظمت کا کیا کہنا ۔

حباب کی علامت بیدل کے معاشرے کے لیے بےحد معنی خیز ہے ۔ بیدل شاہ جہاں کے عہد میں عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے اور محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں شاہجہاں آباد میں فوت ہوئے ۔ انھوں نے اپنی زندگی کے کوئی چالیس سال مغلوں کے دارالسلطنت میں گزارے اور مغل معاشرے کے مطالعے کے لیے انھیں پورے پورے مواقع ملے ۔ انھوں نے دیکھا کہ تقریباً تمام کا تمام معاشرہ اخلاق عالیہ سے عاری ہو چکا ہے ۔ امرا نفس پرستی اور عیش کوشی میں مصروف ہیں ۔ زر و مال جمع کرنا اور عالیشان عمارات تعمیر کرانا ان کا مقصد حیات ہے ۔ غریب عوام کے سود و بہبود سے انھیں سروکار نہ تھا ۔ دیکھنے میں تو ان کی شکل و صورت بڑی بارعب تھی لیکن نہ تلوار کے دھنی تھے اور نہ ہی اعلیٰ ذہنی اوصاف کے مالک

تھے۔ اُن کے بڑے بڑے سر مغرور سے قطعاً خالی ہوئے اور ان کی بے مغزی کی وجہ سے نظامِ سلطنت درہم برہم ہو چکا تھا۔ جہاں تک بادشاہوں کا تعلق ہے بالخصوص جہاں دار شاہ کی وجہ سے عقل و تدبر کا دیوالہ نکل چکا تھا اور فی الواقعہ تان سین کے چیلے طاؤس و رباب ہاتھ میں لے کر حکمرانی کر رہے تھے۔ امرا اور بادشاہوں کی دیکھا دیکھی عوام، خاص بھی زر پرست اور سفلہ مزاج بن چکے تھے۔ ہر ایک کے سر پر نام و نگیں، دستار درباری اور عیش پرستی کا جنون سوار تھا۔ دین کے تقدسوں کو پورا کرنے کی خواہش بالکل عنقا ہو چکی تھی۔ ان شرم ناک اور درد انگیز حالات کو دیکھ کر بیدل نے بصد حسرت و یاس کہا:

بیدل امروز در مسلماناں ہمہ چیز است یک ایماں نیست

اور انھوں نے حباب کے استعارے سے کام لے کر ان لوگوں کی بے راہ روی کو خوب بے نقاب کیا اور ان پر واضح کر دیا کہ تمہارے تمام اعمال بے حقیقت اور بے بنیاد ہیں۔ اس نوعیت کے اشعار بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ بیدل نے انسان کی ہیچ میرزی کا ذکر ایک موجِ مطلق کے مقابلے میں کیا ہے، دوسرے اپنے معاشرے کی بلاعنیوں کے زیر نظر اپنے معاصرین کو بتایا ہے کہ آخر تم ہو کیا؟ تمہارا یہ استکبار کیا حیثیت رکھتا ہے؟ تم تو حباب سے بھی زیادہ بے مایہ ہو۔ جس اقبال کو تم اس قدر اہمیت دیتے ہو وہ تو ہیچ و پوچ ہے، ہوا کے ایک نفس تیز سے ختم ہو جائے گا۔ بیدل کے ان اشعار کو سامنے رکھا جائے تو وہ مصلحِ قوم کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اپنے معاشرے کو دنیا کی فنا پذیری بار بار یاد دلائیں۔ اس لیے وہ کہتے ہیں:

جہاں بہ شہرتِ اقبال پوچ می بالد
توہم بہ گنبدِ گردوں رساں پیامِ حباب

جس معاشرہ اقبال و دولت کا جس قدر دیوانہ تھا بیدل نے اس سے صد گنا زور کے ساتھ مالِ سکندری کا ذکر کیا اور کرۂ ارض پر شاہ و گدا کی مساویانہ حیثیت کو ان الفاظ کے ذریعے واضح کیا:

در حباب و موج ایں دریا تفاوت بیش نیست
الفتی باد است در سر صاحبِ اورنگ را

جہاں تک حباب سے منظر کشی اور معنی آفرینی کا سوال ہے اس کی نہایت ہی عمدہ مثال بیدل کی مثنوی طورِ معرفت میں ملتی ہے۔ بیدل موسمِ برسات

میں نواب شکراللہ خاں کے ہمراہ ہیراٹ تشریف لے گئے - آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں ، مسلسل بارش ہو رہی تھی ، بجلی کی چمک تھی اور قوس قزح کی لہک ، قہستانی علاقہ تھا - نظافت و پاکیزگی اور رعنائی کا ماحول تھا - بیدل کے جذبۂ لطیف میں جیش پیدا ہوئی اور انہوں نے صرف دو روز میں گیارہ سو اشعار کی یہ مثنوی کہہ ڈالی - اس میں انہوں نے حسن والہانہ انداز اور باریک‌بینی سے حسن و جمیں مناظر کو بیان کیا ہے ، یہ انہی کا حصہ ہے - وفور آب کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کئی بار حباب سے منظر کشی کی - مثلاً کہتے ہیں :

در این منزل که جز آب و هوا نیست
کسی با آتش و خاک آشنا نیست
زمین و آسمانش یک حباب است
که هر سو می‌خرامی باد و آبست

اسی طرح کہتے ہیں کہ یہاں مٹی کا تو دم و نشاں نہیں ملتا - اگر شہید عشق کو دفن کرنا پڑا تو حباب کا تابوت بنا کر سطحِ آب پر چھوڑ دیا جائے گا :

شهیدی گر وداع زندگانی ‏ ‏ ‏ شود آمادهٔ خاک آشیانی
مهیا ساز تابوت از حبابش ‏ ‏ ‏ به امید زمین برده به آبش

اس کے بعد کہتے ہیں کہ یہاں تو نشان پا بھی حباب بن چکا ہے :

دریں وادی که طوفان اوج دارد ‏ ‏ ‏ نه تنها جاده حکم موج دارد
که این جا نه نشان پا حبابیست ‏ ‏ ‏ به رنگ چشم عاشق پر ز آبیست

اور جب ابر باراں بیاباں میں برستا ہے تو چشم آہو کو بھی حباب بنا ڈالتا ہے :

وگر سوی بیابان آورد روی ‏ ‏ ‏ بجوشاند حباب از چشم آهو

نیز بارش کے قطرے زمین پر گرتے ہیں تو حباب بن کر ابھرتے ہیں :

همی کاین قطره ها بر خاک ریزند
به سامان حباب از آب خیزند

بیدل کی دوسری معنی خیز علامت آئینہ ہے - اس علامت کے سلسلے میں بھی ہمارے شاعر نے وہی باریک بینی ، دقیقہ رسی اور بالغ نگہی دکھائی ہے - لفظ آئینہ سکندر اعظم کے وقت سے ادبیات عالم میں مستعمل ہو رہا تھا - پہلوی زبان میں یہ لفظ آئینک کی صورت میں موجود ہے - عرب اہل [illegible] نے اسے آئینہ پڑھا -

شعرا نے اس سے بڑے معانی پیدا کیے ہیں مگر جس اہتمام سے اسے بیدل نے استعمال کیا ہے وہ بے نظیر ہے۔ ان کے ہاں آئینے سے تعلق رکھنے والے اشعار سینکڑوں سے گزر کر ہزاروں تک پہنچ گئے ہیں اور جزئیات نگاری کا وہ کمال ہے کہ آئینہ کی تمام صفات اور اس کے تمام متعلقات اشعار میں موجود ہیں۔ اور پھر معانی اور مطالب کا وہ وفور ہے کہ بیدل کا مکمل فلسفۂ حیات ان اشعار کے ذریعے بیان کیا جا سکتا ہے۔ اسی بنا پر وہ کہتے ہیں :

زاں عرض جوہریکہ در آئینہ دیدہ ایم
خط بر جریدہ ہائے ہنر می کشیم ما

جہاں جریدہ ہائے ہنر بھی تمام حکیمانہ اور فنی محاسن کے مطالب کا دعویٰ دیکھیں۔ آئینہ کی علامت کے ذریعے بیدل نے ادبی، فنی اور علمی موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔ ہم ان کا مختصراً ذکر کرتے ہیں۔

بیدل ان بالغ نظر شعرا میں سے ہیں جو نہ صرف ماضی کے ادبی اور فنی سرمایے سے باخبر ہوتے ہیں بلکہ روح شاعری سے پوری طرح آشنا ہونے کی وجہ سے مستقبل کے رجحانات کی بھی نشان دہی کرتے ہیں۔ نظریۂ اسلوب کے سلسلے میں بھی آن کی یہی بالغ نظری ظاہر ہوتی ہے۔ اسلوب میں ابلاغ کو زیادہ اہمیت زمانۂ حال میں حاصل ہوئی ہے۔ لیکن بیدل سترھویں صدی میں اس کے قائل تھے۔ فرماتے ہیں :

عرض مطلب دیگر و اظہار صنعت دیگر است
بیدل از آئینہ نتواں ساخت وضع جام را

وہ محض صنعت گری کی حمایت نہیں کرتے بلکہ صنائع بدائع کے صرف اس حد تک موید ہیں کہ اظہار مطلب میں کام آئیں۔ اس شعر میں وضع جام کی ترکیب جس جذباتی انداز سے وارد ہوئی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ بیان میں اثرانگیزی اور حسن محض خوش معنی سے پیدا ہوتا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق معنی میں جس قدر اسرار موجود ہوں گے، عبارت کو اسی قدر بالیدگی حاصل ہوگی۔ معانی کے بغیر عبارت کی نشوونما ناممکن ہے۔ کہتے ہیں :

جولانگہ اسرار معانیست عبارت چنداں کہ پری ناز کند شیشہ ببالد

تخلیقی تجربے کے دوران میں انھوں نے بارہا بڑے درد و کرب کے ساتھ یہ بات محسوس کی ہے کہ جن مطالب و معانی کو وہ بیان کرنا چاہتے ہیں، الفاظ ان کا ساتھ

جگہ نہیں دے سکتے ۔ بیان اور بلاغت کے مروجہ سانچے ان خیالات کو ادا کرنے سے انہیں عاجز نظر آئے جو ان کے ذہن میں وارد ہوتے تھے ۔ لازماً ان خیالات کے بعض پہلو الفاظ کی گرفت میں نہ آ سکے اور انہیں بدرجہ ناچار کہنا پڑا :

بہ ہرزگی معنی آئینہ نقش بست   فریاد کہ در سر لگنجید ہوایم

الفاظ کی اس کمی کو دور کرنے کے لیے انہوں نے جدید تراکیب وضع کیں ۔ چنانچہ آئینہ کی رعایت سے بھی انہوں نے کثیر تعداد میں تراکیب اختراع کیں جن میں سے بعض ذیل میں درج ہیں :

آئینۂ اسرار ، آئینۂ دل ، آئینۂ ہوش ، آئینۂ تحقیق ، آئینۂ جمال ، آئینۂ حسن ، آئینۂ وحدت ۔ چشمۂ آئینہ ، کسوت آئینہ ، بہار آئینہ ، جدول آئینہ ، چشم آئینہ ۔ آئینہ رو ، آئینہ زار ، آئینہ پوش ، آئینہ حوش ، آئینہ مشرب ، آئینہ تمثال ۔

معنی اور خیالات کو بنیادی اہمیت دینے کے بعد ابلاغ کو اصل اسلوب قرار دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ بیدل فن برائے فن کے قائل نہیں تھے ۔

عمیق حسن کے لحاظ سے آئینہ کے امکانات بڑے روشن ہیں اور بیدل کے شاعرانہ تخیل نے آئینہ کی صفات جلی کو لے کر خوب خلاقی دکھائی ہے اور ادب درسی کو باغ و بہار بنا دیا ہے ۔ کہیں اس کی درخشندگی اور صفائی کو لے کر سحرکشی کی ہے ، کہیں سبز رنگ کے انعکاس کا ذکر کر کے لطیف اور طربیہ استعارے استعمال کیے ہیں ، مثلاً مثنوی 'طور معرفت' میں لب جو سبزہ کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں

ز اضطراب خط سبزہ در جوش   کسودہ طوطی از آئینہ آغوش

پھکی سبز کی نسبت گلابی رنگ بیدل کے لیے زیادہ جاذب نظر ہے اور جب یہ آئینے میں منعکس ہو رہا ہو تو اس کی ساحرانہ کیفیت سے بڑے متاثر ہوتے ہیں ۔ اسی مثنوی 'طور معرفت' میں گلستان کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :

نشیمن ہا ہمہ آئینہ تعمیر   ز عکس لالہ و گل صبح کشمیر

دوسرے مصرع کی رنگینیوں کو ذرا نگاہ تصور کے سامنے لائیں اور پھر دیکھیں کہ کیا عجیب و غریب تہہ دار رنگینی ہے ۔ اس گلابی رنگت کا تعلق اگر صبح کشمیر سے ہو تو آئینے میں اس کا انعکاس اور بھی زیادہ مسحور کن ہو جاتا ہے اور

معلوم ہوتا ہے کہ بیدل کے لیے آئینہ کی لطافتیں اور حسن لطیف کے حسن کی نیرنگیاں اپنی معراج پر پہنچ گئی ہیں ۔ مثنوی 'طور معرفت' کے ایک اور شعر میں قوس قزح کے متعلق کہتے ہیں :

گہ وا کردست بر آئینہ آغـوش
کہ عکسش کرد عالم را چمن پوش

لیکن بیدل کو معراجِ حقیقی اُس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ حسنِ مجازی سے گزر کر حسنِ حقیقی کا ذکر کرتے ہیں ۔ مابعد طبیعیاتی حسن کے دھندلے تصور کو مندرجہ ذیل قطعے میں جس طرب افزا اور لطیف استعارے سے بیان کیا گیا ہے وہ صرف بیدل کا حصہ ہے ۔

بیدل آن گوهر نایاب سراغ   بہ محیطیست کہ پرسیدن نیست
عکس افتـادہ در آئینۂ هـوش   گل توان گفت ولی چیدن نیست

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ بیدل کی جمالیاتی حس کس قدر بے نظیر تھی اور اس حس کی ترتیب میں لفظ آئینہ نے کیا کردار انجام دیا تھا ۔ فی الواقعہ ان کا تخیل رنگینی اور رعنائی کا پیکرِ لطیف بن چکا تھا ۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل شعر بڑے معنی خیز ہیں :

دل ہر اندیشہ طاؤسِ بہار دیگر است
در چہ رنگ افتادہ است آئینۂ گل باز من

طاؤس ما بہارِ چراغان حیرت است
آئینہ خانہ ای بہ تماشا رساندہ ایم

عضو عضوم چمن آرائی پر طاؤس است
بہ خیال تو ہزار آئینہ آغوشِ خودم

اسی بنا پر اپنے عہد کے تازہ گو شعرا کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے وہ کہتے ہیں :

بہ فکرِ تازہ گویان گر خیالم پرتو اندازد
پرِ طاؤس گردد جدول اوراقِ دیوان ها

ان اشعار سے بیدل کا نظریۂ جمال بھی واضح ہو رہا ہے ۔ وہ اسی نظریے کی ترکیب میں داخلی اور خارجی عناصر دونوں کو شامل سمجھتے تھے ۔ اُن کے خیال کے مطابق خارجی طور پر حسنِ محبوب رنگین تصورات عطا کرتا ہے اور داخلی طور پر شاعر کا تخیل اس میں رنگ آمیزی کرتا ہے ، یعنی شاعر کی اپنی شخصیت تخلیقِ حسن میں نمایاں طور پر کار فرما نظر آتی ہے ۔ اُن خیالات کی بنا پر بیدل بیکن (Bacon) سے متفق ہیں جنھوں نے کہا تھا کہ تخلیقِ جمال میں قدرت اور انسان دونوں شریک ہوتے ہیں ۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مشرق و مغرب کے یہ دونوں ماہرینِ فن سترھویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اگرچہ مندرجہ ذیل شعر میں لفظِ آئینہ موجود نہیں ، تاہم اس سے اُن تمام خیالات کی تائید ہوتی ہے جن کا ذکر اس بارے میں ہوا ہے :

بیدل اثری بردۂ از یادِ خرامش
طاؤس برون آ کہ خیالِ تو چمن شد

آئینہ کے حسن پرور تصورات کے ساتھ جب بیدل کے متصوفانہ اور مابعدالطبیعیاتی خیالات شامل ہو گئے تو ان کے ذہن میں ایک عجیب وحدتِ ادراک پیدا ہو گئی ۔ جذبات و احساسات کی گونا گونی جب اس وحدتِ ادراک کو متہیج کرتی تھی تو آئینے کی رعایت سے نہایت ہی خوب صورت شعر نوکِ قلم سے نکلتے تھے ۔ بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس پائے کے شعر ادبیاتِ عالم میں بمشکل ملیں گے ۔ بیدل کے اس قسم کے شعر جان تغزل ہیں اور جن اصحاب نے بیدل کی شاعری کے اس پہلو کا مطالعہ نہیں کیا وہ اس کا اندازہ ذیل کے چند اشعار سے لگانے کی کوشش کریں :

آتش پرست شعلۂ اندیشہ ات جگر
آئینہ دارِ داغِ ہوای تو سینہ ھا

بس دیدہ کہ شد خاک و نشد محرمِ دیدار
آئینۂ ما نیز غبارست ازان ھا

صد سنگ شد آئینہ و صد قطرہ گہر بست
افسوس ہماں خانہ خرابست دل ما

بیدل نقشی نمی‌بندد کہ باوحشت نہ پیوندد
نمی دانم کدامین بے وفا آئینہ چید اینجا

تحیر نام ما دارم ہزار آئینہ دربارم
خیال آہنگ دیدارم بہ چندیں تار می آیم

دراں محفل کہ حسن از جلوۂ خود داشت استغنا
من بے ہوش ہر آئینہ داری کار می کردم

حسن و ہزار نسخۂ نیرنگ در بغل
ما و دلی و یک ورق انشای آئینہ

اب کلام بیدل میں آئینہ کی علمی حیثیت کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ اس کے متعدد پہلو ہیں اور ان کو لے کر بلامبالغہ ایک کتاب تصنیف کی جا سکتی ہے۔ مگر یہ مقالہ اتنی طوالت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ہم پہلے بیدل کے تصور خدا کا ذکر کرتے ہیں۔

بیدل کے تصور خدا کی بنیاد حکمائے اسلام کے خیالات پر ہے۔ اسی لیے انھوں نے آئینے کی رعایت سے قدیم اور حادث، وحدت اور کثرت، تجرید اور تنزیہہ، وحدت اور دوئی، دو رنگی اور حسن بے رنگ، صورت و معنی اور ذات و صفات الٰہی کے مطلب کو بار بار چھیڑا ہے۔ یہ بحثیں بڑی پُر مغز اور اہم ہیں اور ان میں شاعرانہ لوازمات کو بھی پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بیدل کا دوسرا ماخذ ان کا مکاشفہ ہے۔ وہ معمولی درجے کے صوفی نہیں تھے بلکہ عارف کامل تھے اور افراد صوفیہ میں اُن کا شمار ہوتا ہے، اس لیے ان کے تصور خدا میں بڑی رندگی پائی جاتی ہے۔ وہ خداوند تعالیٰ کی ماورائیت کا ذکر بڑی جدبات انگیزی سے کرتے ہیں۔ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ ہمارے شعور اور ادراک

سے ماورا ہیں ۔ ہر ایک اپنے خیالات کے مطابق اُن کا ذکر کرتا ہے ۔ یہ کمالات ذاتِ الٰہی کا آئینہ نہیں ہو سکتی ۔ سائے سے خورشید ہمیشہ دور رہتا ہے ۔ انسان کی کیا مجال کہ بزمِ کبریا میں نمودار ہو سکے ۔ ذاتِ کبریا کا خیال تک نقشِ امکاں کو محو کر دیتا ہے ۔ وہ ذات بے‌نشان ہے ۔ اس کی منزل کا سراغ کیسے لگایا جا سکتا ہے :

آن کیست شود محرمِ اظہار و کفایت
آئینۂ خویشند عیان ها و بیان ها

خورشید ز ظلمت کدۂ سایه برون است
تاکی ز خموشی آئینه سازید قلم را

به بزمِ کبریا مارا چه امکانست پیدائی
مثالِ خاک نتوان دید در آئینۂ گردون

خیالش نقشِ امکاں محو کرد از صفحۂ شوقم
به صورت پی نبرد آئینۂ معنی پرستِ من

ز سراغِ منزلِ بے‌نشاں چه اثر برد تگ و تازِ دل
که بہر قدم سپر افگند چو نفس در آئینه کامِ او

اس کے باوجود اُسی ذات کا جلوہ شش جہت میں موجود ہے :
شش جہت آئینه دارِ شوخیِ اظہارِ دوست

ہر ذرہ اسی خورشید کو بغل میں لیے ہوئے ہے :
کدام ذره که خورشید نیست در بغلش
هزار آئینه دارد حقیقت خودبین

وہ ذات ہر لحظہ نئی شان سے عالم میں جلوہ گر ہوتی ہے :
هر نفس صد رنگ می گیرد عنانِ جلوه‌اش
تا کند شوخی عرق آئینه می بازد حیا

بیدل حسن مطرب سے اسباب توحید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بساط عالم کو اس خوبی سے آراستہ کیا گیا ہے جیسے کسی حسین نے جام عشرت کے طور پر گل دستۂ رنگین بھیجا ہو اور دعوت نظارہ دی ہو :

بوی پیامی از چمن جلوه می رسد
از دیده تا دل آئینه ایجاد می‌کنم

اس کا مطلب یہ ہے کہ بیدل کے خیال کے مطابق ذات الٰہی ماورا ہونے کے باوجود قریب تر اور بے حد شفیق اور کریم ہے ۔

آئینہ کے ذریعے بیدل زمان و مکان کے گہرے مسائل کا بھی ذکر کرتے ہیں ۔ زمان و مکان ان کے خیال کے مطابق علاحدہ حقائق نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں ۔ اُن کے نزدیک الوہی زمان حقیقت دائمی ہے اور یہ حقیقت حق کی صفت ہے جو ازلی اور ابدی ہے ۔ زمانہ کوئی دورانِ محض ہے جو امروز کی آنِ واحدہ کی صورت میں موجود ہے ۔ لوگ جسے ماضی کہتے ہیں وہ امروزِ گزشتہ ہے اور جو مستقبل ہے وہ امروز آئندہ ہوا :

پیش ازاں کز وہم دی آئینہ زنگاری کند
در نظرها روشن است امروز فردائیکه نیست

ہماری نگاہوں کا غلط مشاہدہ ہر لمحہ فردا کو امروز میں منتقل ہوتے اور امروز کو ماضی بنتے دکھاتا ہے ورنہ یہ سب تقسیم بے معنی ہے ۔ صحیح معنوں میں امروز ہی جلوہ گر ہے ۔ لوگ اپنے ماضی سے مایوس ہو کر حال کو بھی تباہ کر دیتے ہیں اور مستقبل سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں جو موہوم ہے :

مستقبل اگر همه کمال است این جا
از عالم اوہام و خیال است این جا
آئینۂ حال جز یاس ماضی نیست
مه داغِ تصورِ هلال است این جا

اُلوہی زمان کے مقابلے میں یہ کونی زمان بالکل بے حقیقت ہے :

گاهی فردا و گهی دی که چه
گہ عشرتِ مہر و گہ غم کینه که چه

نقش حقیقت بہ لوح عدم است
ای صورت ہیچ این ہمہ آئینہ کہ چہ

اسی نقطہء نگاہ سے وہ مکان کو بھی بے حقیقت سمجھتے ہیں۔ زمان و مکان قائم بالذّات نہیں قائم بالحق ہیں، اس لیے یہ کام نسبتی امور ہیں۔

عالم کس طرح وجود میں آیا؟ اس کے متعلق صوفیائے کرام کا جواب وہی ہے جس کی صرف خود موجودہ طبعی علوم انگشت نمائی کر رہے ہیں۔ ان علوم نے نظری اور عملی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ کائنات کی اصل توانائی ہے۔ توانائی مادے کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور مادہ توانائی کی۔ اس طرح نہ صرف مادے کی قدامت کا بطلان ہو گیا ہے اور توحید کے انکار کی گنجائش نہیں رہی بلکہ یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ صوفیائے کرام کا یہ دعویٰ کہ ایک ہی نور کے یہ سب مظہر ہیں، بے بنیاد نہیں۔ ہیگل (۱۷۷۰ء — ۱۸۳۱ء) کا نظریہ ہے کہ ایک ہی حقیقت موجود ہے جسے وہ مطلق کہتا ہے اور یہ مطلق نہ صرف حقیقت مجرّدہ ہے بلکہ عالم صورت بھی یہی ہے۔ اب بیدل کہتے ہیں:

نقش نیرنگ دو عالم رقم لوح دل است
ہمہ از ماست گر این آئینہ بر ما بخشند

اور یہ عالم کیوں وجود میں آیا؟ اس کے متعلق بھی بیدل کی زبان سے سنیے:

بیدل از بسکہ جلوہ مشتاق شدم
بی پردہ ز آئینہء اطلاق شدم
پوشیدن خویشم این زمان ممکن نیست
عریان شدم آن قدر کہ آفاق شدم

یعنی عشق حسن مطلق کی صفت خود اپنی تخلیق آفاق کا موجب ہی۔

شیخ اکبر محی الدین ابن العربی (۱۱۶۵ء — ۱۲۴۰ء) کی وجہ سے افکار تصوف میں ایک عظیم انقلاب شروع ہوتا ہے۔ شیخ اکبر شاعر مزاج صوفی مفکر تھے اور انھوں نے اپنے افکار کو بیان کرنے کے لیے استعارہ اور تشبیہ سے کام لیا۔ فصوص الحکم میں شیخ اکبر عالم کو آئینہء حق کہتے ہیں۔ لیکن وہ فرماتے ہیں کہ یہ آئینہ اس وقت تک جلا سے عاری رہا جس وقت تک اس میں نفس العیسی

انسان یعنی آدمؑ موجود نہ ہو ۔ شیخ اکبر اس کی تصریح یوں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ خواہش کہ اپنے اسمائے حسنیٰ کے اعتبار سے اپنے عین کا معائنہ کریں ، آدم کی پیدائش سے پوری ہو گئی ۔ اس لیے انسان حق تعالیٰ کے اسما کو دیکھنے اور ان اسما کے احکام کے ظہور کے لیے آئینہ کا کام دیتا ہے ۔ اور آئینہ میں نظر آنے والا عکس دیکھنے والے کا عین ہوتا ہے ، اس کا غیر نہیں ۔ البتہ آئینہ اس عکس کو اپنی حقیقت کے مطابق مختلف صورتوں میں ظاہر کرتا ہے ۔

میرزا بیدل نے ابن عربی کے خیالات کو اپنا کر عالم اور آدم کے لیے آئینہ کو علامت قرار دیا اور ایسے کئی اشعار کہے جن میں ان سے آئینۂ حق ہونے پر اظہار ناز کیا ہے ۔ مثلاً عالم کے متعلق یہ شعر :

بہر طرف نگری شوق محو خود بینی است
دکان آئینہ گرم است چار سوی تر

اور انسان کے متعلق یہ اشعار پڑھیں :

تیار آئینہ اسرار نازیست
شکستم کج کلاہی می نویسم

صورت آئینۂ خورشید خورشید است و بس
بر نمی‌دارد خیال غیر طبع روشنم

این انجمن ہنوز ز آئینہ غافل است
حرف زبان شمعم و روشن نگفتہ ام

آخری شعر جس غزل میں وارد ہوا ہے وہ ان مطالب کے بیان اور حسن تغزل کے اعتبار سے شاہکار ہے ۔ اس کے صرف دو مزید شعر سن لیں :

زان نور بےزوال کہ در پردۂ دل است
بہ آفتاب آن ہمہ روشن نگفتہ ام
گلہا بخندہ جزو گریبان دریدہ اند
من حرف از لب تو بہ گلشن نگفتہ ام

لیکن عارف اتحاد کے اس مکاشفے سے جب عاری ہوتا ہے تو اسے اپنے اور ذات مطلق کے درمیان اس قدر فرق نظر آتا ہے کہ سے اپنی اور اپنے ساتھ تمام کائنات کی کچھ حقیقت ہی نظر نہیں آتی۔ اس مقام پر بیدل عالم اور آدم کے آئینہ ہونے کے متعلق سخت تنقید شروع کر دیتے ہیں اور فرماتے ہیں :

بغیر عکس ندانم دگرچہ خواہی دید
اگر در آئینہ بینی جمال یکتا را

اس مطلب کو بیان کرنے کے لیے لفظ تمثال کو لے کر انھوں نے بہت سے اشعار کہے ہیں اور تمثال کو انسان کی بے حقیقی کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے :

برنگ آب می گردم ز شرم خود نمائی ها
که سیلابی کند در خانهٔ آئینه تمثالم

اور اس بات پر زور دیا ہے کہ :

آئینہ گر ہمہ حضور شود   ننماید ز شخص جز تمثال

انسانِ کامل اور انسانِ ربانی کے متعلق آئینہ کی رعایت سے بیدل نے جو کچھ کہا ہے وہ طویل بیان چاہتا ہے۔ اور جی چاہتا ہے کہ اس کا تذکرہ کیا جائے تاکہ وہ لوگ جو روحانیت کے ان پیکروں کے متعلق اپنے دلوں میں شکوک رکھتے ہیں اور ذات مطلق سے رابطہ کی نوعیت سے ناواقف ہونے کی بنا پر ان کے بعض اقوال کو طامات اور شطحیات سے تعبیر کرتے ہیں، اپنے انداز فکر میں کچھ مثبت تبدیلی پیدا کر سکیں مگر افسوس کہ مقالے کی حدود اس بیان کی اجازت نہیں دیتیں۔ اپنے خطبات میں علامہ اقبال صحیح فرماتے ہیں کہ فرائڈ نے احساسات انسانی کی عامیانہ سطح پر جذبۂ جنسی کا مطالعہ کر کے قابل قدر کام انجام دیا ہے، مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس نے مذہبی اعتبار سے ان لوگوں کی واردات (Religious Experience) کا مطالعہ نہیں کیا جو ہی بہتر سیرت کی وجہ سے معاشرے میں ہمیشہ برتر سطح پر رہے ہیں۔ بیدل کے خیال کے مطابق اس قسم کے انسان تکمیل کے درجۂ اعلیٰ پر پہنچ کر نور کا ایسا ذخیرۂ عظیم بن جاتے ہیں کہ کائنات کا ہر چھوٹا بڑا وجود اسی سے بہرہ ور اور مستنیر ہوتا ہے :

پیش ازآن ست در آئینه من مایهٔ نور
که به هر ذره ز خورشید نمایم تقسیم

اس بات پر بیدل کہتے ہیں کہ انسان کی حقیقت سے آگاہ ہونا آسان نہیں

نشد آئینہ کیفیت ما ظاہر آرائی
نہاں ماندیم چون معنی بچندین لفظ پیدائی

اسی طرح بیدل نے قلب صوفی اور موضوع حیرت کے متعلق بھی بہت کچھ کہا ہے۔ آئینہ سے ان دونوں کا تعلق ظاہر ہے۔ قلب صوفی واردات اور تجلیات کا مہبط ہونے کی بنا پر آئینہ سے بڑی مماثلت رکھتا ہے۔ نیز صوفی کی چشم حیران کی طرح آئینہ بھی سرتا پا حیرت ہوتا ہے۔ عرفا کی نفسیات کا مطالعہ کرنے والے لوگوں کے لیے بیدل کے اس قسم کے اشعار بڑے معلومات انگیز ہیں اور ان سے وجدانیات کے اس باب کا بخوبی علم ہو جاتا ہے جس پر رومانی حال میں برگساں (Bergson) نے بڑا زور دیا ہے۔ رومی اور دوسرے صوفی مسلک شعرا نے بھی ان موضوعات کے سلسلے میں آئینہ کا استعارہ استعمال کیا۔ مثلاً رومی فرماتے ہیں:

آئینہات دانی چرا غماز نیست ‌ ‌ ‌ زانکہ زنگار و رخش ممتاز نیست

آئینہ کز زنگ و آلائش جدا است ‌ ‌ ‌ ہر شعاع نور خورشید خدا است

لیکن بیدل نے یہ استعارہ اس کثرت سے استعمال کیا ہے کہ کہا جا سکتا ہے اب یہ ان ہی کے لیے مختص ہو گیا ہے۔ دل کے متعلق ان کے یہ دو شعر دیدنی ہیں:

آنجا کہ دل طرب کدۂ عرض نازہاست
خوباں چرا کنند تمنای آئینہ

دل نیست گوہری کہ بہ جا کش توان نہفت
آئینہ است آنچہ نہ پوش کرد؛

دل کے ساتھ ساتھ صفائی دل اور حواہش و حسرت دیدار کا بھی بیان ہے اور یہاں صیقل آئینہ سے حوب معانی پیدا کیے ہیں مثلاً:

صیقل آئینہ دارد ناخنم در کار دل
کو عرق ہر اشک یک شمع روشن می کنم

به صیقل کم نمی گردد غرور رنگ خود بینی
مگر آئینه بر سنگی زند روشن گر عشقم

از صفائی دل توهم بیدل سراغ راز گیر
حسن معنی دید اسکندر بچشم آئینه

صفائی دل نه پسندد غبار آرائی
به دست آئینه رنگ حنا چه می جوئی

سواد نسخهٔ دیدار اگر روشن توان کردن
به آب حیرت آئینه باید شست دفترها

باز از جہان حسرت دیدار می رسم
آئینه در بغل بدر یار می رسم

به قاصد تا کم از حسرت دیدار ایمائی
به حیرت می روم آئینه بر پیغام می بندم

حیرت اور اس کے سبب کے متعلق مندرجہ ذیل دو شعر کافی رہیں گے :

حیرت حسنی که زد نشتر بچشم آئینه
خشک می بینم رگ جوہر بچشم آئینه

درین گلشن بہار حیرتم آئینهٔ دارد
اگر طائر شوم طاؤسم وگر گل بادامم

دوسرے شعر میں طاؤس اور گل بادام بھی حیرت بیدل کا آئینہ ہیں ۔ بیدل کے ہاں استعارہ در استعارہ کے دروازے اسی طرح کھلتے چلے جاتے ہیں ۔ خاتمے پر یہ کہہ دینا مناسب رہے گا کہ لفظ آئینہ کو لے کر با کمال شاعر نے مثبت اور منفی اخلاق کا ذکر بھی کیا ہے ، ضمناً اپنے معاصرین کے اخلاق پر کڑی نکتہ چینی کی ہے

اور عشق و محبت ، جو اخلاق عالیہ کا جوہر ہے ، اس کا بھی لطف لے کر بیان کیا ہے - مثلاً :

آن چہ ما در حلقۂ دام محبت دیدہ ایم
نی سکندر دید در آئینہ نی در جام جم

نہ وصل آئینہ دارم ، نہ ہجراں پردۂ رازم
بہ حسن عشق می نازم اگر پیدا وگر پنہاں

منفی اخلاق کے سلسلے میں وہ اظہار کمال کو بڑا بھاری عیب سمجھتے ہیں - کہتے ہیں اس سے دل تیرہ ہو جاتا ہے ، معنوی ترقی رک جاتی ہے اور انسان دیدار الٰہی سے محروم رہ جاتا ہے - اس سلسلے میں جوہر آئینہ سے معنی آفرینی کی ہے :

دل روشن چہ لازم تیرہ از عرض ہنر کردن
ز جوہر خانۂ آئینہ را زیر و زبر کردن

عرض جوہر شد حجاب معنیٔ آگاہیم
دیدہ در مژگان نہفت آئینۂ فولاد من

بیدل اظہار ہنر محرومی دیدار بود
خار راہ جلوہ‌ہا شد جوہر اندر آئینہ

ہم نے سطور بالا میں بیدل کی دو علامتوں کا مختصر طور پر ذکر کیا ہے - ان کی معنی آفرینی اور مطالب پروری سے کون انکار کر سکتا ہے - اس تمام بیان سے پتا چلتا ہے کہ حضرت بیدل نے اپنے علم و فن اور اپنی ذات کو درجۂ کمال پر پہنچانے کے لیے کس قدر دقت نظری ، عرق ریزی اور مجاہدۂ نفسی سے کام لیا تھا - انھیں جو کمال حاصل ہوا اس کی مثال بمشکل ملے گی - غور طلب امر یہ ہے کہ بیدل کی علامتیں فنی اعتبار سے جامعیت اور پختگی کا اظہار کرتی ہیں - یہ طرب انگیز بھی ہیں اور فکر پرور بھی - ان میں جذبے کی چاشنی بھی موجود ہے اور عقل کی گہرائی بھی - کبھی یہ دونوں عناصر مخلوط نظر آتے ہیں اور کبھی

رنگ رنگ ۔ طربیہ عنصر پیدا کرنے کے لیے بیدل نے رنگ آفرینی اور حسن ابداع سے کام لیا ہے ۔ عقلیت کا عنصر ان کے ہاں معنی آفرینی کی وجہ سے بھی غالب نظر آتا ہے جس کا رواج معینہ عہد کے تازہ گو شعرا کی وجہ سے عام ہو چکا تھا ۔ مگر حقیقت میں یہ عنصر زیادہ تر ان کے متصوفانہ اور ما بعدالطبیعیاتی افکار کا مرہون منت ہے ۔ ان افکار کا مقصد وحید ان اسرار کو بے نقاب کرنا ہوتا ہے جو عام مظاہر کے پس پردہ موجود ہوتے ہیں ۔ رموز و علائم کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے ۔ اس لیے تصوف اور مابعدالطبیعیات کے ساتھ رموز و علائم کا گہرا رابطہ ہے ۔ بیدل نے اپنے عہد کے معاشی ، معاشرتی اور سیاسی حالات سے جو اثر قبول کیا اس کے بیان کرنے کے لیے بھی انھوں نے اپنی ان محبوب علامات کو استعمال کیا ہے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیر افلاک کرتے ہوئے بھی ان کے پاؤں زمین پر قائم رہتے ہیں ۔ وہ اپنی فکر کو تخیل محض کے حوالے نہیں کرتے بلکہ اپنی عالی دماغی اور بلند پروازی کے باوجود زمین کے باسیوں کے ساتھ ، خواہ کسی درجے کے ہوں ، اپنے روابط استوار رکھتے ہیں ۔ کمزور اور نادار عوام سے انھیں جو حد درجہ ہم دردی ہے اس کا اندازہ ذیل کے شعر سے ہو سکتا ہے :

غرور رستمی گفتم عنا کش کیست اندازد
ز پا افتادگاں گفتند زور ناتوانی ها

مندرجہ بالا تمام مطالب کو سامنے رکھیں تو اس دعوے کی حقیقت دل پر ثبت ہو جاتی ہے جو ہم نے اس مقالے کی افتتاحی سطر میں کیا تھا ۔ بیدل کے عہد سے لے کر اب تک ہر زمانے میں اعلیٰ درجے کے شعرا اور اہل فکر کی بیدل سے وابستگی کا راز یہی ہے ۔

(ساقی ، کراچی ، فروری ۱۹۶۲ع)

ضمیمہ

- ★ تذکرۂ بیدل
- ★ لعل کتنور
- ★ ایک غیر مطبوعہ مخمس

حرفِ نامنظورِ دل یک نقطه هم بیش است و بس
معنیِ دل خواه اگر صد نسخه باشد هم کم است

بیدل

۱۔ تذکرۂ بیدل

[بالخصوص اُن شعراء اور دل‌دادگانِ سخن کا ذکر جنھیں میرزا عبدالقادر بیدل سے اُن کی زندگی کے مختلف ادوار میں واسطہ رہا]

ایسے شعراء اور دل دادگانِ سخن کی ایک بھاری تعداد ہے جنھیں میرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی کی زندگی میں اُن سے واسطہ رہا ۔ جب میرزا کا عہدِ طفلی تھا تو بہت سے اہلِ کمال نے اُن کی موروثیِ طبع سے متاثر ہو کر اُن کی تربیت کرنا چاہی یا اُن کی ہمت افزائی کی ۔ جب اُن کے شباب کا زمانہ تھا اور اُن کی شعرگوئی بھی اپنے شباب پر تھی تو کئی ایک سربرآوردہ شعرا نے اُن کے جوشِ طبع کو ہموار راہوں پر ڈالنے کی کوشش کی ۔ کئی ایک شعراء اپنی تخلیقی قوتوں پر ناز رکھنے کی بنا پر بیدل کے ہم طرح بنے اور کئی دوربین اشخاص نے بیدل کے درخشاں مستقبل اور اُن کی بے نظیر شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ لگا کر اُن سے عہدِ رفاقت باندھا اور پھر تمام عمر اُن کے وفادار رہے ۔ جب بیدل کی پختگی کا زمانہ تھا اور وہ شاہ جہاں آباد میں اقامت گزیں ہو چکے تھے تو اکثر نومشق شعراء نے اُن کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا ۔ اُمراء اور سلاطین نے کچھ فکرِ سخن کے شوق میں اور کچھ بیدل کی وجہ سے شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل کرنے کی خاطر اُن سے راہ و رسم پیدا کی ۔ علاوہ بریں شعر و سخن سے دل چسپی رکھنے والے دیگر حضرات نے ویسے بیدل کو اپنا ملجأ و ماویٰ سمجھا ۔ بہت سے شعراء ایسے بھی تھے جنھیں اتفاقاً بیدل سے ملاقات کا موقع مل گیا اور بعض بزرگ ایسے بھی نکل آئیں گے جو ویسے تو بیدل سے دور رہے لیکن اُنھوں نے اُن کی عظمت کا اعتراف کیا ۔ ان تمام سخن دوست اصحاب کی فہرست بڑی طویل ہے اور اُن کے مفصل تذکرے کے لیے ایک مستقل تصنیف درکار ہے لیکن یہاں ہم اُن کا ذکر اجمالاً کریں گے اور کوشش کریں گے کہ میرزا بیدل کی زندگی کے مختلف ادوار کو سامنے رکھ کر تمام اصحاب کا ذکر کیا جائے تاکہ تسلسلِ زمانی قائم رہے ۔

طفلی اور ابتدائی شباب

(۱۰۵۴ھ سے ۱۰۷۵ھ تک)

میرزا عبدالقادر بیدل سنہ ۱۰۵۴ھ میں عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد ماجد کا اسم گرامی میرزا عبدالخالق تھا ۔ سنہ ۱۰۷۵ھ تک کا زمانہ میرزا بیدل نے عظیم آباد ، رنی سنگر ، آرہ ، سہسی ، کٹک اور کساری میں گزارا ۔ اس کے بعد وہ شاہجہان آباد کی طرف چلے گئے اور پھر صوبہ بہار ، اڑیسہ کی طرف نہ لوٹے ۔ انھوں نے مندرجہ ذیل[1] پہلی رباعی دس سال کی عمر میں اپنے ایک حسین ساتھی کی روح پرور اور مشام آفریں بوئے دہن کی تعریف میں لکھی :

یارم ہر گاہ در سخن می آید   بوئے عجبش از دہن می آید
این بوی قرامست یا نکہت گل   یا رائحۂ مشک ختن می آید

جن لوگوں نے بیدل کی یہ رباعی سنی وہ متعجب ہو کر رہ گئے ۔ اکثر نے کہا یہ آب دار رباعی اس کم سن بچے کی تصنیف نہیں ۔ ہمیں ان مداح یا معترض لوگوں کے نام معلوم نہیں ۔ اس رباعی کے بعد بیدل اپنے فطری ذوق کی بنا پر شعر کہتے رہے ۔ اگرچہ ان کے قول کے مطابق وہ اشعار ہلال فلک کی طرح تاب دار ہوا کرتے تھے لیکن معترضین سے ڈرتے ہوئے وہ انھیں ضائع کر دیتے تھے ۔ ہولے ہولے وہ وقت بھی آ گیا جب معلوم اور معروف اشخاص نے بیدل کے طبعی ذوق کی تربیت شروع کر دی ۔ اب ہم ایک ایک کا ذکر کرتے ہیں ۔

۱۔ میرزا قلندر :

میرزا بیدل کے چچا تھے ۔ جب بیدل کوئی پانچ سال کے تھے تو میرزا عبدالخالق کے وفات پانے پر میرزا قلندر نے ان کی پرورش شروع کی ۔ جن دنوں[2] بیدل مکتب میں 'کافیہ' ختم کر چکے تھے اور 'شرح ملا جامی' پڑھ رہے تھے تو

۱۔ کلیات معدری : چہار عنصر ، صفحہ ۶ ۔
۲۔ کلیات معدری : چہار عنصر ، صفحہ ۲۵ ۔ خوشگو ؛ معارف مئی ۱۹۴۲ء ؛ نشتر عشق : ق ۱ ، صفحہ ۲۵۳ ب ۔

اُن کے اُستادوں کو بحث و مباحثہ کے دوران ایک دوسرے سے محش کلامی کرتے سن کر میرزا قلندر نے اُنھیں مکتب سے اُٹھا لیا اور اپنی نگہداشت میں متقدمین کی نظم و نثر کا مطالعہ کرنے پر لگا دیا اور کہا کہ پسندیدہ اشعار اور نثر کے قابلِ قدر حصے علیحدہ لکھ کر ہر شام مجھے سنایا کرو۔ اگرچہ میرزا قلندر اُمّی محض تھے لیکن بیدل کا انتخاب سن کر جب بعض اوقات بڑے متاثر ہوتے تھے تو فی البدیہہ شعر کہنے لگ جاتے تھے۔ بیدل چہار عنصر[1] میں لکھتے ہیں کہ ایک بار آشوبِ چشم کی بنا پر میرزا قلندر نے زرد رنگ کی پٹی آنکھوں پر باندھ رکھی تھی۔ کسی نے استفسار کیا تو اُنھوں نے فی البدیہہ کہا :

محرومی دیدار تو خوں در جگر انداخت
چشم چه کند چشم تو اش از نظر انداخت

جب میرزا قلندر ۱۰۷۶ھ میں فوت ہوئے تو بیدل نے مرثیہ[2] لکھا اور یہ تاریخ کہی :

قلندر یافت وصل جاودانی
۱۰۷۶ھ

۲۔ شاہ کمال :

قادریہ[3] سلسلے کے بزرگ تھے۔ بیدل کے والد اور چچا دونوں اُن کے معتقد تھے۔ رانی ساگر وطن تھا۔ بیدل اپنے چچا کے ساتھ اکثر رانی ساگر جایا کرتے تھے اور شاہ کمال کی صحبت سے استفادہ کرتے تھے۔ خوشگو[4] لکھتے ہیں کہ شعرگوئی میں شاہ کمال بیدل کے اُستاد ہیں۔ بیدل بھی اُنہیں اپنا اولین اُستاد تسلیم کرتے ہیں۔ بیدل کا ابتدائی تخلص رمزی تھا۔ حسین قلی خان[5] اور خوشگو دونوں کا بیان ہے کہ میرزا ایک روز گلستان کا دیباچہ پڑھ رہے تھے۔ جب سعدی کا یہ مصرع پڑھا :

بیدل از بی نشان چه گوید باز

۱۔ کلیات عبدری : چہار عنصر ، صفحہ ۲۷-۲۸۔
۲۔ کلیات عبدری : قطعات ، صفحہ ۳۷۔
۳۔ کلیات عبدری : چہار عنصر ، صفحہ ۱۳۔
۴۔ خوشگو در معارف : معارف ، مئی ۱۹۴۲ع۔
۵۔ نشتر عشق قلمی : صفحہ ۲۰۴ ب۔

تو طبیعت پر اضطراری کیفیت طاری ہو گئی اور فاتحہ پڑھ کر حافظ کی روح سے استمداد[1] چاہی اور پھر اپنا تخلص تبدیل کر لیا۔ عین ممکن ہے تخلص تبدیل کرتے وقت بیدل نے شاہ کابلی سے بھی مشورہ لیا ہو۔

۳۔ شاہ ملوک[2]:

بڑے ہی مجذوب تھے اور رانی ساگر کے قریب سرائے بنارس میں رہتے تھے۔ جب میرزا قلندر رانی ساگر جا کر ٹھہرا کرتے تھے تو شاہ صاحب بھی آ کر ان کے پاس ہفتوں قیام فرمایا کرتے۔ لوگوں کے سامنے ہمیشہ خاموش رہتے تھے، لیکن تنہا ہوتے تھے تو محو گفتگو ہو جایا کرتے تھے۔ ایک دن عالم جذب میں اسی طرح کچھ فرما رہے تھے اور بیدل ہمہ تن گوش بن کر سن رہے تھے۔ بیدل کو یوں متوجہ دیکھ کر فرمایا: "جو کچھ میری زبان سے نکلتا ہے، لکھتے چلے جاؤ۔" بیدل تین روز تک ایک ایک مصرع جمع کرتے رہے اور چالیس شعر بن گئے جو ریختہ میں تھے اور جن میں ویدانت کی اصطلاحات استعمال کی گئی تھیں۔ بیدل کہتے ہیں کہ شاہ ملوک اسی طرح بے شمار اشعار شب و روز پڑھتے رہتے تھے۔ بیدل تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا شعلۂ بیان شاہ ملوک کے نفس گرم کا مرہون منت ہے۔

۴۔ شاہ فاضل[3]:

بلند پایہ بزرگ تھے۔ تفسیر اور حدیث کے ماہر ہونے کے علاوہ مابعدالطبیعیات اور علمِ بیان میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ بیدل ان کی نظم و نثر کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور انہیں اپنے اساتذہ میں شمار کرتے ہیں۔ ان کی خدمت میں بیدل، میرزا قلندر کے ساتھ پہنچے۔

۵۔ شاہ قاسم ھواللہی:

جب بیدل ۱۰۷۰ھ میں اپنے ماموں میرزا ظریف کے ساتھ بسلسلۂ[1] تجارت

۱۔ حسین قلی خان سعدی کا نام لیتے ہیں لیکن یہ قرین قیاس نہیں۔
۲۔ کلیات صفدری: چہار عنصر، صفحہ ۹۔
۳۔ کلیات صفدری: چہار عنصر، صفحہ ۳۰۔

اڑیسہ کے دارالخلافہ کٹک میں گئے تو وہاں شاہ صاحب موصوف سے تعارف ہوا۔ شاہ صاحب قطب زمان تھے اور علامہ الدہر ۔ دوران گفتگو خود بھی برمحل اشعار پڑھا کرتے تھے اور بیدل کو بھی پڑھنے کے لیے فرمایا[1] کرتے ۔ شاہ صاحب کے ایما پر بیدل نے صوفیائے کرام کے ملفوظات جمع کیے اور دیباچے میں تصوف سے متعلق ۹۲ اشعار لکھے جو شاہ صاحب نے بےحد پسند کیے اور اپنے ہاتھ سے لکھ کر شاہ نعمت اللہ فیروز پوری کے پاس بھیجے ۔ یہ اشعار چہار عنصر[2] میں موجود ہیں ۔ جب ۱۰۸۳ھ میں بیدل کو اکبرآباد میں ان کی وفات کی خبر ملی تو انہوں نے قطعۂ تاریخ لکھا اور اس مصرع[3] سے تاریخ نکالی :

"ز ہی تعینِ ذات ربِ تام صفت"

شعر و شاعری کے سلسلے میں بیدل شاہ صاحب کی ایک صحبت[4] کا ذکر کرتے ہیں ، جس میں منقوط اور غیر منقوط صنعتوں کے متعلق گفتگو ہوئی ۔ اس موقع پر بیدل نے صنعت منقوط میں یہ شعر کہا :

بجبش تیغ زن جبں جبیش   غضب ہستی سیں نقش چھش

شاہ صاحب نے اس شعر کی بڑی تعریف کی اور بعد میں بیدل نے اسے اپنی مثنوی طلسم حیرت میں شامل[5] کر لیا ۔ شاہ صاحب بیدل کی نظم و نثر کی بھی اصلاح[6] فرمایا کرتے تھے ۔

۹۔ والہ ہروی :

شاہ قاسم ہواللہی کی صحبت میں جب منقوط اور غیرمنقوط صنعتوں کا ذکر ہو رہا تھا تو والہ بھی وہیں موجود تھے ۔ بیدل انھیں تازہ گو شاعر کہتے ہیں اور تمکین عبارت اور رنگینی مضامین کی بنا پر ان کی تعریف کرتے ہیں ۔

۱۔ کلیات صفدری ؛ چہار عنصر ، صفحہ ۲۹ ۔
۲۔ کلیات صفدری ؛ چہار عنصر ، صفحہ ۳۳ ۔
۳۔ کلیات صفدری ؛ چہار عنصر ، صفحہ ۷۱-۷۲ ۔ [illegible] ، صفحہ ۵۰ ۔
۴۔ کلیات صفدری ؛ چہار عنصر ، صفحہ ۵۵-۵۶ ۔
۵۔ کلیات صفدری ؛ طلسم حیرت ، صفحہ ۳۲ ۔
۶۔ کلیات صفدری ؛ چہار عنصر ، صفحہ ۳۳ ۔

کلیات الشعرا میں ان کا مختصرا ذکر موجود ہے۔

۱۰۷۵ھ میں جب بیدل اڑیسہ سے واپس آ چکے تھے تو ان کے ممدوح میرزا ظریف کا انتقال ہو گیا۔ بیدل نے ایک قطعہ[1] وفات[2] لکھا اور :

"نیک فرجام عاقبت محمود"۔

۱۰۷۵

سے[1] تاریخ نکالی۔

بیدل اب بے یارومددگار تھے۔ میرزا قلندر[3] بنگال جا چکے تھے۔ گزران مشکل ہو گئی۔ افلاس[4] سے ڈر کر اور احباب کے مشورے پر شاہجہان آباد کا رستہ لیا اور روانگی کے وقت یہ قطعہ[5] کہا :

از ملک بہار سوی دهلی	خون اشک روان سدیم یکس
همدوش سهود فضل بیچون	همراه حضور فیض اقدس
سال تاریخ این عزیمت	دریاب که رهبر خدا بس

۱۰۷۵

(ب) بہار سے روانگی کے بعد اور شاہجہان آباد میں مستقل اقامت اختیار کرنے تک کا زمانہ : ۱۰۷۶ھ - ۱۰۹۶ھ

زندگی کے یہ بیس سال بیدل نے شاہجہان آباد ، اکبر آباد اور اسلام آباد[6] (متھرا) میں آتے جاتے گزارے۔ ایک بار سیر[7] کی غرض سے سرائے نکودر سے

۱- کلات الشعرا : صفحہ ۱۲۳ -

۲- کلیات صفدری : قطعات ، صفحہ ۴۸ -

۳- کلیات صفدری : چہار عنصر ، صفحہ ۱۲۳ -

۴- سوانح وطن : صفحہ ۱۰۷ -

۵- کلیات صفدری : قطعات ، صفحہ ۵۱ -

۶- اورنگ زیب عالمگیر ۱۰۸۰ھ میں متھرا گئے۔ وہاں غیر معمولی بت پرستی پائی جاتی تھی۔ اس کی بیخ کنی کے لیے ایک مسجد تعمیر کرائی اور شہر کا نام اسلام آباد رکھا۔ دیکھیں : ساقی ، مآثر عالمگیری ، صفحہ ۹۶ -

۷- کلیات صفدری : چہار عنصر ، صفحہ ۱۰۷ ، ۱۰۸ ، ۱۰۹ - قطعات ، صفحہ ۵۱ -

گرویدہ ہوئے لاہور اور حسن ابدال بھی گئے۔ اپنی سالوں میں شادی[1] بھی کی اور فوج میں بھی ملازم ہوئے لیکن بہت جلد مستعفی ہو گئے۔ بیدل کے حالات زندگی کے متعلق ان اشارات کے بعد ہم اپنے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ان شعرا اور سخن دوست لوگوں کا ذکر کرتے ہیں جن کے تعلقات اس دوران میں کسی نہ کسی بنا پر بیدل سے قائم ہوئے۔

۷۔ عاقل خان رازی :

میر عسکری نام تھا۔ سادات خواف[2] میں سے تھے اور اورنگ زیب کے محبوب درباری صوفی منش شاعر تھے اور مثنوی مولانا روم کے اسرار و معارف کو خوب سمجھتے تھے۔ ''مرقع'' مثنوی معنوی کی تقلید میں لکھی۔

بیدل جب بہار سے دہلی پہنچے تو شروع میں ہی عاقل خاں رازی سے واقفیت پیدا ہوگئی۔ بیدل نے ظہوری کے تتبع میں اپنا ساقی نامہ بعنوان مثنوی، عارف نے سن ۱۰۷۸ھ میں لکھا اور اس کا نام محیط اعظم رکھا۔ کچھ عرصہ بعد یہ مثنوی بیدل نے نواب موصوف کو بھیجی[3] اور غالباً اس کے بعد ان کے تعلقات مستحکم ہو گئے۔ جب ۱۰۸۰ھ میں بیدل نے اپنی دوسری مثنوی 'طلسم حیرت' لکھی تو نواب عاقل کے نام پر معنون کی اور جب ۱۰۹۶ھ کے بعد بیدل نے دہلی میں مستقل طور پر اقامت اختیار کی تو نواب عاقل خاں رازی دہلی کے حاکم تھے۔ یہ وہ ایام تھے جب اورنگ زیب دکن میں مرہٹوں سے نبرد آزما تھے اور دہلی میں امن و اطمینان محض نواب صاحب موصوف کے حسن انتظام کی وجہ سے پایا جاتا تھا۔ نواب صاحب سے بیدل کی ملاقات[4] ہفتے میں کم از کم ایک بار ضرور ہو جایا کرتی تھی۔

۱۔ کلیات صمدری ; قطعات ، صفحہ ۵۱ -
۲۔ مرآۃ الخیال ; صفحہ ۲۸۸ - ۲۹۰ - کلمات الشعرا : صفحہ ۳ قلمی حاشیہ۔ مآثر عالمگیری ; صفحہ ۳۰ ، ۳۷ ، ۴۷ ، ۴۸ - مآثر الامراء ; حصہ دوم ، صفحہ ۸۲۱ - ۸۳۲ -
۳۔ رقعات بیدل ; صفحہ ۱۲ -
۴۔ رقعات بیدل ; نولکشور ایڈیشن ، صفحہ ۸۱ - ۸۲ -

خوشگو لکھتے ہیں[1] کہ بیدل نے شاعری اور تصوف میں عاقل خان رازی سے بہت کچھ سیکھا اور جب کبھی ان کی طرف سے بیدل کو تحسین ملتی تھی تو کھڑے ہو جاتے تھے اور تسلیم بجا لاتے تھے - اور یہ احترام ان کی امارت کی بنا پر نہ تھا بلکہ ان کے علم و فضل کی وجہ سے تھا - بیدل کا ایک قطعہ منقبت[2] ان کی مثال میں موجود ہے - اس میں بیدل انہیں انسان کامل لکھتے ہیں - ۱۱۰۸ھ میں ان کی وفات پر بیدل نے ایک قطعہ[3] لکھا اور :

"سپہدی جمجاہ عاقل خان نماند"

سے تاریخ وفات نکالی -

۸- شہزادہ اعظم شاہ :

خوشگو[4] لکھتے ہیں کہ اعظم شاہ شعر کہتے تھے اور بڑے سخن فہم اور قدردان فن تھے - ان کے دربار میں کئی شعرا موجود رہتے تھے - ۱۰۹۰ھ میں شادی کے بعد فکر روزگار نے بیدل کو اعظم شاہ کی ملازمت میں پہنچا دیا - فارسی اور ترکی میں شہزادہ کے ہم زبان تھے - سپاہی بھی تھے ، اس لیے جلد پانصدی منصب مل گیا - جب شاہزادے کو معلوم ہوا کہ بیدل اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں تو قصیدے کی فرمائش ہوئی لیکن بیدل نے پیشہ ور قصیدہ گو بننا اپنے لیے باعث ذلت سمجھا اور ملازمت سے مستعفی ہو گئے - ویسے شاہزادے کی تعریف میں بیدل کا ایک زبردست قصیدہ[5] موجود ہے جس میں یہ شعر بھی پائے جاتے ہیں :

صورت احوالم از طرز تخلص روشن است
بیدلیہ چیدہ ام بر خود ز وضع روزگار
گر شود ابر عنایت آبیار مزرعم
خوشہ سان از پای تا سر جملہ دل آرم بیار

۱- خوشگو در معارف ؛ جولائی ۱۹۳۲ء -
۲- کلیات بیدل : قطعات ، صفحہ ۵۳ -
۳- کلیات بیدل : قطعات ، صفحہ ۵۵ -
۴- خوشگو در معارف ؛ جولائی ۱۹۳۲ء -
۵- کلیات بیدل : قطعات و قصائد ، صفحہ ۳۰ -

خوش‌گو[1] کا بیان ہے کہ بعد میں شہزادے نے اپنے قلم سے بیدل کو از سر نو ملازمت قبول کرنے کے لیے لکھا اور اضافۂ منصب کا وعدہ کیا، لیکن بیدل نے ایک غزل[2] لکھ کر جس کا مطلع مندرجہ ذیل ہے، شاہزادے کو ٹال دیا:

اگر خورشید گردونم و گر خاک سر راهم
گدای حضرت شاهم گدای حضرت شاهم

اورنگ زیب کی وفات کے بعد جنگِ جانشینی میں جب جاجو کے مقام پر ۱۱۱۹ھ میں اعظم شاہ اور ان کے بیٹے بیدار بخت مارے گئے تو بیدل کو دلی قلق ہوا[3]۔

۹- حکیم حسین شہرت[4]:

خاص طبیب ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ چوں کہ اعظم شاہ کی ملازمت میں تھے اس لیے بیدل سے متعارف ہو گیا اور دوستی پیدا ہو گئی۔ بیدل کے ہم طرح تھے۔ اعظم شاہ کے مارے جانے پر حکیم صاحب نے دہلی میں اقامت اختیار کر لی۔ وفات ۱۱۴۹ھ۔

۱۰- میر محمد احسن ایجاد[5]:

ان کی تاریخ وفات ۱۱۳۳ھ ہے۔ اعظم شاہ کی ملازمت میں تھے، وہیں بیدل سے عقیدت پیدا ہوئی۔ ایجاد تخلص بیدل کا عطیہ تھا اور انہیں کے شاگرد بھی تھے۔ بیدل نے ان کی سفارش نواب حسن علی خاں کے پاس کی۔ فرخ سیر کے عہد میں شہنامہ لکھنے پر مامور ہوئے اور عہد فرخ سیر تک مکمل کیا۔ خطاب معنی یاب خاں تھا۔

۱- خوش‌گو در معارف: مئی ۱۹۴۲ء۔
۲- خوش‌گو در معارف: مئی ۱۹۴۲ء - بیاض صفدری: مطبوعہ، صفحہ ۵۹ -
۳- رقعات بیدل: صفحہ ۱۱۴ -
۴- سرو آزاد: صفحہ ۲۰۱ - خوش‌گو در معارف: جولائی ۱۹۴۲ء -
۵- خزانۂ عامرہ، صفحہ ۲۸ - رقعات بیدل: صفحہ ۱۱۸ - خوش‌گو در معارف: جولائی ۱۹۴۲ء -

۱۱- حاجی محمد اسلم سالم[1] :

اعظم شاہ کی ملازمت میں بیدل کے ہم نشیں اور ہم طرح تھے ۔ اعظم شاہ کے مارے جانے پر دہلی وارد ہوئے ۔ بیدل سے اخلاصِ قدیم کی بنا پر ملنے کے لیے آئے اور دیر تک شعر و سخن کی صحبت رہی ۔ بیدل نے حمد شعر سالم سے باصرار بیدل کا تازہ کلام سنا تاکہ طرزِ فکر معلوم کرے ۔ بیدل نے عمر بھر کسی زندہ شاعر کا دیوان تلاش نہ کرایا ، لیکن سالم کا دیوان خاص طور پر منگا کر چند روز زیر مطالعہ رکھا ۔ ان کی وفات ۱۱۱۹ھ میں ہوئی ۔

۱۲- شیخ سعد اللہ گلشن[2] :

(وفات ۱۱۴۱ھ) ۔ تخلص بیدل کا عطا کردہ ہے ۔ شاہ گل ان کے مرشد طریقت تھے ، اس مناسبت سے بیدل نے گلشن تخلص تجویز کیا ۔ اعظم شاہ کی ملازمت میں بیدل سے تعارف ہوا ۔ شروع شروع میں سرخوش کے شاگرد رہے ، لیکن بعد میں فطری رجحان کی بنا پر بیدل سے نسبتِ تلمذ قائم کی ۔ بڑے پُرگو شاعر تھے ۔ کہا گیا ہے کہ ایک لاکھ شعر کہے تھے ۔

۱۳- خواجہ عبداللہ ساقی[3] :

اعظم شاہ کی سرکار میں بیدل سے دوستی پیدا کی ۔ شاہجہاں آباد میں بھی دونوں کی صحبت رہی ۔ لاہوری تھے ۔ وفات ۱۱۵۰ھ ۔

۱۴- مولانا عبدالعزیز عزت[4] :

ملا عبدالرشید اکبر آبادی کے فرزند ارجمند تھے ۔ علوم معقول و منقول میں

۱- شمع انجمن : صفحہ ۲۱۳ - خوش گو در معارف ، جولائی ۱۹۳۲ء -
۲- کلمات الشعرا : صفحہ ۹۶ - سرو آزاد : صفحہ ۱۹۸ - اسپرنگر : جلد اول ، صفحہ ۱۲۸ و ۱۵۸ - خوش گو در معارف : جولائی ۱۹۳۲ء -
۳- خوش گو در معارف : جولائی ۱۹۳۲ء - صبح گلشن ۔ صفحہ ۱۹۵ -
۴- کلمات الشعرا : صفحہ ۷۸ - مآثر عالمگیری : صفحہ ۹۸ - ۹۹ - رقعات بیدل : نولکشور ایڈیشن ، صفحہ ۶ ، ۷۰ ، ۷۹ ، ۹۱ - کلیات صفدری : قطعات ، ۴۷ ، ۵۰ ، ۵۱ - کلیات صفدری : رقعات ، صفحہ ۳ -

ماہر تھے ۔ فن انشا اور سخن گوئی میں اپنی نظیر آپ تھے ۔ اس کے علاوہ فن حرب میں بھی مہارت تامہ حاصل تھی ۔ ١٠٨٠ھ میں آکبر آباد میں اورنگ زیب کے دربار میں حاضر ہوئے اور یاصدی منصب ملا ۔ شہنشاہ انہیں سعداللہ خاں علامی کا عہدہ دینا چاہتے تھے لیکن فرشتۂ اجل نے مولانا کو مہلت نہ دی ۔ جب بیدل اعظم شاہ کی ملازمت میں تھے تو مولانا عبدالعزیز عزت سے اصلاح لیا کرتے تھے ۔ رقعات بیدل میں چار رقعات مولانا کے نام ہیں ۔ ایک خط صنعت بے نقط میں ہے ۔ اسی کے ساتھ ایک بے نقط غزل بھی ہے جس کا مطلع یہ ہے :

در طلوع کمال بیدل ما　　ماہ در ہالۂ سہا گردد

١٠٨٩ھ میں جب مولانا کی وفات ٨٨ سال کی عمر میں ہوئی ، تو بیدل نے دو قطعات لکھے اور دو تاریخیں نکالیں :

بردہ نور از چراغ عہدساور :　　چہل و ہشت سالہ مرد

١٠٩٢ھ میں جب مولانا کے مزار کے قریب "زاویۂ عزیزیہ" کے نام سے ایک مدرسے کا افتتاح ہوا تو بیدل نے "مقام فضلا" سے تاریخ نکالی ۔

٥١۔ کامگار خاں ولد عمدۃ الملک جعفر خاں[1] :

اعظم شاہ کی ملازمت چھوڑنے کے بعد جب بیدل ١٠٨١ھ میں اکبر آباد تھے تو کامگار خاں ان کی جملہ خدمات بجا لاتے تھے ۔ کامگار خاں کو درویشوں سے اُنس تھا اور شعر و شاعری سے لگاؤ ۔ بہت سے شعراء ان کی صحبت میں موجود رہتے تھے ۔ باغ زہرہ اکبر آباد کی تعریف میں بیدل نے جو رسالہ "سرمۂ اعتبار" کے نام سے لکھا اور جو چہار عنصر کے حصۂ ثالث میں موجود ہے ، وہ انہی کے ایما پر لکھا گیا تھا ۔ رقعات بیدل میں ایک رقعہ کامگار خاں کے نام موجود ہے جس میں ان سے ملاقات نہ کر سکنے پر اظہار افسوس کیا گیا ہے ۔ قطعات بیدل میں ایک جگہ کسی فتح پر کامگار خاں کو مبارکباد کہی گئی ہے اور "نوید غیب" (١٠٨٢ھ)

١۔ کلیات صعدری : چہار عنصر ، صفحہ ٩٠ ۔ خوش گو در معارف : مئی ١٩٣٢ء ۔ مرآۃ الخیال : صفحہ ٣٦٩ ۔ مآثرعالمگیری : صفحہ ١٠٣ ۔ رقعات بیدل : نولکشور ایڈیشن ، صفحہ ٧٠ ۔ کلیات صعدری : قطعات ، صفحہ ٥١ ۔ آگرہ از لطیف : صفحہ ١٩٠ ۔

سے تاریخ وفات نکالی گئی ہے۔

۱۶۔ عبدالرحیم[1] :

شاعر تھے۔ جب ۱۰۸۰ھ میں بیدل کا اکبر آباد میں قیام تھا تو ایک روز ان کی ناکی میں عبدالرحیم نے یہ شعر لکھ کر پھینکا۔ انھیں بیدل کے ریش صف کرانے پر اعتراض تھا[2] :

چہ خطا در خط استاد ازل دید آیا
کہ بہ اصلاح خط و ریش بہ ناز افتاد است

بیدل نے فی البدیہ یہ جواب لکھ دیا :

غنصر کن بہ تغافل ہوس جنگ و جدل
دستۂ سررشتۂ تحقیق دراز افتاد است

۱۷۔ مولوی محمد سعید اعجاز اکبر آبادی[3] :

علوم معقول اور منقول میں بڑا درک حاصل تھا۔ شیخ عبدالعزیز عزت سے استفادۂ اصلاح کیا کرتے تھے۔ میرزا بیدل، میر معز فطرت اور ناصر علی کے

۱۔ خوشگو در معروف : مئی ۱۹۳۲ء۔
۲۔ اسی قسم کا ایک واقعہ تذکرۂ حسینی (صفحہ ۸۴) میں درج ہے۔ حسین دوست یوں رقم طراز ہیں : ''گویند میرزا از دستار بہ نہشتہ و از ریش بہ عمد ریش اکتفا کردہ بود۔ ظریفی این بیت بر پارۂ کاغذ نوشتہ گذشتہ رفت :

بهشتہ و ریش میرزا بیدل   ہیچ و رس و ہیچ و دستار

چون نظر میرزا بر آن کاغذ افتاد، بر ظہرش این رباعی را ثبت کرد :

ای معز خرد غبار تشویش مباش
عیمسہ و بزرگی اندیش مباش
گر یک سر موست آدمیت کافیست
چون خرس و فرق تا بقدم ریش مباش

۳۔ کلمات الشعرا : صفحہ ۶۔ نشتر عشق قلمی : صفحہ ۱۲۱ب۔

ہم صحبت ہیں اور ان کی اکثر مرحی غزلیات پر طبع آزمائی فرمایا کرتے تھے ۔ وفات ۱۱۱۷ھ ۔

۱۸- مہر علی بےکس[۱] :

متھرا کے قاضی زادوں میں سے ہیں ۔ جب مرزا بیدل ۱۰۹۴–۱۰۹۶ھ میں متھرا میں تھے تو غالباً انھی دنوں میں بےکس ان کے پاس مشق سخن کیا کرتے تھے ۔

۱۹- عاشق محمد ہمت[۲] :

بیدل کے ہم صحبت ہیں ۔ اسلام آباد (متھرا) میں دونوں مل کر رہے ۔ ہمت نے اپنے ممدوح کی تعریف میں طالب آملی کے مقابلے میں ایک قصیدہ لکھا اور نمایاں کامیابی حاصل کی ۔ بیدل ہمت کو حسن طراز فطرت کہتے ہیں ۔

۲۰- حکیم سرمد شہید[۳] :

شیخ محمد اکرام 'رود کوثر' میں 'کلمات الشعرا' تذکرۂ سرخوش کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ایک دن سرخوش ، ناصر علی سرہندی اور میرزا عبدالقادر بیدل جامع مسجد دہلی میں حوض کے کنارے بیٹھ کر شعرخوانی کر رہے تھے کہ سرمد آئے ، انہیں دیکھ کر مسکرائے اور یہ شعر پڑھا :

"عمریست کہ افسانۂ منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را"

چنانچہ اس کے جلد ہی بعد قتل ہوئے ۔ مگر صادق علی دلاوری کے تصحیح کردہ تذکرۂ سرخوش میں حکیم سرمد کا ذکر تو موجود ہے ، یہ واقعہ درج نہیں ۔ سرخوش

۱- صبح گلشن : صفحہ ۷۳ ۔
۲- کلمات الشعرا : صفحہ ۱۲۵ ۔ رقعات بیدل : صفحہ ۵۸ ۔
۳- رود کوثر : صفحہ ۲۶۵ – ۲۶۶ ۔ کلمات الشعرا : صفحہ ۵۰ – ۱۳۰ ۔ مآثر عالمگیری : صفحہ ۶ – ۷ ۔ ڈاکٹر ریو : صفحہ ۱۰۸۹ ب ۔ مرآۃالخیال : صفحہ ۲۸۲ ۔

لکھتے ہیں کہ حکیم سرمد، شاہ عالمگیر کے جلوس کے اوائل میں الحاد اور عریانی کی بنا پر علمائے زماں کے فتوے کے مطابق قتل ہوئے۔ اب عالمگیر کا سال جلوس 'ظل الحق' سے نکلتا ہے، یعنی ۱۰۶۹ھ ہے اور حکیم موصوف ۱۰۷۱ھ کو قتل ہوئے۔ اور بیدل ۱۰۷۵ھ کو ۲۱ سال کی عمر میں افلاس سے خوفزدہ ہو کر اپنے مولد و منشا پٹنہ کو بصد حسرت و یاس خیر باد کہتے ہیں اور دہلی کا راستہ لیتے ہیں، اس لیے حکیم سرمد اور بیدل کی ملاقات از قبیل ناممکنات ہے۔

۲۱۔ نواب شکر اللہ خان خاکسار:

عاقل خان رازی کے داماد تھے۔ ان کے اور بیدل کے باہمی تعلقات کا اگر بالتفصیل تذکرہ کیا جائے تو علیحدہ تصنیف درکار ہے۔ گرچہ ان سے تعارف پہلے ہو چکا تھا لیکن متھرا آخری بار چھوڑنے کے بعد دہلی میں جب بیدل کو بہ اطمینان زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور مطالعہ کرتے ہیں کہ ان کی تخلیقی خوبیوں میں یک لخت نکھار نمودار ہو چکا ہے تو ہمیں پتا لگتا ہے کہ یہ سب کچھ بڑی حد تک نواب صاحب موصوف کی توجہات اور ان کے خلوص و محبت کا مرہون منت ہے۔ اس لیے بیدل کا کوئی تذکرہ نگار نواب شکراللہ خان کو خراج تحسین پیش کیے بغیر اپنے تذکرے کو مکمل نہیں سمجھ سکتا۔

نواب صاحب خود شاعر تھے[1]۔ ان کا ایک شعر ہے:

بلاکش ہمہ بی رحمی و جفای شما
بیک نگاہ ادا شد زہی ادای شما

مثنوی مولانا روم کی تفسیر لکھنے کی وجہ سے انھیں بڑی شہرت حاصل تھی۔ پابند شرع اور صوفی مزاج تھے۔ شعر کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ ناصر علی سرہندی آپ کے خاص طور پر احسان مند تھے۔

بیدل نے ان کے اخلاق حسنہ کے تذکرے میں اپنی مثنوی 'طلسم حیرت'

۱۔ سرو آزاد: صفحہ ۱۴۹۔ مرآۃ الخیال: ۲۹۲—۲۹۳۔ خوشگو در معارف: جولائی ۱۹۳۲ء۔ تذکرۂ حسینی: صفحہ ۷۵۔

انھیں بھیجی[1] اور رقعے میں خوش ہو کر لکھا:

شاد باش ای دل کہ آخر عقدہ ات وا می شود
قطرۂ ما می رسد جائیکہ دریا می شود

نواب شکراللہ خاں نے اس مثنوی کے عنوانات قائم کیے اور اس کے مضامین کا ملخص بھی تیار کیا۔ بہت جلد نواب صاحب کو بیدل سے اتنی عقیدت پیدا ہوگئی کہ ۱۰۹۲-۹۳ھ میں انھیں اپنے ہاں دہلی میں مہمان[2] کی حیثیت سے رکھا۔ جب ۱۰۹۶ھ میں بیدل اپنے اہل و عیال سمیت متھرا سے مستقل طور پر دہلی آ گئے تو نواب شکراللہ خاں اور ان کے فرزند شاکر خاں نے انھیں دہلی دروازے سے باہر یعنی دہلی کہنہ میں کھیکریوں کے محلے کی ایک طرف گزرگھاٹ کے قریب دریائے جمنا کے کنارے ایک شخص لطف علی کی حویلی ۵۰۰۰ روپے میں خرید کر نذر کی اور دو روپے یومیہ مقرر کیا جو ۳۶ سال تک تا دم مرگ بیدل کو ملتا رہا[3]۔

اس کے بعد نہایت ہی پرخلوص، روح پرور اور ذہن افروز تعلقات شروع ہوگئے۔ میرزا صاحب کی شاید ہی کوئی ایسی تصنیف[4] ہو جو یا تو نواب شکراللہ خاں کو پیش نہ کی گئی ہو، یا وہ نواب صاحب کی وجہ سے معرض وجود میں نہ آئی ہو، یا اس کا ذکر بیدل نے ان سے نہ کیا ہو۔ دونوں کے درمیان ایسا معنوی اتحاد قائم ہوگیا تھا کہ اس کی مثال ڈھونڈنا مشکل ہے۔ محیط اعظم، طلسم حیرت اور گل زرد انھیں پیش کی گئی تھیں۔ مثنوی طور معرفت، گدڑی نامہ اور چشم و دل کے متعلق بیدل کا قطعہ نواب صاحب کی وجہ سے معرض تحریر میں آئے۔ جہاں تک غزلیات کا تعلق ہے ان کا نواب شکراللہ خاں نے انتخاب تیار کیا تھا۔ اس موقع پر بیدل نے لکھا:

"لطف کریم بہانہ جوست ہر کہ را جمعیت بسندید و ہر جہ را

۱- رقعات بیدل: صفحہ ۳۔
۲- رقعات بیدل: صفحہ ۶۳۔
۳- خوشگو در معارف: نومبر ۱۹۳۲ع۔
۴- رقعات بیدل: صفحہ ۱۳، ۲۹، ۸، ۳۰، ۶۹، ۱۷، ۳۷، ۳۲، ۵۳، ۲۰، ۲۶۔

برگزید برگزید۔"

علاوہ بریں بیدل نے نواب صاحب کو مطلع کیا کہ عرفان اور چہار عنصر تصنیف کی جا رہی ہیں ، اور اگر ان کے مکمل ہونے پر نواب شکراللہ خان زندہ ہوئے تو یہ تصنیفات بھی ان کی نقاد نگاہوں کے سامنے ضرور پیش کی جاتیں۔ ساتھ ہی بیدل نے انھیں بار بار محبت آمیز خطوط لکھے۔ بیدل کے رقعات کی زیادہ تعداد ان ہی کے نام ہے۔ ان کے فراق میں اور پھر ان سے ملاقات کے موقع پر بیدل نے نہایت ہی اثر انگیز قطعات لکھے۔ نواب صاحب بھی باہر رہتے ہوئے خطوط بھیجتے رہے تھے اور ہر موقع پر ہر قسم کے تحائف[1] بھیجا کرتے تھے۔ مزید برآں خانگی معاملات میں بھی بیدل کا مشورہ[2] لیتے تھے اور ان سے ملاقات کو ایک نعمت عین مترقبہ سمجھتے تھے۔ جب ۸ ربیع الاول ۱۱۰۸ھ کو نواب شکراللہ خان فوت[3] ہوئے تو بیدل کے لیے دنیا سونی ہوگئی اور ہر آن جان سے جاتا کہ ان کے ساتھ ہی سفر آخرت کر جاتے۔ دس شعر کا ایک مرثیہ لکھا جس کے مصرع سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔ اس التزام کے باوجود ہر شعر درد و الم کی تصویر ہے۔ یہاں صرف دو شعر درج کیے جاتے ہیں:

فریاد کان حال کرم در جہان نماند
طاؤس جلوہ ریز درین آشیان نماند
طوفان گریہ بس کہ زہر سمت جوش زد
جز دجلہ در ممالک ہندوستان نماند

ح ۔ عہد عالم گیری کا خاتمہ
(۱۰۹۶ھ سے ۱۱۱۸ھ تک)

اورنگ زیب عالمگیر ۱۰۹۳ھ سے دکن میں مرہٹوں کی سرکوبی میں مصروف تھے ، اور چونکہ قابل ترین امراء اور جرنیل ان کے ساتھ تھے ، شمالی ہند کا

۱۔ رقعات بیدل : صفحہ ۱۴ ، ۱۵ ، ۲۶ ، ۲۹ ، ۳۵ ، ۳۹ ، ۷۱ ، ۷۵ ، ۷۷ ، ۹۰ ، ۹۲ ۔
۲۔ رقعات بیدل : صفحہ ۲۷ ۔
۳۔ کلیات مصدری : قطعات ، صفحہ ۵۸ ، ۶۲ ۔ رقعات بیدل : صفحہ ۷۲ ، ۷۶ ۔
۴۔ مآثر عالم گیری : صفحہ ۲۱۷ ۔

انتظام سب بگڑ چکا تھا اور شاہی افواج کی مرہٹوں سے شکست کے بارے میں مبالغہ آمیز خبریں پھیل چکی تھی۔ اس لیے اکبر آباد اور اسلام آباد (متھرا) کے نواح میں جاٹوں نے فسادات اور لوٹ مار کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بیدل نے اس مصیبت سے تنگ[1] آ کر اپنے اہل و عیال سمیت کرائے کی بہلیوں پر شاہجہان آباد کا رستہ لیا اور ۲۷ جمادی الثانی ۱۰۹۶ھ کو دہلی میں وارد[2] ہوئے۔ اب نئے دل دادگان سخن اور شعرا سے تعلقات کا دور شروع ہوا۔ ریو لکھتے[3] ہیں کہ آخری وقت تک بیدل کا گھر دہلی میں اس قسم کے حضرات کا مرجع رہا۔ خوشگو سے[4] پتا چلتا ہے کہ ہر شام شاگرد اور دیگر سخن دوست حضرات بیدل کے ہاں پہنچ جاتے تھے۔ بیدل بھی دن بھر شعر و سخن سے شغل رکھنے کے بعد حرم سے باہر تشریف لاتے تھے اور پھر نہایت ہی پُر لطف اور بصیرت افروز صحبت شروع ہو جاتی تھی۔ اب ہم اس قسم کے حضرات کا ذکر کرتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے دور رہ کر بیدل کی عظمت کا اعتراف کیا اور بعض کو بیدل سے ان کی شہرت کی بنا پر حسد تھا:

۲۲۔ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر:

یہ شہنشاہ معظم شعر گو بھی تھے اور شعر فہم[5] بھی۔ شعر و سخن سے ان کی دلچسپی کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اپنی گوناگوں اور غیر معمولی مصروفیتوں کے باوجود انہوں نے اپنے عہد کے ایک شاعر میرزا عبدالقادر بیدل کا دیوان حاصل کر کے اس کا مطالعہ کیا، اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنے مشہورۂ آفاق رقعات میں بیدل کے اشعار موقع کے مطابق استعمال کیے۔ ایک رقعے میں اعظم شاہ کو لکھا[6] ہے کہ بہادر پور اور اورنگ آباد کے درمیان وہ سڑک پر سے راہ روں

۱۔ کلیات عنصری: چہار عنصر، صفحہ ۱۲۸ تا ۱۳۲۔
۲۔ رقعات بیدل: صفحہ ۸۱۔
۳۔ ریو: فہرست مخطوطات، لنڈن میوزیم، صفحہ ۷۰۶ ب۔
۴۔ خوشگو در معارف: مئی ۱۹۳۲ء۔
۵۔ بزم تیموریہ: صفحہ ۲۶۲۔
۶۔ رقعات عالمگیری: صفحہ ۸۔

کا جلد خاتمہ کیا جائے اور پھر بیدل کا یہ شعر درج کیا ہے :

من نمی گویم زیان کن یا بفکر سود باش
ای ز فرصت بی خبر در ہر چہ باشی زود باش

ایک اور رقعے[۱] میں اعظم شاہ کو مظلوموں کی داد رسی کرنے کی ہدایت کی ہے اور بیدل کا ایک اور شعر درج کیا ہے :

بترس از آہ معصوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از در حق بہر استقبال می‌آید

یہی شعر ایک بار[۲] اسد خاں کو بھی بیدل کے حوالے سے لکھا ۔ ایک اور[۳] موقع پر بیدل کا یہ مقطع استعمال کیا ہے :

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب معاش
آنچہ ما در کار داریم اکثری درکار نیست

دوسری طرف جہاں تک بیدل کا تعلق ہے وہ عالم گیر کی دین داری اور دین پروری کو بڑا سراہتا[۴] ہے ۔ اور جب عالم گیر کو دکن میں فتوحات شروع ہوئیں تو اس بنا پر کہ یہ فتوحات جمعیتِ عالم کا سبب بنی تھیں ، بیدل نے تاریخیں[۵] کہیں اور ان کی تاریخ :

با زن و فرزند سنبھا شد اسیر

جو مآثر الامراء میں بھی درج ہے ۔ نواب ظفر جنگ نے بھی ان فتوحات کے متعلق تاریخیں لکھنے کے لیے بیدل کو کہا تھا ۔ مطلوبہ قطعات لکھنے کی سندرجہ بالا وجہ بیان کرنے کے بعد بیدل نواب شکر اللہ خاں کو عالم اسعا میں رقم طراز[۶] ہیں :

''وگرنہ چہ نواب و کداہ سعاب بلکہ چہ عالم گیر و کدام بحر میر بہ طریق شوق بے پرواہ نگاشتنی دارد و بہ آہنگ سازی نواری سر و بردہ بیرون می آرد ۔''

۱- رقعات عالم گیری ' صفحہ ۱۹ ۔ یہ شعر دراصل سعدی کا ہے ۔ قارئین کرام درستی فرما لیں ۔
۲- رقعات عالم گیری : صفحہ ۳۹ ۔
۳- رقعات عالم گیری : صفحہ ۲۷ ۔
۴- کلیات صفدری : قطعات ، ۴۹ ۔
۵- کلیات صفدری ، قطعات ، ۴۹ ۔ نیز مآثرالامراء ؛ جلد دوم ، صفحہ ۳۵۰ ۔
۶- رقعات بیدل : صفحہ ۴۴ ۔

۲۳- قاضی عبدالرحیم :

وفات ۱۱۳۱ھ - شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے والد ماجد - شاعری[1] اور ادب میں بھی بلند پایہ رکھتے تھے - بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ شہنشاہ عالمگیر نے دعوت بھیجی مگر ملاقات کے لیے نہ گئے - لیکن ایک شخص جو با مروت شہنشاہ کو درخور اعتنا نہیں سمجھتا تھا، اس نے ایک درویش کے سامنے سر نیاز خم کر دیا - بیدل کی غیبت میں نظم و نثر لکھی جس کے جواب[2] میں بیدل نے تحریر کیا :

"یاد فقراء حرکت است از عالم ارادت بے چونی - در ہر دلی کہ پرتو توجہ آن ثابت خود را آئینہ دار ہوس کیفیت دریافت - حضرات قلوب خاصان کہ مشمول اسرار ربانی اند ادای این شمعہا از حق محق تواند بود ...."

۲۴- ناصر علی سرہندی :

ایک وقت نواب شکر اللہ خاں انھیں بے حد چاہتے[3] تھے - غالباً جب نواب صاحب سرہند کے صوبہ دار تھے تو تعلقات قائم ہوئے ہوں گے - ناصر علی کچھ عرصے کے لیے کرناٹک[4] میں نواب ذوالفقار علی خاں کے ساتھ چلے گئے اور جب بارھویں صدی ہجری کی ابتدا میں واپس شاہجہان آباد پہنچے تو وہاں بیدل کا طوطی بولتا تھا، لیکن ناصر علی کے قوائے ذہنی پر انحطاط[5] طاری ہو چکا تھا اس لیے کچھ نہ کر سکتے تھے - ایک دن[6] ان کی موجودگی میں بیدل نے نواب شکر اللہ خاں کے سامنے ایک غزل پڑھی جس کا مطلع یہ تھا

شد آئینۂ کیفیت ما ظاہر آرائی
نہاں ماندیم چون معنی بچندین نقش پیدائی

۱- حیات ولی : صفحہ ۱۱۱، ۱۱۳، ۱۲۹ -
۲- رقعات بیدل : صفحہ ۱۱۲ -
۳- مرآۃالخیال : صفحہ ۲۹۲ تا ۳۰۵ -
۴- سرو آزاد : صفحہ ۱۱۴ -
۵- خوش گو در معارف : جولائی ۱۹۴۲ع -
۶- مرآۃالخیال : صفحہ ۳۸۹-۳۹۰ -

ناصر علی معترض ہوئے کہ معنی الفاظ کے تابع ہوتے ہیں ۔ جب الفاظ ظاہر ہو گئے تو معنی بھی خود بخود واضح ہو گئے ۔ بیدل مسکرائے ۔ کہا ”جس معنی کو آپ الفاظ کے تابع بیان کرتے ہیں ، خود ایک لفظ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا ۔ لفظ ’انسان‘ کو لیں ۔ کیا اس کی تصویر میں الٰہی صحیح خدوخال لکھ دینے کے بعد بھی یہ آج تک ایک راز نہیں ہے ؟“ ناصر علی خاموش ہو گئے لیکن دل میں آگ سلگتی رہی اور مختلف مواقع پر اپنے دوست محمد افضل سرخوش کو بیدل کے مقابلے کے لیے آمادہ کیا ۔ خوشگو[۱] کہتے ہیں کہ جب رجب ۱۱۰۸ھ میں ناصر علی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے تو بیدل نے یہ تاریخ کہی : ”رنگ از شکست“ لیکن کلیات میں یہ کہیں نظر نہیں پڑی ۔

۷۵۔ احمد عبرت[۲] :

پہلے مفتون تخلص تھا ۔ بیدل نے تبدیل کر کے عبرت کر دیا ۔ بیدل کے محبوب شاگرد تھے ۔ جب ۱۱۲۵ھ میں ان کی وفات ہوئی تو بیدل دیر تک سوگوار رہے ۔ جب ناصر علی سرہندی نے مندرجہ ذیل مطلع والی غزل کہی تو شاہجہان آباد میں اعلان کیا کہ اگر کوئی اس کا جواب لکھے گا تو میں اسے خدائے سخن مانوں گا :

مجو کوی تو سختی کشان دل تنگ اند
که ناله گر نکنند فرش آتش سنگ اند

احمد عبرت نے بیدل کی تائید پر جواب میں غزل کہی ، مطلع تھا :

بوادی تو که واماندگان دل تنگ اند
ز اشک خویش روان همچو چشمهٔ سنگ اند

۷۶۔ محمد افضل سرخوش[۳] :

سرخوش کی پرورش سرہند میں ہوئی تھی ۔ ابتدا ناصر علی سے ملی تو

۱۔ خوشگو در معارف : جولائی ۱۹۳۲ع ۔
۲۔ مرآۃ خیال : صفحہ ۲۸۲-۲۸۳ ۔
۳۔ کلمات الشعرا ، دیباچہ : صفحہ ۱ ، ۲ ، ۳ ۔ سرو آزاد : صفحہ ۱۴۴ ۔ کلمات الشعرا ، صفحہ ۵۶ ۔ خوشگو در معارف : جولائی ۱۹۳۲ع ۔

مشق سخن کیا کرتے تھے۔ دیرینہ روابط تھے۔ جب ترنابک سے واپسی پر ناصر علی
شاہجہاں آباد میں مقیم ہوئے تو سرخوش بھی وہیں زاویہ نشیں ہو چکے تھے۔
ناصر علی کے کہنے پر سرخوش نے کئی موقع پر بیدل کا مقابلہ کرنے کی کوشش
کی۔ کلمات الشعرا میں ذکر موجود ہے۔ سرخوش نے بیدل کے کئی مصرعوں پر
پیش مصرع لگا کر انھیں مطلع بنا دیا۔ بیدل کا ایک شعر ہے:

بہ فرصت نگہی خو است غمیلم
برات رنگم و بر گل نوشتہ اند مرا

سرخوش نے اسے یوں مطلع کی صورت دی:

ز بی ثباتیٔ عشرت سرشتہ اند مرا
برات رنگم و بر گل نوشتہ اند مرا

اس مصرع واقعی صاف ہوگیا ہے لیکن 'فرصت نگاہ' اور 'برات رنگ' میں جو لطافت اور مناسبت تھی وہ بھی ساتھ ختم ہوگئی ہے۔ ایک موقع پر خوشگو نے شیخ سعداللہ گلشن کی وساطت سے کوشش کی کہ سرخوش اور بیدل میں مصالحت کرائی جائے لیکن سرخوش نے جواب دیا "میوں یہ جیوں کی شکل دیکھنا چاہتے ہو۔" اس رقابت کے باوجود سرخوش نے اپنے تذکرۂ کلمات الشعراء میں بیدل کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔

۲۷۔ میر کرم اللہ عاقل خان عاشق[1]:

نواب شکراللہ خاں کے سب سے چھوٹے فرزند تھے اور بیدل کے صاحب دیوان شاگرد۔ بیدل کے طرز پر شعر کہتے تھے۔ ایک موقع پر بیدل نے کہا تھا کہ شعر گوئی میں میر کرم اللہ مجھ سے بازی لے گئے ہیں۔ میر صاحب سے بیدل کو بڑی محبت تھی۔ اس کا اندازہ ان اشعار سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے میر صاحب کے نہیں آنے اور خط نہ لکھنے پر کہے ہیں:

غبار نامہ بہ ہر طپیدن ہزار بیداد می‌نگارم
بسرمہ فرسود خامہ اما ہنوز فریاد می‌نگارم

۱۔ رقعات بیدل: صفحہ ۱۰۳۔ خوشگو در معارف: جولائی ۱۹۴۲ء۔ کلمات الشعرا: صفحہ ۸۰۔

دماغ عیش ندارم اسوں بہ زیرم او بوک جامہ بیرون
ز بعض دل جسہ مصرع حوں بہ بیش فصاد می گیرہ
معاف گرد پائیم چساں نگرم جرا سامہ
فرامشیہای رنگ عالم فرامشت باد می نگارہ

ایک موقع پر شکراللہ خاں عاشق کی مالی حالت خراب تھی ۔ بیدل نے انہیں دو صد اشرفی دی جو انہیں نواب دو لعار خاں نے بھیجی تھی ۔ ۱۱۳۳ھ میں میر صاحب کی وفات پر بیدل بڑے مغموم ہوئے اور دیر تک روتے رہے ۔

۲۸۔ میر عنایت اللہ شاکر خاں[1] :

نواب شکراللہ خاں کے منجھلے بیٹے ۔ شعر تو نہ کہتے تھے لیکن قدردان سخن تھے اور بیدل کے بہت معتقد گزار ۔ دکن میں انہوں نے بیدل کو شہنشاہ سے جاگیر دے دی لیکن بیدل نے قبول نہ کی ۔ بیدل کے بہت سے رقعات ان کے نام ہیں اور جو اشعار دعائیہ یا دوسرے ان میں موجود ہیں ان کی سلاست ، روانی اور اثر انگیزی بیدل کے خلوص کی آئینہ دار ہے ۔ مثلاً دعا دیتے ہیں :

بہ عمل سمع تاباں در گلستاں رنگ و بو باشی
الٰہی ہر کجا باشی بہار آبرو باشی

میر شاکر خاں کی امداد کی خوشی میں ایک بہاریہ بھی پرزور اور طویل قطعہ کلیات میں موجود ہے ۔ علاوہ بریں اور قطعات بھی ہیں ۔

۲۹۔ میر قمرالدین شاکر[2] :

غازی الدین خاں فیروز جنگ کے فرزند ارجمند ہیں ۔ ورنگ زیب نے انہیں

۱۔ تذکرۂ بے نظیر : صفحہ ۳۹ ۔ کتاب صدری : قطعات ، صفحہ ۴۴ ، ۴۵ ، ۵۵ ، ۵۶ ، ۶۰ ۔ رقعات بیدل : صفحہ ۳۵ ، ۳۰ ، ۱۷ وغیرہ ۔

۲۔ خزانۂ عامرہ : صفحہ ۳۵ ۔ مآثر عالمگیری : صفحہ ۴۰۰ ۔ کتاب صدری : قطعات ، صفحہ ۴۴ ، ۵۵ ۔ خوشگو در معارف : مئی و جولائی ۱۹۳۲ع ۔ سرو آزاد : صفحہ ۱۴۹ ۔ تذکرۂ بے نظیر : صفحہ ۳۹ ۔ رقعات بیدل : صفحہ ۱۴ ، ۱۲۸ ، ۱۳۶ وغیرہ ۔ دیوان شاکر : صفحہ ۱۱ ، ۱۵ ، ۳۱۲ ، ۳۱۳ ۔ دیوان آصف : صفحہ ۲—۶ ۔

جن قلیج خان کا خطاب دیا اور بہادر شاہ نے نظام الملک کیا۔ بعد میں آصف جاہ ہوئے اور آصف کے تخلص سے شعر کہتے رہے۔ بعض ہزاری امیر کبیر تھے۔ دکن میں سلطنت آصفیہ کے یہی بانی ہیں۔ بیدل کے شاگرد تھے۔ نواب صاحب کے دیوان میں ایسی غزلیات موجود ہیں جو بیدل کی زمین میں لکھی گئی ہیں، مثلاً:

بیدل: کی از سوی میان شہرت دهد نازک خیالی را
کسی از چین ابرو سکته خواند بیت عالی را

آصف: نگه می فروشش پُر کند مینای خالی را
رخش از خوی تری بخشد بهار برشگالی را

ایک جگہ بیدل کے مصرع پر تضمین کی گئی ہے۔ کہتے ہیں:

بیدل صاحب دل شاکر حد خوش فرموده است
هر چه لیلی گویدم باید ز محمل بشنوم

بیدل کے مکان پر حاضر ہوتے تھے اور دیر تک استفادہ کرتے رہتے تھے اور جب بیدل ان کے مکان پر تشریف لے جاتے تھے تو بہ اعزاز استقبال اور مشایعت کرتے اور اپنی مسند ان کے لیے خالی کر دیتے تھے۔ بیدل کے کئی رقعات ان کے نام موجود ہیں۔ کلیات میں ان کے متعلق قطعات ہیں۔ تذکروں میں ان کے اور بیدل کے کئی قصے نقل کیے گئے ہیں۔ یہ ایک طویل بیان ہے۔ سعادت یار کے اسناد کے حاشیے پر جب ۱۱۳۳ھ میں نظام الملک دکن میں متمکن ہوئے تو بیدل کو دعوت بھیجی۔ بیدل نے جواب میں لکھا:

دلیا اگر دهند نه جنبم ز جای خویش
من بسته ام حنای قناعت به پای خویش

نواب صاحب نے اپنا دیوان بیدل کے مشورے سے مرتب کیا تھا۔

۳۰- نواب سعادت اللہ خان[۱]:

شعر و سخن سے بڑا لگاؤ تھا۔ ان کی ایک تصنیف ''گلشن سعادت'' قلمی صورت میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ گلشن سعادت میں ایک تذ

۱- مآثرالامراء جلد دوم، صفحہ ۵۱۳۔ گلشن سعادت ف؛ پنجاب یونیورسٹی لائبریری نمبر ۱۸۰۶- نیز: فارسی مخطوطات، لنڈن میوزیم، زیر نمبر ۱۶۸۰۲-

بیدل کے نام ہے ۔ طرز نگارش بڑی نیازمندانہ ہے ۔ دیکھیں : "اگر عرض ارادت بمدارج احباب ارتقا نماید امید است کہ از عدم حیرت بر آید و سواد خط اعظم گشتہ گوہر مقصود بچنگ آرد ۔ اگر ایں بیاض خاص کہ ہر ورقش از خط شکستہ مطلوبی است ، مرغوب شود و ہر صفحہ اش از جدول رنگین معشوقی است چار ابرو عنایت شود متوقع است کہ در وحشت سوادی ایں عنبر دل و حواس جمع حال شود ۔" ظاہر ہے بیدل سے ان کی نئی تصنیفات کے لیے استدعا کی جا رہی ہے ۔ بیاض خاص برٹش میوزیم میں موجود ہے اور ریو نے اس کی مفصل تشریح اپنی فہرست مخطوطات میں دی ہے ۔ گلشن سعادت کا سنہ تصنیف ۱۱۳۱ھ ہے ۔ جناب سعادت اللہ خان کا ذکر مآثر الامراء جلد دوم میں موجود ہے ۔

۲۱۔ میر عبدالصمد سخن[1] :

تخلص بیدل نے عطا کردہ ہے ۔ ایک روز انھوں نے برہان نور کی صاحب کی ایک خوش اسلوب چھوٹی سی جمدھر بیدل کو نذر کی ۔ میرزا صاحب نے فرمایا : "بر نسبت ایں جمدھر بہ نشان برہان نور برہان قاطع است کامل" اور پھر اس سلسلے میں دو ہمام عطا کیے ۔ چونکہ میر عبدالصمد قلیل جماعت منصب داروں کے ساتھ رہتے تھے ، لہذا تنگ دست رہا کرتے تھے اس لیے ایک دن یہ شعر پڑھا :

فلاطون گر بیاید بی سود عاجز بہ تدبیرم
کہ منصب آتشین داغی شد و حاکیں جان گیرم

بیدل نے اسی وقت اصلاح کر کے آتشین کے بجائے آتشک کر دیا ۔ عہد فرخ سیر میں ان کی وفات ہوئی ۔ بیدل کے ایک رقعے سے پتا چلتا ہے کہ میر عبدالصمد نے اپنے اشعار بیدل کی خدمت میں اصلاح کے لیے بھیجے ۔ بیدل ان کی تعریف کرتے ہیں اور دعا دیتے ہیں :

رنگینی بہار سخن لایزال باد

۱- خوش گو در معارف : جولائی ۱۹۳۲ء - صبح گلشن ، صفحہ ۲۱۹ - اسپرنگر : ہمیشہ بہار ، صفحہ ۱۲۳ - رقعات بیدل : صفحہ ۷۸ -

۳۲۔ لالہ شیو رام حیا کالستھ[1] :

اسد خان وزیر عالمگیر کے ملازمین میں سے تھے اور بیدل کے شاگرد۔ نسخۂ گلگشت بہار ارم ، چہار عنصر بیدل کی طرز میں لکھی ۔ وفات ۱۱۳۳ھ ۔

۳۳۔ لالہ سکھ راج سبقت[2] :

وفات ۱۱۳۸ھ ۔ بیدل کے شاگرد تھے ۔ میرزا اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ سبقت ہمارے تمام ہندو شاگردوں پر فائق ہے ۔ ان کا دس ہزار شعر کا دیوان تھا جو ضائع ہوگیا ۔ انہوں نے مندرجہ ذیل رباعی بیدل کی پیدائش کے متعلق لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کی تھی :

آں ذات بہ حضرت مریہ مقام عبدالقادر محمود مشہور نام
شد زندہ یکی بہر مسیحائی دین آمد ذکرا کمول پے احیای کلام

۳۴۔ محمد عطاء اللہ عطا[3] :

بیدل کے شاگرد تھے اور امروہہ ضلع مراد آباد وطن تھا ۔ طبع رسا رکھتے تھے ۔ طبیعت کا میلان ظرائف اور ظرائف کی طرف زیادہ تھا ۔ جب کبھی میرزا بیدل کی بزم شریف میں رونق صحبت ہوتی تھی تو میرزا ان کے بے موحدانہ اشعار ترک کر کے پرلطف درمیان میں لاتے تھے اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ دیوان پرلطافت کے نثر اور نظم کا استحقاق عطا کو حاصل ہے ۔ ایک دن میرزا صاحب نے اپنا قلم دان اور اپنے منتخب اشعار کی بیاض انہیں عنایت فرمائی ۔ عطا نے

۱۔ خوش گو در معارف؛ جولائی ۱۹۳۲ء ۔ صبح گلشن: صفحہ ۱۳۳ ۔ ہمیشہ بہار؛ صفحہ ۱۲۱ ۔ نشتر عشق قلمی: صفحہ ۱۵۹ ۔

۲۔ صبح گلشن: صفحہ ۱۹۷ ۔ روز روشن: صفحہ ۲۹ ۔ نشتر عشق قلمی: صفحہ ۲۳۲ ۔ خوشگو در معارف؛ مئی ۱۹۳۲ء ۔

۳۔ خوشگو در معارف؛ جولائی ۱۹۳۲ء ۔ صبح گلشن: صفحہ ۲۸۷ ۔ اسپرنگر: ہمیشہ بہار؛ صفحہ ۱۲۶ ۔

ادائے شکریہ کے طور پر یہ رباعی کہی:

از گوشۂ چشم تا نظر داشت بمن
بیدل شدہ اقسام کمال ہنر فن
از روی عنایت قلم دان و بیاض
فرمود مرا وزارت ملک سخن

عطا ایسی حرکات تمکین کی بنا پر ریب محالی تھا۔ میرزا بیدل کی تاریخ وفات خالق باری کے وزن میں ''عبدالقادر بیدل رفت'' کہی لیکن اس میں چار عدد زائد ہیں۔ جب تک زندہ رہے، میرزا کے مزار پر عرس میں مجمع کی رونق ان کی وجہ سے قائم رہی۔ خوشگو، وفات ۱۱۳۳ھ میں لکھتا ہے۔ صبح گلشن میں ۱۱۳۷ھ درج ہے اور اسپرنگر ہمیشہ بہار کے حوالے سے ۱۱۳۵ھ لکھتا ہے۔ چونکہ خوشگو معاصر تھے اس لیے انھی کی تاریخ صحیح ہوگی۔

۳۵- بندرا بن داس خوشگو[۱] :

مقالات الشعرا میں انھیں بیدل کا شاگرد کہا گیا ہے۔ تخلص بیدل سے حاصل کیا ہے۔ خوش گو لکھتے ہیں کہ انھیں، شیخ سعداللہ گلشن اور میر عبدالصمد سخن تینوں کو بیدل نے تخلص ایک ہی روز عنایت کیا تھا۔ بیدل سے استفاضے کے متعلق خوش گو کہتے ہیں۔ ''از عنفوان شعور بہ خدمتش بندگی داشتہ، و رسائل عروض و قافیہ و معمہ و اکثر دواوین تازہ گویان پیش او گزرانیدہ۔'' خوش گو یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایک ہزار بار سے زیادہ بیدل کی خدمت میں حاضر ہونے کا انھوں نے شرف حاصل کیا تھا۔ بیدل کی شبانہ مجلسوں کے ملفوظات بھی انھوں نے لکھے ہیں۔ اپنے سفینے میں انھوں نے بیدل کے حالات تمام تذکرہ نویسوں سے زیادہ جامع تفصیل سے قلم بند کیے ہیں۔ سفینۂ خوش گو کی جلد دوم صرف بانکی پور لائبریری میں موجود ہے اور قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر ایٹ لاء بانکی پور نے بڑی محنت سے ان تمام حالات کو وہاں سے اکٹھا کر کے معارف اعظم گڑھ کے مئی اور جولائی ۱۹۳۲ء کے پرچوں میں شائع کرا دیا ہے۔

۱- خوش گو در معارف: مئی و جولائی ۱۹۳۲ء - اسپرنگر: مقالات الشعراء، صفحہ ۱۵۵ -

۳۶- برخوردار بیگ ندوی[1] :

وفات ۱۱۱۹ھ - بیدل کے شاگرد تھے -

۳۷- گور بخش حضوری[2] :

بڑے عرصے تک بیدل کی صحبت میں رہے اور شعر گوئی میں مہارت تامہ حاصل کی -

۳۸- مغل خان قابل[3] :

پہلے صحبت تخلص تھا لیکن بیدل کے کہنے پر تبدیل کر دیا - ان کے شاگرد تھے - بیدل کی تاریخ وفات "ختم کلام" سے نکالی لیکن اس میں دو کا اضافہ چاہیے - ۱۱۳۲ھ میں فوت ہوئے -

۳۹- آقا ابراہیم فیضان[4] :

آقا محمد حسین خان ناجی کے بیٹے تھے - اکثر اوقات اُن کے ہاں مجمع شعرا ہوا کرتا تھا اور بیدل کو بھی مدعو کرتے تھے - صحبت ہائے رنگیں واقع ہوا کرتی تھیں - خوشگو کہتا ہے کہ وہ اُن مجالس کے فیوضات کا ریزہ چیں ہے - ۱۱۲۴ھ میں وفات ہوئی -

۴۰- میر محمد زمان خان راسخ[5] :

وفات ۱۱۰۷ھ - بیدل کے ہم طرح تھے اور ان کے گہرے دوست -

۱- خوشگو در معارف : جولائی ۱۹۳۲ء -
۲- روز روشن : صفحہ ۱۸۱ - خوشگو در معارف : جولائی ۱۹۳۲ء -
۳- صبح گلشن : صفحہ ۳۲۵ - خوشگو در معارف : جولائی ۱۹۳۲ء -
۴- خوشگو در معارف : جولائی ۱۹۳۲ء -
۵- مرآۃ الخیال : صفحہ ۳۰۶ - شمع انجمن : صفحہ ۱۶۳ - سرو آزاد : صفحہ ۱۲۸ - خوشگو در معارف : جولائی ۱۹۳۲ء -

۴۱۔ ایزد بخش رسا[1] :

وفات ۱۱۱۹ھ۔ محمد عزیز عرب کے شاگرد تھے۔ محمد سے منسوب ہو گئے تھے اور رسا تخلص رکھ لیا تھا لیکن بیدل کو پسند نہ آیا اور اس لیے اُن کے قاسب ملند کے وزن پر رسا تجویز کیا۔ انہوں نے قبول کیا۔ کھڑے ہو گئے اور سجدہ بجا لائے۔ بیدل کے دو رقعات اُن کے نام ہیں۔ ایک سے پتا چلتا ہے کہ رسا نے بھی غزل اصلاح کے لیے بھیجی تھی۔ ایزد بخش رسا کے رقعات کا قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ اس میں ایک خط درج ہے: "بیدل بعد ذی دیدہ"۔ ایک اور خط پر درج ہے: "میرزا عبدالقادر بیدل کے ہمراہ دلی سے . . .۔" ایک رقعے میں رسا لکھتے ہیں کہ بیدل ان کے ساتھ ایک سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے، میرزا محمد ابراہیم اور خواجہ حسب اللہ بھی ساتھ تھے۔ تفنگچیوں کے درمیان لڑائی چھڑ گئی۔ یہ تماشا کر دیکھتے رہے۔ ایک تیر رسا کے پہلو میں آ لگا اور وہ زخمی ہو گئے۔

۴۲۔ محمد امین عرفان[2] :

منصب دار تھے اور بیدل کے شاگرد۔ جب بیدل نواب شکر اللہ خان کے ساتھ میوات میں گئے اور برسات میں بیرٹ کے پہاڑوں کے مناظر سے متاثر ہو کر اپنی غیر فانی مثنوی "طور معرفت" لکھی تو واپسی پر اس مثنوی کی نقل رہ آورد کے طور پر انہیں بھیجی۔

۴۳۔ محمد صادق الفا[3] :

بیدل کے شاگرد تھے۔ کلمات الشعراء میں ان کا ذکر موجود ہے اور چونکہ اس تذکرے میں ۱۱۰۰ھ تک کے واقعات ہی آ گئے ہیں، اس لیے اگر

۱۔ رقعات بیدل: صفحہ ۳۳ – ۳۶ – خوشگو در معارف، جولائی ۱۹۳۶ء۔
رقعات ایزد بخش رسا (قلمی): صفحہ ۷ الف و ۷ ب، ۱۰ الف۔
۲۔ تذکرۂ محبوب الزمن: حصہ دوم، صفحہ ۱۰۰۳ – رقعات بیدل: صفحہ ۳۳۔
۳۔ صبح گلشن: صفحہ ۳۳ – اسپرنگر: بحوالہ ہمیشہ بہار، صفحہ ۱۱۸۔
کلمات الشعرا: صفحہ ۸، دیباچہ صفحہ ۱۲۔

اس سال تک بھی اگر زندہ تھے تو پھر بھی یقیناً وہ عہد عالمگیری میں بیدل سے مستفیض ہوتے رہے۔

۴۴۔ شیر خاں لودھی[1] :

مرأۃ الخیال کے مصنف، بیدل سے صحبت تھی۔ مرأۃ الخیال میں بیدل کا جو تذکرہ موجود ہے، وہ شیر خاں نے انہیں دکھایا تھا۔ اس تذکرے کا سنہ تصنیف ۱۱۰۲ھ ہے۔

۴۵۔ میرزا عباد اللہ[2] :

بیدل کے ماموں زاد بھائی تھے اور موزوں طبع رکھتے تھے۔ ان کا ایک شعر ہے :

برنگی دوخت بلبل چشم بر گل
کہ شد پیراہن گل چشم بلبل

رقعات میں بیدل انہیں ''اخوان پناہ'' کے لقب سے مخاطب کرتے ہیں۔ عبداللہ بیدل کے پاس اپنی غزلیات اصلاح کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ مثنوی طور معرفت کا نسخہ بیدل نے انہیں بھی بھیجا تھا۔ بیدل کی وفات پر میرزا عبد اللہ کے بیٹے میرزا محمد سعید بیدل کے سجادہ نشین ہوے۔ مجموعۂ نغز میں میرزا عباد اللہ کی اولاد میں سے میرزا نصر اللہ بیاں نامی اُردو کے ایک شاعر کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

۴۶۔ رفیع خاں باذل[3] :

وفات ۱۱۲۳ھ۔ شاہنامہ کی بحر میں رسول ؐ مقبول اور حضرت علیؓ کی تعریف میں ایک جلیل القدر مثنوی 'حملۂ حیدری' لکھی جس کے بیسں ہزار شعر ہیں۔

۱۔ مرأۃ الخیال : صفحہ ۳۹۱۔
۲۔ خوش گو در معارف : مئی ۱۹۳۲ع ؛ رقعات بیدل : صفحہ ۲۳، ۲۸، ۳۵-۵۹۔ مجموعۂ نغز : جلد دوم، صفحہ ۱۷۹۔
۳۔ رقعات بیدل : صفحہ ۵۹۔ کلمات الشعرا : صفحہ ۱۰۔ سرو آزاد : صفحہ ۱۳۱۔

بیدل بیدل کے دوست تھے۔ ایک رقعے میں بیدل نے ایک شخص میر محمد ورا اس کے رقعہ کی رفیع خان بادل کے نام سفارش کی ہے۔ وہ ان دنوں غالباً بانس بریلی کے صوبے دار تھے۔

٣٧۔ نواب حسین قلی خاں[1] :

خان دوراں خطاب تھا اور شاعر تھے۔ بیدل کے پاس اپنی غزلیات بغرض اصلاح بھیجا کرتے تھے۔ بیدل کے ہاں نواب صاحب کا دیوان پڑا تھا جس میں ان کی غزلیات شامل کر کے بیدل نے انہیں لکھا کہ دیوان کا از سر نو بنظر غائر مطالعہ کر لیا گیا ہے۔ اسے اب کاتب کو کتابت کے لیے دے دیا جائے۔ حسین قلی خان بیدل کا تتبع کرتے تھے، لیکن جوش کے بعض اغلاط پر اعتراض تھے۔ ایک دفعہ بیدل نے انہیں مشورہ دیا کہ ان کی نظم و نثر کا مطالعہ کیا جائے۔ مآثر الامراء، مآثر عالمگیری، منتخب اللباب یا خزانۂ عامرہ میں ان کا حال علیحدہ تذکرہ نہیں مل سکا۔ البتہ مآثر الامراء جلد سوم کے صفحہ ۳۲ پر ضمناً ایک شخص حسین فتیح خان بہادر کا تذکرہ موجود ہے جو عہد عالمگیری کے پچاسویں سال میں بیجاپور کے صوبے دار تھے۔ ایک رقعے میں بیدل حسین قلی خان کی دکن سے اکبر آباد واپسی پر خوشی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ممکن ہے حسین فتیح خان بہادر ہی حسین قلی خان ہوں۔

٣٨۔ نعمت خان عالی[2] :

عہد عالمگیری کے ایک مشہور شاعر ہیں۔ ان کا ایک دیوان بھی پایا جاتا ہے۔ اور بھی کئی کتب کے مصنف ہیں جن میں سے ایک وقائع نعمت خان عالی ہے۔ لیکن یہ بعض نوں کچھ بنا دیتے تھے۔ جب کبھی ان کا ذکر ہوتا، بیدل کہا کرتے تھے: "حاجی ہجوی۔" نعمت بیدل میں نعمت خان عالی کا ارادت خان واضح کے نام ایک خط ہے۔ علاوہ بریں بیدل نے ان کے

۱۔ رقعات بیدل، صفحہ ۹۳، ۱۰۳، ۱۱۱، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۲۰۔ مآثر الامراء: جلد سوم، صفحہ ۳۲۔

۲۔ عرشی کو در معارف: جولائی ۱۹۳۲ء۔ دیوان نعمت خان عالی: فہرست مخطوطات لنڈن میوزیم، صفحہ ۳۸۷۔ الف، ب۔

رسالہ حسن و عشق کے اصحابات بھی دیے ہیں ۔

۴۹- ولی دکنی[1] :

۱۱۱۲ھ میں دہلی آئے ۔ بیدل وہیں تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ ولی نے دہلی آ کر شیخ سعد اللہ گلشن کا بڑا اثر قبول کیا اور سعد اللہ گلشن بیدل کے گہرے دوست اور ہر وقت کے ملاقاتی تھے ۔ اگر ولی سے ملاقات ہوئی ہو تو کم از کم ان کی اردو میں غزل سرائی کا علم بیدل کو ضرور ہوگا ۔ تذکرۂ ہندی گویاں میں لکھا ہے کہ جب ۱۱۳۳ھ میں ولی کا دیوان دہلی پہنچا تو میر معز موسوی خاں فطرت ، میرزا عبدالقادر بیدل اور میرزا عبدالغنی بیگ قبول نے اس کی تقلید کی ۔ میرزا بیدل کی تاریخ وفات ۴ صفر ۱۱۳۳ھ ہے اور محرم کا بیشتر حصہ وہ بیمار رہے تھے ۔ بیماری سے چند روز پیشتر بیکھے ساندے اور مصحفی لاہور میں دو سو سادات بارہہ کے خوف سے گزارنے کے بعد وہ واپس آئے تھے ۔ اس لیے میرا یہ قطعی خیال ہے کہ بیدل کو ولی کے دیوان کی تقلید کے لیے وقت ہی نہیں ملا ۔ ممکن ہے ولی کی دہلی میں آمد کا اثر بیدل پر یہ ہوا ہو کہ انھوں نے اردو زبان میں دو ایک شعر کہہ دیے ہوں ، لیکن ذاتی طور پر میرا یہ خیال ہے کہ بیدل نے جو بھی اشعار اردو زبان میں کہے ہیں اور جو تذکروں میں موجود ہیں ، ان کی وجہ اردو کی طرف اہل زمانہ کا عام میلان تھا ۔ ابھی بیدل بچے ہی تھے کہ انھوں نے شاہ ملوک کی زبان سے ریختہ میں اشعار سنے تھے اور پھر بقول شاد عظیم آبادی جب وہ افلاس سے تنگ آ کر بنیے کو چھوڑنے لگے ہیں تو اپنی مہربان کبڑن کو الوداع کہتے ہوئے یہ شعر پڑھا :

مر مر جب کوئی نہیں تب دشمن آپ کس
پٹہ لکری جھاڑ کر اب بیدل چلے بدیس

اب جب وہ شاہجہاں آباد میں تھے جو اردو کا گہوارہ تھا ، ان کا وہاں مزید دو ایک شعر کہہ لینا اسی ماحول کی وجہ سے تھا ۔

۱- کلیات ولی : دیباچہ ، صفحہ ۱۲ - طور کلیم : صفحہ ۳ - مخزن نکات : صفحہ ۱۲ - تذکرۂ شعرائے اردو : صفحہ ۵۹ - نکات الشعراء : صفحہ ۲۲۲ ۔

د ۔ عہد شاہ عالم بہادر شاہ
(۱۱۱۹ھ سے ۱۱۲۳ھ تک)

اورنگ زیب عالمگیر ۱۱۱۸ھ میں دکن میں وفات پا گئے ۔ تخت نشینی کے لیے ایک خون خوار جنگ کے بعد محمد معظم تخت طاؤس کے مالک بنے ۔ اس عہد میں بھی بیدل کے مقدر کا ستارہ اپنے اوج پر رہا ۔ سر دارانِ سخن پروانوں کی طرح ان کے گرد جمع ہو رہے تھے ۔

۵۰۔ شاہ عالم بہادر شاہ[1] :

شہنشاہ معظم اپنے وزیر منعم خان خانخاناں کو اشارہ فرمایا کرتے کہ میرزا بیدل کو 'شاہ نامہ' لکھنے کے لیے کہا جائے ۔ خان خاناں بیدل کے دیرینہ آشنا تھے ۔ انھوں نے پانچ چھ بار لکھ کر درخواست کی لیکن میرزا بیدل آمادہ نہ ہوئے ۔ انجام کار درشت جواب دیا :

"اگر خواہ مخواہ مزاج پادشاہ بدین بند است ، من فقیرم ، جنگ نمی توانم کرد ۔ ترک ممالک محروسہ نمودہ بولایت می روم ۔"

۵۱۔ منعم خان خانخاناں[2] :

منعم تخلص تھا ۔ 'الہامات منعمی' اور 'مکاشفات منعمی' وغیرہ کے مصنف ہیں ۔ شاہ عالم کے وزیر کل تھے اور بیدل کے مربی اور دوست ۔ ۱۱۲۳ھ میں وفات ہوئی ۔ انھوں نے ایک بار یہ شعر کہے ، آخری یہ تھا :

مستم شعلہ ام سوز دل پروانہ مشقم
بدا پی [illegible] سوختن ها کرد تعلیم

معاصرین اعظم شاہ کو خوب غزل کہتے تھے ، وہ بھی اشعار کے جواب میں تھی ۔ اس کا مطلع اوپر درج ہے ۔ مطلع یہاں ملاحظہ فرمائیں :

جز ران آستان دیگر چہ گویم جستم بیدل
غمم درد دلم داغم سرسکم [illegible] ام ۔

۱۔ خوش گو در معارف : مئی ۱۹۳۲ء

۲۔ خوش گو در معارف : مئی و جولائی ۱۹۳۲ء ۔ کتاب صدری : قطعہ ، صفحہ ۵۳ ۔

۵۲- سید جعفر زٹلی[1] :

عہد عالمگیری کے ہزل گو اور فحش گو شاعر۔ شاہزادہ کام بخش کے نوکری میں ملازم تھے لیکن ان کی ہجو لکھنے کی وجہ سے ملازمت سے علیحدہ کر دیے گئے۔ اورنگ زیب اور بیدل کے معاصر تھے۔ ان کے عہد کا شاید ہی کوئی امیر ان کی دریدہ دہنی سے محفوظ رہا ہو۔ ایک رات زٹلی، بیدل کی مجلس میں ایک مثنوی ہاتھ میں لیے ان کے ہاں گئے اور معتقدین کے انبوہ میں پڑھنی شروع کی۔ پہلا مصرع تھا:

چہ عرفی چہ فیضی بہ پیش تو ہیچ

بیدل نے فوراً ٹوک دیا۔ دو اشرفیاں دے کر کہا "آپ۔ شکریہ، میں تو ایک معمولی سا درویش ہوں۔" مزید براں اساتذۂ قدیم کی شان میں ایسے الفاظ بھی نہیں سن سکتا۔ خوش گو اور دیگر حاضرین نے عرض کی آدھے مصرع میں بھنگ کا فدیہ تو مہربانی کر کے ہمیں دے جائے مگر بیدل نہ مانے۔

ایک اور موقع پر زٹلی بیدل کے پاس اس وقت گئے جب وہ فکرِ سخن میں محو تھے۔ پوچھا کون سا مصرع اٹکا ہوا ہے۔ بیدل نے فرمایا:

لالہ بر سینہ داغ خون دارد

زٹلی نے جھٹ کہا، یہ بھی کوئی بات ہے:

چوبکی سر زیر کون دارد

بیدل سخت برہم ہوئے۔ زٹلی کو شہنشاہ فرخ سیر نے ان کے متعلق ہجویہ سکہ کہنے پر قتل کرا دیا تھا۔

۵۳- میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی[2] :

صوفی مشرب شاعر تھے۔ اپنے سفینۂ بے خبر میں بیدل سے ایک ملاقات کا ذکر لکھا ہے جسے آزاد بلگرامی نے "سرو آزاد" میں درج کر دیا ہے۔ بے خبر

۱- کلیات زٹلی: صفحہ ۲۹، ۳۲، ۳۰، ۳۴ - نکات الشعرا: صفحہ ۳۴ - مخزن نکات: صفحہ ۱۳ - خوش گو در معارف: مئی ۱۹۳۲ء - تذکرہ شعرائے اردو: صفحہ ۲۷ - پنجاب میں اردو: صفحہ ۱۹۷، ۱۹۸، ۲۰۰ -

۲- سرو آزاد: صفحہ ۲۱۵ - سفینۂ بے خبر قلمی: صفحہ ۲۳ الف، ب -

کہتے ہیں کہ جتنی دیر بیدل سے ملاقات رہی اشعار ذوق کے بغیر اور کچھ درمیان میں نہ آیا ۔ بیخبر بیدل کے حسن اخلاق ، حسن مذاق اور ان کی صوفیانہ شاعری کی تعریف کرتے ہیں ۔

۵۴- میر عبدالجلیل واسطی بلگرامی[1] :

بڑے بلند پایہ صوفی مسلک شاعر تھے ۔ اپنے عہد میں ان کا بڑا احترام کیا جاتا تھا ۔ انھیں اور ان کے بیٹے سید محمد کو کئی بار بیدل سے ملاقات کا موقع ملا ۔ بیدل کے مصرع :

روز سوار سبب کشد اسپ چراغ پا

پر میر عبدالجلیل نے یہ پیش مصرع لگایا تھا :

غرہ مشو کہ ابلق ایام رام تست

ایک روز میر عبدالجلیل واسطی کی مجلس میں اس بات کا ذکر ہو رہا تھا کہ بیدل نے اسرار تصوف بیان کرنے میں کمال کر دکھایا ہے ۔ انھوں نے فی الفور سعدی کے مصرع پر یوں تضمین کی :

"دی کسی گفت میرزا بیدل
خوب گفت ست در تصوف راز
مصرعی در جواب خواند جلیل
بیدل از بی نشان چہ گوید باز"

۵۵- سید جعفر روحی[2] :

وفات ۱۱۵۲ھ ۔ شاہ عالم کے عہد میں شاہ جہاں آباد آئے اور بیدل سے ملاقات کی ۔

۵۶- رامی[3] :

بیدل کا ایک ہندو شاگرد تھا ۔ بیدل نے ایک مجلس میں اسے نصیحت کی تھی

۱- تذکرۂ جلوۂ خضر : صفحہ ۹۷ - درالمنثور قلمی : صفحہ ۳۵ - سرو آزاد : صفحہ ۲۵۳ -

۲- سرو آزاد : صفحہ ۲۰۷ - شمع انجمن : صفحہ ۱۳۵ -

۳- تذکرۂ جلوۂ خضر : صفحہ ۹۷ -

کہ اکابر کے سامنے بلند پایہ شعر پڑھنے چاہئیں ۔ اس مجلس میں دوسروں کے علاوہ بیدل ، سید محمد ولد میر عبدالجلیل بلگرامی اور رامی موجود تھے ۔

۵۷۔ عمدۃالملک نواب امیر خاں انجام[1] :

وفات ۱۱۵۹ھ ۔ بیدل کے شاگرد ہیں ۔

۵۸۔ حافظ محمد جمال تلاش[2] :

وفات ۱۱۲۷ھ ۔ بیدل کے شاگرد ہیں اور تخلص انہی کا عطا کردہ ہے ۔ شاہ عالم کے زمانے میں بیدل کی مجالس میں نظر آیا کرتے تھے ۔ بیدل کو تلاش کا یہ شعر بڑا پسند تھا :

"بروز عید ہر شاہ و گدا کہ می کند خود را
و رفتی بر سمند ناز و من از خویشتن رفتم"

۵۹۔ میرزا سہراب رونق[3] :

ان کے مراسم بیدل سے بڑے گہرے ہیں ۔ بیدل لکھتے ہیں کہ رونق کی نثر جمیل ہے اور نظم متین اور اس کے علاوہ شعور کے جوہر سے بھی آراستہ ہیں ۔ ان کی معروض شاہ عالم کے بخشی میرزا نعیم سے کی تھی ۔

۶۰۔ قیوم خاں فدائی[4] :

عاقل خاں رازی کے بیٹے تھے ۔ شعر کہتے تھے اور اپنا کلام اصلاح کے لیے بیدل کے پاس بھیجا کرتے تھے ۔

ز۔ عہد جہاندار شاہ (۱۱۲۴ھ)

شاہ عالم لاہور میں ۱۹ محرم‌الحرام ۱۱۲۴ھ کو فوت ہو گئے ۔ لاہور کے قریب

۱۔ بزم سخن : صفحہ ۹۸ ۔ عقد ثریا : صفحہ ۹ ۔ تذکرۂ ریختہ گویاں ، صفحہ ۲ ۔
۲۔ صبح گلشن : صفحہ ۹۰ ۔ خوش گو در معارف : جولائی ۱۹۳۲ء ۔
۳۔ رقعات بیدل : صفحہ ۹۶ ۔
۴۔ رقعات بیدل : صفحہ ۱۱۱ ، ۵ ۔

ان کے چار بیٹوں ، جہاندار شاہ ، عظیم‌الشان ، رفیع‌الشان اور جہاں شاہ کے درمیان کئی دنوں تک جنگ جاری رہی ۔ آخر جہاندار شاہ دو حریفوں نواب ذوالفقار خاں اور نواب عبدالصمد خاں کی مدد سے غالب آئے ۔ دوسرے شہزادے مارے گئے ۔ تخت نشینی کے بعد جہاندار شاہ نے عیش و طرب میں وقت گزارنا شروع کر دیا ۔ اس کی محبوبہ لعل کنور اور اس کے نارسیدہ رشتہ داروں کو دہلی میں اقتدار حاصل ہو گیا اور گرچہ جہاندار شاہ کی تخت نشینی پر اس قائم ہونے کے بعد بیدل نے خوش ہو کر یہ چار تاریخیں کہی تھیں :

"معز شرف شاہ زماں ختم الہدی دین ملک
کشور کشا سوسوا عصا گیتی ستاں و جم نگیں"

لیکن اس عہد میں بے حیائی ، بے غیرتی اور شراب و رباب کو رواج پذیر دیکھ کر وہ مایوس ہو گئے اور پیشین گوئی کی :

دور بی غیرت ندارد امتداد سال و ماہ[1]

اور اس کے علاوہ کہا :

"قلتبان تا کی بہادر زعیب تا چند ماہ"

اس عہد میں بیدل کے صرف ایک نئے عقیدت مند کا پتا چلتا ہے اور یہ بھی درحقیقت دیرینہ عقیدت مند تھا ۔

۶۱ ۔ نواب ذوالفقار خاں[2] :

اورنگ زیب کے مشہور و معروف جرنیل ۔ جہاندار شاہ کو فتح انھی کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی اور اس لیے ان کے وزیر الممالک تھے ۔ لاہور سے انھوں نے بیدل کو تحفے کے طور پر سیب اور انار بھیجے ۔ بیدل نے ایک قطعے میں شکریہ ادا کیا ۔ ایک موقع پر انھوں نے بیدل کو دو صد اشرفیاں نذر میں جو بیدل نے میر کرم اللہ کو عنایت کر دیں ۔

۱۔ اس تمام تذکرے کے لیے مندرجہ ذیل حوالہ جات دیکھیں : منتخب اللباب ۔ جلد دوم صفحہ ۶۸۵—۷۱۵ تا ۸۲۵ ۔ سیرالمتاخرین ، صفحہ ۱۵ تا ۱۸ ۔ کلیات بیدل قلمی مقبوضہ کتبخانہ معارف کابل ، صفحہ ۱۰۳۱ تا ۱۰۳۲ ۔

۲۔ کلیات مصوری : قطعات ، صفحہ ۴۴ ۔ خوشگو : معارف جولائی ۱۹۳۲ء ۔

س ۔ عہد فرخ سیر

(۱۱۲۴ھ سے ۱۱۳۱ھ تک)

فرخ سیر نے عظیم آباد پٹنہ میں رہتے ہوئے جہاندار شاہ کے خلاف فوج کشی کی ۔ فرخ سیر جہاندار شاہ کے بھائی عظیم الشان کے بیٹے تھے ۔ حسن علی خاں اور حسین علی خاں سادات بارہہ نے فرخ سیر کی مدد کی ۔ اکبر آباد کے قریب جنگ ہوئی ۔ جہاندار شاہ شکست کھا کر اپنی محبوبہ لال کنور سمیت دہلی بھاگ گیا ۔ لیکن بعد میں قتل کر دیا گیا[1] ۔ عہد فرخ سیر میں تو بیدل کے ستارۂ قسمت میں اور بھی آب و تاب پیدا ہو گئی ۔ نئے نئے شاگرد اور نئے نئے قدردان آنے لگ گئے ۔

۶۲۔ بیدل و فرخ سیر[2] :

شہنشاہ نے پہلے بیدل کی مزاج پرسی کی ۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بیدل ملاقات کے لیے آئیں ۔ لیکن جب پتا چلا کہ وہ نہ آئیں گے تو دو ہزار روپیہ اور ایک زنجیر فیل مرحمت کیے ۔ روپے تو پہنچ گئے لیکن چوں کہ ہاتھی لینے کے لیے میرزا کا کوئی وکیل نہ گیا اس لیے متعلقانِ شکم بندہ خود ہضم کر گئے ۔

شاد عظیم آبادی 'نوائے وطن' میں لکھتے ہیں کہ شہنشاہ فرخ سیر نے بیدل کے منتخب اشعار اپنے قلم سے اپنی بیاض میں درج کیے اور بارہا رقعات اور احکامات میں بیدل کے برمحل اشعار لکھے ۔

۶۳۔ حسن علی عبداللہ خاں[3] :

قطب الملک ۔ مشہور و معروف بادشاہ گر سید ہیں اور سادات بارہہ میں سے تھے ۔ فرخ سیر کے وزیراعظم تھے اور ہفت ہزاری ہفت ہزار منصب تھا ۔ بیدل دو تین بار

۱۔ منتخب اللباب : جلد دوم ، صفحہ ۶۸۵ ، ۷۱۵ تا ۷۲۸ ۔ سیرالمتاخرین : صفحہ ۱۵ تا ۱۸ ۔ کلیات بیدل قلمی ، مقبوضہ کتبخانۂ معارف کابل : صفحہ ۱۰۳۱ ، ۱۰۳۲ ۔

۲۔ خوشگو در معارف : مئی ۱۹۴۲ع ۔ شاد عظیم آبادی : نوائے وطن ، صفحہ ۴۲ ۔

۳۔ منتخب اللباب : جلد دوم ، صفحہ ۷۲۸ ۔ خوشگو در معارف : مئی ۱۹۴۲ع ۔

اُن کے طلب کرنے پر اُن کے ہاں گئے ۔ جوں ہی کہ بیدل پر اُن کی نظر پڑتی تھی ، کرسی سے اُٹھ پڑتے تھے ۔ آگے بڑھ کر معانقہ کرتے اور تکیہ اور مسند اُن کے لیے چھوڑ دیتے تھے ۔

۴۹۔ امیرالامرا سید حسین علی خاں :

حسن علی کے چھوٹے بھائی تھے ۔ بڑے والا مرتبت ، بلند ہمت اور سخن دوست اور سخن سنج امیر تھے ۔ بیدل سے قدیمی تعارف تھا ۔ ان کے پاس اپنے اشعار اصلاح[1] کے لیے بھیجا کرتے تھے ۔ جن دنوں امیرالامرا ممالکِ دکن کے انتظام و انصرام میں مصروف تھے ، تو بیدل نے شاہ جہان آباد سے انھیں یہ دو شعر[2] لکھے :

"ای نشۂ پیالۂ قدرت بہ کاری
مست اثری بیا پئ تاراج خماری
می در قدحی گل بسری جام بدستی
رنگ چمنی موج گلی جوش بہاری"

'سروِ آزاد' میں صرف یہی دو شعر درج ہیں لیکن 'کلیاتِ صفدری' میں دس شعر موجود ہیں ۔

امیرالامرا[3] ایک دفعہ جاہ و حشم کے ساتھ سوار ہو کر دہلی کے بازار میں جا رہے تھے ۔ بیدل بھی اُدھر سے گزرے ۔ بیدل نے سر پر سوسنی کپڑا باندھا ہوا اور ریش و بروت حسبِ معمول صاف تھی ۔ امیرالامرا نہ پہچان سکے ۔ بیدل نے بھی عادتاً وارستگی میں توجہ نہ کی ۔ جب امیرالامرا کو پتا چلا تو ان کے مکان پر گئے اور پالکی پر بٹھا کر اپنے دولت سرا میں لے گئے اور دو تین روز اُن کی صحبت سے مستفید ہوتے رہے ۔ رخصت کے وقت بیدل کو تین لاکھ روپے نقدی اور جنس کی صورت میں پیش کیے ۔ اخلاقِ کریمانہ کی ظاہر ہونے کے حیلے

۱۔ رقعات بیدل : صفحہ ۷۸ ۔
۲۔ سرو آزاد : صفحہ ۱۰۹ ۔ کتاب : صفدری مطبعات ، صفحہ ۵۴ ۔
۳۔ مجموعۂ نغز : صفحہ ۱۱۷ ۔

ہو قبول کر لیے لیکن ناموس فقر قائم رکھنے کے لیے بعد میں بڑی دانش مندی سے کہا کہ فقیر کی جھونپڑی میں ان نعمتوں کے لیے جگہ کہاں ؟ آپ سے زیادہ امانت دار کون ہے ۔ آپ کے پاس امانت رہیں ، جب ضرورت پڑے گی لے لوں گا۔

ان گہرے اور مخلصانہ روابط کے باوجود جب ان دونوں بھائیوں نے شریف و کریم الطبع شہنشاہ فرخ سیر کو تخت سے اُتارنے کے بعد پہلے اندھا کرکے پھر قتل کر دیا تو بیدل نے تاریخ[1] کہی :

دیدی کہ چہ با شاہ گرامی کردند
صد جور و جفا ز راہ خامی کردند
تاریخ چو از خرد جستم فرمود
سادات بوی نمک حرامی کردند

۱۱۳۱ھ

بیدل کی زبان سے نکلی ہوئی تاریخ تھی اور پھر اس قدر موزوں ، جلد مشہور ہو گئی ۔ سادات نے انتقام لینا چاہا ۔ اس لیے میرزا متوحش ہو کر لاہور نواب عبدالصمد خاں کے پاس چلے گئے ۔ اور ۶ ذی الحجہ ۱۱۳۲ھ کو امیرالامرا دکن جاتے ہوئے رستے میں تورہ کے مقام پر مارے گئے[2] اور سادات بارہہ کا اقتدار ختم ہوا تو ۱۱۳۳ھ کے ابتدائی[3] ایام میں میرزا واپس شاہجہان آباد پہنچے ۔

۶۵- میر جملہ قاضی عبداللہ تورانی[4] :

فرخ سیر سے انہیں ہفت ہزاری ہفت ہزار منصب دیا گیا ۔ بظاہر تو دیوان خاص اور ڈاک کے داروغہ تھے لیکن درحقیقت فرخ سیر کے ہمدم اور ہمراز تھے اور دستخط خاص کے اختیارات انہیں سونپ دیے گئے تھے ۔ فرخ سیر اور سادات بارہہ کے درمیان نزاع کی اصل بنیاد یہی تھی ۔ میر جملہ اور بیدل کے سلسلے میں بھی

۱- سرو آزاد : صفحہ ۱۴۹ ۔
۲- سیر المتاخرین : صفحہ ۶۱ ، ۷۱ ۔ منتخب اللباب : صفحہ ۸۱۶ تا ۹۳۳ ۔
۳- خوش گو در معارف : مئی ۱۹۴۲ع ۔ میرزا کے مرض الموت کے بیان سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے ۔
۴- خوش گو در معارف : مئی ۱۹۴۲ع ۔ منتخب اللباب : جلد دوم ، صفحہ ۷۲۸-۹ ۔

ایک حکایت ملتی ہے۔ ایک روز بیدل کا ایک منشی میر حملہ کے پاس سے اٹھ کر آیا اور کہنے لگا کہ ابھی ابھی میر حملہ کہہ رہے تھے میں نے آج میرزا بیدل کو دیکھا جنہیں قطب الملک سید عبداللہ خاں نے کئی بار دعوت پر طلب کیا ہے، انسان کامل نظر آتے ہیں لیکن ایک عیب نظر آیا؛ اور پھر ریش کی طرف اشارہ کیا کہ سرا ہے۔ یہ سن کر بیدل نے جواب دیا: "آرے درمیان ما و ایشان تفاوت مقدار یشمے است، ایشان دارند و ما نداریم۔"

۹۶۔ آنند رام مخلص[1] (۱۱۱۱ھ تا ۱۱۶۴ھ):

بڑے خاص ہندو تھے اور مختلف امرا کے وکیل رہے تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ابتدا میں میرزا بیدل کے شاگرد تھے اور کافی عرصے تک ان سے اصلاح لیتے رہے۔ ان کے پاس میرزا کا ایک دستخطی دیوان تھا اور دیوان میں میرزا کی شبیہ بھی موجود تھی۔ آنند رام، میرزا کو عرف عام لکھتے ہیں، اور کہتے ہیں میرزا عرف کو تمام علوم سے بہتر سمجھتے تھے۔

۹۷۔ محمد احسن سامع دہلوی[2]:

بیدل کے شاگرد تھے لیکن ان کی وفات کے بعد حکیم حسن شہرت کے شاگرد بنے اور بیدل کے جملہ حقوق کو فراموش کر دیا۔

۹۸۔ گل محمد معنی یاب خان شاعر[3]:

وفات ۱۱۵۰ھ۔ بیدل کے شاگردوں میں امتیاز حاصل کیا۔ بیدل کو ان سے

۱۔ خزانۂ عامرہ: صفحہ ۴۳۵۔ مخلص کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ورق مقبوضہ مولوی محمد شفیع صاحب۔ چمنستان مخلص: صفحہ ۹۸۔ نکات الشعراء: صفحہ ۸۔ سفینۂ ثریا: صفحہ ۵۳۔ بزم تیموریہ: صفحہ ۳۱۰ تا ۳۱۳۔

۲۔ روز روشن: صفحہ ۲۸۴۔ اسپرنگر بحوالہ "مقالات الشعراء: صفحہ ۱۵۶۔ خوش گو در معارف: جولائی ۱۹۳۲ء۔

۳۔ شمع انجمن: صفحہ ۲۲۳۔ سرو آزاد: صفحہ ۲۳۵۔ خوش گو در معارف: جولائی ۱۹۳۲ء۔

بڑی عجیب تھی اور بھیں ایک عصا اور ایک شمشیر عنایت کی جو دیر تک ان کے پاس رہی ۔ ہمیشہ بیدل کے متعلقین کی خدمت کیا کرتے تھے اور جب تک زندہ رہے ان کی وجہ سے میرزا کے عرس کا ہنگامہ گرم رہا ۔

۶۹۔ شاہ فصیح الفصح[1] :

اُردو اور فارسی دونوں کے شاعر تھے ۔ بیدل کی شاگردی کا شرف حاصل تھا ۔ ان کا فارسی کا دیوان ان کے اُستاد کی طرح تصوف کا مذاق رکھتا ہے ۔ وفات ۱۱۹۲ھ ۔

۷۰۔ میرزا محسن ذوالقدر[2] :

فرخ سیر کے عہد میں وفات ہوئی ۔ عیسے سے ان کا اور بیدل کا شعر و سخن میں مقابلہ رہتا تھا ۔ ابتدا میں شاہزادہ شجاع کی ملازمت میں تھے ۔ خوشگو نے بیدل کے پاس انہیں کمال پیری میں ، جب کہ ان کی عمر سو سے سال سے متجاوز تھی ، دیکھا ۔

۷۱۔ میرزا مبارک اللہ ارادت خاں واضح[3] :

رائے انند رام مخلص نے انہیں عہد فرخ سیر میں عرف کمل میرزا عبدالقادر بیدل کے پاس دیکھا تھا ۔ ان کا کلیات بیس ہزار اشعار پر مشتمل تھا ۔ چار سربس میں انہیں میرزا بیدل کا شاگرد درج کیا گیا ہے ۔ وفات ۱۱۲۸ھ ۔

۷۲۔ سراج‌الدین علی خاں آرزو[4] :

خود اپنے تذکرہ مجمع‌النفائس میں لکھتے ہیں کہ انہیں دو بار عہد فرخ سیر

۱۔ گلشن ہند : صفحہ ۳۰ ۔ اسپرنگر ، صفحہ ۱۹۷ ۔ تذکرۂ شعرائے اُردو : صفحہ ۱۵۳ ۔

۲۔ مرأۃ الخیال : صفحہ ۲۱۷ ۔ خوشگو در معارف : جولائی ۱۹۳۲ع ۔

۳۔ مرأۃ الاصلاح : مخطوطہ ، صفحہ ۱۲۲ الف ۔ چار شربت قتیل : صفحہ ۹۷ ۔ سرو آزاد : صفحہ ۱۲۶ ۔

۴۔ مجمع‌النفائس : مخطوطہ ، صفحہ ۵۶ الف ۔ مرقع دہلی : صفحہ ۴۴ ، ۳۵ ۔

میں بیدل کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مستفید ہونے کا موقع ملا ۔ درگاہ قلی خان
اپنی تصنیف مرقع دہلی میں لکھتے ہیں کہ شاگرد ہونے کی بنا پر سراج الدین
علی خان آرزو عرس بیدل کے روز لوگوں کو خاص طور پر ملاقات کا موقع دیا کرتے
ہیں ۔ خان آرزو نے بیدل کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا جو ذیل میں پایا جاتا ہے
اور جس کا ایک مصرع مندرجہ ذیل ہے :

"ابن العربی بود بہ فرس"

۷۳۔ میر ابوالفیض مست[1] :

بیدل سے اشعار کی اصلاح کرایا کرتے ہیں اور ان کی وفات کے بعد شیخ
حسین شہرت کی شاگردی اختیار کی ۔

۷۴۔ میر محمد ہاشم جرأت[2] :

موسوی خان خطاب تھا ۔ امیرالامراء حسین علی خان کی ملازمت میں تھے
اُن کے ساتھ دکن سے ۱۱۳۱ھ میں دہلی آئے اور میرزا بیدل اور میر عبدالجلیل
بلگرامی کی صحبت کا فخر حاصل کیا ۔ وفات ۱۱۷۵ھ ۔

۷۵۔ ناظم خان[3] :

تاریخ فرخ شاہی کے مصنف ہیں ۔ ایک روز انہوں نے بیدل کو دعوت
طلب کیا ۔ طعام سے فارغ ہونے کے بعد ناظم خان کہنے لگے : "میرزا صاحب !
آپ کے اس شعر میں روزمرہ بڑا تازہ ہے :

تو نگری کہ دم از لاغری زند غلط است
بہ موی کاسۂ چینی گمد نمی ماند

میرزا صاحب نے جواب میں فرمایا "میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ آپ کے

۱۔ صبح گلشن : صفحہ ۳۰۲ ۔
۲۔ سرو آزاد : صفحہ ۲۳۷ ۔ شمع انجمن : صفحہ ۱۰۷ ۔ نشتر عشق : قلمی ؛
صفحہ ۲۶۱ الف ؛ ب ۔
۳۔ خوشگو در معارف : مئی ۱۹۳۲ء ۔

طعنے کو نہ سمجھ سکوں۔" خان صاحب نے مقرر کہا "باللہ یہ روزمرہ آپ کی اختراع ہے۔" حضرت بیدل نے فرمایا "آپ شعرائے قدیم میں سے کون سے شاعر کو عسجدی، فرخی، معزی، مسعود سعد سلمان، خواجہ سلمان اور دیگر اساتذہ سے ہمدانی کے روزمرہ کی صحت کے بارے میں زیادہ مسلم اور معتبر سمجھیں گے۔"

ناظم خان حیران رہ گئے اور بیانگ بلند کہا کہ واللہ! جو شخص اس عزیز کی استادی کے متعلق شک رکھتا ہے، بے شک کافر ہے۔ بعدہٗ تازیست ان کے معتقد رہے۔

معلوم ہوتا ہے بیدل کے اعزاز میں اکثر دعوتیں ہوا کرتی تھیں۔ قطب الملک سید عبداللہ خان کی دعوتوں کا ذکر پیشتر ازیں کیا جا چکا ہے۔ بیدل خود اپنے ایک مقطع میں اس قسم کی دعوتوں کا ذکر کرتے ہوئے اظہار مسرت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ان کی وجہ سے باردیگر احباب کے مواقع میسر آ جاتے ہیں:

مفت این عصر است بیدل گریبان دوستان
گاہی گاہی دید و وادیدی بدعوت می شود

ص - متفرق شعرا

جن کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ کون سے عہد میں میرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

۵۷- میر محمد علی رائج[1] :

وطن سیالکوٹ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ میرزا بیدل کے غائبانہ شاگرد تھے۔ اپنے وطن میں عزلت اور قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ میرزا صاحب کے ہم طرح بھی تھے۔

۱- شمع انجمن: صفحہ ۱۷۰ - اسپرنگر: صفحہ ۱۲۲ - خوش گو در معارف: جولائی ۱۹۳۲ء -

۷۷۔ حکیم چند للوت[1] :

بارہا میرزا صاحب کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔

۷۸۔ نصرت[2] :

کشمیری الاصل ، لاہور سکونت تھی ۔ خوش‌گو لکھتے ہیں کہ بیدل کی یہ بیت لاہور میں نصرت کے نام سے مشہور ہے اور خود دیوان میں موجود ہے :

جسم پوشیدہ بود گرد سفر
چہ قدر راہ فنا ہموار است

قاضی عبدالودود معارف جولائی ۱۹۴۲ء میں خوش‌گو کے مندرجہ بالا بیان کے بعد ذیلی حاشیے میں لکھتے ہیں کہ بانکی‌پور لائبریری میں سفینۂ خوش‌گو کا جو نسخہ موجود ہے وہ عزلت کے قبضے میں رہ چکا ہے ۔ اس کے حاشیے میں عزلت نے لکھا ہے کہ انہوں نے یہ شعر مقرر نصرت کی زبان سے سنا اور وہ اپنے آپ کو بیدل کا شاگرد کہتے تھے ۔

بیدل کے دیوان مطبوعہ میں ایک غزل اس زمین میں ہے لیکن یہ شعر نہیں ۔ دیوان غزلیات مطبوعہ کابل میں بھی یہ شعر نہیں پایا جاتا ۔ ادھر سرو آزاد میں بھی یہ شعر نصرت کے نام مندرج ہے ۔

۷۹۔ امانت وام امانت[3] :

پرگو شاعر تھے اور بیدل کے شاگرد ۔

۸۰۔ میر محمد اشرف حسرت[4]

تلامذۂ میرزا عبد القادر بیدل میں صاحب ذہن سلیم و فکر نکو تھے ۔

۱۔ خوش‌گو در معارف : جولائی ۱۹۴۲ء ۔ صبح گلشن : صفحہ ۵۱۲ ۔
۲۔ خوش‌گو در معارف : جولائی ۱۹۴۲ء ۔
۳۔ صبح گلشن : صفحہ ۳۷ ۔ تذکرۂ حسینی : صفحہ ۴۸ ۔
۴۔ خوش‌گو در معارف : جولائی ۱۹۴۲ء ۔ صبح گلشن : صفحہ ۱۰۰ ۔ نشتر عشق قلمی : صفحہ ۳۶۱ ۔

۸۱- سید ابوالفیض معنی[1] :

گلاب باڑی ، شاہ جہاں آباد میں مسکن تھا - میرزا عبدالقادر بیدل کے شاگردوں میں سے تھے اور جادۂ تجرید پر گامزن تھے -

۸۲- سری گوپال تمیز[2] :

میرزا بیدل کے تلامذہ میں سے تھے - وفات ۱۱۴۷ھ -

۸۳- سید مرتضیٰ قانع[3] :

کہا جاتا ہے کہ بیدل کے شاگرد تھے -

۸۴- میر محمد معصوم وحدان[4] :

کچھ عرصہ بیدل کے شاگرد رہے -

۸۵- محمد پناہ کامل[5]:

مسید بیدل - تذکرۂ بے نظیر میں تخلص 'قابل' درج ہے -

۸۶ غلام نبی وحشت[6]:

مرزا عبدالقادر بیدل کے معاصر تھے اور نظم و نثر میں ان کے کلام کا تتبع کیا کرتے تھے -

۸۷- عبدالعزیز ایجاد[7]:

شاید ۱۱۳۶ھ میں زندہ تھے - بیدل کے شاگرد تھے -

۱- صبح گلشن : صفحہ ۴۳۱ - روز روشن : صفحہ ۶۳۷ -
۲- روز روشن : صفحہ ۱۳۵ - خوش گو در معارف : جولائی ۱۹۳۲ع -
۳- کلمات‌الشعرا : صفحہ ۹۴ - خوش گو در معارف : جولائی ۱۹۳۲ع -
۴- خوش گو در معارف : جولائی ۱۹۳۲ع -
۵- تذکرۂ بے نظیر : صفحہ ۴۰۱ - خوشگو در معارف ، جولائی ۱۹۳۲ع -
۶- روز روشن : صفحہ ۷۵۳ -
۷- اسپرنگر : بحوالہ ہمیشہ بہار ، صفحہ ۱۱۸ -

۸۸۔ میرزا نادرالزماں فصیح[1]:

شاگرد بیدل۔

۸۹۔ عصمت اللہ قابل[2]:

شاگرد بیدل۔

۹۰۔ میر رضی وحدت[3]:

بیدل کے معتقد تھے۔ رقعات بیدل سے پتہ چلتا ہے کہ ایک بار میرزا کو حقہ بھیجا۔

۹۱۔ شاہ فقیر اللہ آفرین[4]:

۱۱۴۳ھ (۱۷۳۱ء) تاریخ وفات ہے۔ یہ زمانے کے لاہور کے اہم شعراء میں سے ہیں۔ میاں ناصر علی سرہندی (وفات ۱۱۰۸ھ ۱۶۹۶ء) نے شاہ آفرین کو بھی (یوسف[5] زلیخا کی زمین والی) مثنوی تعزیہ[6] بھیجی جس کا مطلع ہے:

اسپی دردی دردی بحالہ زیر سرز در بیہ وار استخوان زیر

میرزا بیدل نے شاہ آفرین کو دیکھا ہوا نہیں تھا مگر غائبانہ ان کی تعریف و توصیف کیا کرتے تھے اور ان کا یہ شعر انہیں بڑا پسند تھا:

حجاب عشقہ نہ داد رخصت سوال بوس از دہان تنگش
از و نمی آید این مروت وس نمی آید این تماشا

۱۔ اسپرنگر: بحوالہ مقالات الشعراء، صفحہ ۱۵۸۔
۲۔ اسپرنگر: بحوالہ مقالات الشعراء، صفحہ ۱۵۸۔
۳۔ رقعات بیدل: صفحہ ۳۲۔
۴۔ تذکرۂ مردم دیدہ: از عبدالحکیم حاکم، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۱ء باہتمام ڈاکٹر سید عبداللہ، صفحہ ۱۷ - ۱۹۔
۵۔ کلمات الشعراء: محمد افضل سرخوش، صفحہ ۷۷۔

۹۲- عارف الدین خان اورنگ آبادی[1] :

تذکرۂ مردم دیدہ کے مصنف عبدالحکیم حاکم ۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء میں خود اورنگ آباد[2] میں یہ تذکرہ لکھ رہے تھے ۔ عارف الدین خان اورنگ آبادی کے متعلق لکھتے ہیں کہ شعراء میں سے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے اور صرف میرزا بیدل کے معتقد ہیں ۔

۹۳- پنر ور خان عاقل[3] :

مدتہائے مدید تک آصف جاہ نظام الملک کے ساتھ رہے ۔ آخر دکن سے شاہ جہاں آباد دہلی میں آئے اور وہیں جوار رحمت ایزدی میں پیوست ہوئے ۔ سراج الدین علی خان آرزو کو گمان ہے کہ عاقل میرزا عبد القادر بیدل کے شاگرد تھے کیوں کہ شعر طرز بیدل میں لکھا کرتے تھے ۔ میرزا بیدل کی تاریخ وفات بھی یوں کہی تھی :

سال تاریخ وفات بیدل رضوان مقام
از سر بی تابی دل گفته ام ختم کلام[4]

شعر و شاعری کے سلسلے میں بیدل سے تعلق رکھنے والوں کی یہ مکمل فہرست نہیں ۔ اگر ہم رقعات بیدل کا مطالعہ کریں[5] تو میرزا محمد ابراہیم ، میرزا معین سمیع محمد ماہ ، میرزا دوارہار ، میرزا فضائل ، میرزا نعیم ، میاں شمس محمد ، میرزا سلیمان ،

۱- تذکرۂ مردم دیدہ : صفحہ ۱۷۵ -

۲- تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان : دکتر سید علی رضا نقوی ، طبع تہران ۱۹۶۴ء ، صفحہ ۳۱۹ -

۳- مجمع النفائس : مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی ، صفحہ ۶۳۹ -

۴- میرزا بیدل کی تاریخ وفات ۱۱۳۳ھ ہے - 'ختم کلام' کے اعداد '۱۱۳۱' بنتے ہیں -

۵- رقعات بیدل : صفحہ ۱۷ ، ۲۲ ، ۲۳ ، ۳۱ ، ۱۵ ، ۵۶ ، ۵۸ ، ۶۳ ، ۶۷ ، ۶۷ ، ۶۸ ، ۷۶ ، ۸۰ ، ۸۸ ، ۹۱ ، ۹۵ ، ۱۰۵ ، ۱۳۵ -

میرزا زین العابدین ، خو جان ، میرزا عطاءاللہ ، شکراللہ خان ثانی[1] پسر شکر اللہ خان اول ، ملا باقر گیلانی ، میرزا ابوالخیر ، میرزا محسن ، منشی قابل خان ، میرزا خسرو بیگ اور میرزا ابوالوقار کے نام بھی ملتے ہیں ۔ ان کے ساتھ بھی راہ و رسم یقیناً اسی سلسلے میں پیدا ہوئی ہو گی ۔ اس طرح یہ تعداد ۱۱۱ تک پہنچ جاتی ہے ۔

۱- شکر اللہ خان اول کی وفات کے بعد اورنگ زیب عالمگیر نے ان کے فرزند اکبر لطف اللہ خان کو شکراللہ خان ثانی کا خطاب دیا ۔ بیدل نے مبارک باد کے طور پر جو قطعہ لکھا ، اس کے مندرجہ ذیل تین شعر پڑھیں :

میر لطف اللہ نور چشم شکر اللہ خان
آن بہار معرفت آن شمع آگاہی نظر
بی نیازی را بہ دانش نسبت موج و محیط
شرم را با طینت او الفت آب و گہر
شاہ عالمگیر شکراللہ خان کردش خطاب
نور چون بالد جہان خورشید می گردد قمر

رقعات بیدل میں بہت سے رقعات اس شکراللہ خان کے نام بھی ہیں ۔ یہ التباس بادی النظر میں مغالطہ آمیز ہے لیکن انداز تحریر اور تاریخی واقعات کی طرف اشاروں سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ کون سے شکر اللہ خان مراد ہیں ۔ محمد حسین آزاد نے حسب معمول حوالہ دیے بغیر نگارستان فارس میں نواب لطف اللہ خان شکر اللہ خان کا ایک واقعہ درج کیا ہے ۔ لکھتے ہیں کہ ایک کابلی سوداگر انار ہندوستان میں بیچنے کے لیے لایا ، اتفاقاً سب انار اس کے گل گئے ۔ حیران ہو کر چند انار جو باقی تھے ، بطریق نذر میرزا کے پاس لایا اور عرض حال کیا ۔ میرزا نے ایک شعر اسے لکھ دیا اور نواب لطف اللہ خان کے پاس بھیج دیا ۔ وہ شعر یہ ہے :

غنچہ گشتم اگر دنداں نما شد عیب نیست
خندہ دارد چرخ ہم بر غنچہ گردیدہای من

نواب اسے حسن طلب سمجھے کہ شاید میرزا کی جوتی ٹوٹ گئی ہے ۔ موقع کو غنیمت سمجھا ، اسی وقت ایک لاکھ روپیہ بھیج دیا ۔ میرزا نے کل روپیہ اسی کابلی کو دے دیا ۔

مطلعات بیدل میں بھی بہت سے اور نام درج ہیں لیکن حالات نہ ملنے کی بنا پر انہیں اس تذکرے میں نظر انداز کیا گیا ہے ۔ علاوہ بریں بہت سے لوگوں کے نام ایسی کتب اور ایسے مخطوطات میں موجود ہوں گے جو ہماری نظر سے نہیں گزرے ۔ ساتھ ہی بے شمار ایسے لوگ ہوں گے جن کا نام کسی قلمی یا مطبوعہ کتاب میں درج نہیں ہو سکا ۔

جیسا کہ اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے ، میرزا بیدل ۳ صفر[1] ۱۱۳۳ھ کو رہ گرائے عالم جاودانی ہو گئے ۔ انہیں اپنے گھر کے صحن میں دفن کیا گیا ۔ خوش گو نے میرزا صاحب مرحوم کی مندرجہ ذیل تاریخ وفات[2] کہی :

افسوس کہ بیدل از جہان روی نہفت
وان جوہر پاک در تہ خاک بخفت
خوشگو چو ز عقل کرد تاریخ سوال
"از عالم رفت میرزا بیدل" گفت
۱۱۳۳

میرزا صاحب کی وفات کے وقت خوش گو دہلی میں تھا اور سوم میں شامل ہوا ۔

بارھویں صدی ہجری کے اختتام تک ہر سال اُن کی قبر پر عرس منایا جاتا تھا ، جس میں شاہ جہان آباد کے اُردو کے شعراء بھی شامل ہوتے تھے اور دامن اُردو کو بیدل کی حسین تراکیب اور اُن کے رنگین افکار سے مزین کرتے تھے ۔ پھر بڑے عرصے تک مزار بیدل کس مپرسی کی حالت میں رہا اور لوگوں کو یہ بھی علم نہ تھا کہ کہاں واقع ہے ، لیکن چند سال گزرے مولانا حسن نظامی نے مولانا شاہ سلیمان پھلواری کے بتانے پر قبر کا ایک مقام متعین کیا اور پھر حضور نظام آصف جاہ ہفتم والیء دکن کو لکھا ۔ انہوں نے دو ہزار روپے بھیجے اور اس طرح ۱۹۴۰ع میں سنگ مرمر سے مزار بیدل از سر نو بنایا گیا ، جسے اب قلعہ کہنہ کے قریب حضرت یار پران[3] کے مزار کے بالمقابل دیکھا جا سکتا ہے ۔ افسوس ہے مزار کے کتبے پر غلطی سے تاریخ وفات ۳ صفر ۱۱۳۳ھ لکھی گئی

۱- خوش گو در معارف ; مئی ۱۹۳۲ع ۔
۲- خوش گو در معارف ; جولائی ۱۹۳۲ع ۔

ہے اور اس طرح ایک دن کا فرق پڑ گیا ہے ۔ نیز مزار بھی صحیح مقام پر نہیں بنا ۔

دہلی میں بیدل کے عرس کی تقریب ایک عرصے سے ختم ہو چکی ہے لیکن کابل میں اب بھی ہر سال منائی جاتی ہے اور اس میں کابل کے عہد حاضرہ کے شعراء ، ادباء اور فضلاء مثلاً آقای سردار فیض محمد خان ذکریا ، خلیلی[1] اللہ خان خلیلی ، سرور خان[2] گویا اعتمادی ، ہاشم شائق آفندی ، جناب صوفی بیتاب اور ڈاکٹر الٰہی شامل ہوا کرتے ہیں ۔ فاتحہ خوانی کے علاوہ بیدل خوانی ہوتی ہے ۔ اپنا اپنا کلام سنایا جاتا ہے اور ضیافت کا انتظام بھی ہوتا ہے ۔

(اورینٹل کالج میگزین ، جون ۱۹۵۴ء)

۱۔ انہوں نے حال ہی میں بیدل کے حالات پر مشتمل زبان فارسی میں ایک کتابچہ لکھی ہے جو کابل میں طبع ہوئی ہے ۔ اس کا ذکر حرف اول میں موجود ہے ۔

۲۔ سرور خان گویا دسمبر ۱۹۶۷ء میں رہگرائے عالم بقا ہو گئے ۔ راقم کے مخلص دوست تھے ۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت فرمائیں ۔ آمین ۔ ہاشم شائق آفندی چند سال پہلے فوت ہو گئے تھے ۔ وضعدار بزرگ تھے ۔

۲۔ لعل کنور[۱]

قوموں اور تہذیبوں کے ادبار اور زوال کی تاریخ ایک دنیائے معانی اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے اور میرا خیال ہے عروج یافتہ اقوام کی تاریخ کا مطالعہ جس قدر اہم ہے ، زوال پذیر اقوام کی داستان کا مطالعہ بھی اس سے کچھ کم دلچسپ اور معنی خیز نہیں ۔ واقعی ہمت اور جوانمردی کے کارہائے نمایاں جب نگاہوں کے سامنے سے گزرتے ہیں تو تخیل کی پرواز فلک الافلاک سے بھی پرے پہنچ جاتی ہے اور حوصلوں میں بےحد رفعت پیدا ہوتی ہے ، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سیرت میں ہمواری ، کردار میں حزم و احتیاط ، اعمال کے نتائج و عواقب کی طرف مسلسل توجہ صرف زوال یافتہ اقوام کی تاریخ پر گہری نظر ڈالنے سے ممکن ہے ۔ ہماری زندگی ، ہمارے اپنے اعمال کے سانچے میں ڈھلتی ہے اور اس حقیقت کی تائید جس طرح عروج و ارتقا کی نظر فریب منازل کرتی ہیں اسی طرح ادبار و نحوست کی پستیاں بھی ایک نہایت ہی درد انگیز لہجے میں اس کا اعلان کر رہی ہوتی ہیں ۔

روما کی تقدیر کے یہ دونوں پہلو ہمارے سامنے موجود ہیں اور مورخین نے فلسفۂ تمدن کے عجیب عجیب نکات پیدا کرکے ہمیں سرمایۂ بصیرت عطا کیا ہے ۔ لیکن مسلمانوں کی تاریخ کی یہ صورت نہیں ۔ ان کے درخشاں ماضی اور ان کے محیرالعقول کارناموں کی توجیہ بڑے اہتمام سے کی جاتی ہے ۔ ایک مختصر سے عرصے میں جس حیرت انگیز تیزی کے ساتھ مسلمان اکناف عالم میں پھیل گئے ، اس کے اسباب و علل دریافت کرنے میں بڑی کد و کاوش سے کام لیا جاتا ہے لیکن افسوس کہ ان کی پستی اور ادبار کے زمانے کی کوئی مفصل اور مبسوط تاریخ ابھی تک مدون

۱۔ سیرالمتاخرین میں یہ نام 'لال کنور' درج ہے لیکن خافی خان نے 'لعل کنور' لکھا ہے ۔

نہیں ہو سکی ۔ یہ صحیح ہے کہ پاک و ہند میں مسلمان عروج و ادبار کے تمام ادوار سے گزرے ہیں لیکن ان کی تاریخ کا یہ کس قدر افسوس ناک پہلو ہے کہ جونہی عروج کی روح پرور داستان ختم ہوتی ہے ، مورخین کے قلم سست پڑ جاتے ہیں اور عہد زوال کا وہ المناک[1] باب آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے جو ایک عالم کے لیے عبرت خیز اور سبق آموز ثابت ہو سکتا ہے ۔ میرا ارادہ ہے کہ اس مبحث میں اس باب کے صرف ایک گوشے کو بے نقاب کرنے کی کوشش کروں ۔

میرزا تان سین عہد اکبری کا شہرۂ آفاق مغنی تھا ۔ اکبر کے دربار میں پہنچنے سے پہلے وہ مہاراجہ ریوا کے ہاں ملازم تھا ۔ دربار اکبری میں پہنچنے پر اس نے اسلام قبول کیا اور میرزا کا خطاب پایا ۔ اکبر کہا کرتا تھا کہ تان سین کے پایہ کا مغنی ہزار سال قبل تک تلاش کرنا ناممکن ہے ۔ جہانگیر بھی اپنی تزک میں اسی خیال کا اظہار[2] کرتا ہے ۔ تان سین ۹۹۷ھ میں فوت ہوا اور اسے گوالیار میں دفن کیا گیا ۔ اس کی وجہ سے اس کے خاندان اور اس کی اولاد کو جو عظمت اور شہرت حاصل ہوئی ، وہ تمام دور مغلیہ میں قائم رہی اور جب ختم ہوئی ہے تو اس امتیازی شان کے ساتھ کہ نامور مغلوں کی شمشیر و سنان ، تان سین کی اولاد کے ہاتھ میں پہنچ کر طاؤس و رباب کی صورت اختیار کر چکی تھی ۔

عہد عالم گیری میں تان سین کی نسل سے ایک شخص خوشحال[3] خان تھا ۔ اس کے گھر ایک زہرہ جبین لڑکی لعل کنور پیدا ہوئی جو جوان ہونے پر اپنے حسن وجمال اور ناز و ادا کے اعتبار سے قتالۂ عالم ثابت ہوئی ۔ اورنگ زیب کا

۱- اس موضوع پر بہت سی کتابیں ملتی ہیں اور ان سے استفادہ کرتے ہوئے بالخصوص اروین نے بڑی تحقیق سے مغل اخلاف کے واقعات کو قلمبند کیا ہے لیکن جیسا کہ خود اس کے دل میں احساس موجود ہے ، اس نے صرف کسی فلسفی مورخ کے لیے رستہ صاف کیا ہے ۔

۲- پہلی بار اکبر کے دربار میں نغمہ سرائی کرنے پر تان سین کو ایک لاکھ روپیہ انعام بخشا گیا ۔ آئین اکبری ، ترجمہ انگریزی ، بلاخمن ؛ صفحہ ۶۰۳ ۔ ہزار سال کے سلسلے میں یہی کتاب صفحہ ۶۱۲ اور ''عہد مغلیہ میں فارسی علم و ادب'' مصنفہ عبدالغنی : حصہ سوم ، صفحہ ۳۸ ، ذیلی حاشیہ ۔

۳- اروین ؛ صفحہ ۱۸۰ ، ذیلی حاشیہ ، جلد اول ۔

پوتا محمد معزالدین اس کے دام عشق[1] میں گرفتار ہو گیا اور ایسا معتوب اور والہ و شیدا ہوا کہ اپنے والد محمد معظم بہادر شاہ کے لشکر میں موجود ہوتے ہوئے بھی لعل کنور کو اپنے ساتھ رکھتا ۔ محمد معزالدین کے حرم میں تین بیگمات تھیں ۔ ایک کا نام سیدالنسا تھا ، دوسری کا انوپ بائی اور تیسری میرزا مراد کام مکرم خان صفوی کی دختر تھی ۔ اولاد بھی تھی لیکن لعل کنور کے عشق میں وہ اس قدر مدہوش تھا کہ اس سے ایک لمحہ کی جدائی بھی برداشت نہ ہو سکتی تھی ۔ چنانچہ جب ۱۹ محرم الحرام ۱۱۲۴ھ کو بہادر شاہ لاہور میں فوت ہوا تو لعل کنور معزالدین کے ساتھ تھی ۔ اس دختر ناہید کے مسحور کن حسن کا بیان ایک طویل نظم میں موجود ہے جس کا ایک شعر مندرجہ ذیل ہے :

به خوبی لعل کنور نام او بود
شکر گفتار سیم اندام او بود

بہادر شاہ کی وفات پر اس کے چاروں بیٹوں کے درمیان حسب دستور تخت نشینی کے لیے جنگ ہوئی اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس جنگ میں لعل کنور معزالدین کے ساتھ ساتھ موجود ہے ۔ جب دوسرے دو بھائیوں کے مارے جانے کے بعد ۲۰ صفر ۱۱۲۴ھ کو معزالدین اور جہاں شاہ کے درمیان لڑائی ہوئی اور جہاں شاہ نے بے جگری سے معزالدین کی فوج پر حملہ کیا تو معزالدین کی فوج میں افراتفری پھیل گئی ۔ جہاں شاہ نے فتح کے شادیانے بجوانے شروع کر دیے ۔ اس افراتفری اور بدحواسی کے وقت لعل کنور[2] معزالدین سے علیحدہ ہو گئی اور گھبراہٹ کے عالم میں لاہور شہر کی طرف بھاگی جا رہی تھی ۔ جہاں شاہ کے ایک امیر رستم دل خان نے اسے گرفتار کر لیا اور اس کے آراستہ شدہ مروارید کھول لیا ۔ معلوم نہیں کیا نوبت آتی ، مگر اس وقت معزالدین کا ایک فوج دار زبردست حال

۲۔ خافی خان اور غلام حسین اس کے عشق کے عجیب و غریب قصے بیان کرتے ہیں ۔ آگے تمام حوالے آ رہے ہیں ۔

۱۔ خافی خان : منتخب اللباب ، حصہ دوم ، صفحہ ۶۸۷ ۔ غلام حسین : سیرالمتاخرین ، صفحہ ۱۰ ۔

پہنچ گیا جس نے لعل کنور کو نجات دلائی ۔ ادھر ذوالفقار خان[1] نے ایک چال چل کر جہاں شاہ کو شکست دے دی اور اس کا سر قلم کرکے معزالدین کی خدمت میں پیش کیا ۔ دن کو جس طرح سگے بھائی کا سر معزالدین کے نذر کیا گیا اور رات کو اپنے خیمے میں وہ لعل کنور کے ساتھ داد عیش[2] دے رہا تھا ۔

۲۱ صفر ۱۱۲۴ھ کو محمد معزالدین کی رسم تاج پوشی لاہور شہر سے باہر ادا کی گئی اور اس نے ابوالفتح جہاں دار شاہ کا لقب اختیار کیا ۔ اب لعل کنور ایک مغل شہزادے کی محبوبہ کی بجائے شہنشاہ ہند کی ملکہ تھی اور اسے وہی مقام حاصل ہوا جو نورجہاں اور ممتاز محل کو اپنے اپنے زمانے میں حاصل تھا ۔

جہاں دار شاہ ۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۱۲۴ھ کو شاہ جہان آباد پہنچا ۔ نئی حکومت کے دیگر فرامین کے علاوہ ایک فرمان یہ بھی جاری ہوا کہ لعل کنور کا خطاب امتیاز محل[3] ہوگا ۔ اسے شاہی چتر اور شاہی نوبت کے ساتھ کوچ کرنے کی اجازت عطا ہوئی ۔ اس کا وظیفہ دو کروڑ روپیہ سالانہ مقرر کیا ۔ اس کے لباس ، زیورات اور جواہرات کا خرچ علیحدہ تھا جو شاہی اخراجات میں شامل تھا ۔ اسے بیش بہا خزانے دے دیے گئے ۔ لعل کنور نے اپنے عہد کی نورجہاں بننے کی کوشش کی ۔ اس کے نام کے سکّے جاری ہوئے جو اب نایاب ہیں ، لیکن نورجہاں اور اس کی بھتیجی ممتاز محل کے حسن ، گلابی کی سرخی جس عجیب خون سے تیار ہوئی تھی وہ لعل کنور کو کب نصیب تھا ۔ اس کی اداؤں میں طوطرہ کے اندر پیدا ہوگئے ۔ ایک روز وہ جہاں دار شاہ کے ساتھ محل کے جھروکے سے جمنا کا نظارہ دیکھ رہی تھی کہ سامنے سے دریا میں مسافروں سے بھری ہوئی ایک کشتی گزری ۔ لعل کنور نے بڑی معصومیت سے بادشاہ سے کہا : ”میں نے مسافروں سے لدی ہوئی کشتی کبھی ڈوبتے نہیں دیکھی ۔“ ادنیٰ سا اشارہ کافی تھا ، ایک کشتی اسی صورت

۱۔ ایک نامور تورانی امیر ، جس نے عہد عالمگیری میں مرہٹوں کے خلاف خوب خوب مردانگی دکھائی ؛ جنجی کے مشہور و معروف قلعے کا فاتح بھی یہی تھا جو بعد میں جہاں دار شاہ کا وزیر اعظم بنا ۔ فرخ سیر نے اپنے باپ اور بھائی کا بدلہ لینے کے لیے اسے قتل کرا دیا ۔ مآثرالامراء ، جلد دوم ، صفحہ ۹۳ ۔

۲۔ سیرالمتاخرین : صفحہ ۱۱ ۔

۳۔ سیرالمتاخرین : صفحہ ۱۱ ۔

میں لائی گئی اور اسے لعل کنور کے سامنے ایسے بدقسمت مسافروں[1] کے ساتھ دریا میں غرق کر دیا گیا۔

جہاں دار شاہ کے ناعاقبت اندیشانہ فرامین کی وجہ سے غلہ مہنگا ہوگیا۔ ایک بار کچھ مزدور غلہ سر پر اُٹھائے ہوئے جمنا پار سے آ رہے تھے؛ لعل کنور مثمن برج سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک مزدور کو بلا کر پوچھا ''اس غلے کی کیا قیمت ادا کی ہے؟'' جواب ملا ''کوئی پانچ سات روپے۔'' وہ متعجب ہو کر کہنے لگی'' ارے غلہ اس قدر سستا ہے؟ میں کوشش کروں گی کہ اس رقم کے پانچ سات سیر[2] ملیں۔''

صرف لعل کنور ہی کے اقتدار میں اضافہ نہیں ہوا تھا بلکہ اس کا پورا خاندان اس کی وجہ سے مقتدر ہوگیا۔ خافی خاں لکھتا ہے: ''چناں بازار رود و سرود قوالاں و کلاونت و ڈھاڑھی گرم گردید کہ نزدیک .... بود قاضی قرابہ کش و مفتی پیالہ نوش گردد۔ و ہمہ برادران و خویشان دور و نزدیک لعل کنور بہ منصب چہار ہزاری و پنج ہزاری و عطائے فیل و نقارہ و جواہر بیش بہا سرفرازی یافتہ میان ہم قوم خود سرفراز گردیدہ و اعتبار خدمہ زادان و دیگر صاحب کمالان و علما او بیان برخاست۔[3]'' لعل کنور کے بھائی خوش حال خاں کو ہفت ہزاری اور اس کے چچازاد بھائی نعمت خاں کو پنج ہزاری منصب ملا۔ اس کے دو اور بھائیوں کو نامدار خاں اور خانہ زاد خاں کے خطابات دے کر بلند مناصب سے سرفراز فرمایا۔ اس کے تمام بھائیوں کو نوبت کی اجازت تھی۔ باقی رشتہ دار اور بھوئی بھی اسی طرح مختار بنا دیے گئے۔ لعل کنور کے والد کی جو عزت ہوئی ہوگی اس کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔

شاہ جہاں آباد کی بعض بہترین عالی شان عمارتیں ضبط کر کے ان کلاونتوں کو دے دی گئیں، جو وہاں امرا کے سے ٹھاٹھ باٹھ سے رہنے لگے۔ کام ور صحیح

۱۔ خوش حال چند: صفحہ ۴۰۳ ب، بہ حوالہ اروین، جلد اول، صفحہ ۱۹۲ - اسی صفحے پر ذیلی حاشیے میں اروین کامراج کا حوالہ دیتا ہے کہ ذوالفقار خاں نے کشتی ڈبونے سے روکا تھا۔

۲۔ ایضاً خوش حال چند۔

۳۔ منتخب اللباب: حصہ دوم، صفحہ ۶۸۹۔

کہتا ہے کہ عنابوں کے نشیمن راغوں کے تصرف[1] میں آ گئے تھے ۔ راغوں کی طرح یہ لوگ گلیوں اور بازاروں میں آوارہ پھرتے تھے ۔ ہر قسم کی نازیبا حرکات کرتے تھے اور معصوم اور بے کس لوگوں کو سخت ایذائیں پہنچاتے تھے ۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ دہلی اور قلب دہلی ان دنوں لعنہ سراؤں کے قبضے میں تھے ۔ اللہ اللہ گویے اور کلاونت اس لال قلعے میں کلیلیں بھرتے پھر رہے تھے جہاں سے صرف چند سال قبل اورنگ زیب اعظم نے انھیں بیک بینی و دو گوش نکال دیا تھا ۔ گویا اب اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ کا منہ چڑایا جا رہا تھا ۔ شاید ہی تاریخ نے کسی انسان سے اس قدر درد ناک طریقے سے انتقام لیا ہو ۔ رات کے وقت یہ لوگ شاہی محل میں شہنشاہ کے ساتھ محفل طرب منعقد کرتے تھے اور جی کھول کر شراب نوشی کرتے ۔ مخمور ہو کر اس جہانگیر کے جانشیں کی تواضع لات[2] مکے سے کیا کرتے تھے ، جو عالم مستی میں بھی ایک معمولی سی ناخوش گوار حرکت سے بپھر جاتا تھا ۔ یہ حقیقت ہے کہ جہاندار شاہ کے دل میں اپنی عزت اور اپنے وقار کا ذرہ برابر بھی احساس باقی نہیں رہ گیا تھا ۔

جہاندار شاہ نے لعل کنور کی خوشنودی کے لیے اس کے بھائی خوش حال خان کو اکبر آباد کا صوبیدار[3] نامزد کر دیا ۔ صوبیداری کی سند وزیرالممالک نواب ذوالفقار خان دیا کرتے تھے ۔ نواب موصوف نے حق التحریر کے طور پر خوش حال خان سے ایک ہزار طنبور کا مطالبہ کیا ۔ اس نے دوڑ دھوپ کر کے بمشکل دو سو طنبور اکٹھے کر لیے لیکن ایک ہزار کا مطالبہ پورا کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی ۔ ادھر دو مقدار حل مصر تھے ۔ خوش حال خان نے لعل کنور کے ذریعے شہنشاہ سے شکایت کی ۔ جہاندار شاہ نے وزیرالممالک سے کہا "معلوم ہوتا ہے آپ کو مذاق سوجھا ہے ۔ لیکن اسیار محل کے بھائی سے یہ مذاق ۔"

۱- کام ور ، صفحہ ۱۱۹ - یحییٰ : صفحہ ۱۱۹ الف ، بحوالہ اروین ، جلد اول ، صفحہ ۱۹۳ ۔
۲- وسیہری ڈائری ویلنٹین ، جلد چہارم ، صفحہ ۲۹۸ ۔ بحوالہ اروین جلد اول صفحہ ۱۹۶ ۔
۳- منتخب اللباب : حصہ دوم صفحہ ۶۸۹ - وارد : صفحہ ۸۰ - خوش حال چند : صفحہ ۳۸۹ ب ۔ وارد اور خوش حال چند بحوالہ اروین جلد اول صفحہ ۱۹۲ ۔

وزیرالملک نے عرض کیا ''جہاں پناہ مذاق میں، حقیقت ہے۔ جب قوال اور کلاونت امرا کا کام سنبھال رہے ہیں، بندہ امرا کے لیے طنبور حاصل کرنا چاہتا ہے تاکہ حصول معاش کے لیے یہ خانہ زاد غلام، ان سازوں کا پیشہ اختیار کر لے۔'' شہنشاہ نے شرمندہ ہو کر ۱۹ جمادی الثانی ۱۱۲۳ھ کو یہ حکم[1] منسوخ کر دیا۔

اسی خوش حال خان کے ہمسائے میں ایک نجیب اور با عصمت عورت رہتی تھی۔ یہ اس کی عصمت کے درپے تھا اور اکثر اپنے مکان کے غرفے[2] سے جھانکا کرتا تھا۔ اس عفیفہ کے شوہر نے ذوالفقار خان کے پاس جا کر شکایت کی۔ وزیرالملک نے اپنے ملازمین کو بھیجا جو خوش حال خان کو کشاں کشاں لائے اور اس زور سے خوب زد کی گئی کہ خوش حال خان بے ہوش ہو گیا۔ اس کی جائداد ضبط کر لی گئی اور چوں کہ لوگ اس سے تنگ آ چکے تھے اس لیے ذوالفقار خان نے تورانی امراء کی غیرت اور حمیت کا شاندار مظاہرہ کرتے ہوئے اسے سلیم گڑھ میں قید کر دیا۔

لعل کنور کی ایک سہیلی زہرہ تھی۔ وہ در اصل سبزی فروش[3] تھی لیکن جب لعل کنور ملکۂ عالم بن گئی تو کس طرح ممکن تھا کہ زہرہ کا ستارۂ قسمت نہ چمکتا۔ اسے بھی جاگیر اور منصب سے نوازا گیا۔ یہ رذیل عورت ہاتھی پر سوار ہو کر قلعے میں محل سرائے کے اندر آیا جایا کرتی تھی اور آتے جاتے اس کے ملازم رستے میں لوگوں کو تنگ کیا کرتے تھے۔ ایک روز زہرہ حسب معمول آ رہی تھی کہ اُدھر سے چین قلیچ خان[4] کی پالکی گزری۔ وہ اس سے کترا کر

۱۔ اروین: صفحہ ۱۹۳؛ ذیلی حاشیہ جلد اول۔ اصلی حوالہ ویش صفحہ ۲۹۹۔
۲۔ سیرالمتاخرین: صفحہ ۱۲۔
۳۔ سیرالمتاخرین: صفحہ ۱۲۔
۴۔ نظام الملک آصف جاہ بانی سلسلۂ آصفیہ دکن۔ بہادر شاہ نے ۱۱۱۸ھ میں خان دوران بہادر کا خطاب دیا تھا۔ ان کا اصلی نام چین قلیچ خان تھا۔ بڑے عالی ظرف امیر تھے۔ شاعر بھی تھے۔ سرو آزاد میں ان کا ذکر موجود ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین نے ان کے متعلق انگریزی میں ایک مقالہ لکھا ہے جو حیدرآباد دکن میں شائع ہو چکا ہے۔

دوسرا راستہ اختیار کر رہے ہیں کہ زہرہ کے ملازمین نے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی ۔ زہرہ کو جب معلوم ہوا کہ چین قلیچ خاں کی پالکی ہے تو اس نے اپنا پردہ اٹھا کر کہا : "چین قلیچ خاں سر کور ہوئی" ۔ نواب موصوف ابھی اور مرحوم اندھے[1] باپ کی ہتک برداشت نہ کر سکے ۔ جلاد کو اشارہ کیا ۔ زہرہ کو عماری سے نیچے گھسیٹ لیا گیا اور بقول صاحب سیرالمتاخرین اسے "زیرلگد و مشت گرفتند" زہرہ روتی پیٹتی لعل کنور کے پاس پہنچی ۔ لعل کنور نے جہاندار شاہ کو بھڑکایا ۔ وہ انتقام لینے کے لیے تیار ہوگیا ۔ لیکن اس دوران میں چین قلیچ خاں ذوالفقار خاں کے پاس پہنچ کر تمام ماجرا سنا چکے تھے ۔ ذوالفقار خاں نے شہنشاہ کو پیغام بھیجا کہ خاندانوں کی عزت مشترک ہے ۔ چنانچہ وہ ٹھنڈا ہو گیا ۔

صرف امرا ہی لعل کنور کی وجہ سے دل برداشتہ اور آزردہ خاطر نہیں تھے ، بلکہ تمام کا تمام شاہی خاندان بھی نالاں تھا ۔ ان دنوں جہاندار شاہ کی ایک پھوپھی زینت النسا بیگم[2] زندہ تھیں ۔ عمر اکثر سال تھی ۔ پاک باز ، اتقاء اور علوم دینیہ سے شغف اور وقعت کے لحاظ سے وہ اپنے دین پرور اور عظیم المرتبت والد مرحوم اورنگ زیب عالمگیر کا زندہ نمونہ تھیں ۔ ۱۱۱۱ع میں انھوں نے اپنے خرچ سے دہلی میں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی جس کا نام زینت المساجد رکھا گیا ۔ دکن کی مہموں میں عالمگیر کی وفات تک پورے پچیس سال شہنشاہ

۱۔ ان کا نام غازی الدین تھا ۔ زندگی کے آخری بیس سال اندھے رہے ۔ پھر بھی افواج کی قیادت کرتے تھے ۔ مفصل حالات کے لیے مآثرالامراء حصہ دوم صفحہ ۸۷۲ دیکھیں ۔

۲۔ عجیبلی : صفحہ ۱۹ الف ۔ سکاٹ : صفحہ ۸۳ ۔ شاعرہ بھی تھیں ، ۱۱۴۳ھ میں وفات پائی ۔ زینت المساجد میں انھیں دفن کیا گیا ۔ مزار پر ان کا اپنا یہ شعر منقوش ہے ۔

مونس ما در لحد فضل خدا تنہا بس است
سایہ از ابر رحمت قبر پوش ما بس است

ان کی شاعری کا ذکر معارف اعظم گڑھ بابت مئی ۱۹۴۲ع اور بزم تیموریہ میں موجود ہے ۔

کے ذاتی امور کا انتظام اور انصرام ان کے ذمے رہا اور خطاب پادشاہ بیگم تھا۔ ایک مبارک عہد کی مبارک یادگار ہونے کی بنا پر تمام شاہی خاندان، امرا اور عوام الناس ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ ایسی والا مرتبت شہزادی اور ایسی بلند فطرت اور بلند مشرب خاتون بھلا لعل کنور کی ناشائستہ حرکات کو کس طرح پسندیدہ نگاہوں سے دیکھ سکتی تھیں۔ اسی لیے لعل کنور ان سے ہمیشہ ناراض رہتی تھی۔ یہ دریدہ دہن فاحشہ عورت اس مقدس خاتون کی ہر ممکن طریق سے تذلیل کرتی تھی۔ جہاں دار شاہ بھی لعل کنور کی وجہ سے زینت النسا سے ناراض تھا اور اس سے ملاقات ترک کر دی تھی۔ ایک دفعہ جہاں دار شاہ زینت النسا کی دعوت میں اس لئے شامل نہ ہوا کہ لعل کنور کو اس میں مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ یہ تو پھوپھی کا قصہ ہے۔ جہاں دار شاہ کے دو چھوٹے لڑکے عز الدولہ اور معز الدولہ تھے۔ لعل کنور سوتیلی ماں ہونے کی بنا پر ان سے متنفر تھی۔ یہی جذبات نفرت جہاں دار کے قلب میں بھی منتقل ہوگئے۔ چناں چہ اس نے ان معصوم بچوں کو قید خانے میں بھجوا دیا۔

لعل کنور کی اپنی اولاد کوئی نہ تھی اور اولاد کی خاطر کلاونتوں کی اس چھوکری نے جو شرم ناک حرکات جہاندار شاہ سے کرائیں، ان کو سن کر جبین حیا عرق آلود ہو جاتی ہے۔ جہاں دار لعل کنور کے ساتھ ہر ہفتے نصیر الدین محمود[1] چراغ دہلوی کے مزار پر جا کر نہایا کرتا تھا۔ کیونکہ ایک روایت ہے کہ میاں بیوی کے اس حوض میں برہنہ نہانے سے اولاد حاصل ہوتی ہے۔ لعل کنور جہاں دار شاہ کے خیالات اور جذبات پر پوری طرح مستولی ہو چکی تھی اور وہ ایک بچے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا پھرتا تھا۔ اس کی حرکات تمام کی تمام طفلانہ تھیں۔ ایک دفعہ وہ شیخ قطب الدین[2] کے مزار پر گیا۔ قریب ہی ایک جنان کے ہموار چٹیل اور نرم نرم ڈھلوان سے بچے کی طرح کم سن بچے کھیل میں ہنستے اور شور و غل مچاتے لڑھکتے ہوئے

۱۔ وفات ۱۸ رمضان ۷۵۷ھ۔ جہاں دار شاہ کے جا کر نہانے کا واقعہ کام ور حال؛ صفحہ ۱۲۰۔ کامراج: عبرت نامہ، صفحہ ۳۴ ب: بحوالہ اردو جلد اول صفحہ ۱۹۶۔

دکھائی دیے - تھوڑی دیر میں شہنشاہ سلامت[1] بھی پچاس سال کی عمر میں اس ڈھلواں سے نیچے لڑھکتے ہوئے دیکھے گئے -

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں دار شاہ ایک معنی شہنشاہ کی حیثیت سے اپنی عظمت اور اپنے وقار کا خاتمہ کر دینا چاہتا تھا - اس نے لعل کنور کے ساتھ بازاروں میں چکر لگانا شروع کر دیا - سبحان اللہ وہ بھی وقت تھا کہ شاہ جہاں کے پر جلال چہرے کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے لوگ بے تاب رہتے تھے - ہندوؤں میں ایسے درشنی لوگوں کی تعداد کافی تھی، جو جب تک سعادت و حشمت کے مظہر اس جلیل القدر شہنشاہ کے درشن[2] نہ کر لیتے تھے، روٹی نہ کھاتے تھے اور اب اسی شہنشاہ کا جانشین بازاروں اور گلیوں میں آوارہ پھر رہا تھا اور لوگ اس پر نگاہ غلط ڈالنے کے بھی روادار نہ تھے - بلکہ اسے دیکھ کر حقارت اور نفرت کے جذبات پیدا ہوتے تھے -

ایک روز لعل کنور کے ساتھ رتھ[3] پر سوار ہو کر جہاندار شاہ بازاروں میں چکر لگاتا ہوا لعل کنور کی ایک سہیلی کے مے خانے[4] میں پہنچ گیا - وہاں جا کر خوب مے نوشی کی - چلتے ہوئے اس مے فروش عورت کو بیش بہا انعامات دیے اور ایک گاؤں بھی بخشا - جب محل سرائے میں پہنچے تو شہنشاہ سلامت اور لعل کنور دونوں مدہوش تھے اور محو خواب - خادمائیں لعل کنور کو سہارا کر اندر لے گئیں

۱- خوشحال چند: صفحہ ۹۰۳ الف - ارادت خان بحوالہ ملکٹ - اروِن: جلد اول صفحہ ۱۹۶ -

۲- درشن کا یہ سلسلہ بھی بعد میں اورنگ زیب نے ۱۰۷۹ھ میں بند کر دیا تھا - اس مصلح اعظم کی اصلاحات میں سے ایک یہ بھی تھی -

۳- منتخب اللباب: حصہ دوم، صفحہ ۶۹۰؛ خوشحال چند؛ بحوالہ اروِن صفحہ ۱۹۶ -

۴- اورنگ زیب نے اپنے عہد میں سوسائٹی کی اصلاح کے لیے بڑی جد و جہد کی - لیکن اس کی وفات کے بعد حالات بالکل بگڑ گئے تھے - شراب نوشی عام ہو گئی تھی - مرآۃ الاصطلاح مخطوطہ مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے صفحہ ۷۹ الف پر درج ہے کہ نواب اللہ وردی خان کا بیٹا ایک رات مدہوشی کے عالم میں اپنی جورو کے بستر پر پہنچا جو کسبیوں کے درمیان سو رہی تھی -

لیکن جہاندار شاہ کا کسی کو بھی خیال نہ رہا اور رہا بھی کیسے ۔ اُن دلوں مرکزی حیثیت تو لعل کنور کو حاصل تھی ۔ رتھ بان بھی مدہوش تھا ۔ مستی کی حالت میں رتھ اصطبل میں چھوڑ کر چلا گیا ۔ اب جب تلاش شروع ہوئی تو لال قلعہ اور تخت طاؤس کا مالک عرب سرائے سے دو تین میل دور اصطبل میں رتھ کے اندر مخمور پڑا تھا ۔ جگانے پر کہنے لگا "میں کون ہوں ؟ تم کون ؟ یہ کون سی جگہ ہے ؟" ادھر جہاندار شاہ ، شاہ جہاں آباد میں لعل کنور کے عشق میں فنا اور غرق تھا ، ادھر عظیم آباد پٹنہ میں اس کا بھتیجا فرخ سیر جو عظیم الشان کا بیٹا تھا ، حسین علی خاں[1] اور حسن علی خاں سید بھائیوں کی اعانت سے تخت پر قابض ہونے کے لیے تیاریاں کر رہا تھا ۔ جہاندار شاہ نے فرخ سیر کے مقابلے کے لیے اپنے بیٹے عزالدین کو ایک لشکر جرار دے کر بھیجا مگر اسے شکست فاش ہوئی ۔ آخر جہاندار شاہ خود ایک ٹڈی دل فوج کے ساتھ ادھر گیا اور ۱۳ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ کو آگرہ کی جمعہ کی جنگ لڑی گئی ۔ ابتدا میں جہاندار شاہ کا پلہ بھاری تھا ۔ حسین علی خاں شمت بست لڑتا ہوا زخمی ہو کر گر پڑا ۔ اس وقت اس کا بڑا بھائی حسن علی خاں مضطرب اور پریشان حال ایک بلند پشتے[2] پر پہنچا ۔ جہاندار شاہ کی فتح کے شادیانے بج رہے تھے ۔ تھوڑی دیر میں سادات بارہہ کا ایک گروہ حسن علی خاں کے اردگرد جمع ہو گیا ۔ حسن علی خاں نے دیکھا کہ قریب ہی زنانہ سواریاں ہیں اور ان کی طرف سے غفلت برتی جا رہی ہے ۔ سادات بارہہ بڑی تندی سے اُن سواریوں پر حملہ آور ہوئے ۔ لعل کنور اور دیگر عمدہ سراؤں کے ہاتھی حسن علی خاں اور اُس کے حربی ساتھیوں کے تیروں کی بوچھاڑ کے سامنے ٹھہر نہ سکے ۔ بے قابو ہوکر ادھر اُدھر بھاگے ۔ جہاندار شاہ کا ہاتھی بھی بے قابو ہوگیا ۔ وہ اتر کر گھوڑے پر سوار ہوا لیکن کلاونتوں کی اولاد سے استقامت اور مردانگی کی توقع کب ہو سکتی تھی ۔ لعل کنور خواص بخشا اپنے ہاتھی پر پہنچ گئی اور جہاندار شاہ کو اپنی عماری میں بٹھا کر آگرہ بھاگ گئی ۔ شیر دل ورانی نواب ذوالفقار خاں ڈٹا رہا ۔ لیکن اب اس کی جرأت اور ہمت بے کار تھی ۔ لعل کنور کی وجہ سے فتح و ظفر

۱۔ ان دونوں بھائیوں کا مفصل حال سرو آزاد میں دیکھیں ۔

۲۔ منتخب اللباب : حصہ دوم ، صفحہ ۷۰۳ ۔

کے شادیانے غم و اندوہ کے طبل بن چکے تھے ۔

جہاندار نے بھیس بدل کر زنانہ گاڑی میں لعل کنور کے ساتھ دہلی پہنچا ، وہاں اسے قید کر دیا گیا اور فرخ سیر کے پہنچنے پر ۱۶ محرم ۱۱۲۵ھ کو قتل ہوا ۔ کہتے ہیں جب جلاد جہاندار شاہ کی کوٹھری میں پہنچے تو لعل کنور بڑی چیخی چلائی لیکن اسے زبردستی جدا کرکے سیڑھیوں کے نیچے پہنچایا گیا ۔ جہاندار شاہ کے قتل کے بعد اس نے اپنی زندگی کے باقی ایام سہاگ پورہ میں گزار دیے جہاں مرحوم شہنشاہوں کی بیوائیں رہا کرتی تھیں ۔

(یثرب لاہور ، ۱۹۵۱ء)

۳۔ بیدل کی ایک غیرمطبوعہ مخمس[1]

موسوم بہ شہرآشوب

الصلا ای سرخوشان جلم اقبال طرب
السرور ای عشرت آهنگان قانون ادب
التوید ای سروران دین و دولت را سبب
الحضور ای مقبلان عمں اسرار رب
اسلام ای روشان صبح فصل اند

۱۔ لال کنور کے متعلق مقالہ پڑھنے کے بعد اس شہر آشوب کا مطالعہ از بس ضروری تھا ۔ بیدل نے اور بھی بہت سی مخمسات لکھی ہیں لیکن عہدِ جہاندار شاہ اور بعد کی بے حیائیوں سے بیزاری کا اظہار جس "غم و غصہ" کے ساتھ انہوں نے اس مخمس میں کیا ہے ، اور کہیں نہیں ملتا ۔ اس لحاظ سے اس کی حیثیت منفرد ہے ۔ آپ غور فرمائیں کہ "دورِ بے غیرت" کے انجام کے متعلق بیدل نے جو پیشین گوئی کی تھی ، کس طرح حرف بہ حرف پوری ہوئی ۔ علاوہ بریں اسے اس لیے بھی بطور ضمیمہ شامل کرنا ضروری تھا کہ کابل میں ڈاکٹر علی احمد پوپل وزیر معارف کی وجہ سے مطبع وزارت معارف میں کلیات بیدل طبع کروانے کا جو عظیم منصوبہ چار سال کی پیہم عرق‌ریزی سے چار ضخیم جلدوں میں بروز جمعۃالمبارک ۲۸ مئی ۱۹۶۵ء کو پایۂ تکمیل تک پہنچا ، اس میں باقی سب مخمسات درج ہو گئی ہیں مگر کسی وجہ سے یہ رہ گئی ہے ، حالانکہ میں اسے ۱۹۵۱ء میں کتاب خانۂ معارف کابل کے کلیات بیدل نوشتۂ غلام حسین کابلی سے نقل کر کے لایا تھا ۔ خطرہ ہے کہ اگر اب اسے طبع نہ
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

آمدید ای ملک و تعظیم آفتاب و مه بهم
تا فتید از اوج عزت بر اسیران ظلم
گل کند یارب تلافیهای این رنج قدم
بی کسی را سایه افگندید بر فرق از کرم
بیدلیها وا رهاندید از فراق عمرگاه

مدتی تشویش طبع از چرخ دون انباشتید
در زمین خوشکسرانه تخم الفت کاشتید
حیف مجذرا ابهی عرسی بداشتید
بی تکلف سیر دلهای پریشان داشتید
ساعتی در چشم ما باید نشاندن گرد راه

گرچه بود آن دیدلیها صورت نادیدنی
معنیٔ معلوم شد مجهول نافهمیدنی
گشت باری منکشف کیفیت خلق دنی
استحاق داشت لقش شیوهٔ کبر و منی
گرچه رسوائیست برپا این ندامت کارگاه

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)
کرایا گیا تو پھر کبھی موقع نہ آئے گا ۔ کہیں والے تو اپنا فرض مخمس و حوبی
ادا کر چکے ، اہل عجم تک اسے پہنچانے کی اب صرف یہ سبیل باقی رہ
گئی ہی ۔ بیدل کی ایک اور بھی شہر آشوب مخمس ہے جس کا پہلا بند یہ ہے :

ای حمرہ عمری چند نہ ہی حال و نہ دل اند
و ز جهل رسا منکر ارباب کمال اند
حیزلد و لئیم اند و سفیه اند و ضلال اند
حالی نگونسار تلاش زر و مال اند
فطرت اگر این است حران درچه خیال اند

لیکن یہ مخمس کابل کے مذکورہ بالا نئے طبع شدہ کلیات بیدل میں موجود ہے ۔

آتش بے زینہار افتادہ در جیع حسود
شش جہت در تیرگی حوابیدہ از طوفان دود
برچنین ہنگامہ تا کی چشم می باید کشود
زان صعی بی تنگ جستن بی کراںاتی نود
حیف غیرتہا کہ دوزد مرد بر خشک نگاہ

عرصۂ دہر از تنگ و تار عفت گرد بیخ
عالیت با عفت از کر و فر حیزان گریخت
شخص تمکیں سد مکوں آب رخ اقبال ریخت
ہر لجا مر رشتۂ ناموس غیرتہا گسیخت
مرد را باید بعصمتگاہ حق بردن پناہ

فضل یزداں سد بہر صورت دلیل آگہی
تا رہ حہدیکہ ضائع بود زد بر کوتہی
غیرت اکنون لوحہ دارد بر امیری و شہی
کشوری از آفتاب و ماہ و انجم شد تہی
نیست چیزی بر سرش جز سایۂ روز سیاہ

رفت آں عہدیکہ غیرت داشت با عسم تمیز
کرد بی قدری عرتہا را مبدل با کمیز
کارہا شد منحصر بر نرلۂ دیثوث و حیز
آبروی نیست جز آب منی با ہیچ چیز
روزگار اکنون عیار مردمی گیرد ز باہ[1]

۱- محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں جب نادر شاہ حملہ آور ہوا ، نواب درگاہ قلی خاں نے مرقع دہلی کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اُن دنوں کی عیش کوشی کا نقشہ کھینچا ۔ نواب صاحب نے اُن مقامات کا ذکر کیا جہاں عورتیں داد عیش دینے کے لیے بناؤ سنگار کر کے آیا کرتی تھیں ۔ یہ حالات بیدل کے ایسے زمانے میں شروع ہو چکے تھے ۔ وہ ۱۷۲۰ء میں فوت ہوئے اور نادر شاہ ۱۷۳۹ء میں حملہ آور ہوا ۔

آمدید ای ملک و تعظیم آفتاب و مہ بہم
تاختید از اوج عزت بر اسیران ظلم
گل کند یارب تلافیہای این رنج قدم
بی کسی را سایہ افگندید برفرق از کرم
پیدلیها وا رهاندید از فراق عمرگاہ

مدتی تشویش صبح از جرخ دون اباشتید
در زمین خوشکساران تخم الفت کاشتید
حیلہ مستجالرا انیس هرسی پنداشتید
بی تکلف سیر دلہای پریشان داشتید
ساعتی در چشم ما باید نشاندن گرد راہ

گرچہ بود آن دیدنیہا صورت ندیدنی
معنیٔ معلوم شد مجہول نافہمیدنی
گشت باری منکشف کیفیت خلق دنی
استحاق داشت نقش شیوۂ کبر و منی
گرچہ رسوائیست برہا این ندامت کارگاہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

کرایا گیا تو پھر کبھی موقع نہ آئے گا۔ کہیں وایے تو اپنا عرض محسن و خوبی ادا کر چکے ، اہل علم تک اسے پہنچانے کی اب صرف یہ سبیل باقی رہ گئی ہی۔ بیدل کی ایک اور بھی شہر آشوب مخمس ہے جس کا پہلا بند یہ ہے:

این حیرہ سری چند کہ فی حال و لہ قال اند
و ر حوصل رسا منکر ارباب کمال اند
حیزلہ و لئیم اند و سفیہ اند و ضلال اند
حمال نگونسار تلاش زر و مال اند
فطرت اگر این است حران درحد خیال اند

لیکن یہ مخمس ڈ ل کے مذکورہ بالا نئے طبع شدہ کلیات بیدل میں موجود ہے۔

آتش بے زنہار افتادہ در جمع حسود
شش جہت در تیرگی خوابیدہ از طوفان دود
برچنین ہنگامہ تا کی چشم می باید کشود
زان ہمی بی ننگ ہستی بی گرانباتی نبود
حیف غیرتہا کہ دورد مرد بر حنظل نگاہ

عرصۂ دہر از تک و تاز بخت گرد یحب
عاقبت باعث از کر و فر حیزان گریخت
شخص تمکین شد نگون آب رخ اقبال ریخت
ہر کجا سر رشتۂ ناموس غیرتہا گسیخت
مرد را باید بعصتگاہ حق بردن پناہ

فص بردان شد بہر صورت دیل آگہی
تا رہ جہدیکہ ضائع بود زد بر کوتہی
عبرت اکنون نوحہ دارد بر اسیری و شہی
کشوری کز آفتاب و ماہ و انجم شد تہی
نیست چیزی بر سرش جز سایۂ روز سیاہ

رفت ان عہدیکہ غیرت داشت با عالم تمیز
کرد بی قدری عرقہا را مبدل با کمیز
کارہا شد منحصر بر فرقۂ دیثوث و حیز
آبروی نیست جز آب بنی با ہیچ چیز
روزگار اکنون عیار مردمی گیرد ربا[۱]

۱۔ محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں جب نادر شاہ حملہ آور ہوا، نواب درگاہ قلی خان نے مرقع دہلی کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں ان دنوں کی عیش کوشی کا نقشہ کھینچا ۔ نواب صاحب نے ان مقامات کا ذکر کیا جہاں عورتیں داد عیش دینے کے لیے ہاؤ سنگار کر کے آیا کرتی تھیں ۔ یہ حالات بیدل کے اپنے زمانے میں شروع ہو چکے تھے ۔ وہ ۱۷۲۰ع میں فوت ہوئے اور نادر شاہ ۱۷۳۹ع میں حملہ آور ہوا ۔

دهر بر فرق جهانی خاک ننگ و عار ریخت
معجری را چین کرده بر سر دستار ریخت
ساده تر گردیده ، تر بر ماه‌کی یک بار ریخت
دور اقبال‌ها برگشت و این ادبار ریخت
سایهٔ بال زغن افتاد بر شاه و سپاه

روز تا عس مرورد شمع می جوشد ز شب
می‌کند شب از عمود صبح سامان طرب
اینچه جور است اینچه طوراست اینچه دور است ای عجب
زن پیٔ تسکین شوهر هر طرف شوهر طلب
همچنان مرد از برای خدمت زن مرد خواه

سردیٔ دوران زبان اهل جرأت کرد لال
زیر شد یک سر بم هنگامهٔ سار رحال
دست گه طم طراق و رستمی ها گشت زال
کوس کبر و دار مردی نم کشید از انفعال
این زمان آوازهٔ طبل و نفیر آه است آه

یعنی چند از غرور ساز غفلت طینتی
جیده در پستی دکان نار گردون مطرقی
اهلی ازین کز پاس چند سایهٔ بی عرقی
سایه وار افتاده است از دلت دون همتی
رو بخاک و پایی در گل سر بسنگ و تن براه

تر دماغیها در آب این و آن افگنده بنگ
کج حرامی تیشه ها دارد نیاز پای لنگ
گرد جولان تعین عسی را کرد تنگ
می دود سر بر هوا خلقی و در پیش است سنگ
می رود غلطان جهانی کور و مشتاق است چاه

از هجوم اسب و فیل و قصر و طاق زرنگار
دشت و در را ننگ دارد مبتلای اعتبار

تا کجا باید بنای خودسران بی وقار
این بجود بالیده ها و بی تمیز و نابکار

جسم مردار اند گر آماس می‌گردد تباه

بر بنای عدل و رافت کرد ویران کمین
گشت از نا ایمنی معموره ها صحر نشین
داد رس گردید از خواب گران گاو زمین
بر که نالد حق مسکین در چنین دور معین

ابر خشک و خاک بی نم وای بر مشت گیاه

کوشش غفلت سرشتان غفلت اغماء است و بس
سعی باطل پایمال گرد ابرام است و بس
نان اگر دارد تنور کروفر خام است و بس
لعنت ساری خور خوان هوس نام است و بس

سیر می گردد بیک شه خوردن شطرنج شاه

بر حباب بوج کس نقش نگین نه نشانده است
تا نفس بالیده باشد یادش از سر رانده است
امتحان زین نسخه ها سطر وفا که خوانده است
بی تامل دفتر حیرت ورق گردانده است

انتظاری می‌کشد مژگان به تحریک نگاه

وحشت کار جهان را با توقف کار نیست
آن چه امروز است فردا گشتن دشوار نیست
گرمی هنگامه طول امل بسیار نیست
تا سحر زین شمع اقبالی که حر ادبار نیست

می دمد داغ از سریر و می چکد مغز از کلاه

زین شکوه و جاه باطل مسوه خوردن هیچ نیست
نقد بیرنگ شررها تا شمردن هیچ نیست
باد در دست است فرصت پا شمردن هیچ نیست
در بسط آتش خس جز عسردن هیچ نیست

دور بی غیرت ندارد امتداد سال و ماه

دهر بر فرق جهان خاک تنگ و عار ریخت
معجری را پهن کرده بر سر دستار ریخت
ساده تر گردیده ، تر بر سادگی یک بار ریخت
دور اقبال ها برگشت و این ادبار ریخت
سایهٔ بال زغن افتاد بر شاه و سپاه

روز تا مجلس فرورد شمع می جوشد ز شب
می‌کند شب از عمود صبح سامان طرب
اینچه جور است اینچه طور است اینچه دور است ای عجب
ران پیٔ تسکین شوهر هر طرف شوهر طلب
همچنان مرد از برای خدمت زن مرد خواه

سردیٔ دوران زبان اهل حرات کرد لال
زیر شد یک سر بم هنگامهٔ ساز رجال
دست که علم طراق و رستمی ها گشت زال
کوس گیر و دار مردی نم کشید از انفعال
این زمان آوازهٔ طبل و نفیر آه است آه

بیحسی چند از غرور سر غفلت طینتی
چیده در سستی دکان در گردون قطرتی
ایش ازین کز پاس چیند مایهٔ بی عرق
سایه وار افتاده است از دست دون همتی
رو بخاک و پای در گل سر بسنگ و تن براه

تر دماغیها در آب این و آن افکنده بنگ
کج حرامی کیشه ها دارد نیاز پی لنگ
گرد جولان تعین عالمی را کرد تنگ
می دود سر بر هوا خلقی و در پیش است سنگ
می رود غلطان جهی کور و مشتاق است چاه

از هجوم اسپ و فیل و قصر و طاق زرنگار
دشت و در را ننگ دارد مبتلای اعتبار

تا کجا باید بپای خودسران بی وقار
این بخود بالیده ها و بی تمیز و نابکار
جسم مردار اند کز آتش می‌گردد تباه
بر بنای عدل و رأفت کرد ویران کمین
گشت از نا ایمنی معموره‌ها صحرا نشین
داد رس گردید از خواب گران گو زمین
هر که باید حق مسکین در چنین دور حزین
ابر خشک و خاک بی نم وای بر مشت گیاه
کوشش خست سرشتان غفلت انعام است و بس
سعیٔ باطل پایمال گرد ایهام است و بس
نان اگر دارد تنور کروفر خام است و بس
نعمت ماری خور خوان هوس نام است و بس
سیر می گردد بیک شه خوردنی شطرنج شاه
بر حباب موج کس نقش نگین ننشانده است
تا نفس بالیده باشد بادش از سر رانده است
امتحان زین نسخه‌ها سطر وفا کم خوانده است
بی تامل دفتر حیرت ورق گردانده است
انتظاری می‌کشد مژگان به تحریک نگاه
وحشت کار جهان را پا توقف کار نیست
آن چه امروز است فردا گشتنش دشوار نیست
گرمیٔ هنگامهٔ طول امل بسیار نیست
تا سحر زین شمع اجنبی که جز ادبار نیست
می دمد داغ از سریر و می چکد مغز از کلاه
زین شکوه و جاه باطل عشوه خوردن هیچ نیست
نقد نیرنگ شررها تا شمردن هیچ نیست
باد در دست است فرصت پا شمردن هیچ نیست
در بساط آتش خس جز فسردن هیچ نیست
دور بی غیرت ندارد امتداد سال و ماه

داد لوبهدی جهانی را بسیلاب گداز
عالمی آواره شد زان غافل بی امتیاز
کاشکی از پا نشیند این غبار هرزه تاز
لعنت الله بر نعین گر باین وضعست للز
خاک بر فرق بزرگی گر باین رنگست جاه

شاد باشید ای جوان مردان تمکین آب رنگ
بر صفای نشأ اوقات مپسندید زنگ
گردش احوال نامردان نمی‌خواهد درنگ
رود برهم می خورد این جمع آثار ننگ
قلتبان تا کی بهادر زلجیب تا چند شاه

گر فلک کج یافت با نقش خیالی آورد راست
در بساط معنی آگاهان چه افزود و چه کاست
بیدماغی نیست گر دل ناگزیر انزواست
از کنار عرصه چندی سیر عبرت مفت ماست
عالم است این یک هم می خندد اینجا گاه گاه

فرہنگ اصطلاحات

احدیت : اس سے مراد حق تعالیٰ کی ذات محض ہے جو ابھی کہہ اور حقیقت کے لحاظ سے نامعلوم و ناقابل علم ہے ۔ یہ بے رنگی اور بے کیفی کا مرتبہ ہے اور معرفت سے بالاتر ۔

ارتقائے ذات : صفائے باطن کے بعد محبت الٰہی سے اپنی ذات کی تربیت ۔ ارباب تصوف کا کہنا ہے کہ اس طرح ہماری ذات بےحد توانا اور لازوال بن جاتی ہے ۔

استعارہ : ایک لفظ کا استعمال مستعار لینا ۔ مثلاً شیر کا لفظ ایک بہادر جوان کے لیے استعمال کرنا ۔

اسلوب کا ترچھا پن : (Reflex Art) تخیل افروز طریقے سے اپنے دل کی بات دوسروں کا ذکر کر کے بیان کرنا ۔

اشعاعِ نور : اس کے لغوی معانی ہیں نور کا ادھر ادھر پھیلنا ۔ اصطلاح اشراقی فلسفہ سے متعلق ہے جس کے مطابق حقیقی وجود نور ہے اور اس کا اقتضاء ظہور ہے اور جو ابھی شعاعیں تمام اشیاء پر منعکس کر کے ان میں زندگی کی لہر دوڑا دیتا ہے ۔ اس سے جو عجیب ظہور پذیر ہوتی ہیں ان کی تعداد لامحدود ہے ۔ اس نور قاہر کی شعاعیں جوں جوں اپنے مرکز سے دور ہوتی چلی جاتی ہیں ، ان کی شدت میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور روشنی میں بتدریج انحطاط شروع ہو جاتا ہے ۔ اسی انحطاط کے باعث مادی وجود ظہور پذیر ہوتے ہیں ۔

اطلاق : اللہ تعالیٰ کی شانِ مطلقیت جو قید تشبیہ اور قید تنزیہ ہر دو سے آزاد ہے ۔

افراد : صوفیائے کرام کا وہ طبقہ جو اللہ تعالیٰ کی تجلیٔ ذات سے مستفیض ہوتا ہے، جب کہ اقطاب تجلیٔ صفات سے کسبِ کمال کرتے ہیں۔

الوہی زمان : علمائے اسلام مثلاً جلال الدین دوانی اور صوفی شاعر عراقی نے مختلف ہستیوں کے لیے زمان کی مختلف نوعیت بیان کی ہے۔ مادی اشیاء کے لیے وقت آسمانوں کی گردش سے پیدا ہوتا ہے جسے ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ غیر مادی ہستیوں کے لیے وقت کا بہاؤ ایسا ہے کہ جو مدت مادی ہستی کے لیے ایک سال کی ہے وہ غیر مادی ہستی کے لیے ایک دن سے زیادہ نہیں۔ غیر مادی ہستیوں کے علیٰ طبقوں کو درجہ بدرجہ طے کر کے آخر میں ہم ربانی یا الوہی وقت پر پہنچتے ہیں جو گزرنے یا بہاؤ کی خاصیت سے بالکل مبرا ہے اور اس لیے اس میں نہ تقسیم ہے نہ ترتیب نہ تغیر۔ یہ دوام سے بھی بالاتر ہے اور اس کا نہ آغاز ہے نہ انجام۔ اس وقت میں ساری تاریخِ عالم علت و معلول کے سلسلے سے آزاد ہو کر ایک مافوق الدوام ”اب“ میں سما جاتی ہے۔

امکان : ممکن ہونا۔ اصطلاحی معانی ممکن الوجود کے ذیل میں دیکھیے۔

انا : (ego) اپنی ذات اور اس کا احساس۔

انسانِ ربانی : (God man) انسانِ کامل جو خداوند تعالیٰ کی شانِ مطلقیت کا مظہر ہوتا ہے۔

انسانِ کامل : (Perfect Man) صوفیائے کرام کے نزدیک انسانِ کامل کا ظہور ہی تخلیق کائنات کی غایت ہے۔ تصوف کا ذخیرہ انسانِ کامل کی دریافت اور تربیت کے لیے مفید معلومات سے لبریز ہے۔

برھما : ہندوؤں کے نظریۂ تخلیق کے مطابق برہما کی پیدائش وشنو کی ناف سے ہوتی ہے۔ جس کو فکر اسلامی کے مطابق

ذات واجب الوجود کہا جا سکتا ہے اور اسی طرح برہما کو ہم عقل اول کہہ سکتے ہیں ۔ اپنی پیدائش کے بعد برہما تخلیق کائنات کرتا ہے ۔ پھر سال و ماہ کے ادوار شروع ہو جاتے ہیں جن میں سے ہر دور تینتالیس لاکھ بیس ہزار سال کا ہوتا ہے ۔ زمانے کے سب سے بڑے دور کے بعد "مہا پرالایا" آتی ہے ، یعنی نظام کائنات درہم برہم ہو جاتا ہے ۔ برہما کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے ۔ اس کے بعد از سر نو تخلیق شروع ہو جاتی ہے ۔ تخلیق و قیام کائنات اور وقوع قیامت کے یہ چکر غیر مختتم طور پر جاری رہتے ہیں ۔

بساط کبریا : بساط کا لفظ اسلوبِ بیان کے طور پر وارد ہوا ہے اور اس ترکیب کا مطلب ذاتِ باری تعالیٰ کی کبریائی ہے ۔

بش : جیسا کہ برہما کے سلسلے میں بتایا گیا ہے ، فکرِ ہندی میں بش سے مراد ذاتِ واجب الوجود ہے ۔

تازہ گوئی : یہ وہ اسلوبِ غزل گوئی ہے جسے عہد مغلیہ میں ہندوستان میں عروج حاصل ہوا ۔ خیال آفرینی ، رنگیں بیانی ، معنی پروری ، بداعتِ اسلوب اور جدت تراکیب اس کے عناصر تھے ۔ مثالیہ پر زور دیا جاتا تھا ۔ ان امور کے ساتھ اگر تجسیم معانی ، ایہالیت اور غرائب کو بھی شامل کر لیا جائے تو اس سبک کے تمام عناصر نگاہوں کے سامنے آ جاتے ہیں ۔ ان تمام خصوصیات نے بیک وقت موجود ہو کر ایک تازہ اسلوب پیدا کیا ۔

تجرید : لغوی معنی جدا کرنا ۔ تصوف کی اصطلاح میں محبتِ الٰہی میں تمام دنیاوی چیزوں سے علیحدگی ۔ فلسفے میں اس سے مراد مختلف چیزوں میں سے قدر مشترک لے لینا ہے ۔ جب یہ ذہنی عمل اس انتہا کو پہنچتا ہے جس وقت دنیائے آب و گل میں اس کی کوئی افادیت باقی نہیں رہتی تو اسے تجرید محض کہتے ہیں ۔

تجلی : اس کے معنی ہیں چمکنا ۔ اس میں یہ تصور موجود ہے کہ گویا اللہ ایک نور ہے ۔ یہ نور گویا خود صورتوں میں مجسم ہو کر چمکتا ہے ؛ اسی لیے تجلی یا ظہور سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ جب یہ نور بر نفسِ خود چمکتا ہے تو یہ تجلی بنفسہ ہوتی ہے ۔ جب سالک صفاتِ الٰہی کا جلوہ دیکھتا ہے تو یہ تجلی صفاتی کا جلوہ ہوا اور اگر ذاتِ الٰہی کا جلوہ ہو تو تجلیٔ ذاتی کا مشاہدہ ہوتا ہے ۔

تجلیاتی شعور : ایک چمک کی صورت میں ذہن کا ادراکِ حقائق کرنا ۔ وجدان کی یہی صورت ہے ۔

تجلیٔ الٰہی : تجلی کا مفہوم سطور بالا میں موجود ہے ۔ یہاں اس بات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ فلسفۂ تنزلات کے مطابق مرتبۂ واحدیت مرتبۂ الوہیت ہے ۔ اسی مرتبے میں ذاتِ مطلق ، اللہ کے نام سے موسوم و معروف ہوتی ہے ۔ گویا تجلیٔ الٰہی کا تعلق مرتبۂ واحدیت سے ہے ۔ تنزلات اور واحدیت کے لیے سطور آئندہ کا ملاحظہ فرمائیں ۔ یاد رہے احدیت ، واحدیت وغیرہ مرتبے محض رتبی ہیں اور ازلی اور لازمِ ذات ہیں اور ذات سے ابداً جدا نہیں ۔

تشبیہ : اس کے لفظی معنی مشابہت دینا ہیں اور علم کلام کی اصطلاح میں خالق کو مخلوق کی صفات سے متصف کرنے کے ہیں ۔

تعینات وجودی : ان سے تنزلات مراد ہیں ۔ ضروری شرح تنزلات کے ضمن میں دیکھیں ۔

تعین حقیقی : ذاتِ محض جو صفتِ اطلاق سے بھی منزہ ہے ، ظہور اختیار کرتی ہے تو اس کا ہر مرتبہ تعین کہلاتا ہے ۔

تنزلات : ذاتِ مطلق اپنے حال ، اوصاف اور ذات سے جیسی کہ ہے ویسی رہتے ہوئے اور کسی قسم کے تغیر یا تبدل یا تحول کے بغیر مظاہرِ مختلفہ میں ظہور پذیر ہوتی ہے ۔ صوفیۂ کرام کی اصطلاح میں اسے نزول کہتے ہیں ۔ پس تنزل کے

معنی تقید یا تعین ہونے - یہ وجود محض سے وجود مقید کی طرف نزول کرتا ہے - نزول کے بے شمار مراتب ہیں - لیکن کلی اعتبار سے ان سے چھ مراد لیے جاتے ہیں جو تنزلاتِ ستہ کہلاتے ہیں - یہ علی الترتیب احدیت ، وحدت ، واحدیت ، روح ، مثال اور جسم ہیں - احدیت ، وحدت اور واحدیت مراتبِ الٰہیہ کہلاتے ہیں - صرف رتبی حیثیت رکھتے ہیں ، انفکاک تام کو بھی نہیں - ان حقائق کا تعلق عارفین و اہل یقین کے ذوق و وجدان سے ہے اور وہ ان کے لیے کتاب و سنت کو معیار قرار دیتے ہیں -

تنزیہہ : خداوند تعالیٰ کو اُن تمام باتوں سے مبرا یقین کرنا جو اسے مخلوقات سے مشابہ کرتی ہوں یا اُس کی پاکی و قدوسیت اور عظمت و کبریائی کے خلاف ہوں - صوفیائے کرام تنزیہہ اور تشبیہ کو موردِ بحث بنا کر حق اور خلق کے متعلق حیرت انگیز نکات بیان کرتے ہیں -

جدلیت : انگریزی میں منطق کی اس اصطلاح کو Dialectics کہتے ہیں - عام الفاظ میں حقارت آمیز طور پر ایسے اُس استدلال کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو عملی حیثیت سے مبرا ہو اور لفظی یا محض تجریدی بحث و نزاع سے تعلق رکھتا ہو - فلسفہ میں ہے ہر ایک کا نظام جدلیہ جداگانہ ہے مثلاً زینو (Zeno) کا طریق یہ تھا کہ مدمقابل کی دلیل پہلے صحیح فرض کر کے ، پھر اس کا تضاد واضح کرتا تھا - ہیگل (Hegel) نامناسب تجرید کی بنا پر پیدا ہونے والے اسقام (errors) کو دور کر کے بتدریج حقیقت کا تصور واضح کرتا ہے -

جُگ : ہندوؤں کی اصطلاح میں دورِ زمان -

حادث ، قدیم : حادث وہ شئی جو زمان و مکان کی حدود میں ظاہر ہوتی ہے اور پھر معدوم ہو جاتی ہے - اور قدیم وہ جو ازلی اور ابدی ہے -

حال و مقام : اصطلاحِ تصوف میں حال وہ کیفیت ہے جو خدا کی طرف سے سالک کے دل میں پیدا ہوتی ہے ۔ جب حال طاری ہوتا ہے تو کوشش سے دور نہیں کیا جا سکتا اور جب غائب ہو جاتا ہے تو تکلف سے طاری نہیں کیا جا سکتا ۔ قرب ، محبت ، خوف ، رجا ، شوق وغیرہ حال ہیں ۔ مقام کا تعلق مجاہدے سے ہے۔ سالک خدا کی راہ میں کوشش اور کسب کی کوئی صورت اختیار کرتا ہے ۔ مقامات کی ابتدا توبہ سے ہوتی ہے ، اس کے بعد انابت ، زہد ، توکل وغیرہ مقامات ہیں جو رضا پر ختم ہوتے ہیں ۔ رضا کو حال بھی شمار کیا جاتا ہے لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے جب کسب اور کوشش منقطع ہو کر عشق اور جوش کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں ۔ صاحبِ کشف المحجوب کے الفاظ میں مقام کوشش ہے اور حال بخشش ۔

حقیقتِ بےرنگ : اس سے مراد احدیت ہے ۔

حقیقتِ محمدیہ : تنزلاتِ ستہ میں سے یہ دوسرا مرتبہ ہے اور وحدت کہلاتا ہے ۔ یہ تعینِ اول ہے ۔ انائے مطلق اور اس کے توابعات کا ظہور یہاں کامل ہے ۔ چوں کہ اطلاقیت کا ظہور باقی اشیاء کی نسبت ذواتِ انسانی میں زیادہ ہے اور انسانوں میں بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک مظہرِ اتم ہے ، اطلاقیت کے اس ظہور کے لحاظ سے وحدت کو ذات محمدی کی حقیقت کہا جاتا ہے ۔ یہ یاد رہے کہ حقیقت محمدی رب ہے اور ذات محمدی عبد ۔

حقیقت و مجاز : حقیقت سے ذات حق مراد ہے اور مجاز سے ماسواء ۔

حقیقی شخصیت : شخصیت سے مراد وہ انسان ہے جو ہر شخص کی ذات میں چھپا ہوتا ہے اور تمام اعمال کا سرچشمہ بنتا ہے ۔ مستور ہونے کے باوجود یہی اصل انسان ہوتا ہے ۔ اب حقیقی شخصیت اس مستور وجود کے اندر اس طرح پائی جاتی ہے جس طرح پیاز کے بالائی پردوں کے اندر اس کا اصلی حصہ ہوتا ہے ۔

حقیقی شخصیت کو بروئے کار لانا جان جوکھوں کا کام ہے اور اس کے بغیر اپنے آپ کو انسان تصور کرنا انسانیت کا منہ چڑانا ہے۔

خود آگاہی : عرفانِ نفس۔ من میں ڈوب کر اپنی حقیقت کو پا جانا۔

خیال آفرینی : یہ اصطلاح اسلوب بیان (Style) سے تعلق رکھتی ہے۔ شعراء یا ادیب قوت واہمہ (Fancy) سے کام لے کر نئے نئے خیالات (Conceits) کی آفرینش عمل میں لاتے ہیں۔

خیال پرستی : (Idealism) فلسفے کی اصطلاح ہے۔ اس کی رو سے خیال ہی اشیاء کی اصل قرار پاتی ہے۔

ذاتِ الٰہی : نزول کے جو مراتب ہیں ان سے دوسرا وحدت کہلاتا ہے۔ اور ذات الٰہی وحدت کا دوسرا نام ہے۔ وحدت کا ایک نام حقیقتِ محمدیہ بھی ہے۔

ذاتِ بحت : حق تعالیٰ کی ذات محض۔ احدیت ذات بحت کا مرتبہ ہے۔

ذاتِ حق : خلق کے مقابلے میں خداوند تعالیٰ کو ذات حق کہا جاتا ہے۔

ذات کا علم اجمالی : یہ مرتبہ وحدت پر ہوتا ہے۔ مزید شرح وحدت کی اصطلاح کے زیر دیکھیں۔

ذاتِ واجب الوجود : وہ ذات جس کا عدم ناقابل تصور ہے اور جس کا وجود حقیقی، ذاتی اور دوامی ہے۔ انگریزی میں اس کے لیے Necessary کی اصطلاح مستعمل ہے۔

روحِ کل : اس سے ذات مطلق مراد ہے۔

رعایتِ لفظی : ایک ہی لفظ سے نئے نئے معنی نکالنا۔ یعنی جب بھی استعمال میں آئے، کوئی جدت پیدا کر دینا۔

رعایتِ معنوی : ایک ہی معنی مختلف پیرایہ بیان کے ساتھ پیش کرنا اور اس غرض کے لیے خوب تر پیرایے کی تلاش میں رہنا۔

سالک : تلاش حق میں شریعت کے تقاضوں کا پورا پورا احترام کرتے ہوئے طریقت کی راہ پر چلنے والا صاحب عزم و ارادہ بزرگ۔

سوفسطائی : لفظ Sophist سے ماخوذ ۔ پانچویں صدی عیسوی میں یونان کے اساتذۂ منطق کا گروہ جو دلائل پر زور دیتا تھا ۔

شیونات : ذات کی قابلیات کثرت کو شیونات کہتے ہیں ۔

صنعتِ تمثیل : شعر کے پہلے مصرع میں ایک دعویٰ پیش کرنا اور دوسرے میں "شاعرانہ انداز" سے مثال کے ذریعے اس طرح دلیل لانا کہ دعویٰ ثابت ہو جائے ۔

صورِ علمی : ان سے اعیانِ حق مراد ہیں ۔ ان کو ذوات خلق اور حقائق کونیہ بھی کہتے ہیں جو ذات حق میں مخفی اور علم میں مندرج ہیں ۔ اسی کی ذوات قبل تحقیق عدم ابھی میں ثابت ہیں ۔ ثبوت علمی رکھتی ہیں اور معلومات حق ہیں ۔

عالمِ اصغر : اس سے مراد انسان ہے ۔ حکما کہتے ہیں کہ دیکھنے میں تو یہ عالم اصغر (Microcosmos) ہے مگر حقیقت میں عالم اکبر (Macrocosmos) ہے ۔ بیدلؔ بھی کہتے ہیں :

بمعنی محیط و بصورت نمی

عالمِ اکبر : اس سے مراد ساری کائنات ہے ۔

عقلِ اول : حقیقت محمدی کو عقل اول کہا جاتا ہے ۔ عقل اول اجمالی طور پر تمام حقائق اشیاء پر محیط ہے ۔

عقلِ تاسع : عقل نہم ۔ تفصیل کہ آسماں کے ضمن میں دیکھیے ۔

عینیت : اشیا کو غیر ذات حق نہیں بلکہ عین حق قرار دینا ۔

فلسفۂ تنزلات : ضروری شرح تنزلات کے ضمن میں دیکھیے ۔

قائم بالذات : مراد حق تعالیٰ جو اپنی ذات سے قائم ہے ۔

قدیم اور حادث : حادث کے ذیل میں دیکھیے ۔

قلب : Mind اور مادہ Matter ان دونوں کی ماہیت کے متعلق بحثیں مدتوں سے آ رہی ہیں ۔ صوفیائے کرام قلب سے مراد باطنی ادراک کا آلہ بھی لیتے ہیں ۔

کشف : اس کے لغوی معنی ہیں کھولنا ۔ نور باطن کے ذریعے و تعات و حقائق کا ادراک کشف کہلاتا ہے ۔ کشف کے ذریعے مادی اور روحانی دونوں قسم کے حقائق تک باطنی

کے سامنے آتے ہیں ۔ کشف کی بنا پر دل کے اسرار معلوم کرنا کشف‌الصدور اور قبروں کے حالات معلوم کرنا کشف‌القبور کہلاتا ہے ۔ یہ ظنی علم ہے تاہم اکابر صوفیہ اسے چنداں اہمیت نہیں دیتے ۔ بلکہ فرماتے ہیں :
” کعش برسر کشف زن و راہ خویش بگیر ۔“

کشف تکوینی : عالم کون و فساد میں جو کچھ واقع ہونے والا ہو اس سے آگاہی ۔ حضرت موسیٰ ؑ کے مقابلے میں حضرت خضر ؑ کو کشف تکوینی حاصل تھا ۔

کتاب بصورت کائنات : اس سے وہ نظام فکر مراد ہے جس کی رو سے مظاہر تخلیق مختلف اسمائے الٰہی کا مظہر ہیں ۔ مثلاً انسان اسم جامع کا مظہر ہے ۔

کنایہ : ذہن میں کسی چیز کو کسی اور چیز سے تشبیہ دے کر مشبہ مخفی رکھنا اور مشبہ بہ کو مذکور کرنا ۔ مثلاً :

لو لو از نرگس فرو بارید و گل را آب داد
و ز تگرگ روح پرور مالش عناب داد

اس شعر میں متعدد چیزیں جو مشبہ ہیں ، مخفی ہیں ۔

گوپی : ہندو عورت جو کرشن مہاراج کی محبت سے سرشار ہو کر تارک‌الدنیا ہو جاتی ہے ۔

لا ادریت : ذات حق کا ادراک سے ماوراء ہونا ۔ یہ مرتبہٗ ہویت ہے جو بطون‌البطون اور خفاءالخفاء ہے ۔ یہ احدیت کے دیگر نام ہیں ۔

مابعدالطبیعات : (Metaphysics) یہ ارسطو کا رکھا ہؤا نام ہے ۔ اس کا تعلق ان ارفع اصولوں سے ہوتا ہے جن سے کائنات کی تشریح کی جاتی ہے ۔ ساتھ ہی اس کے ذریعے کائنات کا نظریہ پیش کیا جاتا ہے جو ان اصولوں پر مبنی ہوتا ہے ۔ مذہب اور تصوف کے مسائل بھی اس طرح فلسفیانہ مباحث بن جاتے ہیں ۔

مثالیہ : صنعت تمثیل مراد ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے ۔

مجازِ مرسل : علم بیان کی اصطلاح میں مجازِ مرسل سے مراد وہ لفظ ہے جو اپنے حقیقی معنی کی بجائے مجازی معنی میں استعمال ہو اور اس کے حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کے سوا کوئی اور تعلق ہو ۔ مثلاً :

حمد بےحد مر خدای پاک را
آن کہ ایمان داد مشت خاک را

یہاں مشت خاک سے مراد انسان ہے ، اور حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کے سوا یہ تعلق ہے کہ انسان وجود میں آنے سے پہلے خاک تھا ۔

مجرد : لفظ تجرید سے بنا ہے جس کی تشریح کی جا چکی ہے ۔ اس کے مطابق تصوف میں اس کا معنی ہوا علایق اور ان کی احتیاج سے پاک ، اور فلسفے میں اس کا مطلب ہوا اخذ کردہ ذہنی نتیجہ ۔

مجسم : فلسفے میں مجرد کی ضد ۔ جسم ابعاد ثلاثہ رکھتا ہے جبکہ مجرّد ایک ذہنی حیثیت ہے ۔

مدارجِ تصوف : ان سے مراد فنافی‌الشیخ ، فنافی‌الرسول ، فنافی‌اللہ اور باقی‌باللہ کے مدارج ہیں ۔

مراتبِ عقول : ان سے عقول عشرہ مراد ہیں ۔ "نُہ آسمان" کے ذیل میں تشریح دیکھیے ۔

مراتبِ کونیہ : تنزلاتِ ستہ میں سے روح ، مثال اور جسم کو مراتبِ کونیہ کہتے ہیں ۔

مراتبِ وجود : ان سے مراد تنزلاتِ ستہ ہیں ۔

مراعاۃالنظیر : آپس میں مناسبت رکھنے والے الفاظ کی رعایت کرنا ۔ مثلاً گل و خار ، بحر و بر ۔

مرتبۂ جامع : اس سے مراد انسان ہے جو حق کی تمام صفات کا جامع ہے ۔

معروضی : (Objective) خارجی یا ظاہری ۔

ممکن الوجود : وہ ہے جس کا نہ ہونا عدم ناقابل تصور ہو ، نہ وجود ناقابل تصور ہو ۔

مناصبِ تصوف : قطب ، غوث ، فرد ، قطب وحدت وغیرہ ۔ حصول مناصب میں اگرچہ مجاہدہ کا بڑا دخل ہے مگر انجام کا انحصار بخشش پر ہے ۔

منفی رجحانات : مذموم صفات جو ہماری شخصیت کو مجروح کرتی ہیں اور اسے صحیح طور پر نشو و نما نہیں پانے دیتیں ۔

من و تو : صوفیائے کرام ہست مطلق کو مشار الیہ بناتے ہوئے لفظ ''من'' سے تعبیر کرتے ہیں اور ''من و تو'' ذوات انسانی کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔ مارٹن بوبر (Martin Buber) اپنی تصنیف 'من و تو' میں خدا کو اپنا ''تو'' یعنی مخاطب بنا کر شریک گفتگو کرتا ہے اور حقیقی اتصال کا تجربہ کرتا ہے ۔ اس طرح وہ خدا ، واردات روحانی اور ماورائے ادراک عناصر کو زیر بحث لاتا ہے ۔ بیدل کے ہاں بھی لفظ ''من'' ہست مطلق میں گہرے انجذاب کا پتا دیتا ہے اور اتصال کے عجیب و غریب حقائق بیان کرتا ہے ۔ بیدل کا یہ خصوصی موضوع ہے اور خاص توجہ کا طالب ہے ۔

موضوعی : (Subjective) ۔ داخلی یا باطنی ۔

موناڈ : لیبنز (Leibniz) ہر شئی کی اصل قوت یا فعالیت قرار دیتا ہے جو طبعی اور اندرونی (Immanent) ہوتی ہے ۔ اس قسم کی ہر اکائی کو وہ موناڈ (Monad) کہتا ہے ۔ جس طرح اقبال ساقی نامہ میں خودی کے متعلق کہتا ہے :

مگر عین محفل میں خلوت نشین

یہ موناڈ بھی محفل میں رہتے ہوئے خلوت نشین ہوتے ہیں ۔ ان کے دروازے دوسروں کے لیے نہیں کھلتے ۔ یعنی نہ یہ کسی کا اثر قبول کرتے ہیں اور نہ ہی کسی پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ بلکہ اپنی آزادانہ حیثیت برقرار رکھ کر ارتقاء پذیر رہتے ہیں ۔ اس کے باوجود ہر موناڈ آئینۂ عالم ہوتا ہے

اور اپنی ذات میں تمام کائنات کی نمائندگی کر رہا ہوتا ہے اور اس طرح اپنی انفرادیت قائم رکھ کر تمام اشیاء میں ایک زندہ وحدت قائم کر دیتا ہے ۔ جو موناڈ جس درجے کی وضاحت کے ساتھ کائنات کی نمائندگی کرتا ہے اسے اتنی ہی امتیازی حیثیت حاصل ہوتی ہے ۔ اعلیٰ ترین موناڈ جسے لیبنیز مرکزی موناڈ کہتا ہے ، خدا ہے کیوں کہ وہ کامل وضاحت کے ساتھ کائنات کی نمائندگی کرتا ہے ۔ اس لیے وہ فعالیت محضہ (pure activity) ہے ۔

نصب العینی انسان : (Ideal Man) ۔ وہ انسان کامل جو نصب العین کی صورت میں سامنے رہتا ہے ۔

نور محمدی : یہ مرتبۂ وحدت یا حقیقت محمدی ہے ۔ اس کی توجیہ بھی حقیقت محمدی کی طرح کی جاتی ہے ۔ چونکہ ذات محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کامل و اکمل ہے اس لیے کامل نور کا ہو الانے کامل کا ایک اعتبار ہے ، اس میں ظہور ہوتا ہے اور اسی کامل نور سے اشیاء کی تخلیق ہوتی ہے ۔ اس لیے کہا جاتا ہے نور محمدی سے اشیا کی تخلیق ہوئی ہے ۔ یہاں بھی یاد رہے نور محمدی رب ہے اور ذات محمدی عبد ۔

نوفلاطونی : فلاطینوس (Plotinus) کا پیرو کار یا اس سے متعلق ۔ یہ مفکر (۲۰۶ تا ۲۶۹ء) مصر کا رہنے والا تھا ۔ وحدت اشراقیت کا بانی ہے ۔ جس کی رو سے شئی کو غیرذات حق نہیں بلکہ عین حق قرار دیا گیا لیکن شئی زیر نظر ہو تو اسلام یہ ازوحت کی تعلیم دیتا ہے ۔

نُہ آسمان : ابن سینا کے نظریۂ تخلیق کے مطابق اللہ تعالیٰ نے عقل اول پیدا کیا ۔ عقلِ اول نے عقلِ دوم اور فلکِ اول کی تخلیق کی ۔ یہ سلسلہ بڑھتا رہا حتی کہ اس طرح دہ عقول (عقول عشرہ) اور نُہ افلاک یا آسمان پیدا ہو گئے ۔

واجب الوجود : ذات و حسبا بوجود کے تحت تصریح دیکھیے ۔

واحدیت : جب سالک حق کی ذات کو اس اعتبار سے ملحوظ رکھتا ہے

کہ وہ ذات اپنا تفصیلی علم رکھتی ہے ، اپنے اسماء و صفات و معلومات کو جملہ تفصیلات اور باہمی امتیازات کے ساتھ جانتی ہے تو اس مرتبے کو واحدیت یا تعین ثانی یا حقیقت انسانیہ کہتے ہیں ۔

وجوب : یہ واجب کی صفت ہے ۔

وحدت : جب سالک حق تعالیٰ کی ذات کا اس اعتبار سے لحاظ کرتا ہے کہ وہ ذات اپنا اجمالی علم رکھتی ہے ، اپنی ذات کا تمام شیونات کے ساتھ بطریق اجمال ادراک کرتی ہے کہ انا و لاغیری یعنی میں ہی موجود ہوں اور میرے سوا کوئی موجود نہیں اور مجھ میں ظہور کی قابلیت اور صلاحیت موجود ہے ، تو اس مرتبے کو وحدت یا تعین اول یا حقیقت محمدیہ کہا جاتا ہے ۔ اس مرتبے کو انائے مطلق سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے ۔

وحدت شہود : جو کچھ نظر آ رہا ہے ، وہ وحدت ہے ۔ وحدت شہود شیخ مجدد الف ثانیؒ کے نزدیک وحدت وجود کی تعبیر ہے ۔

وحدت وجود : وجود حقیقی ایک ہے ۔ باقی اس کے اظلال اور شیون ہیں ۔ یہ ابن العربیؒ کا نظریہ ہے اور اکثر صوفیائے کرام کا نظریہ بھی یہی ہے ۔ اس نظریے کے ذریعے خدا اور کائنات کی ثنویت دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

وجود : عرفاء کے نزدیک وجود (بمعنی موجود) کا اطلاق صرف حق تعالیٰ پر ہوتا ہے ، یعنی وجود حقیقی حق تعالیٰ ہی کا ہے ۔ اس کا غیر عدم ہے اور عدم لاشئ محض ہے ۔ وجود کو صفت ذات نہیں قرار دیا جاتا بلکہ عین ذات تسلیم کیا جاتا ہے کیوں کہ ذات کا وجود کے بغیر موجود ہونا بداہتہً محال ہے ۔

وجودیت : (Existentialism) ۔ یہ فلسفۂ وجود ہے اور یورپی فکر کا جدید ترین پیرایۂ اظہار ہے ۔ اس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ فرد کا وجود اس کے جوہر (Essence) پر مقدم

ہے ۔ اس نظامِ فکر میں فرد ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے ۔ فرد کی اہمیت ، اس کا صاحب اختیار ہونا اور ذمہ دار ہونا یہ تین امور وجودیت کے تمام مفکرین کا مشترکہ سرمایہ ہیں اور سب کے فکر کا نقطہٴ آغاز قرار پاتے ہیں ۔ لیکن آگے چل کر سب کی مسالیں مختلف ہو جاتی ہیں ۔ رومی ، بیدل اور اقبال کے افکار وجودیوں سے کسی حد تک مماثلت رکھتے ہیں ۔ لیکن ان مسلمان مفکرین کے افکار کی اساس خالصۃً اسلامی تصوف پر ہے اور اس اساس پر جو عمارت تعمیر ہوئی ہے ، وہ بھی زیادہ جمیل اور جلیل ہے ۔

ویدانت : ہندوؤں کا نظامِ فکر اور اصولِ تحریکہٴ باطن ۔

کتابیات

(اردو کی امدادی کتب کے سلسلے میں بھی انگریزی
کی طرح مصنف کا نام پہلے دیا گیا ہے)

(الف) اُردو کتب

ابن العربی : فصوص الحکم ۔
ابوالفضل : آئین اکبری ۔
ابوالکلام آزاد : ترجمان القرآن ۔
آزاد بلگرامی : خزانۂ عامرہ ۔
آزاد بلگرامی : سرو آزاد ۔
آزاد ، محمد حسین : آب حیات ۔
آزاد ، محمد حسین : سخندان فارس ۔
آزاد ، محمد حسین : نگارستان فارس ۔
اقبال : بانگ درا ۔
اقبال : ضرب کلیم ۔
اقبال : فلسفۂ عجم (ترجمہ از انگریزی) ۔
اقبال : تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (ترجمہ نذیر نیازی) ۔
الجیلی : انسان کامل (ترجمہ اُردو) ۔
الند رام مخلص : چمنستان (ق) ۔
الند رام مخلص : مرآۃالاصطلاح (ق) ۔
اند رام مخلص : قلمی ورق ، مقبوضہ مولانا محمد شفیع مرحوم ۔
اورینٹل کالج میگزین : بابت اپریل ۱۹۵۳ء ۔
ایزد بخش رسا : رقعات (قلمی) ۔
بشیرالدین : واقعات دارالحکومت دہلی ۔
برہان الدین احمد فاروقی : مجدد سرہندی کا نظریۂ توحید ۔
بیدل : کلیات مطبوعہ صفدری پریس بمبئی ۔
بیدل : کلیات مقبوضہ کتابخانۂ معارف کابل ، کاتب غلام حسین ۔
بیدل : رقعات مطبوعہ نولکشور پریس ۔
تذکرہ : تحفۃالاحباب فی تذکرۃالاصحاب ، مطبوعہ تاشقند ۔
تذکرہ : درر المنثور ۔

تذکرہ : مقالات الشعراء (بحوالہ اسپرنگر) ۔
تذکرہ : ہمیشہ بہار (بحوالہ اسپرنگر) ۔
ثاقب کانپوری : انتخاب سودا ۔
حالی ، الطاف حسین : یادگارِ غالب ۔
حسین دوست : تذکرۂ حسینی ۔
حسین قلی خان : نشترِ عشق (ق) ۔
خافی خان : منتخب اللباب ۔
خانِ آرزو : مجمع النفائس ۔
خلیق احمد نظامی : تاریخ مشایخ چشت ۔
خوشگو : سفینہ ۔
درگاہ قلی خان : مرقع دہلی ۔
دیوانِ آصف : (نظام الملک) ۔
دیوانِ شاکر : (نظام الملک) ۔
رحمان علی : تذکرۂ علمائے ہند ۔
رحیم بخش : حیاتِ ولی ۔
رضی الدین صدیقی : اقبال کا تصورِ زماں ۔
زٹلی : کلیات ۔
ساقی مستعد خان : مآثر عالم گیری ۔
سر خوش : کلمات الشعراء ۔
سر سید احمد : آثار الصنادید ۔
سلطان باہو : نور الہدیٰ ۔
سلطان باہو : شمس العارفین ۔
سلطان باہو : رسالہ روحی ۔
سید سلیمان ندوی : سفر کابل ۔
سید سلیمان ندوی : حیاتِ شبلی ۔
شاد عظیم آبادی : نوائے وطن ۔
شاہ نواز خان : مآثر الامراء ۔
شبلی نعمانی : شعر العجم ۔
شیر خان لودھی : مرآۃ الخیال ۔
صباح الدین : بزم تیموریہ ۔
عابد علی عابد : انتقاد ۔
عابد علی عابد : شعر اقبال ۔
عباد اللہ اختر : بیدل ۔
عبدالجبار خان : تذکرۂ محبوب الزمن ۔
عبدالحکیم حاکم : تذکرۂ مردم دیدہ ۔
عبدالحکیم خلیفہ : داستانِ دانش ۔
عبدالحکیم خلیفہ : فکرِ اقبال ۔
عبدالحکیم خلیفہ : حکمتِ رومی ۔
عبدالحق : غرابت نگار ۔
عبدالحی : تذکرۂ گل رعنا ۔
عبدالرحمان بجنوری : دیوانِ غالب ۔
عبدالرحیم خواجہ : معارف النفس ۔
عبدالغفور نساخ : سخن شعراء ۔
عبدالوہاب افتخار : تذکرۂ بے نظیر ۔
عبداللہ خان قاری : ادبیات ۔
عظمت اللہ بلگرامی : سفینۂ بے خبر ۔
علی حزیں ، شیخ : کلیات ۔
علی حسن خان : صبح گلشن ۔
علی حسن خان : بزم سخن ۔
علی رضا نقوی ، ڈاکٹر سید : تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان
علی لطف ، میرزا : گلشنِ ہند ۔
علی ہجویریؒ : کشف المحجوب ۔

غلام حسین : سیرالمتاخرین ۔
غلام ہمدانی مصحفی : عقدِ ثریا ۔
غیاث اللغات ۔
فتح علی حسینی : تذکرۂ ریختہ گویاں ۔
فرزند احمد صفیر بلگرامی ۔ تذکرۂ جلوۂ خضر ۔
قتیل : چار شربت ۔
قیام الدین قائم : مخزنِ نکات ۔
کابل میگزین کے ۱۹۵۱ء تک کے مجلے ۔
کاشانی : شرحِ فصوص الحکم ۔
گلشنِ سمات : مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی ۔
لچھمی نرائن شفیق ۔ چمنستانِ شعراء ۔
مجدد الف ثانیؒ : مکتوبات ۔
مجلہ اردو : جنوری ۱۹۵۸ء ۔
مجلہ سویرا : سالنامہ ۱۹۵۷ء ۔
مجلہ ماہِ نو : اپریل ۱۹۶۱ء ۔
مجلہ معارف : اعظم گڑھ ، جنوری ۱۹۳۳ء ، مئی ۱۹۳۲ء ، جولائی ۱۹۳۲ء ۔
مجلہ ہدیہ ایمی : کابل ۔
محمد اکرام : رودِ کوثر ۔
محمد صالح کمبوہ : عمل صالح ۔
محمد صدیق حسن : شمع انجمن ۔
محمد صدیق حسن : روز روشن ۔
محمد طاہر نصرآبادی : تذکرۂ نصرآبادی ۔
محمد عالم شاہ مزاراتِ اولیائے دہلی ۔
محمد علی تھانوی : اصطلاحات الفنون ۔
محمد لطیف : آگرہ ۔
محمود شیرانی : پنجاب میں اردو ۔
معین الدین : بہار اور اردو شاعری ۔
میر تقی میر : نکات الشعراء ۔
میر درد : دیوان (عکس از مخطوطہ ، مقبوضہ ڈاکٹر وحید قریشی) ۔
میر حسن دہلوی : تذکرۂ شعرائے اردو ۔
میرزا سودا : دیوان ۔
میرزا مہدی : تاریخ جہاں کشای نادری ۔
میر قدرت اللہ قاسم : مجموعۂ نغز ۔
میر ولی الدین : قرآن اور تصوف ۔
نصیر احمد ناصر : جمالیات (قرآنِ کریم کی روشنی میں) ۔
نورالحسن خاں : تذکرۂ طور کلیم ۔
نورالدین ظفر آبادی : تجلیِ نور ۔
نئی تحریریں نمبر ۱ ۔
نیاز فتح پوری : مکتوبات ۔
والہ داغستانی : ریاض الشعراء ۔
یوسف حسین خاں : اردو غزل ۔
یوسف حسین خاں : نظام الملک آصف جاہ ۔

(ب) انگریزی کتب

Abdul Hakim, Khalifa, *Metaphysics of Rumi.*

Abdul Ghani, Doctor, *Life and works of Bedil*

Abdul Ghani, Professor, *History of Persian Literature at the Mughul Court.*

Cambridge History of India.

Catalogue of the Arabic and Persian Manuscripts in the Oriental Public Library at Bankipur.

Elphinstone, M, *History of India.*

Fergusson, *Mughul Architecture.*

Iqbal, Dr Muhammad, *Stray Reflections.*

Irvine, *Later Mughuls.*

James, William, *Varieties of Religious Experience.*

Muhammad Sharif, Professor, *Beauty.*

Nicholson, *The Mystics of Islam.*

Nicholson, *Kashful Mahjub (tr).*

Nicholson, *The Idea of Personality in sufism.*

Nicholson, *Studies in Islamic Mysticism.*

Rieu, Dr, *Catalogue of Persian Mss. in the British Museum London.*

Russel. *History of Philosophy.*

Sharma, *Mughul Empire in India*

Shushtrey, A.M.A., *Outlines of Islamic Culture.*

Sprenger, *Catalogue of the Arabic, Persian and Hindustaney Mss.*

Wahid Mirza, *Life and Works of Amir Khusrau.*

Windelband, Dr. W., *A History of Philosophy.*

اشاریہ

مرتبہ : احمد رضا

۱۔ اشخاص ۴۲۳

۲۔ مقامات اور ادارے ۴۳۷

۳۔ کتب ، رسائل ، مقالات ۴۴۳

۴۔ اصطلاحات و تلمیحات ۴۵۰

اشخاص

آ

آدم علیه السلام ، حضرت : ۲۲۳ ، ۲۲۳ ، ۲۸۵ ، ۲۸۶ ، ۳۲۴ -
آزاد بلگرامی : ۱۰۳ ، ۱۱۰ ، ۱۱۲ ، ۱۲۵ ، ۳۶۴ -
آصف‌جاه آصف ، نظام الملک : ۳۵۴ ، ۳۸۱ -
آصف جاه سابع : ۱۲۵ ، ۳۸۳ -
آقا ابراهیم فیضان (رک : ابراهیم فیضان) -
آقا محمد حسین خان ناجی (رک : محمد حسین خان ناجی) -
آقای سردار فیض محمد خان زکریا (رک : فیض محمد خان زکریا)
آقای سرور خان گویا : (رک : سرور خان گویا) -
آقای عالم شاهی : (رک : عالم شاهی آقا) -
آقای عبدالحی حبیبی : (رک : عبدالحی حبیبی) -
آق سهسک : ۱۱ ، ۱۸۶ -

الف

ابراهیم ادهم : ۳۹ -
ابراهیم فیضان : ۳۶۱ -
ابراهیم موسینوف : ۱۴ ، ۱۳۳ -
ابن العربی : ۲۱ ، ۵۹ ، ۶۲ ، ۱۰۵ ، ۱۹۱ ، ۲۸۳ تا ۲۸۹ ، ۲۹۳ ، ۲۹۹ ، ۳۰۶ ، ۳۱۵ ، ۳۲۶ ، ۳۲۴ -
ابن سینا : ۲۱ ، ۶۲ ، ۱۳۲ ، ۳۸۹ ، ۳۱۳ ، ۳۱۵ -
ابوالحسن خرقانی ، شیخ : ۱۵ -
ابوالخیر ، میرزا : ۳۸۲ -
ابوالفیض مست : ۳۴۶ -
ابوالفیض معنی ، سید : ۳۴۹ -
ابوالوفا ، میرزا : ۳۸۲ -
ابوبکر صدیق ، حضرت : ۲۱۳ ، ۳۰۶ -
ابوبکر طوسی : ۱۲۶ -
احمدؒ سرهندی ، حضرت : ۳۰ ، ۱۲۴ ، ۱۲۸ -

احمد شاہ ابدالی : ۱۱۴ ، ۱۲۸ ، ۱۲۹ ، ۲۵۳ -
احمد عبرت : ۹ ، ۹۴ ، ۳۵۴ -
احمد مخدوم : ۱۷ -
ارادت خاں : ۲۹۴ -
ارادت خاں واضح ، میرزا مبارک اللہ : ۳۶۳ ، ۳۷۵ -
ارسطو : ۱۲۱ ، ۱۹۲ ، ۲۲۵ ، ۳۱۱ -
اروِن : ۳۸۶ ، ۳۸۹ تا ۳۹۱ ، ۳۹۲ ، ۳۹۴ -
اسپرنگر : ۳۴۴ ، ۳۵۸ ، ۳۵۹ ، ۳۶۰ ، ۳۶۲ ، ۳۷۴ ، ۳۷۵ ، ۳۷۷ ، ۳۷۹ ، ۳۸۰ -
اسد (غالب بھی دیکھیے) : ۱۲۵ ، ۱۶۳ -
اسد خاں : ۳۵۲ ، ۳۵۹ -
اعظم شاہ ، شہزادہ : ۳۹ ، ۴۲ ، ۵۴ ، ۶۰ ، ۶۴ تا ۶۷ ، ۷۱ ، ۷۸ ، ۳۴۲ تا ۳۴۵ ، ۳۵۱ ، ۳۵۲ -
افلاطون : ۴ ، ۱۸۹ ، ۱۹۲ ، ۲۱۱ ، ۲۲۵ ، ۲۹۸ ، ۳۰۰ -
اقبال ، علامہ ، ڈاکٹر : ۴ ، ۱۱ ، ۱۵ ، ۱۶ ، ۱۹ ، ۲۰ ، ۳۰ ، ۳۲ ، ۴۰ ، ۱۱۳ ، ۱۲۲ تا ۱۲۴ ، ۱۲۸ ، ۱۳۷ ، ۱۴۱ ، ۱۵۸ ، ۱۵۹ ، ۱۸۶ ، ۱۸۸ ، ۲۲۱ ، ۲۳۰ ، ۲۵۲ تا ۲۵۵ ، ۲۸۳ ، ۲۸۹ ، ۲۹۲ ، ۲۹۳ ، ۲۹۹ ، ۳۰۳ تا ۳۰۶ ، ۳۲۸ ، ۴۱۳ ، ۴۱۶ -
اکبر الہ آبادی : ۲۲ -
اکبر ، جلال الدین محمد ، بادشاہ : ۲۹ ، ۵۱ ، ۷۱ ، ۳۸۹ -
الجیلی : ۲۹۲ -
اللہ وردی : ۲۹۴ -
امانت رام امانت : ۳۷۸ -
امتیاز محل (لعل کنور بھی دیکھیے) : ۳۸۸ ، ۳۹۰ -
امیر خاں انجام ، نواب ، عمدۃ الملک : ۱۲۰ ، ۱۲۲ ، ۳۶۹ -
امیر خسرو : ۴۶ ، ۷۷ ، ۱۶۵ ، ۱۹۲ ، ۳۰۹ -
انس ، ڈاکٹر : (رک : ڈاکٹر انس) -
انند رام مخلص : ۷۷ ، ۱۰۴ ، ۱۱۱ ، ۱۱۵ ، ۱۲۰ ، ۱۹۱ ، ۲۸۵ ، ۳۷۴ ، ۳۷۵ -
انوپ بائی : ۳۸۷ -
انوری : ۶۰ ، ۷۹ -
اورنگ زیب عالم گیر : ۲۱ ، ۲۷ ، ۳۹ ، ۴۰ ، ۵۰ تا ۵۳ ، ۶۳ تا ۶۶ ، ۷۳ ، ۷۵ ، ۸۲ ، ۸۶ ، ۱۰۰ ، ۱۳۶ ، ۲۰۱ ، ۲۴۴ ، ۲۳۵ ، ۲۵۳ ، ۳۳۰ ، ۳۳۱ ، ۳۴۳ ، ۳۴۵ ، ۳۵۰ تا ۳۵۲ ، ۳۵۹ ، ۳۶۶ ، ۳۶۷ ، ۳۷۰ ،

۲۸۲ ، ۳۸۶ ، ۳۹۰ ، ۳۹۴ ۔
ایاز : ۱۹ ۔
ایزد بخش رسا : ۶۴ ، ۳۶۲ ۔

ب

بابجی رام لروکا : ۱۳۲ ۔
بایزید بسطامی : ۱۵ ، ۲۱ ، ۴۹ ، ۵۴ ، ۱۰۵ ، ۱۹۲ ۔
برٹرنڈرسل : ۲۲۶ ، ۲۸۹ ۔
برخوردار بیگ فدوی : ۳۶۱ ۔
برکات احمد ، سید : ۱۹ ۔
برگساں : ۲۳۰ ، ۲۸۸ ، ۳۲۹ ۔
برہان الدین راز الٰہی : ۶۴ ۔
بشپ برکلے : ۲۹۸ ۔
بلاخمن : ۳۸۶ ۔
بندرا بن داس خوشگو : (رک : خوش گو بندرا بن داس) ۔
بوبر : (رک : مارٹن بوبر) ۔
بوسانی ، پروفیسر : ۱۹ ۔
بہادر شاہ : ۷۵ ، ۷۸ ، ۲۴۵ ، ۳۵۷ ، ۳۸۷ ، ۳۹۱ ۔
بہار ، ملک الشعرا : ۲۲ ۔
بیدار بخت : ۳۴۳ ۔
بیدل ، میرزا عبدالقادر ۔ (تقریباً ہر صفحے پر ان کا ذکر موجود ہے) ۔
بیکن : ۲۶۸ ، ۳۲۲ ۔

پ

پادشاہ بیگم : ۳۹۳ ۔
پرسی لائیڈز : ۲۹۸ ۔

ت

تاش بین ، میرزا : ۴۷ ، ۳۱۷ ، ۳۸۶ ۔
تیمور ، امیر : ۵۰ ، ۱۱۳ ، ۱۱۸ ۔
تیمور شاہ : ۱۲۹ ۔

ٹ

ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ : ۲۷۰ ۔

ج

جامی ، مولانا : ۱۹ ، ۴۶ ، ۷۹ ، ۱۹۲ ، ۳۱۵ ۔
جعفر خان ، عمدۃ الملک : ۶۷ ، ۳۴۵ ۔
جعفر زٹلی ، میر : ۶۹ ، ۸۸ ، ۳۶۷ ۔
جلال الدین دوانی : ۳۰۴ ۔
جمدۃ الملک : (رک : جعفر خان جمدۃ الملک) ۔
جنید بغدادی : ۲۱ ، ۴۹ ، ۵۴ ، ۱۹۲ ، ۲۰۷ ۔
جہاندار شاہ : ۲۱ ، ۷۴ ، ۷۵ ، ۱۴۰ ، ۲۴۵ ، ۳۵۲ ، ۳۱۷ ، ۳۶۹ تا ۳۷۱ ، ۳۸۸ ، ۳۸۹ ، ۳۹۰ ، تا ۳۹۷ ۔
جہاں شاہ : ۳۸۷ ، ۳۸۸ ۔
جہانگیر بادشاہ : ۵۱ ، ۷۱ ، ۳۸۶ ، ۳۹۰ ۔

جوہر : ۱۱ ، ۱۸٦ ، ۱۸۷ ، ۳۹۲ -
جین پال سارتر : ۲۳۰ ، ۲۹۱ -

چ

چنگیز خاں : ۷۱ -
چین قلیچ خاں : ۲۹۱ ، ۳۹۲ -

ح

حافظ : (رک : خواجہ حافظ) -
حالی ، خواجہ الطاف حسین : ۳۷ ، ۱۳۰ -
حامد علی خاں ، مولانا : ۹ -
حسام الدین : ٦۷ -
حسن علی عبداللہ خاں : ۱۰۳ ، ۳۰۰ ، ۳۴۲ ، ۳۹۵ -
حسن نظامی ، خواجہ ، مولانا : ۲۵ تا ۱۲۸ ، ۱۳۱ ، ۳۸۳ -
حسین دوست : ۳۳٦ -
حسین علی خاں بارہہ ، امیر الامرا : ۳۹ ، ٦۸ ، ۷۲ ، ۹۵ ، ۱۰۳ ، ۳۷۱ ، ۳۷۲ ، ۳۷٦ ، ۳۹۵ -
حسین قلیچ خاں بہادر : ۳٦۳ -
حسین قلی خاں عظیم آبادی ، نواب : ۱۰۳ ، ۱۳۵ ، ۳۳۷ ، ۳۳۸ ، ۳۴۳ ، ۳٦۳ -
حفیظ جالندھری : ۱۳۷ -
حکیم چند ندرت : ۳۷۸ -
حکیم حسین شہرت : ۳۴۳ ، ۳۷۴ -
حکیم دیو جانس کلبی : ۹٦ -
حکیم سرمد شہید : ۳۳۷ ، ۳۳۸ -

خ

خاقی خان : ۳۸۵ ، ۳۸۷ ، ۳۸۹ -
خاقانی : ۱۰۵ -
خالدہ عینی : ۱۷ -
خان آرزو : (رک : سراج الدین علی خان آرزو) -
خانہ زاد خاں : ۳۸۹ -
خسرو ، امیر : (رک : امیر خسرو) -
خسرو بیگ ، میرزا : ۳۸۲ -
خصوصیت خاں : ۳۸٦ -
خضر علیہ السلام : ۲۰۳ ، ۳۱۱ -
خلیق احمد نظامی : ٦۸ -
خلیل اللہ خاں خلیلی : ۱۸ ، ۱۲۷ ، ۱۲۸ ، ۳۸۳ -
خواجہ احرار : ۱۷ -
خواجہ تہوّر حسین : ۱۱۳ -
خواجہ حافظ شیرازی : ۱۷ ، ۲۱ ، ۳۸ ، ۱۰۵ ، ۳۰۹ ، ۳۳۸ -
خواجہ حبیب اللہ : ۳٦۲ -
خواجہ سلیمان : ۹۳ ، ۳۴۴ -
خواجہ عباد اللہ اختر : ۱۲ ، ۱۳ ، ۱٦ ، ۱۳٦ ، ۲۹۹ -
خواجہ عبد الرشید ، کرنل : ۱۱ ، ۱۲ ، ۱۳ ، ۱٦ ، ۲۰ ، ۱۸٦ -
خواجہ عبد اللہ سالک : ۳۳۳ -

خواجہ معین‌الدین چشتی اجمیری : ۲۸ -
خواجہ نظام الدین اولیا : ۲۸ ، ۳۶ -
خوش حال چند : ۵۹ -
خوش حال خان : ۳۹۰ ، ۳۹۱ ، ۳۹۳ -
خوش حال خان خٹک : ۵۳ -
خوشگو ، بندرا بن داس : ۶۰ ، ۶۳ تا ۶۷ ، ۷۶ تا ۷۸ ، ۸۰ تا ۸۲ ، ۸۳ ، ۸۶ ، ۸۸ ، ۹۱ ، ۹۳ ، ۹۳ ، ۹۷ ، ۹۸ ، ۱۰۲ تا ۱۰۷ ، ۱۱۰ ، ۱۱۱ ، ۱۱۵ ، ۱۲۵ ، ۱۲۶ ، ۲۸۳ ، ۲۸۵ ، ۳۳۶ ، ۳۳۷ ، ۳۳۲ تا ۳۳۶ ، ۳۳۸ ، ۳۳۹ ، ۳۵۱ ، ۳۵۳ تا ۳۵۶ ، ۳۵۸ تا ۳۶۳ ، ۳۶۶ ، ۳۶۷ ، ۳۶۹ ، ۳۷۱ ، ۳۷۳ تا ۳۷۹ ، ۳۸۷ ، ۳۸۹ -

د

دارا شکوہ : ۲۷ ، ۳۷ ، ۴۰ -
دانش بخاراٸی : ۱۷ -
دانتے : ۱۳۹ ، ۱۵۳ ، ۱۵۵ ، ۲۵۳ ، ۲۵۵ -
درد ، خواجہ میر : ۳۵ ، ۱۱۹ ، ۱۲۱ -
درگاہ قلی خان ، نواب : ۱۰۸ تا ۱۱۱ ، ۱۱۵ ، ۱۲۱ ، ۱۲۵ ، ۳۷۹ ، ۳۹۹ -

ڈ

ڈاکٹر ابراہیم موسوف : (رک : ابراہیم موسوف ، ڈاکٹر) -
ڈاکٹر انس : ۳۸۳ -
ڈاکٹر ربو : (رک : ربو ، ڈاکٹر) -
ڈاکٹر عبدالغنی : (رک : عبدالغنی ، ڈاکٹر) -
ڈاکٹر سید عبداللہ : (رک : سید محمد عبداللہ ، ڈاکٹر) :
ڈاکٹر محمد باقر : (رک : محمد باقر ، ڈاکٹر) -
ڈاکٹر وحید قریشی : (رک : وحید قریشی ، ڈاکٹر) -
ڈاکٹر یوسف حسین : (رک : یوسف حسین ، ڈاکٹر) -

ذ

ذوالفقار خان ، نواب : ۶۸ ، ۳۵۳ ، ۳۵۶ ، ۳۷۰ ، ۳۸۸ تا ۳۹۲ ، ۳۹۵ -
ذوق ، ابراہیم : ۱۱۶ -

ر

رادھا کرشن ، ڈاکٹر : ۲۳ -
راسخ : ۳۶۸ -
رستم خان : ۳۸۷ -
رضی وحدت ، میر : ۳۸۰ -
رفیع الدرجات : ۲۶۵ -

رفیع الدولہ : ۲۳۷ ۔
رفیع الشان ، شہزادہ : ۳۷ ۔
رفیع خان باذل : ۳۶۲ ، ۳۶۳ ۔
رفیق احمد بی ۔ اے ، ۲۳ ۔
زمری : ۳۶ تا ۳۸ ، ۳۳۷ ۔
روحی ، مولانا : (رک : مولانا روحی) ۔
رودکی : ۳۶ ۔
رومی ، مولانا : ۲۱ ، ۳۸ ، ۵۹ ، ۶۳ ، ۶۶ ، ۶۷ ، ۹۹ ، ۱۰۵ ، ۱۲۳ ، ۱۳۳ ، ۱۹۳ ، ۲۰۷ ، ۲۱۲ ، ۲۳۱ ، ۲۵۳ ، ۲۸۵ ، ۳۰۹ ، ۳۲۹ ، ۴۱۶ ۔
ریو ، ڈاکٹر : ۳۳۷ ، ۳۵۱ ، ۳۵۷ ، ۳۵۸ ۔

ز

زبردست خاں : ۳۸۷ ۔
زہرہ : ۳۹۱ ، ۳۹۲ ۔
زین العابدین ، میرزا : ۳۸۲ ۔
زینت النسا بیگم : ۳۹۲ ، ۳۹۳ ۔
زینو : ۳۰۷ ۔

س

سارتر : ۱۱ ، ۱۸۶ ۔
سپہر شکوہ : ۳۷ ۔
سراج الدین علی خاں آرزو : ۷۷ ، ۹۳ ، ۱۰۳ ، ۱۱۰ تا ۱۱۲ ، ۱۱۵ ، ۱۱۶ ، ۱۲۰ ، ۱۲۱ ، ۲۸۵ ، ۳۷۵ ، ۳۷۹ ، ۳۸۱ ۔
سرخوش ، محمد افضل : ۳۲ ، ۴۴ ، ۷۹ ، ۹۰ ، ۱۵۸ ، ۲۰۱ ، ۳۳۳ ، ۳۳۷ ، ۳۵۳ ، ۳۵۵ ، ۳۸۰ ۔
سر سید احمد خان : ۱۲۳ ، ۱۲۶ ۔
سرور خان گویا : ۸۷ ، ۱۲۸ ، ۱۳۱ ، ۱۳۲ ، ۳۸۳ ۔
سری گوپال تمیز : ۳۷۹ ۔
سعادت اللہ خاں ، نواب : ۳۵۷ ، ۳۵۸ ۔
سعادت یار خاں رنگین : ۱۲۲ ۔
سعد اللہ خاں ، علامی : ۶۷ ، ۳۵۳ ۔
سعدی شیرازی ، شیخ مصلح الدین : ۳۰ ، ۶۵ ، ۱۰۵ ، ۱۶۹ ، ۳۰۹ ، ۳۳۷ ، ۳۳۸ ، ۳۵۲ ، ۳۶۸ ۔
سکاٹ : ۳۹۲ ، ۳۹۳ ۔
سکندر اعظم : ۹۶ ، ۲۶۱ ، ۲۷۵ ، ۳۱۸ ۔
سلطان باہوؒ : ۲۹۵ ، ۲۹۶ ۔
سلطان محمود غزنوی : ۱۵ ، ۹ ، ۷۸ ، ۳۰۹ ۔
سلیمان شکوہ : ۳۶ ۔
ساقی : ۳۸ ، ۶۶ ، ۷۹ ، ۱۰۵ ، ۱۲۳ ، ۳۰۹ ۔
سودا ، میرزا محمد رفیع : ۱۱۳ ، ۱۱۵ ، ۱۲۱ ، ۱۲۲ ۔
سہراب رونق ، میرزا : ۳۶۹ ۔
سید النساء : ۳۸۷ ۔

سید جعفر پاشا : ۱۳۰ -
سید جعفر روحی : ۹۰ ، ۳۶۸ -
سید سرور خان پاچا : ۱۳۰ ، ۱۳۱ -
سید سلیمان ندوی : ۱۳۱ -
سید عبد اللہ ، قطب الملک : ۳۷۳ ، ۳۷۷ -
سید علی ہجویری : ۲۸ -
سید محمد : ۳۶۸ ، ۳۶۹ -
سید محمد داؤد حسین خطاط : ۱۲۷ تا ۱۲۹ -
سید محمد عبد اللہ ، ڈاکٹر : ۳ ، ۳۸۰ -
سید مرتضیٰ : ۳۷۹ -
سید ہدایت اللہ چاہ پانی : ۱۳۰ -

ش

شاد عظیم آبادی : ۱۱۹ ، ۳۶۵ ، ۳۷۱ -
شاکر خان : ۶۷ ، ۷۸ ، ۹۲ ، ۹۵ ، ۱۰۱ ، ۱۰۲ -
شاہ جہاں بادشاہ : ۲۷ ، ۲۸ ، ۳۰ ، ۳۷ ، ۵۰ تا ۵۳ ، ۷۰ ، ۷۱ ، ۷۳ تا ۷۶ ، ۱۵۲ ، ۱۶۰ ، ۲۳۵ ، ۲۵۳ ، ۳۱۶ ، ۳۹۳ -
شاہ حاتم : ۱۲۲ -
شاہ سلیمان پھلواری ، مولانا : ۱۲۵ ، ۳۸۳ -
شاہ عالم بہادر شاہ : ۳۶۶ ، ۳۶۸ -
شاہ عالم ثانی : ۱۱۳ ، ۲۳۵ ، ۲۵۳ ، ۳۶۹ -
شاہ فاضل : ۳۳۸ -
شاہ فصیح افصح : ۱۲۰ ، ۳۷۵ -
شاہ قاسم ہواللٰہی : (دیکھئے : قاسم ہواللٰہی ، شاہ) -
شاہ کابلی : ۵۹ -
شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی : ۶۸ ، ۷۰ -
شاہ کابل : ۳۳۷ ، ۳۳۸ -
شاہ گل : ۳۳۳ -
شاہ ملوک : ۶۲ ، ۱۱۸ ، ۱۱۹ ، ۳۳۸ ، ۳۶۵ -
شاہ نعمت اللہ فیروز آبادی : ۳۳۹ -
شاہ ولی اللہ محدث دہلوی : ۱۱ ، ۳۵۳ -
شبلیؒ : ۳۹ ، ۱۹۲ ، ۲۰۷ -
شبلی ، علامہ : ۱۶ -
شجاع ، شہزادہ : ۳۶ ، ۵۲ ، ۵۳ ، ۳۸۵ -
شکر اللہ خان خاکسار ، نواب : ۶۶ تا ۶۸ ، ۷۸ ، ۸۶ ، ۹۰ ، ۹۲ ، ۱۰۰ تا ۱۰۲ ، ۱۳۳ ، ۱۸۲ ، ۳۱۸ ، ۳۳۸ تا ۳۵۰ ، ۳۵۳ ، ۳۵۵ ، ۳۵۶ ، ۳۶۲ ، ۳۸۲ -
شکر اللہ خان ثانی : (لطف اللہ ، نواب بھی دیکھیے) : ۲۸۲ -
شیخ احمد سرہندی : ۲۹ -
شیخ حسین شہرت : ۳۷۶ -

شیخ سعد اللہ گلشن : ۶۸ ، ۹۳ ، ۱۱۵ ، ۱۲۰ ، ۲۸۳ ، ۳۳۳ ، ۳۵۵ ، ۳۶۰ ، ۳۶۵ -
شیخ شہاب الدین ، شیخ الاشراق : ۲۹۳ ، ۲۹۵ -
شیخ علی حزیں : ۱۱۶ ، ۱۵۸ -
شیخ کبیر : ۹۴ ، ۱۰۴ -
شیخ کمال : ۲۸ -
شیخ محمد اکرام : ۳۳۴ -
شیخ محمد ماہ : ۳۸۱ -
شیر خان لودھی : ۳۹۳ -
شیکسپئر : ۱۳۳ ، ۱۳۹ -
شبلی : ۱۳۴ ، ۲۴۵ -

ص

صادق علی دلاوری : ۳۳۴ -
صائب کشمیری : ۳۱ ، ۳۰۰ -
صدر الدین عینی : ۱۴ -
صدر الدین قونوی ، مولانا : ۲۸۵ -
صدیق اکبر : (رک : ابوبکر صدیق) -
صوفی عبدالحق بیتاب : ۱۲۹ ، ۳۸۳ -

ض

ضمیر علی بدایونی : ۱۸۴ -

ط

طالب آملی : ۳۳۴ -
طالسطائی : ۱۸۹ -

ظ

ظہوری ترشیزی : ۱۶۹ ، ۱۹۲ ، ۳۰۹ ، ۳۳۱ -
ظہیر فاریابی : ۶۰ ، ۴۹ -
ظہیری : ۳۲ -

ع

عابد علی عابد ، سید : ۲ ، ۳ ، ۲۲ ، ۱۳۱ ، ۲۶۱ ، ۲۴۶ ، ۲۴۹ -
عاجز افغان : ۱۲۹ -
عارف الدین خان اورنگ آبادی : ۳۸۱ -
عاشق محمد بسمل : ۸۹ ، ۳۳۴ -
عاقل خان رازی ، نواب : ۶۳ تا ۶۴ ، ۸۸ ، ۳۳۱ ، ۳۳۲ ، ۳۳۸ ، ۳۹۹ -
عالم شاہی ، آقا : ۱۲۴ -
عالم گیر ، بادشاہ : ۱۳ ، ۱۳۳ ، ۱۵۲ ، ۲۳۸ ، ۳۵۳ ، ۳۵۹ ، ۳۹۲ -
عباد اللہ اختر : (رک : خواجہ عباد اللہ اختر) -
عبدالجلیل واسطی بلگرامی : ۳۶۸ ، ۳۶۹ ، ۴۲۶ -
عبدالحکیم حاکم : ۳۸۰ ، ۳۸۱ -
عبدالحکیم ، خلیفہ ، ڈاکٹر : ۲۲ ، ۱۲۳ ، ۱۹۵ ، ۲۳۱ ، ۲۳۲ -

عبدالحی : ۱۱۳ -
عبدالحی حبیبی : ۱۹ ، ۱۲۷ تا ۱۲۹ ، ۱۳۲ -
عبدالخالق : ۶۹ ، ۸۶ ، ۸۷ ، ۱۳۱ -
عبدالرحمان بجنوری : ۱۳۵ ، ۱۳۶ -
عبدالرحمان چغتائی : ۱۰۵ ، ۱۷۶ -
عبدالرحیم : ۹۱ ، ۳۳۶ -
عبدالصمد خان ، نواب : ۷۵ ، ۱۰۳ ، ۳۶۰ ، ۳۶۲ ، ۳۷۰ ، ۳۷۳ -
عبدالصمد سخن ، میر : ۸۹ ، ۳۵۸ ، ۳۶۰ ، ۳۶۲ -
عبدالعزیز ایجاد : ۳۷۹ -
عبدالعزیز عزت : ۶۴ ، ۸۸ ، ۳۳۳ تا ۳۳۶ -
عبدالغنی (ڈاکٹر) : ۲۳ ، ۳۵ -
عبدالغنی (پروفیسر) : ۳۸۶ -
عبدالغنی بیگ قبول ، میرزا : ۳۶۵ -
عبدالقادر جیلانی ، شیخ : ۱۰۸ ، ۲۹۵ -
عبدالقادر بیدل (رک : بیدل ، میرزا عبدالقادر) -
عبداللہ چغتائی ، ڈاکٹر : ۶۵ -
عبدالولی سورتی ، میر : ۱۱۲ -
عراق : ۳۱۵ ، ۳ ۳ -
عرفی : ۳۲ ، ۸۹ ، ۱۳۸ ، ۲۷۹ ، ۳۰۹ -
عزالدولہ : ۳۹۳ -
عزالدین : ۳۹۵ -
عزلت : ۳۷۸ -
عسجدی : ۹۳ ، ۳۷۷ -
عصمت اللہ قابل : ۳۸۰ -
عطار : (رک : فریدالدین عطار) -
عطاء اللہ عطا : ۹۳ ، ۹۷ ، ۱۰۳ ، ۳۵۹ ، ۳۹۰ -
عطاء اللہ ، میرزا : ۳۸۲ -
عظمت اللہ بے خبر ، میر : ۷۹ ، ۸۹ ، ۳۶۷ ، ۳۹۸ -
عظیم الشان ، شہزادہ : ۲۷ ، ۳۷۰ ، ۳۷۱ ، ۳۹۵ -
علی ، حضرت : ۵۸ تا ۶۰ ، ۳۰۵ ، ۳۰۶ ، ۳۶۳ -
علی احمد ہوبل ، ڈکتور : ۳۹۷ -
علی حسن خان بارہہ ، سید : ۱۰۲ -
علی رضا نقوی ، ڈکتر ، سید : ۳۸۱ -
علی شیر نوائی : ۱۷ -
علی لطف ، میرزا : ۷۱ -
عنایت اللہ ، میر : ۷۸ ، ۹۵ ، ۳۵۶ -
عنصری : ۷۸ -

غ

غازی الدین . ۳۹۲ -
غازی‌الدین خان فیروز جنگ : ۳۵۶ -
غالب ، میرزا اسد اللہ خان : ۲ تا ۳ ، ۹ ، ۱۰ ، ۳۰ ، ۳۳ ، ۱۱۶ ، ۱۱۷ ، ۱۱۹ ، ۱۲۰ ، ۱۲۳ ،

۱۲۶ ، ۱۲۸ ، ۱۳۵ تا ۱۳۱ ،
۱۳۳ ، ۱۵۰ ، ۱۵۹ ، ۱۶۳ ،
۲۸۳ -
غزالی : ۵۹ ، ۶۲ ، ۱۹۰ ، ۲۱۲ ،
۲۰۷ ، ۳۳۹ -
غلام حسین : ۳۸۷ -
غلام حسین شاکر : ۳۳ ، ۱۲۲ -
غلام حسن کابلی : ۲۹۷ -
غلام رسول مہر ، مولانا : ۲ ، ۳۰۶ -
غلام علی آزاد بلگرامی (رک : آزاد بلگرامی) -
غلام قادر روہیلہ : ۱۱۳ -
غلام نبی وحشت : ۳۷۹ -
غنی کاشمیری : ۱۶۲ ، ۲۰۰ -

ف

فاروقی : ۵۱ -
فتو خان : ۳۸۲ -
فرائڈ : ۲۶۹ ، ۳۲۸ -
فرخ سیر ، شہنشاہ : ۳۹ ، ۵۲ ، ۵۵ ،
۷۸ ، ۱۰۲ ، ۱۳۶ ، ۲۵۳ ،
۳۰۳ ، ۳۵۸ ، ۳۶۷ ، ۳۷۱ ،
۳۸۳ ، ۳۷۵ ، ۳۸۸ ، ۳۹۵ ،
۳۹۶ -
فرحی : ۹۳ ، ۳۷۷ -
فرید الدین عطار ، شیخ ، ۱۵ ، ۱۶ ،
۵۹ ، ۶۶ ، ۸۸ ، ۱۲۳ ، ۳۱۵ -
فضولی : ۱۷ -
فقیراللہ آفریں ، شاہ ، ۳۸۰ -
فلاطینوس : ۱۹۵ ، ۳۱۳ -
فیضی محمد خان زکریا : ۱۲۸ ، ۳۸۳ -
فیضی : ۷۹ ، ۸۹ ، ۳۰۹ -

ق

قاری عبداللہ خان ، ملک الشعرا :
۱۲۹ -
قاسم درویش : ۲۸ -
قاسم ہوالنبی ، شاہ : ۳۸ ، ۵۹ ،
۲۹۶ ، ۳۲۸ ، ۳۳۹ -
قاضی عبدالرحیم : ۳۵۳ -
قاضی عبدالودود : ۳۶۰ ، ۳۷۸ -
قاتل خان ، منشی : ۳۸۲ -
قطب الدین ، شیخ : ۳۹۳ -
قلندر شاہ : ۹۲ -
قلو بطرہ : ۳۸۸ -
قلیج خان : ۳۵۷ -
قمر الدین شاکر ، میر : ۳۵۶ -
قیوم خان فدائی : ۶۷ ، ۳۶۹ -

ک

کارل حسر : ۲۹۲ -
کام بخش ، شہزادہ : ۸۶ ، ۳۶۷ -
کام راج ، ۳۸۹ ، ۳۹۳ -
کام ور : ۳۸۹ ، ۳۹۰ ، ۳۹۳ -
کیڑن : ۳۶۵ -
کرشن مہاراج : ۵۳ ، ۶۳ ، ۱۰۰ ،
۲۰۵ ، ۳۱۱ -

کرم‌اللہ خاں ، نواب : ۶۷ ، ۶۸ ، ۹۳ ، ۱۰۱ ، ۳۵۶ ، ۳۷۰ -
کروچے : ۱۶۰ -
کلیم : ۳۱ ، ۱۵۲ -
کوپرنیکس : ۲۱۹ ، ۲۲۶ -
کیٹس : ۱۸۳ -

گ

گل محمد محی باب خاں : ۹۳ ، ۱۱۰ ، ۳۷۳ -
گور بخش حضوری : ۳۶۱ -
گوئٹے : ۱۳۹ ، ۱۵۳ -

ل

لال کنور (لعل کنور بھی دیکھیے) : ۲۳ ، ۳۷۱ ، ۳۸۵ -
لالہ سکھراج سبقت : ۸۱ ، ۱۰۸ ، ۳۵۹ -
لالہ شیورام حیا کاتستھ : ۳۵۹ -
لطف‌اللہ خاں مجذوب : ۶۷ ، ۶۸ ، ۱۰۱ ، ۱۰۲ ، ۱۰۳ ، ۳۸۲ -
لطف علی : ۳۳۹ -
لطیف : ۳۳۵ -
لعل کنور : ۷۳ ، ۷۵ ، ۳۳۳ ، ۳۷۰ ، ۳۸۵ تا ۳۹۷ -
لیبنز : ۲۸۸ ، ۲۸۹ ، ۳۱۳ ، ۳۱۴ -
لیلیٰ : ۱۵۶ ، ۱۸۰ -
لینن : ۲۳۶ -

م

مارلی نوبر : ۱۱ ، ۱۲ ، ۱۸۶ ، ۳۱۳ -
مارکس : ۹ ، ۲۳۶ -
مبارز خاں : ۵۵ -
مجدد الف ثانی : ۱۱ ، ۲۹ ، ۳۰ ، ۵۱ ، ۳۱۵ -
محمد سرہندی : ۵۹ -
محمود : ۱۸۰ -
محمود گورکھپوری : ۳ تا ۱۰ ، ۱۶ ، ۱۷ -
محمد ابراہیم : ۳۸۱ -
محمد احسن سامع دہلوی : ۳۷۳ -
محمد اسلم سالم ، حاجی : ۸۹ ، ۳۳۳ -
محمد اشرف حسرت ، میر : ۳۷۸ -
محمد افضل سرخوش (رک : سرخوش ، محمد افضل)
محمد باقر ، ڈاکٹر : ۱۹ ، ۱۳۲ ، ۱۳۳ -
محمد امین عمر خاں : ۱۲۰ ، ۳۶۲ -
محمد بن قاسم : ۳۵ -
محمد پناہ : ۳۷۹ -
محمد جان قدسی ، حاجی : ۱۶۰ -
محمد جمال تلاش ، حافظ : ۳۶۹ -
محمد حسین آزاد ، مولانا : ۶۸ ، ۱۱۳ ، ۱۱۶ ، ۱۱۸ ، ۱۲۰ ، ۱۲۱ ، ۳۸۲ -
محمد حسین خاں ناجی ، آغا : ۳۶۱ -

محمد رسول‌اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) :
۳۱ ، ۵۴ ، ۵۸ ، ۶۱ ، ۲۱۳ ،
۳۰۱ ، ۳۰۵ تا ۳۰۷ ، ۳۶۳ ،
۳۰۸ -
محمد رفیق چودھری بی - اے : ۲۳ -
محمد سعید : ۸۰ -
محمد شاہ رنگیلا : ۲۱ ، ۳۲ ، ۵۲ ،
۸۲ ، ۱۰۳ ، ۱۰۸ ، ۲۳۵ ،
۳۱۶ ، ۳۹۹ -
محمد شریف ، پروفیسر : ۲۶۸ ، ۲۶۹ ،
۲۷۶ -
محمد شفیع ، ڈاکٹر ، مولوی : ۴۴ ،
۱۰۳ ، ۱۲۶ ، ۳۴۳ -
محمد صادق القا : ۳۶۲ -
محمد صالح کمبوہ : ۵۱ -
محمد عالم شاہ : ۱۲۶ -
محمد عزیز بی - اے : ۲۳ -
محمد عطاءالرحمان‌عطا کاکوی ، پروفیسر ،
سید : ۱۶ -
محمد علی تھانوی : ۵۹ -
محمد معزالدین : ۳۸۷ -
محمد معصوم وجدان ، میر : ۳۴۹ -
محمد معظم : ۳۶۶ ، ۳۸۷ -
محمد ہاشم جرات ، میر ۳۴۶ -
مریم (یا مریم زمانی) : ۸۳ -
مسعود سعد سلمان : ۹۳ ، ۳۴۴ -
مصحفی ، غلام ہمدانی : ۱۱۳ ،
۱۲۳ ، ۱۲۵ ، ۱۲۴ ، ۱۲۸ -
مضمون : ۸۰ -
مظہر جان جاں ، میرزا : ۱۲۱ -
معزالدولہ : ۳۹۳ -
معزالدین : ۳۸۸ -
معز موسوی خان فطرت : ۳۳۶ ،
۳۶۵ -
معزی : ۹۳ ، ۳۴۴ -
معنی یاب خان (رک : محمد احسن ایجاد
وکل محمد معنی یاب) -
مغل خان قابل : ۳۶۱ -
ملا باقر گیلانی : ۳۸۲ -
ملا صدرا : ۳۰ -
ملا عبدالرشید اکبر آبادی : ۳۳۳ -
ملا محمد جونپوری : ۳۰ ، ۵۰ -
ملا محی الدین موہی : ۵۰ -
ممتاز محل : ۳۸۸ -
منعم خان خان خانان : ۴۸ ، ۳۶۶ -
موسیٰ علیہ السلام ، حضرت : ۳۸ ،
۳۰۱ ، ۳۱۱ -
مولانا روحی : ۳۰۴ -
مولانا کمال : ۳۵ ، ۳۴ ، ۳۸ -
مولوی محمد سعید اعجاز اکبر آبادی :
۳۳۶ -
موسوف (رک : ابراہیم مومنوف ڈاکٹر)
مہر علی بے کس : ۳۳۷ -
مہر علی شاہ گولڑوی : ۳۸۵ -
میر باقر داماد : ۳۰ -

میر تقی میر: ۱۱۳، ۱۲۱، ۱۲۴ -
میر حمله، قاضی عبدالله تورانی ۳۷۳، ۳۷۴ -
میرزا ابوالقاسم ترمذی: ۴۵، ۴۶ -
میرزا دواریار: ۳۸۲ -
میرزا روح الله: ۸۷ -
میرزا سلطان احمد: ۳۳ -
میرزا سلیم: ۳۸۲ -
میرزا سلیمان: ۳۸۲ -
میرزا سهراب: ۸۹ -
میرزا صائب: ۱۲۲ -
میرزا ظریف: ۴۸، ۵۳، ۸۵، ۸۷، ۱۲۷، ۲۳۸، ۳۴۰ -
میرزا عباد الله: ۸۰، ۸۶، ۸۸، ۱۰۶، ۳۶۳ -
میرزا عبد الخالق: ۲۸، ۴۵، ۶۹، ۸۳، ۸۷، ۲۳۶ -
میرزا عبد اللطیف: ۵۳ -
میرزا فضائل: ۳۸۲ -
میرزا فضل الله: ۱۱۲، ۲۶۳ -
میرزا قلندر: ۴۴ تا ۴۸، ۵۳، ۸۴، ۲۳۶ تا ۲۳۸، ۲۸۰ -
میرزا محمد ابراهیم: ۲۶۲ -
میرزا محمد امین خان: ۷۲، ۷۳ -
میرزا محمد سعید: ۸۸، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۱۰، ۱۱۲، ۳۶۳ -
میرزا محسن: ۳۸۲ -
میرزا مراد کام مکرم خان: ۳۸۷ -
میرزا معین: ۳۸۲ -
میر عسکری: (رک: عاقل خان رازی) -
میر کامگار: ۸۹ -
میر کرم الله عاقل خان عاشق: ۳۵۵، ۳۵۶ -
میر محمد: ۳۶۴ -
میر محمد احسن ایجاد: ۲۴۳ -
میر محمد زمان خان راسخ: ۳۶۱ -
میر محمد علی رائج: ۳۷۷ -

ن

نادرالزمان فصیح، میرزا: ۳۸ -
نادر شاه. ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۵۳، ۲۹۹ -
ناصر علی سرهندی، شیخ: ۹۰، ۱۱۷، ۲۰۰، ۳۴۶ تا ۳۴۸، ۳۵۳ تا ۳۵۵، ۳۸۰ -
ناظم خان: ۹۳، ۳۷۶، ۳۷۷ -
نامدار خان: ۳۸۹ -
ندرت کاشمری، مولانا: ۱۱۳، ۱۱۴ -
نذیر نیازی: ۳۰۲ -
نسفی: ۲۸۹ -
نصرالله خان، شهزاده: ۱۲۲ -
نصرت: ۲۷۸ -

نصیرالدین محمود چراغ دہلی ، ۳۹۳ -
نظام الدین اولیا (رک خواجہ نظام الدین اولیا)
نظام الملک : ۳۹ ، ۱۱۵ ، ۱۲۵ -
نظام الملک آصف جاہ : ۲۷ ، ۴۳ ، ۴۸ ، ۱۰۸ ، ۱۰۹ ، ۳۵۴ ، ۳۹۱ -
نظیری : ۱۳۸ -
نعمت خان عالی : ۸۹ ، ۳۶۳ -
نقیب خان طغرل احراری : ۱۴ -
نواب ظفر جنگ : ۳۵۲ -
نورالدین یار پران ، ملک : ۱۲۵ ، ۱۲۶ -
نور جہاں بیگم : ۵۱ ، ۳۸۸ -
نور بہ خان ، حافظ : ۱۲۹ -
نیاز فتح پوری : ۲۴۶ -

و

وارد : ۳۹۰ -
والہ ہروی : ۳۳۹ -
وحید قریشی ، ڈاکٹر : ۳۵ ، ۱۱۹ -
ورلڈ فرتھ : ۱۳۴ -
ولی الدین ، میر : ۱۹۳ ، ۱۹۳ ، ۳۰۲ ، ۳۰۶ -
ولی دکنی : ۱۱۶ ، ۱۱۹ تا ۱۲۱ ، ۳۶۵ -
ولیم جیمز : ۲۳۶ ، ۲۹۶ -
ولنشین : ۳۹۱ -

ہ

ہاشم شائق آفندی : ۱۲۴ ، ۱۲۸ ، ۱۳۳ ، ۳۸۳ -
ہاکنگ ، پروفیسر : ۳۰۲ -
ہمایوں ، بادشاہ : ۳۰ -
ہرور خان عاقل : ۳۸۱ -
ہیگل : ۹ ، ۲۶۹ ، ۲۹۲ ، ۲۹۸ ، ۳۲۶ ، ۳۰۴ -

ی

یاسمین : ہ -
یار پران ، حضرت : ۳۲ ، ۳۸۳ -
یسوع ۳۹۰ -
یوسف حسین خان ، ڈاکٹر : ۱۶۳ ، ۲۴۶ ، ۳۹۱ -
یوسف علیہ السلام : ۱۸۲ تا ۱۸۵ -

آ

آرہ : ۳۸ ، ۳۳۶ -
آگرہ : ۱۰۰ ، ۱۳۰ ، ۱۶۵ ، ۱۶۶ ، ۱۶۹ ، ۳۹۵ -

الف

الٰی : ۱۹ -
ادارۂ مصنفین پاکستان : ۲۸۳ -
ارکو قشلاق : ۱۲۹ -
ازبیہ : ۳۸ ، ۳۹ ، ۵۳ ، ۵۵ ، ۵۶ ، ۱۳۰ ، ۱۶۵ ، ۱۹۹ ، ۲۸۵ ، ۲۸۷ ، ۲۹۵ ، ۳۳۶ ، ۳۳۹ ، ۳۳۰ -
ازبکستان : ۱۶ ، ۱۷ -
اسکندریہ : ۲۹ ، ۱۹۵ ، ۲۶۱ -
اسلام آباد : (متھرا) ۱۰۰ ، ۱۰۱ ، ۳۳۰ ، ۳۳۷ ، ۳۵۱ -
اسلامیہ کالج لاہور : ۱۳۳ -
افغانستان : ۱۸ ، ۱۹ ، ۱۲۸ ، ۱۲۹ ، ۱۳۲ ، ۱۳۳ -
اکبر آباد : ۵۳ تا ۵۵ ، ۵۷ ، ۶۰ ، ۶۴ ، ۷۳ ، ۸۵ ، ۸۹ ، ۹۱ ، ۱۹۹ ، ۲۳۹ ، ۳۳۰ ، ۳۳۵ ، ۳۳۶ ، ۳۵۱ ، ۳۶۳ ، ۳۷۱ ، ۳۹۰ -
امریکہ : ۳۵۹ -
اندلس : ۲۸۳ -
اورنگ آباد : ۳۵۱ ، ۳۸۱ -
اورینٹل کالج لاہور : ۱۹ -
ایران : ۱۱۶ ، ۱۳۲ ، ۱۵۹ ، ۲۶۱ ، ۲۸۹ ، ۲۹۲ -
ایشیا : ۱۷ ، ۱۸ ، ۲۰۱ -
ایوان اردو پٹنہ : ۱۶ -

ب

باریہ : ۷۵ ، ۷۶ ، ۱۱۶ -
بازار خانم دہلی : ۷۱ -
باغ زہرہ : ۳۳۵ -
بانکی پور لائبریری : ۳۶۰ ، ۳۷۸ -
عراخضر : ۲۰۸ -
عارا : ۱۳۳ ، ۳۰۹ -
بدخشاں : ۱۲۹ ، ۱۳۰ -
برٹش میوزیم : ۱۱۹ -

برطانیہ : ۲۰۱ ـ
برہان پور : ۳۵۸ ـ
بمبئی : ۱۲۹ ـ
بندرابن : ۱۲۶ ، ۱۴۸ ـ
بنگال : ۴۸ ، ۵۳ ، ۳۳۰ ـ
بہادر پور : ۳۵۱ ـ
بہار : ۲۸ ، ۳۶ ، ۴۷ ، ۴۹ ، ۵۰ ،
۵۳ ، ۵۵ ، ۶۲ ، ۶۳ ، ۷۰ ،
۷۳ ، ۱۱۷ تا ۱۱۹ ، ۱۶۵ ،
۱۹۹ ، ۲۸۵ ، ۳۳۶ ، ۳۳۰ ،
۳۳۱ ـ
بھارت : ۱۶ ، ۱۸ ، ۲۳ ، ۱۳۱ ـ
بیت اللہ : ۱۳۰ ـ
بیجا پور : ۱۳۰ ـ
بیدل اکیڈیمی : ۱۳۲ ـ
بیراٹ : (رک : کوہ بیراٹ) ـ

پ

پاکستان : ۱۹ ، ۲۳ ، ۱۳۱ ـ
پاک و ہند : ۱۳۲ ، ۳۸۹ ـ
پانی پت : ۱۱۲ ، ۱۲۸ ـ
پبلشرز یونائٹڈ : ۱ ، ۱۳۰ ـ
پٹنہ : (عظیم آباد بھی دیکھیے) ۲۷ ،
۲۸ ، ۳۶ ، ۴۹ ، ۵۳ ، ۱۱۸ ،
۲۸۵ ، ۳۱۶ ، ۳۳۶ ، ۳۴۸ ،
۳۶۵ ، ۳۷۱ ، ۳۹۵ ـ
پرانا قلعہ دہلی : ۱۲۵ ، ۱۲۶ ـ
پنجاب : ۱۰۲ ، ۱۳۰ ـ
پنجاب یونیورسٹی : ۱ ، ۱۹ ، ۱۳۱ ـ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری : ۱۲۰ ،
۱۲۲ ، ۱۳۶ ، ۳۵۷ ، ۳۶۳ ،
۳۸۱ ، ۳۹۳ ـ
یورپ : ۳۰ ، ۵۰ ، ۶۳ ، ۱۱۸ ـ

ت

تاج محل : ۲۰ ، ۲۱ ، ۳۶ ، ۵۱ ،
۱۴۳ ، ۱۵۰ ، ۱۶۰ ، ۱۶۲ ،
۱۹۰ ـ
تاجیکستان : ۱۶ ، ۱۷ ـ
تاشقند : ۱۳۳ ـ
ترکستان : ۱۳۳ ـ
ترکی : ۱۳۲ ـ
ترہٹ : ۵۵ ـ
تہران : ۳۸۱ ـ

ج

جاجو : ۳۴۳ ـ
جامع مسجد دہلی : ۳۶ ، ۷۱ ، ۱۶۰ ،
۳۴۷ ـ
جزیرہ نمائے عرب : ۲۱ ـ
جلال پور شریف : ۱۹ ـ
جنجی ، قلعہ : ۳۸۸ ـ
جون پور : ۷۵ ، ۱۱۸ ـ
جہان آباد : ۱۲۳ ـ
جہلم : ۱۹ ، ۱۳۱ ـ
جھنگ : ۲۹۵ ـ

ج

چاند پور: ۵۵ -
چکوال: ۱۳۱ -

ح

حسن ابدال: ۵۳، ۹۰، ۱۰۲، ۱۳۰، ۳۳۱ -
حلقۂ ارباب ذوق: ۱۳۱ -
حویلی لطف علی: ۳۳۹ -
حیدر آباد دکن: ۳۹۱ -

خ

خراسان، ۶۳ -
خواجوہ: ۵۳ -
خواجہ رواش: ۱۲۷ -
خوال: ۶۳، ۶۷، ۷۵ -

د

دانش کدۂ چکوال: ۱۳۱ -
دانش گہ پنجاب: ۹۸، ۱۳۳، ۲۵۹ -
دریائے جمنا: ۱۰۲، ۱۰۳، ۳۳۹، ۳۸۸، ۳۸۹ -
دکی: ۲۷، ۳۹، ۴۲، ۶۶، ۷۸، ۸۶، ۹۵، ۱۰۰، ۱۰۳، ۱۰۸ تا ۱۲۱، ۱۲۵، ۲۳۳، ۳۳۱، ۳۵۰، ۳۵۲، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۶۳، ۳۶۶، ۳۶۸، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۶، ۳۸۱، ۳۸۳، ۳۹۱، ۳۶۲ -
دہلی: ۳۶، ۳۷، ۳۹، ۴۲، ۵۰، ۵۳ تا ۵۵، ۶۰، ۶۳، ۶۳، ۶۶، ۶۸، ۷۰، ۷۲، ۷۳، ۷۵، ۷۶، ۸۰، ۸۵، ۸۶، ۱۰۰ تا ۱۰۳، ۱۰۵ تا ۱۱۶، ۱۱۸، ۱۲۳ تا ۱۲۷، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۳، ۱۳۶، ۱۶۶، ۱۶۹، ۱۸۶، ۱۹۹، ۲۸۸، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۷ تا ۳۳۹، ۳۵۱، ۳۶۵، ۳۷۰، ۳۷۲، ۳۷۶، ۳۸۱، ۳۸۳، ۳۸۳، ۳۹۰، ۳۹۲، ۳۹۶ -
دہلی دروازہ، ۱۰۳، ۱۲۶ -

ر

راجپوتانہ: ۶۶ -
رانی ساگر: ۳۸، ۱۱۸، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸ -
روس: ۱۶، ۱۷ -
روما: ۳۸۵ -
ریوا: ۳۸۶ -

ز

زاویۂ عزیزیہ (مدرسہ): ۳۳۵ -
زہرہ گلستان: ۱۶۶، ۳۳۵ -
زینت المساجد: ۳۹۲ -

س

سامو گڑھ : ۳۶ ، ۵۱ -
سرائے بارس : ۳۳۸ -
سرہند : ۱۰۹ ، ۳۵۳ ، ۳۵۴ -
سری نگر : ۲۳ -
سلیم گڑھ : ۳۹۱ -
سمرقند : ۳۰۹ -
سہاگ پورہ : ۳۹۶ -
سومنات : ۱۸ ، ۱۹ -
سیالکوٹ : ۳۷۷ -

ش

شاہ جہان آباد : ۵۱ ، ۶۶ ، ۶۷ ، ۶۸ ، ۷۳ ، ۹۰ ، ۹۲ ، ۹۹ ، ۱۰۲ ، ۱۰۳ ، ۱۰۹ ، ۱۱۲ ، ۱۶۵ ، ۱۶۷ ، ۱۹۹ ، ۳۱۶ ، ۳۲۵ ، ۳۳۶ ، ۳۳۰ ، ۳۳۴ ، ۳۵۱ ، ۳۵۳ تا ۳۵۵ ، ۳۶۵ ، ۳۶۸ ، ۳۷۲ ، ۳۷۳ ، ۳۷۹ ، ۳۸۱ ، ۳۸۳ ، ۳۸۸ ، ۳۸۹ ، ۳۹۵ -
شاہدرہ : ۱۶۰ -
شالی بند : ۳۴۴ ، ۳۵۰ -
شورکوٹ : ۲۹۵ -
شہر سبز : ۱۳۳ -
شیراز : ۳۰ ، ۱۴۴ -

ط

طور : ۱۵۲ -
طورہ : ۱۰۳ -

ع

عظیم آباد (پٹنہ بھی دیکھیے) : ۲۷ ، ۳۹ ، ۱۱۸ ، ۱۳۰ ، ۱۶۰ ، ۲۸۵ ، ۳۱۶ ، ۳۳۶ ، ۳۷۱ ، ۳۹۵ -

غ

غزنی : ۱۹ -

ف

فرخ آباد : ۱۱۳ ، ۱۱۴ -
فیض آباد : ۱۱۴ ، ۱۲۹ ، ۱۳۰ -

ق

قلعہ کہنہ دہلی : ۳۸۳ -

ک

کابل : ۱۸ ، ۱۹ ، ۸۷ ، ۹۹ ، ۱۲۶ تا ۱۲۸ ، ۱۲۹ تا ۱۳۴ ، ۲۰۱ ، ۳۷۶ ، ۳۷۸ ، ۳۸۴ ، ۳۹۷ ، ۳۹۸ -
کارتہ : ۱۸ -
کارتہ چار کابل : ۱۳۱ -
کتاب خانۂ معارف کابل : ۸۶ ، ۱۲۹ ، ۳۷۰ ، ۳۷۱ ، ۳۹۷ -

کلکتہ: ۴۸، ۴۹، ۵۵، ۵۷، ۵۹، ۳۳۶، ۳۳۹، ۳۵۳، ۳۵۵ -
کراچی: ۹۹، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۳۳، ۳۲۲ -
کساؤلی: ۴۸، ۳۳۶ -
کشمیر: ۲۳، ۱۳۳، ۲۷۲ -
کوہ پیراٹ: ۱۰۰، ۱۳۸، ۱۳۳، ۱۴۳، ۱۳۹، ۵۸، ۱۶۱، ۱۶۷، ۱۶۸، ۲۰۱ تا ۲۰۳، ۲۷۱، ۲۷۵، ۳۱۸، ۳۶۲ -
کھکریان، جہلم: ۱۰۲، ۱۰۳، ۳۳۹ -
کیمرج: ۲۳۳ -

گ

گرز گھاٹ: ۱۰۲، ۳۳۹ -
گلاب باڑی: ۳۷۹ -
گوالیار: ۳۸۶ -
گوجرانوالہ: ۳۲، ۱۲۳ -
گورنمنٹ کالج جہلم: ۲۳ -

ل

لال قلعہ دہلی: ۲۷، ۷۰، ۳۹۰، ۳۹۵ -
لاہور: ۲، ۳۳، ۶۳، ۷۵، ۷۶، ۱۰۳، ۱۳۳، ۱۳۱، ۱۵۹، ۳۳۱، ۳۶۵، ۳۷۰، ۳۷۳، ۳۷۸، ۳۸۰، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۹۶ -
لکھنؤ: ۱۱۳، ۱۱۹ -
لندن میوزیم: ۳۵، ۸۹، ۳۵۱، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۹۳ -

م

ماسکو: ۱۳۳ -
متھرا: ۵۷، ۶۲، ۶۸، ۶۹، ۷۳، ۸۰، ۸۵، ۸۶، ۹۹، ۱۰۱، ۱۳۰، ۱۶۶، ۱۶۷، ۲۱۵، ۳۳۰، ۳۳۷ تا ۳۳۹، ۳۵۱ -
مراد آباد: ۳۵۹ -
مشرق: ۲۶۸، ۲۸۵، ۲۹۷ -
مصر: ۳۱۳ -
مطبع صفدری بمبئی: ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۹۲ -
مغرب: ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۸۵، ۲۹۷ -
مقبرہ جہانگیر: ۱۶۰ -
مہسی: ۴۸، ۳۳۶ -
موتی مسجد آگرہ: ۳۶، ۱۶۰ -
سوات: ۱۳۸، ۱۳۳، ۱۴۳، ۳۶۲ -

ن

نالندہ یونیورسٹی: ۲۸ -
نکودر: ۳۳۰ -
نولکشور پریس: ۳۳۱، ۲۳۳، ۳۳۵ -

و

وسط ایشیا : ۱۲۳ ، ۲۰۱ -
ولایت : ۳۶۶ -

ہ

ہند و پاک : ۹۹ ، ۱۰۲ -
ہندوستان (بر ہند) : ۱۱ ، ۲۹ ، ۳۱ ، ۳۵ ، ۳۲ ، ۵۰ ، ۷۱ ، ۱۰۸ ، ۱۱۲ ، ۱۱۶ ، ۱۲۸ ، ۱۳۵ ، ۱۳۳ ، ۱۶۰ ، ۱۸۹ ، ۲۵۳ ، ۳۰۹ ، ۳۱۰ ، ۳۵۰ ، ۳۸۲ ، ۳۰۵ -

ی

یکہ طریب (کابل) : ۱۲۷ -
یورپ : ۱۲ ، ۲۰۱ -
یونان : ۱۰۵ ، ۳۱۰ -

کتب ، رسائل ، مقالات

آ

آبِ حیات : ۱۱۲ ، ۱۱۳ ، ۱۱۴ ، ۱۲۲ -
آثار الصنادید : ۱۲۳ ، ۱۲۶ -
آگرہ از لطیف : ۳۳۵ -
آئی اینڈ دو (I and Thou) : ۱۸۶ -
آئینِ اکبری : ۳۸۶ -

الف

ادبِ لطیف : ۱۹۰ -
ادبیات : ۱۲۹ ، ۱۳۱ -
اردو ، مجلہ : ۱۱۳ ، ۱۳۳ -
اردو غزل : ۱۶۳ ، ۲۴۶ -
استقلال ، مجلہ : ۲۴۶ -
اصطلاحات الفنون : ۵۹ -
افکارِ پریشاں : ۳۰۰ -
اقبال وجودیوں کے درمیان : ۱۸۷ -
الانسان الکامل : ۲۹۲ -
الہاماتِ منعمی : ۳۶۶ -
القاد : ۲۶۱ -
السائیکلو پیڈیا آف اسلام : ۱۲۶ -
اورینٹل کالج میگزین : ۷۷ ، ۸۲ ، ۸۹ ، ۱۰۳ ، ۱۳۰ ، ۳۸۳ -

ب

بانگِ درا : ۱۱۳ -
برہان ، مجلہ : ۱۸۶ -
بزمِ تیموریہ : ۳۵۱ ، ۳۰۳ -
بزمِ سخن : ۳۶۹ -
بہارستانِ جنوں : ۱۶۹ ، ۱۸۶ -
بہارِ عجم : ۲۶۱ -
بیدل : ۱۳ ، ۱۳۶ -
بیدل پر کام کی ضرورت ، مقالہ : ۲۰ -
بیدل و داستانِ عرفان او : ۱۴ -
بیوٹی (Beauty) : ۲۴۶ -

پ

پنجاب میں اردو : ۳۶۴ -

ت

تاریخِ جہاں کشای : ۱۰۹ ، ۱۱۲ -
تاریخِ فرخ شاہی : ۹۳ ، ۲۴۶ -
تاریخِ مشائخِ چشت : ۶۸ ، ۴۰ -
تاریخِ ادب (کیمبرج) : ۳۳۳ -

تالیف الاحکام : ۶۳ -
تجربۂ روحانی کی مختلف صورتیں :
۲۹۶ -
تجلیٔ نور : ۵۰ -
تحفۃ الاحباب : ۱۳۳ -
تخلیق فن : ۲۶۸ ، ۲۶۹ -
تذکرۃ الاولیاء : ۱۶ ، ۵۹ ، ۱۱۸ -
تذکرۂ بیدل : ۷۷ ، ۸۲ ، ۸۹ ،
۱۳۰ -
تذکرۂ بے نظیر : ۱۰۸ ، ۳۵۶ ،
۳۷۹ -
تذکرۂ حسینی : ۵۳ ، ۷۲ ، ۹۱ ،
۳۳۶ ، ۳۳۸ ، ۳۷۸ -
تذکرۂ خوش گو : ۸۲ -
تذکرۂ ریختہ گویاں : ۳۶۹ -
تذکرۂ سرخوش : ۳۴۷ -
تذکرۂ شعرائے اردو : ۳۶۵ ، ۳۶۷ ،
۳۷۵ -
تذکرۂ محبوب الزمن : ۳۶۲ -
تذکرہ‌نویسی فارسی در ہند و پاکستان:
۳۸۱ -
تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ :
۲۹۹ ، ۳۰۲ -
توزک جہانگیری : ۳۸۶ -

ج

جلوۂ خضر : ۳۶۸ -

چ

چار شربت : ۳۷۵ -
چشم و دل : ۳۴۹ -
چمنستان عنص : ۳۷۴ -
چہار عنصر : ۳ ، ۱۹ ، ۴۴ تا ۴۸ ،
۵۰ ، ۵۳ ، ۵۵ تا ۵۷ ، ۵۹ ،
۶۰ ، ۶۲ ، ۸۳ تا ۸۵ ، ۱۱۸ ،
۱۶۸ ، ۲۷۰ ، ۲۹۵ ، ۳۳۶ تا
۳۳۰ ، ۳۳۵ ، ۳۵۰ ، ۳۵۱ ،
۳۵۹ -

ح

حسن و عشق ، رسالہ : ۸۹ ،
۳۶۵ -
حکمت رومی : ۱۹۵ ، ۲۳۱ -
حملۂ حیدری : ۳۶۳ -
حیات ولی : ۳۵۳ -
حیرت زار : ۱۴ ، ۱۶ -

خ

خالق باری : ۳۹۰ -
خزانۂ عامرہ : ۴۸ ، ۱۰۳ ، ۱۰۸ ،
۲۱۲ ، ۳۳۳ ، ۳۵۶ ، ۳۶۳ ،
۳۷۳ -
خیالات آوارہ : ۲۰ -

د

داد سخن : ۱۱۶ -

درالمنثور : ۳۶۸ -
دیوان آصف : ۳۵۶ -
دیوان زاده : ۱۲۲ -
دیوان شاکر : ۳۵۶ -
دیوان غالب : ۱۳۵ ، ۱۳۷ -
دیوان غزلیات بیدل : ۲۵۰ ، ۲۵۱ ،
۳۶۰ ، ۳۷۸ -
دیوان نعمت خاں عالی : ۳۶۳ -

ڈ

ڈیمس آف یونیٹری : ۲۷۵ -

ر

رباعیات بیدل : ۲۵۰ -
رقعات ابرد بخش رسا : ۶۳ ، ۳۶۲ -
رقعات بیدل : ۶۶ تا ۶۸ ، ۷۸ ،
۸۶ ، ۸۷ ، ۹۵ ، ۳۳۱ ، ۳۳۳ تا
۳۳۵ ، ۳۳۷ ، ۳۳۹ تا ۳۵۳ ،
۳۵۵ ، ۳۵۶ ، ۳۵۸ ، ۳۶۲ تا
۳۶۳ ، ۳۶۹ ، ۳۷۲ ، ۳۸۰ تا
۳۸۲ -
رقعات عالمگیری : ۳۰ ، ۶۳ ، ۶۵ ،
۶۶ ، ۳۵۱ ، ۳۵۲ -
روح بیدل : ۱ -
روحی ، رسالہ : ۲۹۵ -
رود کوثر : ۳۳۷ -
روز روشن ، تذکرہ : ۳۵۹ ، ۳۶۱ ،
۳۷۳ ، ۳۷۹ -

ز

زبور : ۲۲۳ -

س

ساقی ، مجلہ : ۳۳۲ ، ۳۳۰ -
ساقی نامہ ، ۱۳۹ ، ۳۱۳ -
سخن دان پارس : ۱۱۷ -
سرمۂ اعتبار : ۱۶۵ ، ۳۳۵ -
سرو آزاد : ۷۵ ، ۷۸ ، ۱۰۳ ،
۱۱۲ ، ۳۴۳ ، ۳۳۳ ، ۳۳۸ ،
۳۵۳ ، ۳۵۴ ، ۳۵۶ ، ۳۶۱ ،
۳۶۳ ، ۳۶۷ ، ۳۶۸ ، ۳۷۲ تا
۳۷۶ ، ۳۷۸ ، ۳۹۱ ، ۳۹۵ -
سفر کابل : ۱۳۱ -
سفینۂ بے خبر : ۷۹ ، ۳۶۷ -
سفینۂ خوشگو : ۷۰ ، ۱۰۲ ، ۱۰۶ ،
۱۰۸ ، ۳۶۰ ، ۳۷۸ -
سواد اعظم : ۱۶۵ ، ۱۹۲ ، ۱۹۹ -
سورۂ یوسف : ۱۸۲ -
سویرا ، مجلہ : ۳ -
سیرالمتاخرین : ۳۷۰ ، ۳۷۱ ،
۳۷۳ ، ۳۸۵ ، ۳۸۷ ، ۳۸۸ ،
۳۹۱ -
سیرت امیر خسرو : ۷۷ -
سیرت بیدل (انگریزی) : ۱۳ ، ۵۹ ،
۹۲ ، ۱۳۰ ، ۱۳۱ ، ۱۳۶ ،
۱۳۹ ، ۳۸۷ -

ش

شاہ نامہ (اسدی) : ۳۴۳ ۔
شاہ نامہ (بیدل) ۳۶۶ ۔
شاہ نامہ (مغل) : ۷۸ ۔
شرح ملا جامی : ۴۴ ، ۳۳۶ ۔
شعر اقبال : ۲۷۶ ، ۲۷۹ ۔
شمس العارفین : ۲۹۵ ۔
شمس بازغہ : ۳۰ ، ۵۰ ۔
شمع انجمن : ۳۴۴ ، ۳۶۱ ، ۳۶۸ ، ۳۷۴ ، ۳۷۶ ، ۳۷۷ ۔
شہر آشوب ، مخمسات : ۷۳ ، ۳۸۹ ، ۳۹۷ ۔

ص

صبح گلشن : ۳۴۴ ، ۳۴۷ ، ۳۵۸ ، ۳۵۹ ، ۳۶۰ تا ۳۶۳ ، ۳۶۹ ، ۳۷۶ ، ۳۷۸ ، ۳۷۹ ۔

ط

طلسم حیرت : ۶۵ ، ۱۶۵ ، ۱۸۶ ، ۱۹۳ ، ۱۹۵ ، ۱۹۷ تا ۱۹۹ ، ۲۳۹ ، ۲۴۰ ، ۳۰۶ ، ۳۴۱ ، ۳۴۸ ، ۳۴۹ ، ۳۵۸ ، ۳۶۳ ۔
طور کلیم : ۱۹ ، ۳۶۵ ۔
طور معرفت : ۱۲۰ ، ۱۳۷ ، ۱۳۸ ، ۱۳۲ ، ۱۳۳ ، ۱۵۰ ، ۱۶۱ ، ۱۶۶ ، ۱۶۸ ، ۱۸۳ ، ۲۰۰ ، ۲۰۱ ، ۲۷۰ تا ۲۷۲ ، ۲۷۴ ، ۲۷۵ ، ۲۷۷ ، ۳۱۷ ، ۳۲۰ ، ۳۲۱ ، ۳۴۹ ، ۳۶۲ ۔

ع

عبدالقادر بیدل ، مقالہ : ۱۷ ۔
عبرت نامہ : ۳۹۳ ۔
عرفان ، مثنوی : ۳۰ ، ۲۰۰ ، ۲۱۰ ، ۲۳۲ ، ۲۵۱ ، ۲۵۷ ، ۳۵۰ ۔
عقد ثریا : ۱۱۴ ، ۱۳۴ ، ۳۶۹ ، ۳۷۴ ۔
علم النفسیات کا ایک الادی پہلو : ۱۸۶ ۔
عمل صالح : ۵۱ ۔
عہد مغلیہ میں فارسی علم و ادب : ۳۸۶ ۔

غ

غالب اور بیدل ، مقالہ : ۲۰ ۔
غرابت نگار : ۱۲۶ ۔
غیاث اللغات : ۲۶۱ ۔

ف

فرہنگ آنندراج : ۲۶۱ ۔
فصوص الحکم : ۲۸۴ تا ۲۸۷ ، ۳۲۶ ۔
فلسفۂ الٰہیات کی تشکیل جدید : ۱۸۶ ۔

فہرست مخطوطات لنڈن میوزیم: ۳۵۱، ۳۵۷، ۳۶۴ -
فیض الحق: ۱۴، ۱۹ -

ق

قرآن اور تصوف: ۱۹۲، ۱۹۴، ۳۰۲، ۳۰۶ -
قرآن مجید: ۸۴، ۱۸۲، ۲۱۶، ۲۲۳، ۲۹۳، ۲۹۹ -
قلم کار، مجلہ: ۲۸۳ -

ک

کابل میگزین: ۱۲۹ -
کافیہ: ۴۴، ۳۳۶ -
کتاب بیدل: ۱۴ -
کشف المحجوب: ۴۰۸ -
کلمات الشعرا: ۳۲، ۶۳، ۷۷، ۷۹، ۹۰، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۴، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۷۹، ۳۸۰ -
کلیات بیدل، قلمی: ۸۷، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۱۲، ۱۱۵، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۹۲، ۲۷۰، ۳۷۱، ۳۹۷، ۳۹۸ -
کلیات چہار عنصر: ۴۹ -
کلیات زٹلی: ۲۹۷ -
کلیات مفقودی: ۴۴ تا ۴۸، ۵۰، ۵۳، ۵۵ تا ۵۷، ۵۹، ۶۰، ۶۲، ۶۳، ۶۵ تا ۶۸، ۸۱، ۸۳ تا ۵۸، ۸۸، ۹۵ تا ۹۷، ۱۹۲، ۲۶۰، ۳۳۶، ۳۴۵، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۶، ۳۶۶، ۳۷۰، ۳۷۲ -
کلیات غالب فارسی: ۱۰ -
کلیات ولی: ۳۶۵ -

گ

گدڑی نامہ: ۳۴۹ -
گل رعنا: ۱۰۸، ۱۱۲ -
گل زرد: ۳۴۹ -
گلستان سعدی: ۴۷، ۲۲۷ -
گلشن سعادت: ۳۵۷، ۳۵۸ -
گلشن ہند: ۷۱، ۳۷۵ -
گلگشت بہار ارم: ۳۵۹ -

ل

لائف اینڈ ورکس آف عبدالقادر بیدل: ۱

م

مآثرالامرا: ۶۲، ۶۴، ۳۳۱، ۳۵۰، ۳۵۲، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۶۴، ۳۸۸ -
مآثر الکرام: ۵۰ -
مآثر عالم گیری: ۹۳، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۷، ۳۵۶، ۳۶۴ -
ماہ نو: ۱۸۷ -

مثنوی معنوی : ۳۶ ، ۶۷ ، ۳۳۱ - ۳۴۸ -
مجدد کا نظریۂ توحید : ۵۱ -
مجلۂ المجمع عربی و فارسی : ۹۸ ، ۲۵۹ -
مجمع النفائس : ۷۷ ، ۱۱۱ ، ۳۷۵ ، ۳۸۱ -
مجموعۂ نغز : ۶۸ ، ۷۲ ، ۱۱۲ ، ۳۶۳ ، ۳۷۲ -
محیط اعظم : ۶۴ ، ۱۲۰ ، ۱۳۶ ، ۱۳۷ ، ۱۳۹ ، ۱۶۵ ، ۱۶۸ ، ۱۶۹ ، ۱۹۲ ، ۱۹۴ ، ۱۹۵ ، ۱۹۸ ، ۱۹۹ ، ۲۰۳ ، ۲۱۰ ، ۲۲۴ ، ۲۴۰ ، ۲۶۰ ، ۲۷۰ ، ۲۷۱ ، ۲۷۴ ، ۲۷۹ ، ۳۰۷ ، ۳۴۱ ، ۳۴۹ ، ۳۵۸ -
مخزن ، مجلہ : ۱ ، ۴۳ ، ۱۵۹ -
مخزن نکات : ۳۶۵ ، ۳۶۷ -
مرآۃ الاصطلاح : ۳۷۵ ، ۳۹۴ -
مرآۃ الخیال : ۶۳ ، ۷۹ ، ۹۰ ، ۹۴ ، ۳۴۱ ، ۳۴۵ ، ۳۴۷ ، ۳۴۸ ، ۳۵۳ ، ۳۵۴ ، ۳۶۱ ، ۳۶۳ ، ۳۷۵ -
مردم دیدہ : ۳۸۰ ، ۳۸۱ -
مرقع دہلی : ۱۰۸ ، ۱۲۵ ، ۳۷۵ ، ۳۷۶ ، ۳۹۹ -
مرقع مثنوی ، ۶۴ : ۳۴۱ -
مزارات اولیاء دہلی : ۱۲۶ -
معارف ، مجلہ : ۴۴ ، ۴۵ ، ۶۰ ، ۶۵ تا ۷۱ ، ۷۶ تا ۷۸ ، ۸۰ تا ۸۲ ، ۸۴ ، ۸۶ ، ۸۸ ، ۹۱ ، ۹۲ ، ۹۴ ، ۹۷ ، ۳۳۷ ، ۳۴۲ تا ۳۴۶ ، ۳۴۸ ، ۳۴۹ ، ۳۵۳ تا ۳۵۶ ، ۳۵۸ تا ۳۶۴ ، ۳۶۶ ، ۳۶۷ ، ۳۶۹ تا ۳۷۱ ، ۳۷۳ تا ۳۷۹ ، ۳۸۳ -
معارف العمل : ۱۱ ، ۱۴ ، ۱۹ -
مکاشفات منعمی : ۳۶۶ -
مقالات الشعرا : ۳۶۰ ، ۳۷۴ ، ۳۸۰ -
مقالۂ ڈکٹری (تذکرۂ بیدل) : ۸۲ ، ۹۹ -
منتخب اللباب : ۵۱ ، ۷۴ ، ۳۶۴ ، ۳۷۰ ، ۳۷۱ ، ۳۷۲ ، ۳۸۷ ، ۳۸۹ ، ۳۹۰ ، ۳۹۴ ، ۳۹۵ -
من و تو : ۱۸۶ ، ۴۱۳ -
مہابھارت : ۶۲ ، ۶۳ ، ۲۱۶ -

ن

نسخۂ حمیدیہ ، دیوان غالب : ۱۳۷ -
نشتر عشق : ۴۴ ، ۴۸ ، ۱۰۴ ، ۳۳۶ ، ۳۳۷ ، ۳۴۶ ، ۳۵۹ ، ۳۷۶ ، ۳۷۸ -
نصرت ، مجلہ : ۲۰ ، ۲۱ -
نکات الشعرا : ۳۶۵ ، ۳۶۷ ، ۳۷۴ -

نکات بیدل : ۳۰۷ -
نگار پاکستان ، مجلہ : ۱۹۰ -
نگارستان فارس : ۶۸ ، ۳۸۲ -
نوائے وطن ، مجلہ : ۳۳ ، ۳۷۱ -
نورالہدیٰ : ۲۹۵ -
نئی تحریریں : ۲ ، ۱۳۱ -

و

والعات دارالحکومت دہلی : ۱۲۶ -
وقائع نعمت خان عالی : ۳۶۳ -
ولندیزی ڈائری ویلنٹین : ۳۹۰ -
ویلہ ، ۱۳۵ -

ہ

ہدیہ‌ٔ الیس کابل : ۸۶ ، ۸۷ -
ہمیشہ بہار ، تذکرہ : ۳۵۸ تا ۳۶۰ ، ۳۶۲ ، ۳۷۹ -

ی

یادگار غالب : ۱۳۷ -
یثرب : ۳۹۶ -
یوسف زلیخا ، مثنوی : ۳۸۰ -

اصطلاحات و تلمیحات

آ

آب : ۱۹۳ -
آدم : ۲۲۵ ، ۲۲۶ ، ۳۴۸ -
آفاق : ۶ -
آفتاب : ۱۹۵ -
آمد : ۲۷۴ -
آئینہ و متعلقات آئینہ : ۲۴ ، ۱۵۵ ، ۱۵۶ ، ۱۶۲ ، ۱۴۵ ، ۱۴۷ ، ۲۲۵ ، ۲۶۰ تا ۲۶۷ ، ۲۷۰ تا ۲۸۸ ، ۲۹۷ ، ۳۰۶ تا ۳۰۸ ، ۳۱۸ تا ۳۳۱ -

الف

ابدال : ۶۰ -
ابدآباد : ۲۹۲ -
ابعاد ثلاثہ : ۲۳۲ -
ابلاغ : ۲۹۴ ، ۳۱۹ ، ۳۲۰ -
اتحاد : ۸۵ ، ۲۹۰ ، ۲۹ ، ۲۹۶ ، ۳۰۲ ، ۳۰۳ ، ۳۰۵ ، ۳۲۸ -
ابعاد ادراک : ۲۷۲ -
اثبات ذات : ۱۸۵ ، ۱۹۸ ، ۲۰۷ ، ۲۹۰ -
اثبات ہستی : ۲۴۰ -
احدیت : ۳۰۵ ، ۴۰۳ ، ۴۰۷ -
احساس : ۱۸۵ ، ۲۹۸ -
احساس جمال : ۱۴۳ ، ۱۳۸ ، ۱۶۱ ، ۱۶۷ ، ۱۶۹ ، ۱۷۴ ، ۲۶۸ ، ۲۷۴ ، ۲۷۶ ، ۲۷۸ -
احساس ذات : ۱۸۵ ، ۱۸۶ -
احساس ہستی : ۱۸۵ -
احوال : ۶۰ ، ۱۹۱ -
اختیار : ۲۳۲ ، ۲۴۱ -
ادب عالیہ : ۱۹۰ -
ادراک : ۲۷۰ ، ۲۷۴ ، ۲۷۶ ، ۲۸۱ ، ۲۸۸ ، ۳۰۱ ، ۳۰۴ ، ۳۰۶ ، ۳۰۸ -
ارادۂ الٰہی : ۲۲۸ -
ارباب تصوف : ۱۸۸ ، ۲۸۹ ، ۳۰۶ ، ۳۰۷ -
ارباب حال : ۶۹ -
ارتقا : ۲۳۸ ، ۲۴۰ ، ۲۴۱ ، ۳۱۲ -
ارتقائے ذات : ۱۸۱ ، ۲۲۳ ، ۲۳۹ ، ۲۴۳ ، ۳۱۰ ، ۳۱۲ ، ۴۰۳ -
اردوئے معلیٰ : ۱۱۶ -

از خود بے سدھی : ۲۰۸ ۔
ازل : ۳۰۱ ۔
اول الازلال : ۲۹۲ ۔
استعاره : ۱۰ ، ۱۱۷ ، ۱۸۲ ، ۱۹۰ ، ۱۹۱ ، ۱۹۵ ، ۱۹۶ ، ۲۲۵ ، ۲۷۷ ، ۲۸۸ ، ۳۲۶ ، ۳۳۰ ، ۴۰۳ ۔
استغراق : ۲۳۸ ، ۳۰۲ ۔
استغنا : ۲۳۳ ، ۲۳۸ ، ۳۰۰ ، ۳۵۲ ۔
اسرار نبی : ۳۰۵ ۔
اسلامی تصوف : ۱۸۵ ، ۱۸۶ ۔
اسلوب : ۲۹۷ ، ۳۱۹ ، ۳۲۰ ۔
اسلوب کا ترچھا پن : ۷ ، ۴۰۳ ۔
اشراق : ۲۷۱ ۔
اشراقیات : ۱۹۵ ۔
اشعاع ازلی : ۱۹۵ ۔
اشعاع نور : ۱۹۴ ، ۲۱۰ ، ۴۰۳ ۔
اعیان ثابتہ : ۲۱۱ ۔
اطلاق : ۴۰۳ ۔
اغراق : ۱۴۰ ۔
الحاد : ۵۹ ، ۱۵۷ ، ۴۰۴ ۔
التصاے ذات : ۲۲۹ ۔
الآن کما کان : ۲۱۱ ۔
الٰہیات : ۶۳ ۔
الوہی زمان : ۲۲۱ ، ۲۹۲ ، ۳۲۵ ، ۴۰۳ ۔
الوہیت : ۲۹۱ ، ۳۰۵ ۔
الہام : ۱۳۵ ، ۲۳۰ ، ۲۹۴ ۔
امکان : ۱۵۵ ، ۲۴۰ ، ۴۰۴ ۔
انا : ۲۲۴ ، ۲۲۵ ، ۲۳۹ ، ۲۸۸ ، ۲۹۱ ، ۴۰۴ ۔
انا الحق : ۲۹ ۔
انائیت : ۲۹۱ ۔
انا و لاغیری : ۴۱۵ ۔
انائے باطنی : ۱۸۵ ۔
انائے حقیقی : ۱۸۵ ۔
انائے ذاتی : ۱۴ ، ۸۰ ، ۹۱ ۔
انائے کامل : ۱۸۵ ۔
انائے مطلق : ۳۰۶ ۔
انسان : ۱۹۱ ، ۲۱۵ تا ۲۱۷ ، ۲۲۵ تا ۲۲۸ ، ۲۸۴ تا ۲۸۷ ، ۲۹۰ ، ۲۹۳ ، ۲۹۴ ، ۳۰۳ ، ۳۱۰ ، ۳۱۴ ، ۳۲۷ ، ۳۲۹ ، ۳۵۴ ۔
انسان ربانی : ۲۸۹ ، ۲۹۲ ، ۳۲۸ ، ۴۰۴ ۔
انسان کامل : ۱۶ ، ۲۸۵ تا ۲۸۷ ، ۲۹۲ ، ۲۹۴ ، ۳۰۳ ، ۳۲۸ ، ۳۴۲ ، ۴۰۴ ۔
انفس : ۶ ۔
انفعال : ۱۳۷ ، ۲۶۹ ۔
ایگو : ۱۸۷ ۔

ب

باطن : ۱۸۰ ، ۱۸۲ ، ۲۳۸ ،

اصطلاحات و تلمیحات

آ

آب : ۱۹۳ -
آدم : ۲۲۵ ، ۲۲۶ ، ۳۲۸ -
آفاق : ۶ -
آفتاب : ۱۹۵ -
آمد : ۲۴۳ -
آئینہ و متعلقات آئینہ : ۲۳ ، ۱۵۵ ، ۱۵۶ ، ۱۶۲ ، ۱۴۵ ، ۱۴۴ ، ۲۲۵ ، ۲۶۰ تا ۲۶۴ ، ۲۴۰ تا ۲۸۸ ، ۲۹۴ ، ۳۰۶ تا ۳۰۸ ، ۳۱۸ تا ۳۳۱ -

الف

ابدال : ۶۰ -
الہ آباد : ۲۹۲ -
ابعاد ثلاثہ : ۲۳۲ -
ابلاغ : ۲۶۳ ، ۳۱۹ ، ۳۲۰ -
اتحاد : ۸۵ ، ۲۹۰ ، ۲۹۱ ، ۲۹۶ ، ۳۰۲ ، ۳۰۳ ، ۳۰۵ ، ۳۲۸ -
اتحاد ادراک : ۲۴۲ -
اثبات ذات : ۱۸۵ ، ۱۹۸ ، ۲۰۴ ، ۲۹۰ -
اثبات ہستی : ۲۳۰ -
احدیت : ۳۰۵ ، ۳۰۳ ، ۳۰۴ -
احساس : ۱۸۵ ، ۲۹۸ -
احساس جمال : ۱۴۳ ، ۱۳۸ ، ۱۹۱ ، ۱۶۴ ، ۱۶۹ ، ۱۴۳ ، ۲۶۸ ، ۲۴۳ ، ۲۴۶ ، ۲۴۸ -
احساس ذات : ۱۸۵ ، ۱۸۶ -
احساس ہستی : ۱۸۵ -
احوال : ۶۰ ، ۱۹۱ -
اختیار : ۲۳۲ ، ۲۳۱ -
ادب عالیہ : ۱۹۰ -
ادراک : ۲۴۰ ، ۲۴۳ ، ۲۴۶ ، ۲۸۱ ، ۲۸۸ ، ۳۰۱ ، ۳۰۳ ، ۳۰۶ ، ۳۰۸ -
ارادۂ الٰہی : ۲۲۸ -
ارباب تصوف : ۱۸۸ ، ۲۸۹ ، ۳۰۶ ، ۳۰۴ -
ارباب حال : ۶۹ -
ارتقا : ۲۳۸ ، ۲۳۰ ، ۲۳۱ ، ۳۱۲ -
ارتقائے ذات : ۱۸۱ ، ۲۳۳ ، ۲۳۹ ، ۲۳۲ ، ۳۱۰ ، ۳۱۲ ، ۳۰۳ -
اردوئے معلیٰ : ۱۱۶ -

از خود بی شدن : ۲۰۸ ۔
ازل : ۳۰۱ ۔
ازل الازال ۔ ۲۹۲ ۔
استعارہ : ۱۰ ، ۱۱۷ ، ۱۸۲ ، ۱۹۰ ، ۱۹۱ ، ۱۹۵ ، ۱۹۶ ، ۲۲۵ ، ۲۷۷ ، ۲۸۸ ، ۳۲۶ ، ۳۳۰ ، ۳۰۳ ۔
استغراق : ۲۳۸ ، ۳۰۲ ۔
استغنا : ۲۳۳ ، ۲۳۸ ، ۳۱۰ ، ۳۵۲ ۔
اسرار نبی : ۳۰۵ ۔
اسلامی تصوف : ۱۸۵ ، ۱۸۶ ۔
اسلوب ۔ ۲۶۷ ، ۳۱۹ ، ۳۲۰ ۔
اسلوب کا ترچھا پن : ۷ ، ۳۰۳ ۔
اشراق : ۲۷۱ ۔
اشراقیات : ۱۹۵ ۔
اشعاع ازلی : ۱۹۵ ۔
اشعاع نور : ۱۹۳ ، ۲۱۰ ، ۳۰۳ ۔
اعیان ثابتہ : ۲۱۱ ۔
اطلاق : ۳۰۳ ۔
اغراق : ۱۳۰ ۔
افراد : ۵۹ ، ۱۵۷ ، ۳۰۳ ۔
اقتضائے ذات : ۳۲۹ ۔
الآن کما کان : ۲۱۱ ۔
الٰہیات : ۶۳ ۔
الوہی زمان : ۲۲۱ ، ۲۹۲ ، ۳۲۵ ، ۳۰۳ ۔
الوہیت : ۲۹۱ ، ۳۰۵ ۔
ابہام : ۱۳۵ ، ۲۳۰ ، ۲۸۶ ۔
امکان : ۱۵۵ ، ۲۳۰ ، ۳۰۳ ۔
انا : ۲۲۳ ، ۲۲۵ ، ۲۳۹ ، ۲۸۸ ، ۲۹۱ ، ۳۰۳ ۔
اناالحق : ۲۹ ۔
انائیت : ۲۹۱ ۔
انا و لاغیری : ۳۱۵ ۔
انائے باطنی ۔ ۱۸۵ ۔
انائے حقیقی : ۱۸۵ ۔
انائے ذاتی : ۱۴ ، ۱۸۰ ، ۱۹۱ ۔
انائے کامل : ۱۸۵ ۔
انائے مطلق : ۳۰۶ ۔
انسان : ۱۹۱ ، ۲۰۵ تا ۲۰۷ ، ۲۲۵ تا ۲۲۸ ، ۲۸۳ تا ۲۸۷ ، ۲۹۰ ، ۲۹۳ ، ۲۹۳ ، ۳۰۳ ، ۳۱۰ ، ۳۱۳ ، ۳۲۷ ، ۳۲۹ ، ۳۵۳ ۔
انسان ربانی : ۲۸۹ ، ۲۹۲ ، ۳۲۸ ، ۳۰۳ ۔
انسان کامل : ۱۶ ، ۲۸۵ تا ۲۸۷ ، ۲۹۲ ، ۲۹۳ ، ۳۰۳ ، ۳۲۸ ، ۳۳۲ ، ۳۰۳ ۔
انفس : ۶ ۔
انفعال : ۱۲۷ ، ۲۶۹ ۔
اینگو : ۱۸۷ ۔

ب

باطن : ۱۸۰ ، ۱۸۲ ، ۲۳۸ ،

۳۰۸ -
باطن آراستہ ۔ ۱۸۲ ، ۸۳ -
باطن رنگین : ۲۴۸ -
باطنی نگاہ : ۱۸۰ -
باقی باللہ : ۹ ، ۲۳ -
بالغ ادراک : ۴ -
بالیدگی : ۲۳۹ ، ۲۶۳ ، ۲۹۳ -
بالیدگیِ ذات : ۳۱۲ -
بالیدگیِ نفس : ۲۳۲ -
بحر : ۱۹۳ ، ۱۹۳ ، ۲۱۲ ، ۲۱۶ ،
۲۱۴ ، ۲۱۹ ، ۲۵۱ ، ۳۱۵ -
بداعت : ۱۸۹ -
برزخ : ۱۳ -
بروج و ثوابت : ۵۴ -
برھا : ۶۱ ، ۳۰۳ ، ۳۰۵ -
بزم کبریا ۔ ۳۲۳ -
بزم گہ قلم : ۳۰۳ -
بساطِ عالم . ۳۲۵ -
بساطِ کبریا : ۵۸ ، ۳۰۵ -
بشر : ۶۱ ، ۳۰۵ -
بقا : ۲۳۲ -
بلاغت : ۱۰ ، ۱۵۱ -
بولاس : ۹۴ ، ۱۰۶ -
بہاریہ : ۱۳۹ ، ۱۹۸ ، ۱۹۲ ، ۲۴۰،
۲۴۱ -
بہشت : ۱۳ ، ۱۶۳ ، ۱۴۳ ، ۱۴۸ ،
۱۸۰ ، ۱۸۳ ، ۱۸۵ -
بیرنگی : ۳۰۵ -
بیعت : ۱۸۸ ، ۱۸۹ -
بے کمی : ۵۰۳ -

پ

پاس انفاس : ۲۰۶ -
پردۂ مثال : ۵۸ -
پیکر مثالی ۔ ۱۳۹ -
پیراہن : ۲۵۵ -

ت

تازہ گو شعرا : ۲۵۵ ، ۲۶۳ ، ۲۴۸ ،
۳۲۱ ، ۳۳۲ ، ۳۳۹ -
تازہ گوئی : ۳۲ ، ۴۰ ، ۱۵۲ ، ۱۶۲ ،
۱۶۳ ، ۱۹۰ ، ۱۹۱ ، ۳۰۵ -
تعدد امثال : ۲۹۹ ، ۳۰۰ ، ۳۰۱ -
تجربۂ روحانی : ۲۸۳ ، ۲۸۴ ، ۲۸۹ ،
۲۹۱ تا ۲۹۳ ، ۲۹۶ ، ۲۹۴ ،
۳۰۲ -
تجرید : ۳۲۳ ، ۳۰۵ -
تجریدی افکار : ۲۸۳ -
تجریدی خیال ۔ ۲۶۶ -
تجلی : ۲۲۹ ، ۲۳۱ ، ۲۸۹ ، ۲۸۴ ،
۳۰۶ -
تجلیات . ۱۳۱ ، ۲۹۴ ، ۳۲۹ -
تجلیات الہی : ۲۸۹ ، ۲۸۴ ، ۳۰۶ -
تجلیاتی شعور . ۱۵ ، ۳۰۹ -
تحت الشعور : ۲۴۴ -
تخلیل : ۲۳۰ -

تحقیق حسن : ۲۶۹ ، ۲۴۲ -
تقابلی تعیّن : ۲۲ ، ۱۳۲ ، ۲۶۳ ،
۲۶۶ ، ۲۹۴ ، ۲۴۹ ، ۳۱۹ -
تحمل : ۲۴۰ ، ۲۴۸ -
تذلیل : ۲۳۰ -
ترک : ۲۳۶ -
تزکیهٔ باطن : ۲۳۸ -
تزکیهٔ نفس : ۱۲۳ ، ۱۸۸ -
تسلیم و رضا : ۲۳۳ -
تشبیه : ۱۱۴ ، ۱۸۵ ، ۱۹۱ ،
۲۰۳ ، ۲۶۵ ، ۲۴۲ ، ۲۸۸ ،
۳۰۳ ، ۳۰۴ ، ۳۲۹ ، ۳۰۶ -
تصور خدا : ۳۰۵ ، ۳۲۳ -
تصوف : ۱۱ ، ۱۲ ، ۱۶ ، ۳۹ ،
۶۲ ، ۱۲۲ ، ۱۲۳ ، ۱۳۵ ،
۱۳۹ تا ۱۴۱ ، ۱۵۸ ، ۱۹۱ ،
۱۹۹ ، ۲۰۴ ، ۲۶۱ ، ۲۴۰ ،
۲۹۵ ، ۳۰۴ ، ۳۱۰ ، ۳۱۲ ،
۳۳۲ -
تضاد : ۱۸۳ -
تعقل : ۲۸۸ -
تعقل پسندی : ۲۹۶ -
تعینات وجودی : ۲۱۰ ، ۳۱۵ ،
۳۰۶ -
تعین حقیقت : ۳۰۶ -
تغزل : ۲۵۸ ، ۲۸۱ -
تکمیل ذات : ۳۱۲ -
تلمیح : ۱۸۳ ، ۱۸۵ -
تمثال : ۳۲۸ -
تنزلات : ۵۴ ، ۵۹ ، ۱۹۵ ، ۱۹۶ ،
۲۱۰ ، ۳۰۶ -
تنزلات ستة : ۳۰۴ ، ۳۰۶ -
تنزیه : ۳۰۳ ، ۳۰۴ ، ۳۲۳ ، ۳۰۴ -
تنقید : ۲۶۸ -
توانائی : ۲۹۹ ، ۳۲۶ -
توحید : ۲۱۲ ، ۲۱۵ ، ۳۲۵ ،
۳۳۶ -
تولید معنوی : ۲۰۸ -
تهی از خویش : ۳۱۱ -

ث

ثوابت : ۵۴ -

ج

جام جهان نما : ۳۱۱ -
جدت خیال : ۱۵۱ -
جدلیات فلسفه : ۹ :
جدلیت : ۸ ، ۹ ، ۳۰۴ -
جذب کامل : ۱۹۲ -
جذب و حال : ۳۹ -
جذب و سلوک ، ۱۲ -
جذب و شوق : ۱۰۵ ، ۱۸۱ -
جذبه : ۲۱۸ ، ۲۳۸ ، ۲۶۳ ، ۲۴۴ -
جذبهٔ تخلیق : ۲۸۰ -
جذبهٔ جنسی : ۳۲۸ -
جسم : ۳۰۴ -

چنگ : ۶۱، ۷۳ -
جلوہ : ۱۸۳، ۲۳۸، ۳۰۰، ۳۰۳ -
جلوۂ الٰہی : ۲۳۸ -
جلوۂ طور : ۳۰۱ -
جلی : ۳۰۶ -
جمال : ۱۸۳، ۲۶۴ -
جمال احدیت : ۵۴ -
جمالیاتی تاثر : ۲۴۳ -
جمالیاتی حِسّ : ۳۲۱ -
جمالیاتی ذوق : ۱۶۱ -
جمالیاتی شعور : ۱۴۳ -
جمال یکتا : ۲۸۴ -

چ

چشمۂ نور : ۲۷۱ -

ح

حادثہ : ۲۱۱، ۲۲۳، ۲۲۸، ۲۷۶، ۳۲۳، ۳۰۴ -
حاسۂ ادراک : ۲۳۰ -
حال : ۳۹، ۶۰، ۷۰، ۱۸۰، ۳۰۸ -
حالتِ جذب : ۷۹ -
حال و قال : ۱۶ -
حال و مقام : ۳۰۸ -
حجاب : ۲۳، ۳۰، ۱۵۳، ۱۵۸، ۱۶۲، ۱۹۱ تا ۲۰۳، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۹ تا ۲۵۳، ۲۵۵ تا ۲۵۹، ۲۷۱، ۳۱۰ تا ۳۱۸ -
حجاب : ۳۰۳ -
حدیثِ کنز : ۲۳۰ -
حرکت : ۲۳۰، ۲۳۱ -
حسن : ۳، ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۹۰، ۲۶۳، ۲۶۴ -
حسن آفرینی : ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۶۲، ۲۴۰، ۲۴۳، ۲۴۸ -
حسن ازل : ۱۴۴، ۲۸۱، ۲۸۹، ۲۹۰ -
حسن باطنی : ۱۸۳ -
حسن بیان : ۱۳۹ -
حسن بےرنگ : ۳۲۳ -
حسن پروری : ۱۶۱ تا ۱۶۳، ۲۶۴، ۲۷۵ -
حسن تخلیق : ۱۸۹ -
حسن حقیقی : ۳۲۱ -
حسن کامل : ۲۴۶ -
حسن مجازی : ۳۲۱ -
حسن مطلق : ۳، ۱۶۴، ۱۴۴، ۳۲۶ -
حسن عروضی : ۲۷۶ -
حسن و جمال : ۲۷۰ -
حسن و صداقت : ۱۸۳ -
حقیقت : ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۵، ۲۹۶، ۲۹۸ -
حقیقت اولیٰ : ۱۹۵ -
حقیقت الحقائق : ۱۹۱، ۲۱۱،

۲۱۳ -

حقیقت بے رنگ : ۲۲۹ ، ۳۰۸ -

حقیقت لتریہ : ۳۰۲ -

حقیقت ثابتہ : ۳۷ ، ۵۶ -

حقیقت حقہ : ۲۱۳ ، ۲۱۶ ، ۲۳۶ ، ۲۸۷ ، ۲۸۹ ، ۲۹۴ ، ۲۹۶ ، ۳۲۵ -

حقیقت سرمدیہ : ۳۰۲ ، ۳۰۳ -

حقیقت قائمہ : ۳۲۵ -

حقیقت مجردہ : ۳۲۶ -

حقیقت نهایہ : ۳۰۶ تا ۳۰۸ -

حقیقت مطلق : ۲۱۵ ، ۲۲۱ ، ۲۳۵ ، ۲۸۱ ، ۲۸۸ ، ۳۰۳ -

حقیقت و مجاز : ۱۲ ، ۳۰۸ -

حقیقی انفرادیت : ۲۸۸ -

حقیقی شخصیت : ۳۰۸ ، ۱۸۳ -

حکمت بالغہ : ۱۲۳ -

حلول : ۲۱۲ -

ہما : ۱۶۳ ، ۱۶۳ -

حواس خمسہ : ۱۶۳ ، ۳۱۲ -

حیات بعد الموت : ۳۱۳ -

حیرت : ۱۵۸ ، ۲۳۸ ، ۲۶۲ ، ۲۷۰ ، ۳۰۰ تا ۳۰۲ ، ۳۲۹ ، ۳۳۰ -

خ

خارجیت : ۳۶۸ -

خرابات ظہور : ۲۱۹ -

خفی : ۳۰۶ -

خلل حواس : ۲۷۹ -

خود آگاہی : ۱۲ ، ۳۰۹ -

خود شناسی : ۱۵۶ -

خود گدازی : ۱۵۶ -

خودی : ۱۲ ، ۱۸۷ ، ۳۱۳ -

خیر : ۱۹۰ -

خیر کامل : ۲۷۶ -

خیال : ۲۸۱ ، ۲۹۸ -

خیال آفرینی : ۲۵۵ ، ۲۶۲ ، ۳۰۹ -

خیال پرستی : ۲۹۸ ، ۳۰۳ ، ۳۰۹ -

د

داخلیت : ۲۶۸ -

دانائے راز : ۸ -

درد و داغ : ۱۷۷ -

درد و سوز : ۲۸۱ -

درد و شوق : ۲۱۳ -

درون بینی : ۱۸۰ -

دل : ۱۸۳ ، ۱۹۶ ، ۱۹۷ ، ۲۳۰ ، ۲۳۱ ، ۲۳۳ ، ۲۳۵ ، ۲۶۱ ، ۲۹۶ ، ۲۹۷ ، ۳۰۰ ، ۳۲۹ -

دوران محض : ۳۲۵ -

دور تسلسل : ۲۱۱ -

دورنگی : ۳۲۳ -

دولت وصال : ۱۷۷ -

دوق : ۱۵۳ ، ۲۲۸ ، ۲۹۰ ، ۳۲۳ -

دیدار الٰہی : ۳۰۵ ، ۳۳۱ -

ذ

ذات : ۱۹۳ ، ۳۱۲ ۔
ذات احد : ۲۲۴ ۔
ذات النبی : ۳۲۵ ، ۳۰۹ ۔
ذات بحت : ۱۹۳ ، ۱۹۵ ، ۲۲۸ ، ۳۰۹ ۔
ذات حق : ۲۹۰ ، ۳۰۳ ، ۳۰۶ ، ۳۰۹ ۔
ذات کا اجمالی علم : ۳۰۶ ، ۳۰۹ ۔
ذات کبریا : ۳۲۳ ۔
ذات مطلق : ۱۹۳ ، ۲۲۲ ، ۲۲۴ ، ۲۸۴ ، ۲۹۲ ، ۲۹۹ ، ۳۰۳ ، ۳۰۵ ، ۳۱۴ ، ۳۲۸ ۔
ذات عشق : ۲۰۹ ، ۳۰۵ ، ۳۱۵ ۔
ذات علیہ : ۳۰۶ ۔
ذات واجب الوجود : ۳۰۹ ۔
ذات و صفات النبی : ۳۲۳ ۔
ذاتی مشاہدہ : ۱۱ ۔

ر

رخصت استقبال : ۱۴۴ ۔
رسالت : ۳۰۵ ، ۳۰۶ ، ۳۱۳ ۔
رعایت لفظی ، ۲۵۵ ، ۳۰۹ ۔
رعایت معنوی : ۲۵۶ ، ۳۰۹ ۔
رقم جلی : ۳۰۵ ۔
رقم خفی ۔ ۳۰۵ ۔
رمز الٰہی : ۳۰۵ ۔
رمزیت : ۱۵۸ ۔
رنگ : ۶ ، ۲۴۴ ، ۲۴۹ ۔
رنگین بیانی : ۱۶۳ ، ۱۶۹ ، ۱۹۰ ، ۲۴۹ ۔
رنگین خیالی : ۱۶۲ ، ۱۶۳ ، ۱۶۹ ، ۱۷۰ ، ۱۹۰ ، ۲۰۰ ۔
روح : ۲۳۶ ، ۲۹۸ ، ۳۱۲ ، ۳۰۴ ۔
روحانی ارتقا : ۲۹۲ ۔
روحانیت : ۱۱ ، ۱۲ ، ۳۲۸ ۔
روح تصوف : ۲۳۶ ۔
روح کل : ۲۹ ، ۵۹ ، ۱۰۹ ۔
روح مطلق : ۲۹۸ ۔
رؤیا : ۵۹ ۔
رہبانیت : ۲۰۹ ۔
ریاضیات : ۶۳ ، ۲۱۹ ، ۲۲۶ ۔
ریختہ : ۱۱۸ ، ۳۳۸ ۔

ز

زمان : ۲۲۱ ، ۲۲۲ ، ۲۹۲ ۔
زمان کونی : ۳۲۵ ۔
زمان و مکان : ۲۳۱ ، ۲۸۵ ، ۳۱۳ ، ۳۲۵ ، ۳۲۶ ۔

س

ساعت وصال : ۳۰۳ ۔
سالک : ۶۱ ، ۲۲۸ ، ۲۲۹ ، ۲۹۶ ، ۳۰۶ ، ۳۰۹ ۔
سدرۃ المنتہیٰ : ۳۰۱ ۔
سلسلۂ ارتقا : ۵۴ ۔

سلسلۂ تنزلات : ۵۷ -
سلسلۂ قادریہ : ۲۹۵ ، ۳۳۷ -
سور عشق : ۲۱۴ -
سور و ساز : ۱۷۷ ، ۲۵۷ -
سوز و گداز : ۲۳۷ -
سوفسطائی : ۲۲۳ ، ۲۲۵ ، ۳۱۰ -
سیر دل : ۳۱۱ -

ش

شاہین : ۴ ، ۲۵۲ ، ۲۵۳ -
شراب معرفت : ۲۷۱ ، ۲۷۲ -
شعور ذات : ۲۹۱ -
شفق : ۱۶۸ ، ۲۷۴ -
شہود حق : ۳۱۴ -
شیونات : ۵۷ ، ۳۰۶ ، ۳۱۰ -

ص

صحرا : ۱۹۵ -
صداقت : ۱۸۳ -
صداے کن : ۲۱۰ -
صنائع و بدائع : ۳۱۹ -
صنعت بے نقط : ۳۳۵ -
صنعت تضاد : ۱۸۴ ، ۲۵۸ -
صنعت تمثیل : ۱۰ ، ۳۱ ، ۱۹۲ ، ۲۲۹ ، ۲۵۷ ، ۳۱۰ -
صنعت غیر منقوط : ۳۳۹ -
صنعت گری : ۲۵۵ ، ۳۱۹ -
صنعت مراعاۃ النظیر : ۱۸۴ ، ۲۵۶ ، ۳۱۲ -

صورت و معنی : ۳۲۳ -
صور علمی : ۲۲۸ ، ۲۲۹ ، ۳۱۰ -
صوفی : ۱۸۰ ، ۱۹۷ ، ۲۰۶ ، ۲۰۷ ، ۲۱۹ ، ۲۵۱ ، ۲۶۱ ، ۲۷۱ ، ۲۸۸ ، ۳۱۱ ، ۳۱۲ ، ۳۲۳ -
صوفیاے اسلام : ۲۹۶ -

ض

ضبط نفس : ۱۵۸ ، ۲۳۵ ، ۳۱۱ -

ط

طاؤس : ۱۴۷ ، ۱۵۰ ، ۱۵۲ ، ۱۶۳ تا ۱۷۶ ، ۱۸۳ ، ۱۸۵ ، ۱۸۷ تا ۱۹۰ ، ۲۶۸ ، ۲۷۷ تا ۲۷۹ ، ۳۲۲ ، ۳۳۰ -
طاؤس خیال : ۱۷۳ -
طاؤس ما : ۱۸۰ ، ۱۸۱ -
طاؤس من : ۱۸ ، ۱۸۱ -
طبیعیات : ۶۳ ، ۲۰۸ ، ۲۲۶ -
طور : ۱۵۰ ، ۱۵۲ -

ظ

ظنیات : ۳۰۳ -

ع

عارف : ۲۳۹ ، ۳۲۸ -
عارف کامل : ۳۲۳ -
عالم : ۲۲۵ ، ۲۲۶ ، ۳۲۷ ، ۳۲۸ -
عالم جذب : ۳۳۸ -

عالم اصغر : ۲۰۳ ، ۳۱۰ -
عالم اعیان : ۱۸۹ -
عالم اکبر : ۲۰۳ ، ۳۱۰ -
عالم امکان : ۱۸۹ -
عدم : ۱۸۸ ، ۲۱۲ ، ۲۱۸ ، ۲۳۱ ، ۲۳۲ ، ۲۳۹ -
عدم دوستی : ۲۳۲ -
عدم محض : ۲۲۹ -
عدم مطلق : ۲۳۲ -
عدمی عدم : ۲۱۶ -
عرفان : ۵ ، ۲۳۰ ، ۲۳۸ ، ۲۳۰ ، ۲۸۷ -
عرفان حق : ۳۱۳ -
عرفان ذات : ۵ ، ۳۱۳ -
عرق انفعال : ۲۳۸ ، ۲۸۳ -
عشق الهی : ۱۲۳ -
عشق تکوینی : ۲۱۳ -
عشق حقیقی : ۸۳ -
عقل اول : ۳۱۰ -
عقل تاسع : ۳۰ -
عقل کل : ۶۱ -
عقلیت : ۲۸۸ ، ۳۳۱ -
علامت : ۲۵۱ تا ۲۵۳ ، ۲۸۵ ، ۳۱۱ ، ۳۳۱ -
علم بیان : ۳۳۸ -
عمل تخلیق : ۲۶۹ -
عناصر اربعه : ۱۳۰ -
عین : ۲۸۵ ، ۲۸۶ ، ۲۹۶ ، ۳۰۲ ، ۳۲۷ -
عین الوجود : ۳۰۱ -
عین ذات : ۲۹۶ -
عینیت : ۵۹ ، ۲۲۹ ، ۳۰۳ ، ۳۰۷ ، ۳۱۰ -
عینیت تامه : ۳۰۲ -

غ

غنچه : ۱۸۳ ، ۱۸۵ -
غنچه و گل : ۱۸۳ -
غوث : ۶۰ -
غیرالله : ۲۳۳ -
غیرمحسوس : ۷ -
غیر مرئی : ۳۰۳ -

ف

فانی فی‌الله : ۲۳۹ -
فردوس : ۱۶۳ ، ۱۷۰ ، ۱۷۲ ، ۱۸۳ تا ۱۸۵ -
فقر : ۵۶ ، ۲۶۱ ، ۳۱۱ -
فقر فهدی : ۲۰۷ -
فکر و ادراک : ۳۰۸ -
فکر بدی : ۱۰۵ -
فکری اجتهاد : ۸ -
فلسفهٔ تنزلات : ۵۹ ، ۱۹۳ ، ۲۱۶ ، ۲۲۸ ، ۳۰۵ ، ۳۱۰ -
فلکیات : ۲۰۸ -

فنا : ٢٣٢ -
فنا پذیر صفات : ٢٩٥ -
فنا پذیری : ٣١٣ ، ٣١٤ -
فوق البشر : ٢٥٣ ، ٢٥٥ -

ق

قائم بالذات : ٢١٢ ، ٢٢٨ ، ٢٨٦ ، ٣١٠ -
قدیم و حادث : ٢١٠ ، ٢١١ ، ٢٢٨ ، ٣٢٣ ، ٣١٠ -
قطب : ٦٠ -
قلب : ٢٣٠ ، ٢٣١ ، ٢٣٣ ، ٢٣٥ ، ٢٩٦ تا ٢٩٩ ، ٣١٠ -
قلب صوفی : ٣١١ ، ٣٢٩ -
قلب ماهیت : ١٥ ، ١٣٢ ، ١٤٩ ، ٣١٢ -
قوس و قزح : ١٣٤ ، ٢٤٣ ، ٢٤٥ ، ٢٤٤ -
قید اطلاق : ١٩٣ -
قید لتزید : ١٩٣ -

ک

کائنات : ١٩١ ، ٢٨٣ تا ٢٨٦ ، ٢٩٢ ، ٢٩٣ ، ٣٢٦ -
کبریائی : ٢٣٢ ، ٢٣٣ -
کثرت : ٣٩ ، ١٥٥ ، ٢٣٢ -
کرم : ١٨٢ ، ١٨٣ -
کشف الصدور : ٥٦ ، ٣١٠ ، ٣١١ -
کشف القبور : ٣١١ -
کشف تکوینی : ٣١١ -
کشف و وجدان : ٢٢٦ ، ٢٣٠ ، ٢٨٩ -
کف : ١٩٣ ، ٢١٠ ، ٢١٦ -
کلمات بصورت کائنات : ١١ ، ٣١٠ -
کلیت : ٢٤٦ -
کنایه : ٢٦٥ ، ٣١١ -
کن لکان : ١٨٦ -
کیفیات : ٦٠ -

گ

گل : ١٦٣ ، ١٨٥ -
گل و نرگس : ١٦٣ -
گوپی : ٣١١ -
گوشه لشتی : ١٥٤ -
گوبر : ١٩٣ ، ٢٣٢ -

ل

لا ادریت : ٢١٣ ، ٣١١ -
لاشئی : ٢١٥ -
لاله : ٢٥٣ -
لامکان : ١٩٥ ، ٢٢٦ ، ٢٣٣ -
لیلیٰ : ١٥٦ ، ١٩٦ ، ٢٦٣ -

م

مابعدالطبیعات : ٦٢ ، ١٣٩ ، ٩٩ ، ٢٨٩ ، ٢٩٢ ، ٣٠٤ ، ٣١٠ ، ٣١٣ ، ٣٣٢ ، ٣٣٨ ، ٣١١ -

مابعدالطبیعیات : ۱۹۳ ، ۲۵۱ ، ۲۷۶ ، ۲۸۳ ، ۲۸۸ ، ۳۲۱ ، ۳۳۲ -
ماده : ۲۹۷ تا ۲۹۹ ، ۳۰۹ ، ۳۲۵ -
ماسوا : ۳۹۷ -
ماورائیت : ۵ ، ۲۹ ، ۵۹ ، ۲۸۸ ، ۳۰۳ ، ۳۰۷ ، ۳۲۳ -
ماورائے ادراک : ۲۱۳ -
مثال : ۳۰۷ -
مثالیه : ۳۱ ، ۳۸ ، ۲۲۰ ، ۳۱۱ -
مجاز مرسل : ۲۹۵ ، ۳۱۲ -
مجاز و حقیقت : ۳۹ -
مجاہدۂ نفس : ۳۹ ، ۵۳ ، ۳۳۱ -
مجرد : ۷ ، ۳۱۲ -
مجسم : ۷ ، ۳۱۲ -
محبوب ازل : ۲۱۳ ، ۲۱۳ ، ۲۲۸ ، ۲۳۶ -
محسوسات حرکی : ۲۶۹ -
محویت : ۲۳۸ ، ۳۰۲ -
محیط : ۲۰۳ ، ۲۱۷ ، ۲۳۸ -
مدارج تصوف : ۳۱۲ -
مدارج نفوس : ۵۷ -
مراتب عقول : ۵۷ ، ۳۱۲ -
مراتب کونیه : ۱۹۳ ، ۳۱۲ -
مراتب وجود : ۳۹ ، ۳۱۲ -
مرتبۂ تنزیه : ۳۰۵ -
مرتبۂ جامع : ۳۱۲ -
مرتبۂ وحدت : ۳۰۶ ، ۳۰۷ ، ۳۱۵ -
مرد کامل : ۲۵۳ ، ۲۵۵ -
مشاہدہ : ۱۷ ، ۵۹ ، ۲۳۸ ، ۲۸۷ ، ۲۹۶ ، ۳۰۲ -
مشہودات : ۱۳۹ -
مقاصد الحسنیٰ : ۲۸۹ -
معجزۂ فن : ۲۶۸ ، ۲۶۹ -
معروضی : ۲ ، ۳ -
معنی آفرینی : ۳۲ ، ۳۳ ، ۱۳۹ ، ۱۵۳ ، ۱۹۱ ، ۲۰۰ ، ۲۰۲ ، ۲۰۳ ، ۲۳۱ ، ۲۳۳ ، ۲۶۵ ، ۲۶۷ ، ۲۷۲ ، ۲۸۰ ، ۳۰۹ ، ۳۱۰ ، ۳۳۲ -
مکاشفہ : ۵۹ ، ۳۲۳ ، ۳۲۸ -
ملائتیه : ۸۰ -
ملاء اعلیٰ : ۲۲۷ -
ممکن الوجود : ۲۲۸ ، ۳۱۳ -
ممکن و واجب : ۳۹ -
مناصب تصوف : ۳۱۳ -
منطقیاتہ خیال پرستی : ۲۹۸ -
منی وجعالات : ۳۱۳ ، ۳۱۳ ، ۳۱۳ -
منی شخصیت : ۱۸۳ ، ۳۱۳ ، ۳۱۳ -
من و تو : ۱۳ ، ۲۹۱ ، ۲۹۲ ، ۳۱۳ -
موج : ۳۰ ، ۱۹۳ ، ۲۰۹ تا ۲۱۲ ،

۲۱۶ ، ۲۱۴ ، ۲۳۱ -
موضوعی : ۳۱۳ -
موناد (Monad) : ۲۸۸ ، ۲۸۹ ، ۳۱۳ -
میرزائیت : ۴۱ ، ۴۳ ، ۹۴ -

ن

نزول : ۳۰۵ ، ۳۰۶ ، ۳۰۶ -
نصب العینی انسان : ۲۲۳ ، ۲۵۱ ، ۳۲۶ ، ۳۱۳ -
نفس سوزان : ۱۵۸ ، ۳۱۱ -
نفی ذات : ۱۸۸ -
نفسیات : ۳۲۸ -
نفسیات اعداد : ۲۹۶ -
نقطهٔ جاذبه : ۲۶۶ ، ۲۶۹ -
نفی انا : ۱۸۵ -
نفی شخصیت : ۱۸۳ ، ۱۸۵ ، ۱۸۸ -
نو افلاطونی : ۲۹ ، ۲۱۲ ، ۳۱۳ -
نور : ۱۹۳ ، ۱۹۵ ، ۲۱۰ ، ۲۴۱ ، ۲۴۹ ، ۲۹۳ ، ۲۹۵ ، ۳۰۳ ، ۳۲۶ ، ۳۲۸ -
نور ازل : ۳۴ ، ۱۹۵ -
نور الهی : ۳۱۳ -
نور مصطفیٰ : ۳۰۵ ، ۳۰۹ -
نور مطلق : ۱۹۵ ، ۲۹۰ ، ۲۹۳ -
نه آسمان : ۳۱۳ -
نه افلاک : ۲۲۶ -
نیستی : ۲۱۸ -

نیم نفس : ۲۳۸ ، ۲۶۲ -

و

واجب الوجود : ۶۱ ، ۲۲۸ ، ۳۱۳ -
واحدیت : ۳۰۴ ، ۳۱۳ -
واردات : ۸ ، ۱۲ ، ۱۳۲ ، ۳۲۸ ، ۳۲۹ -
وجدان : ۸۱ ، ۲۲۶ ، ۲۳۰ ، ۲۸۸ ، ۲۹۲ -
وجدان ذات : ۳۰۳ -
وجدانیات : ۳۲۹ -
وجوب : ۶۱ ، ۳۱۵ -
وجود : ۱۹۳ ، ۲۰۹ ، ۲۱۲ ، ۲۱۳ ، ۲۲۴ تا ۲۲۹ ، ۲۳۱ ، ۲۳۵ ، ۲۳۴ ، ۲۹۸ ، ۳۱۵ -
وجود مطلق : ۲۴۶ ، ۳۰۴ -
وجود معنوی : ۱۸۳ ، ۱۸۳ ، ۲۶۶ ، ۶۶۴ -
وجود مقیّد : ۳۰۴ -
وجودیت : ۱۱ ، ۱۳ ، ۲۳ ، ۱۸۶ ، ۱۸۴ ، ۲۹۱ ، ۲۹۲ ، ۳۱۵ -
وجودی فلاسفه : ۱۱ ، ۱۳ -
وجودی متفکرین : ۲۹۱ -
وحدت ۱۵۳ تا ۱۵۵ ، ۲۲۸ ، ۲۲۹ ، ۲۳۲ ، ۲۴۰ ، ۳۰۶ ، ۳۰۴ ، ۳۱۵ ، ۳۲۳ ، ۳۰۴ ، ۳۱۵ -
وحدت احساس : ۲۴۹ -

وحدت ادراک : ٣٢٢ ، ٣٢٣ -
وحدت حواس : ٢٨٠ -
وحدت شهود : ٢٩ ، ٣٠ ، ١٥٣ ، ٣٠٤ ، ٣١٥ -
وحدت وجود : ٢٩ ، ١٥٣ ، ٣٠٤ ، ٣١٥ -
وحدت و کثرت : ٩٣ ، ٣٠٤ -
وراء الورا : ١٣٩ ، ٢٨٤ ، ٣٠٣ -
وصال : ٢٣٨ ، ٢٣٩ -
وصال النبی : ٢٣٨ -
ولی : ٣٠٣ -
ویدالت : ٢٣ ، ٢٩ ، ٦٢ ، ١١٨ ، ١٨٩ ، ٢١٥ ، ٢٢٣ ، ٣٣٨ ، ٣١٦ -

ه

هستی : ١٣ ، ٢١٨ ، ٢١٩ ، ٢٣٢ ، ٣٠٣ -
هستی مطلق : ١٩٥ ، ٣١٣ -
هندی ایرانی اسلوب : ١٦٠ -

ی

یاسیت پسند مفکرین : ١٨٨ -
یقینیات : ٣٠٣ -
یوسف : ١٦٢ ، ١٨٣ تا ١٨٥ -

صحت نامۂ اغلاط

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۷	۱۵	ترجیے فن	ترجیے پن
۳۴	۸	بے شاختگی	بے ساختگی
۶۰	۱۲	صوفی مسلک	صوفی کا مسلک
۷۱	۹	ضروی	ضروری
۷۸	۹	منعم	منعم خاں
۹۲	۲۴	ارہی	ابرہی
۹۳	۱۶	سراج دین علی آرزو	سراج الدین علی آرزو
۹۷	۷	معنوی	معنی
۱۰۳	۷	علی حسن خان	حسین علی خان
۱۰۳	۲۶	غبقت	بخفت
۱۱۳	۴	حصروا احصای	حصرو احصای
۱۱۶	۲۵	صیحح	صحیح
۱۱۷	۲۷	بیدل	بیدل
۱۲۰	۲۵	آذاد	آزاد
۱۳۷	۱۶	در	رد
"	۲۵	سالا	سال
۱۵۳	۶	برک گل	برگ گل
۱۵۵	۱۶	نگاۃ	نگاہ
۱۷۸	۱۰	محبوبہ	محبوب
۱۹۵	۴	حباب و کائنات	حباب ، کائنات
۲۳۹	۲۱	اصطلاح	اصلاح

صفحه	سطر	غلط	صحیح
۳۳۰	۱۲	بر پیغام	بر پیغام
۳۴۲	۱	حوشگو	خوشگو
۳۷۲	۲۴	کلیات : صفدری	کلیات صفدری
۳۸۶	۱۸	ثابث	ثابت
۳۹۱	۲۰	ودلثین	ولشین
۴۱۳	۲۱	مناگ	موناگ